اشرف المقالات

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ

بانیٔ مجلس صیانۃ المسلمین کے

حالاتِ زندگی، علمی عملی، اصلاحی، تبلیغی اور قیامِ پاکستان کے
سلسلہ میں اُن کی سعی اور خدمات جیسے موضوعات پر

جلد دوم و سوم

مرتبہ: وکیل احمد شیروانی

ناشر:
مجلس صیانۃ المسلمین پاکستان لاہور

بانی مجلس صیانۃ المسلمین کے

جلد دوم و سوم

مجلس صیانۃ المسلمین پاکستان لاہور

اشرف المقالات

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ

بانی مجلس صیانۃ المسلمین کے

حالاتِ زندگی، علمی عملی، اصلاحی، تبلیغی اور قیامِ پاکستان کے
سلسلہ میں اُن کی سعی اور خدمات جیسے موضوعات پر

علمائے کرام اور دانشورانِ قوم کے

مقالات

مرتبہ: وکیل احمد شیروانی

ناشر:

مجلس صیانۃ المسلمین پاکستان لاہور

سلسلۂ اشاعت ——— نمبر
نام کتاب ——— اشرف المقالات
حصہ دوم وسوم
مرتب ——— وکیل احمد شیروانی خادم مجلس صیانۃ المسلمین
پاکستان لاہور
سرورق ——— محمد زاہد صاحب
ناشر ——— مجلس صیانۃ المسلمین پاکستان لاہور
سن طباعت ——— سنہ ۱۴۱۶ھ مطابق سنہ ۱۹۹۵ء
بار اول ——— " " "
قیمت ———
مطبع : شرکت پرنٹنگ پریس ۴۳ نسبت روڈ لاہور

حقوق العباد سے غفلت

از: حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ

○

"حقوق العباد کا ادا کرنا اوراد و وظائف سے بدرجہا زیادہ ضروری ہے۔ اس کے ترک سے مواخذہ ہوگا، اور ترکِ وظائف سے کچھ مواخذہ نہیں۔ یہ تو مستحب ہے، لوگ ضروری کام چھوڑ کر غیر ضروری کام اختیار کرتے ہیں۔"

(مقالاتِ حکمت ص۱۷)

○

"لوگ اہل و عیال کے حقوق کی بالکل پرواہ نہیں کرتے، بس حکومت کرنا جانتے ہیں، یہ خیال نہیں کرتے کہ جن پر حکومت کرتے ہیں ان محکوموں کا بھی کوئی حق ہمارے ذمے ہے یا نہیں، معاشرت کو تو دین کی فہرست سے نکال ہی رکھا ہے، اس باب میں بڑی کوتاہی ہو رہی ہے، اور ان سب کا سبب دین سے غفلت ہے۔"

(الافاضات الیومیہ ص۴۲)

○

مقالات مہر
تفسیر
حدیث
فقہ
تصوف
حصہ دوم
آثارِ علمیہ مہر

فہرست
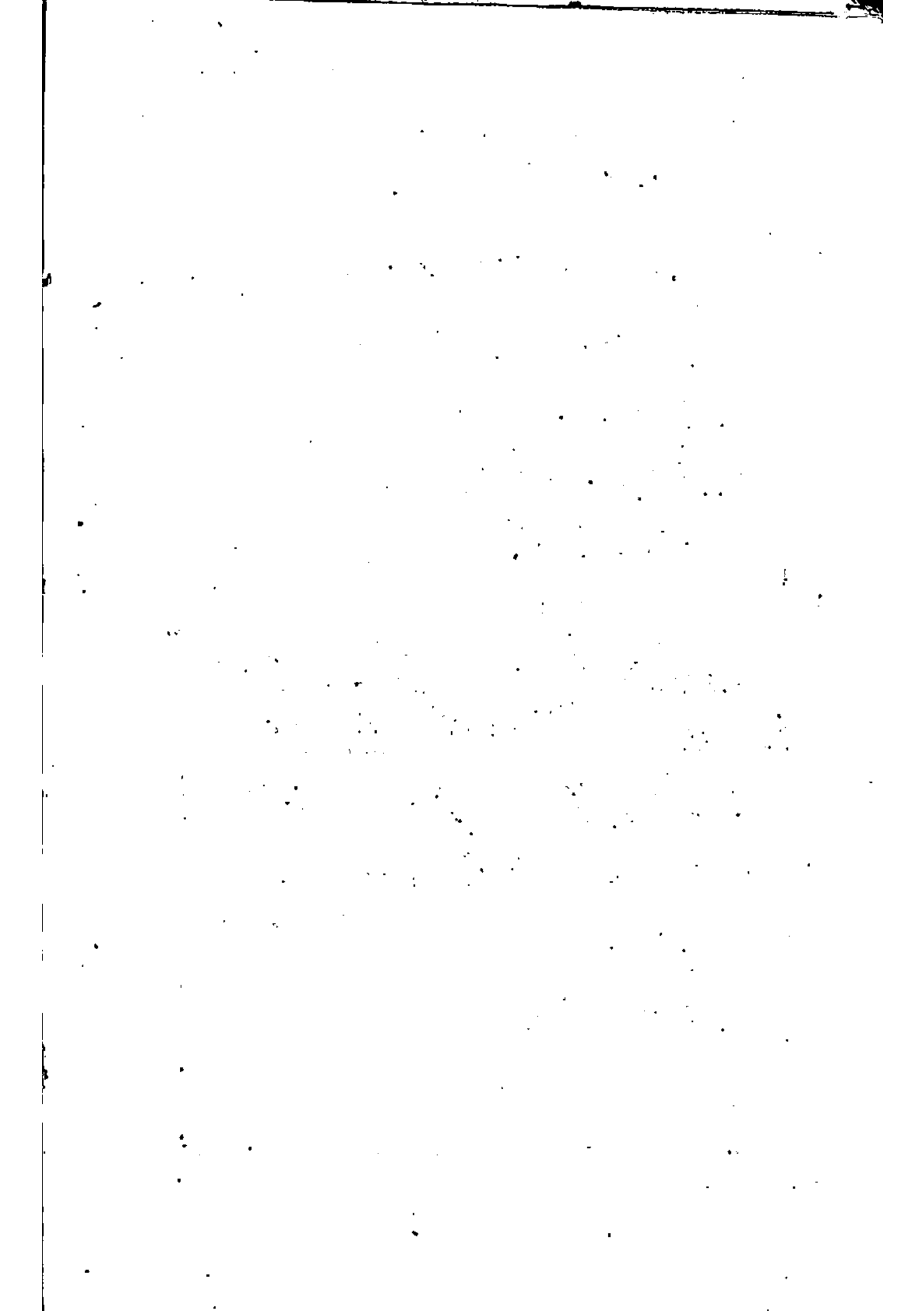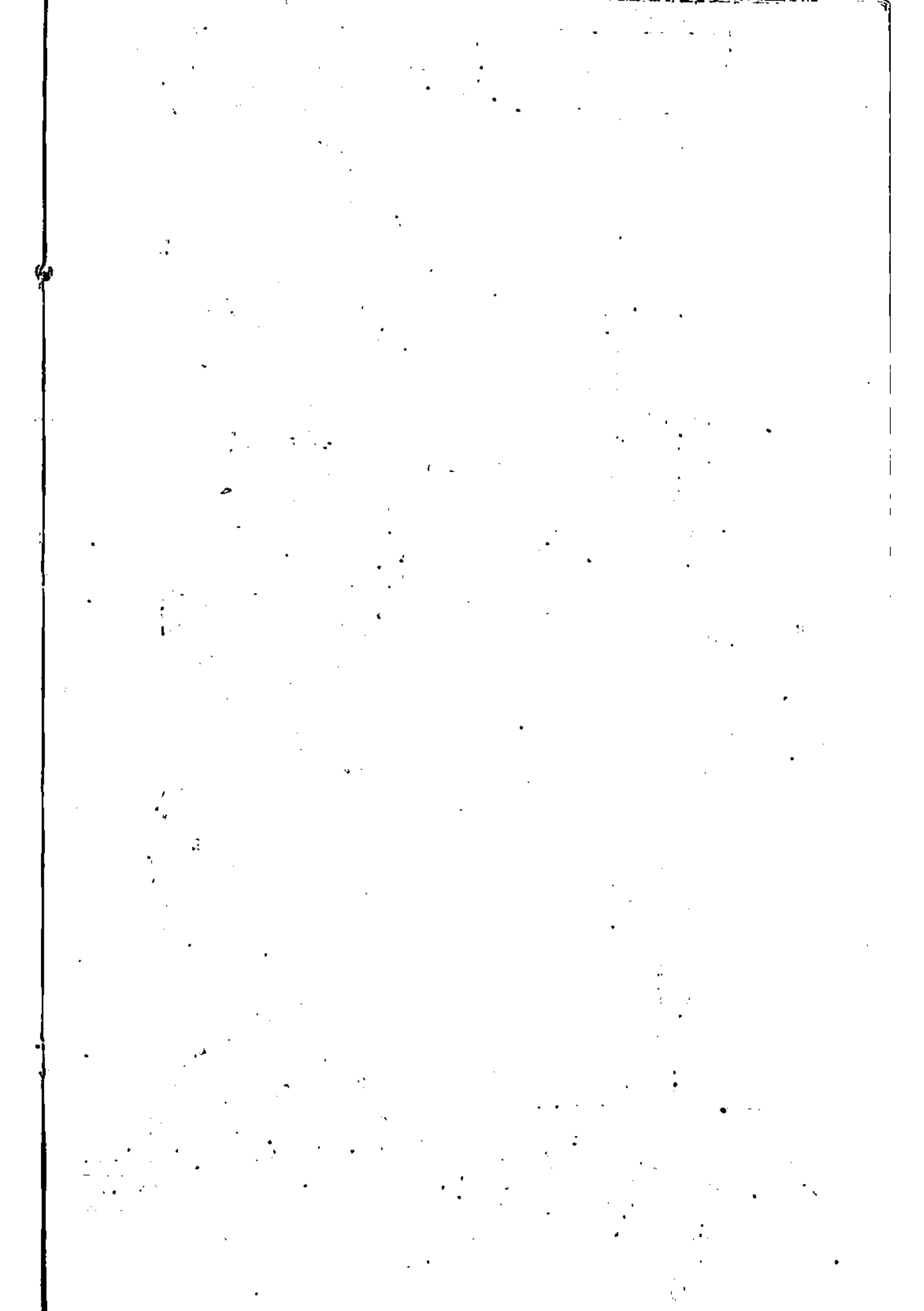
صفحہ	عنوان	نمبر شمار
	مقالات حصہ دوم	
	مقالہ نمبر ۱۸ **حضرت تھانویؒ کے آثارِ علمیہ** مؤرخ اسلام حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ تعالیٰ	

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
	مقالہ نمبر ۲۳	
	حکیم الامتؒ کی فقہی خدمات	
	حضرت مولانا عبید اللہ الاسعدی القاسمی صاحب باندویؒ	

مقالہ نمبر ۲۴

حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی علم تجوید وقرآت کے متعلق خدمات جلیلہ

فقیہ العصر حضرت مولانا مفتی سید عبد الشکور صاحب ترمذی

مقالہ نمبر ۳۱

حکیم الامّت حضرت تھانوی رح

علماء دیوبند کی پہلی شخصیت جنہوں نے علی الاعلان مسلم لیگ کی حمایت کا اعلان کیا

جناب احسان قریشی صاحب بی۔اے سیالکوٹی

مقالہ نمبر ۳۲

حکیم الامّت مولانا تھانویؒ اور قائد اعظم مرحوم

جناب مولانا محمد عبداللہ صاحب

مجلسِ صیانۃ المسلمین

کا

مقصد

اجتماعی طور پر مسلمانوں میں دینی جذبہ پیدا کرنا اور کامیابی کا اصل راستہ بتلانا ہے، جو مسلمانوں کے لیے تعلق مع اللہ دین میں منحصر ہے اور اس کا طریقہ صرف یہ ہے کہ احکام خداوندی اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر چھوٹے بڑے حکم کی خود بھی پابندی کرنا اور دوسروں کو بھی اس کا پابند بنانا اور ہر کام میں اس کا پورا لحاظ رکھنا کہ کوئی امر خلاف شرع نہ ہونے پائے۔

یہی عبدیت کی روح اور حیات مسلم کی اصل الاصول ہے۔

◎

مقالہ نمبر ۱۸

حکیم الامت حضرت تھانوی

کے

آثارِ علمیہ

از

مؤرخِ اسلام حضرت مولانا
سید سلیمان صاحب ندوی
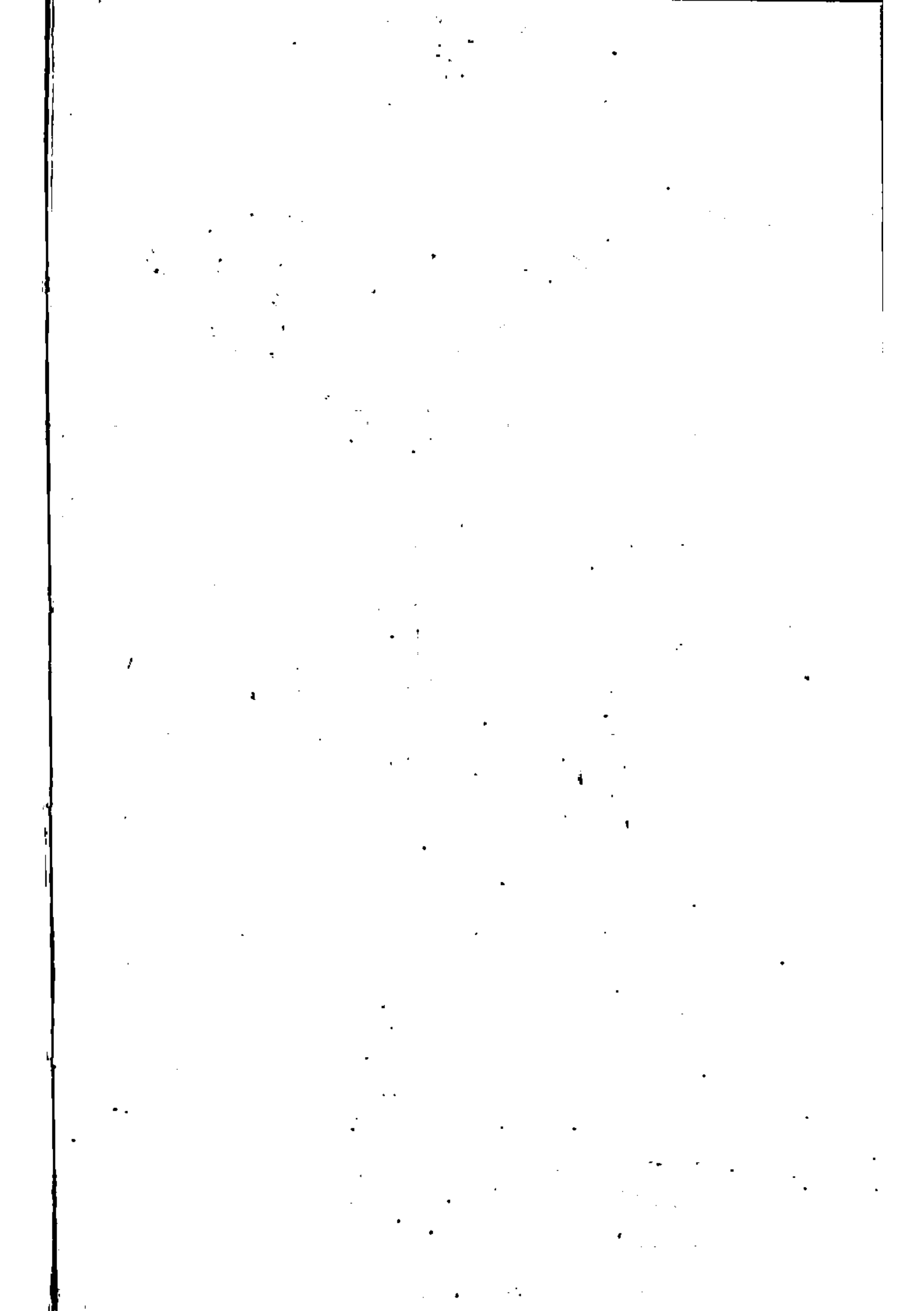
حکیم الامۃ کے آثارِ علمیہ

(از سید سلیمان ندوی قدس سرہ العزیز)

حضرت حکیم الامۃ مولانا اشرف علی رحمۃ اللہ علیہ کے علمی و دینی فیوض و برکات اس قدر مختلف الانواع ہیں کہ ان سب کا احاطہ ایک مختصر سے مضمون میں نہیں ہو سکتا اور یہی ان کی جامعیت ہے جو ان کے اوصاف و محامد میں سب سے اول نظر آتی ہے وہ قرآن پاک کے مترجم ہیں، مجوِّد ہیں، مفسر ہیں، اس کے علوم و حکم کے شارح ہیں، اس کے شکوک و شبہات کے جواب دینے والے ہیں، وہ محدث ہیں، احادیث کے اسرار و نکات کے ظاہر کرنے والے ہیں، وہ فقیہ ہیں۔ ہزاروں فقہی مسائل کے جوابات لکھے ہیں۔ نئے سوالوں کو حل کیا ہے۔ نئی چیزوں کے متعلق انتہائی احتیاطوں کے ساتھ فتوے دیئے ہیں۔ وہ خطیب تھے، خطب ماثورہ کو یکجا کیا ہے وہ واعظ تھے ان کے سینکڑوں وعظ چھپ کر عام ہو چکے ہیں، وہ صوفی تھے، تصوف کے اسرار و غوامض کو فاش کیا ہے۔ شریعت و طریقت کی ایک مدت کی جنگ کا خاتمہ کر کے دونوں کو ایک دوسرے سے ہم آغوش کیا ہے ان کی مجلسوں میں علم و معرفت اور دین و حکمت کے موتی بکھیرے جاتے تھے اور یہ موتی جن گنجینوں میں محفوظ ہیں، وہ ملفوظات ہیں جن کی تعداد بیسیوں تک پہنچ چکی ہے، وہ مرشد کامل تھے، ہزاروں مسترشد و مستفید ان کے سامنے اپنے احوال و واردات پیش کرتے تھے اور وہ ان کے تسکین بخش جوابات دیتے تھے اور ہدایات بتاتے تھے جن کا مجموعہ تربیۃ السالک ہے، انہوں نے بزرگوں کے احوال و کمالات کو یکجا کیا اور اس ذخیرہ سے سب کو آشنا کیا، ان کی متعدد کتابیں اس مضمون پر ہیں۔ انہوں نے حضرات چشت کے احوال و اقوال میں سے بظاہر اعتراض کے قابل باتوں کی حقیقت ظاہر کی اور اس کی تاویلات کیں ان کی کتابوں کے خلاصے، اقتباسات اور تسہیلات ان سے الگ ہیں۔ جن کی ترتیب

ان کے مسترشدین نے کی ہے وہ مصلح امت تھے۔ امت کے سینکڑوں معائب کی اصلاح کی، رسوم و بدعات کی تردید، اصلاح رسوم اور انقلاب حال پر متعدد تصانیف کیں وہ حکیم الامت تھے، مسلمانوں کے علاج اور نشأۃ و احیاء پر حیٰوۃ المسلمین وغیرہ رسائل تالیف فرمائے، غرض ان کی زندگی میں مسلمانوں کی شاید کوئی مذہبی ضرورت ہوگی جس کا مداوا اس حکیم الامۃؒ نے اپنی زبان اور قلم سے نہیں فرمایا اور جس کی وسعت کا اندازہ تحقیق اور مطالعہ کے بعد ہی نظر میں آسکتا ہے۔

ان کی تصنیفات ہندوستان کے پورے طول و عرض میں پھیلیں اور ہزاروں مسلمانوں کی صلاح و فلاح کا باعث ہوئیں۔ اردو اور عربی کے علاوہ مسلمانوں نے اپنے ذوق سے ان کی متعدد تصانیف کا ترجمہ غیر زبانوں میں بھی کیا چنانچہ ان کی متعدد کتابوں کے ترجمے انگریزی بنگالی، گجراتی اور سندھی میں شائع ہوئے۔

ان کی تصانیف کی تعداد جن میں چھوٹے بڑے رسائل اور ضخیم تصانیف سب داخل ہیں، آٹھ سو کے قریب ہیں۔ ۱۳۵۲ھ میں ان کے ایک خادم مولوی عبدالحق صاحب فتحپوری نے ان کی تصنیفات کی ایک فہرست شائع کی تھی جو بڑی تقطیع کے پورے ۸۶ صفحوں کو محیط ہے۔ اس کے بعد کے نو برسوں میں جو رسائل یا تصانیف ترتیب پائیں وہ ان کے علاوہ ہیں کہا جاتا ہے کہ ہر صدی کا مجدد اپنی صدی کے کمالات کا اعلیٰ نمونہ ہوتا ہے اگر یہ سچ ہے تو یہ صدی جو مطبوعات و منشورات کے کمالات سے مملو ہے اور جس کا اہم کارنامہ خواہ حق کے اثبات و اظہار میں ہو یا باطل کی نشر و اشاعت میں پریس اور مطابع ہی کے برکات ہیں، زبان و قلم اس صدی کے مبلغ ہیں اور رسائل و منشورات دعوت کے صحیفے ہیں اس بنا پر مناسب تھا کہ اس صدی کے مجدد کی کرامت بھی انہی کمالات میں جلوہ گر ہو،

علمائے اسلام میں ایسے بزرگوں کی کمی نہیں جن کی تصانیف کے اوراق اگر ان

کی زندگی کے ایام پر بانٹ دیئے جائیں تو اوراق کی تعداد زندگی کے ایام پر فوقیت لے جائے، امام جریر طبری، حافظ خطیب بغدادی، امام رازی، حافظ ابن جوزی، حافظ سیوطی وغیرہ متعدد نام اس سلسلہ میں لئے جاسکتے ہیں، ہندوستان میں مولانا ابوالحسنات عبدالحئی فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ اور نواب صدیق حسن خاں صاحب مرحوم کے نام بھی اس سلسلہ میں داخل ہیں، اس سلسلہ کا اخیر نام حضرت مولانا تھانوی علیہ الرحمۃ کا ہے۔

تصانیف کے انواع مولانا کے رسائل اور تصانیف کی تعداد گو آٹھ سو کے قریب ہے۔ مگر ان میں چھوٹے چھوٹے رسالے بھی جن کو نئی اصطلاح میں مضامین و مقالات کہتے ہیں داخل ہیں، ان میں بعض اتنے مختصر ہیں کہ صرف صفحے دو صفحے ہی ہیں۔ بعض ایسی ضخیم ہیں کہ کئی کئی جلدوں میں ہیں۔ بیشتر تصانیف نثر میں اور اردو زبان میں ہیں البتہ بارہ تیرہ رسائل و کتب عربی زبان میں ہیں جن کے نام یہ ہیں۔ سبق الغایات فی نسق الآیات، انوار الوجود، التجلی العظیم، حواشی تفسیر بیان القرآن، تصویر المقطعات التلخیصات العشر، مائۃ دروس، الخطب الماثورہ، وجوہ المثانی، سبع سیارہ، زیادات جامع الآثار، تائید الحقیقۃ اور تین فارسی میں ہیں: مثنوی زیر و بم، تعلیقات فارسی عقائد بانی کالج۔

نظم و نثر نظم میں مولانا کی تصنیف صرف یہی ایک مثنوی زیر و بم ہے اور یہ طالب العلمی کے بعد ہی لکھی ہے۔ بظاہر اس میں ایک بیوقوف عاشق اور چالاک معشوق کا قصہ ہے مگر درحقیقت یہ نفس انسانی کی بصیرت افروز حکایت ہے ایک اور نظم اوراد رحمانی کے آخر میں ہے۔ مولانا کو فارسی کے بے شمار اشعار یاد تھے۔ حافظ اور مولانا رومی کے اشعار بیشتر نوک زبان تھے اور نظم کا ملکہ اور سلیقہ بھی تھا، مگر کبھی اس سے کام نہیں لیا۔ ایک دفعہ میں نے اپنے برادر گرامی قدر مولوی مسعود علی صاحب کو جو تھانہ بھون میں مقیم تھے اپنے حاضر ہونے کے قصد سے مطلع کیا اور ریاض مرحوم کا یہ مصرع لکھدیا:

زندگی ہے تو فقیروں کا بھی پھیرا ہوگا

برادر موصوف نے یہ اطلاع مولانا کو دی اور یہ مصرع بھی سنا دیا تو فوراً فقیروں کو بدل کر یوں فرمایا۔

زندگی ہے تو سلیماں کا بھی پھیرا ہوگا

ایک دفعہ حضرت نے خاکسار کو ایک تسبیح عنایت فرمائی، تو خاکسار نے ایک بیت کہی ؎

خواجہ بخشید مرا سبحۂ صد دانہ بلطف　　　دانہ انداخت و در حلقہ مرا کرد اسیر

وصل مرحوم نے موقع سے حضرت کو یہ سنا دیا تو فرمایا "تو کبھی مجھے بھی اس کا جواب کہنا پڑے گا" مگر کچھ فرمایا نہیں سب سے آخر میں جب خاکسار نے از خود حضرت کی تحریک و اشارہ کے بغیر اپنے احساس سے مجبور ہو کر رجوع و اعتراف کا مضمون معارف میں شائع کیا اور ملاحظہ کے لئے بھیجا تو بہت مسرت ظاہر فرمائی اور مثنوی کے وزن پر دس بارہ شعر لکھ کر بھیجے جو اس ہیچ میرز کے لئے وجہ سعادت ہیں یہ غالباً آخری نظم کی تصنیف ہے اور اس کا ایک نام بھی حضرت نے رکھ دیا ہے۔

موضوعاتِ نثر | تصانیف کا بیشتر حصہ اصلاحی اور فقہی ہے اور کم تر کتب درس کے متعلق، تاہم دو چار درسی کتابوں پر بھی رسائل ہیں۔ مذہبی تصانیف میں علوم القرآن علوم الحدیث، کلام و عقائد، فقہ و فتاوی اور سلوک و تصوف اور مواعظ اکثر ہیں۔

قرآن پاک کی خدمت | اسلام میں علم کا سب سے پہلا سفینہ خود اسلام کا صحیفہ ہے، یعنی قرآن پاک، مولانا نے اس کی خدمت کی سعادت جس جس نوع سے حاصل فرمائی وہ بجائے خود ان کی ایک علمی کرامت ہے کانپور کے زمانہ قیام میں مطبع انتظامی میں تشریف رکھتے تھے۔ وہاں پر امت اولین مفسر قرآن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو خواب میں دیکھا۔ جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللّٰھم علّمہ الکتاب کی دعا دی تھی اور بشارت سنائی تھی۔ مولانا فرماتے تھے کہ اس رویا کے بعد سے میری مناسبت

قرآنی بہت بڑھ گئی تھی اور یہ رویا اسی کی طرف اشارہ تھا،

قرآن پاک کی خدمت کی یہ سعادت نہ صرف معنوی حیثیت سے حاصل فرمائی بلکہ لفظ و معنی دونوں حیثیتوں سے وہ حافظ تھے اور بڑے جید حافظ و قاری تھے اور فنون تجوید و قرأت کے بڑے ماہر اخیر زمانہ میں پانی پت کے قاری عبدالرحمان صاحب پانی پتی رحمۃ اللہ کی برکت سے قرأت سے ایک خاص مناسبت حاصل ہوگئی تھی۔ مولانا ایک دفعہ جب پانی پت گئے، تو لوگوں نے ان کو بالقصد کسی جہری نماز میں امام بنا دیا۔ مولانا نے بے تکلف کسی تصنع کے بغیر ایسی قرأت فرمائی کہ قاریوں نے تعریف کی کہ صحتِ مخارج کے ساتھ تکلف کے بغیر اس قدر مؤثر قرأت نہیں سنی، مولانا کی قرأت کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں مخارج کی پوری صحت ہوتی تھی، لیکن لہجہ میں عام قاریوں کی طرح بناوٹ نہ تھی اور نہ تحسین آواز کے لئے تکلف اتار چڑھاؤ ہوتا تھا بلکہ فطری آواز بلا تکلف حسب موقع گھٹتی بڑھتی رہتی تھی اور تاثیر میں ڈوب کر نکلتی تھی کہ ہر چہ از دل خیزد بر دل ریزد۔

۱۔ تجوید و قرأت و متعلقاتِ علوم قرآنی | علوم القرآن میں سے یہ پہلا فن ہے مولانا نے اس فن پر حسب ذیل کتابیں تصنیف فرمائیں۔

۱۔ جمال القرآن یہ فنِ تجوید کا رسالہ ہے جس میں قرآن مجید کو ترتیل اور تجوید سے پڑھنے کے مسائل ہیں، مخارج اور صفاتِ حروف، اظہار و اخفاء، ابدال و ادغام و تفخیم و ترقیق، وقف و وصل کے مسائل درج فرمائے ہیں،

۲ تجوید القرآن اس مختصر منظوم رسالہ میں بچوں کی یاد کے لئے تجوید کے عام مسائل لکھے ہیں۔

۳۔ رفع الخلاف فی حکم الاوقاف، اوقاتِ قرآنی کے بارہ میں قاریوں میں جو اختلاف ہے اس رسالہ میں اس کی توجیہ و تطبیق کی صورت بیان کی گئی ہے

۴۔ وجوہ المثانی، اس میں قرآن شریف کی مشہور قرأتوں کے اختلافات کو

قرآن پاک کی سورتوں کی ترتیب سے سلیس عربی میں جمع فرمایا ہے اور اخیر میں تجوید و قرأت کے کچھ قواعد تحریر فرمائے ہیں،

۵۔ تنشیط الطبع فی اجراء السبع' قرأت سبع اور اس فن کے رواۃ کی تفصیل درج کی گئی ہے،

۶۔ زیادات علی کتب الروایات' اس میں قرأت کی غیر مشہور روایتوں کی سندیں ہیں، یہ وجوہ المثانی کے اخیر میں بطور ضمیمہ ہے،

۷۔ ذنابات لمانی الروایات یہ اگلے رسالہ کا ضمیمہ ہے،

۸۔ یادگار حق القرآن اس میں قرآن مجید کے آداب اور تجوید کے مسائل کا مختصر بیان ہے، یہ تجوید القرآن کا اختصار اور ضمیمہ ہے۔

۹۔ متشابہات القرآن للتراویح رمضان میں قرآن پاک کے حفاظ کو تراویح میں قرآن سنانے میں بعض مشہور مقامات پر جو متشابہات لگتے ہیں، اُن سے بچنے کے اس میں چند قواعد کلیہ یعنی گر بعض آیات کے ضبط فرمائے گئے ہیں،

۱۰۔ آداب القرآن' قرآن پاک کی تلاوت کے آداب اور تلاوت کرنے والوں کی کوتاہیوں کی اصلاح کے لئے ہدایات و تنبیہات ہیں،

۲۔ ترجمہ و تفسیر قرآن | ۱۔ ترجمہ۔ قرآن پاک کا سلیس و بامحاورہ اردو ترجمہ جس میں زبان کی سلاست کے ساتھ بیان کی صحت کی احتیاط ایسی کی گئی ہے، جس سے حقیر کی نظر میں بڑے بڑے ترجمے خالی ہیں، قرآن پاک کا سب سے صحیح اردو ترجمہ حضرت مولانا شاہ رفیع الدین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمہ ہے لیکن وہ بہت ہی لفظی ہے، اس لئے عام اردو خوانوں کے فہم سے باہر ہے، مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے اس ترجمہ میں دونوں خوبیاں یکجا ہیں، یعنی ترجمہ صحیح اور زبان فصیح ہے، اس ترجمہ میں ایک خاص بات اور ملحوظ رکھی گئی ہے کہ اس زمانہ میں کم فہمی یا ترجموں کی عدم احتیاط کی وجہ سے جو شکوک قرآن پاک کی آیات

ہیں عام پڑھنے والوں کو معلوم ہوتے ہیں، ان کا ترجمہ ہی اس میں ایسا کیا گیا ہے کہ کسی تاویل کے بغیر وہ شکوک ہی ان ترجموں کے پڑھنے سے پیش نہ آئیں، اور پھر قرآن پاک کے لفظوں سے عدول بھی ہونے نہ پائے، اسی لئے کہیں کہیں مزید تفہیم کی غرض سے قوسین میں ضروری تفسیری الفاظ بھی بڑھائے گئے ہیں، یہ مولانا کی عظیم الشان خدمت ہے،

۲۔ تفسیر بیان القرآن، یہ بارہ جلدوں میں قرآن پاک کی پوری تفسیر ہے، جس کو ڈھائی سال کی مدت میں مولانا نے تمام فرمایا ہے، اس تفسیر کی حسب ذیل خصوصیتیں ہیں، سلیس بامحاورہ حتی الوسع تحت اللفظ ترجمہ نیچے ف کے اشارہ فائدہ سے آیت کی تفسیر میں روایات صحیحہ اور اقوال سلف صالحین کا التزام کیا گیا ہے، فقہی اور کلامی مسائل کی توضیح کی گئی ہے، لغات اور نحوی ترکیبوں کی تحقیق فرمائی گئی ہے، شبہات اور شکوک کا ازالہ کیا گیا ہے، صوفیانہ اور ذوقی معارف بھی درج کئے گئے ہیں، تمام کتب تفسیر کو سامنے رکھ کر ان میں سے کسی قول کو دلائل سے ترجیح دی گئی ہے، ذیل میں اہل علم کے لئے عربی لغات اور نحوی تراکیب کے مشکلات حل کئے گئے ہیں، اور حاشیہ پر عربی میں اعتبارات و حقائق و معارف الگ لکھے گئے ہیں، ماخذوں میں غالباً سب سے زیادہ آلوسی بغدادی حنفی کی تفسیر روح المعانی پر اعتماد فرمایا گیا ہے، یہ تفسیر اس لحاظ سے حقیقۃً مفید ہے کہ تیرہویں صدی کے وسط میں لکھی گئی ہے، اس لئے تمام قدماء کی تصانیف کا خلاصہ ہے، اور مختلف و منتشر تحقیقات اس میں یکجا مل جاتی ہیں،

عام طور سے سمجھا جاتا ہے کہ اردو تفسیریں صرف عوام اردو خوانوں کے لئے علماء لکھتے ہیں، یہی خیال مولانا کی اس تفسیر کے متعلق بھی علماء کو تھا، لیکن ایک دفعہ اتفاق سے مولانا کی یہ تفسیر مولانا انور شاہ صاحب نے اٹھا کر دیکھی تو فرمایا کہ میں سمجھتا تھا کہ اردو میں یہ تفسیر عوام کے لئے ہوگی، مگر یہ تو علماء کے دیکھنے کے قابل ہے، خود میرا خیال یہ ہے کہ قدیم کتب تفسیر میں راجح ترین قول مولانا کے پیش نظر رہا ہے، ساتھ ہی ربط آیات و سور کا ذوقی

مولانا کو ہمیشہ رہا ہے، اور اس کا لحاظ اس تفسیر میں بھی کیا گیا ہے، مگر چونکہ ربط آیات کے اصول سب کے سامنے یکساں نہیں، اسلئے وجوہ ربط میں قیاس اور ذوق سے چارہ نہیں، اس لئے ہر مستند ذوق والے کے لئے اس میں اختلاف کی گنجائش ہے، اسی طرح مفسرین کے مختلف اقوال میں سے کسی قول کی ترجیح میں زمانہ کی خصوصیات اور ذوق وجدان کا اختلاف بھی امر طبعی ہے، اس لئے اگر کلام سلف کے اصول متفقہ سے دور نہ ہو تو تنگی نہ کی جائے۔

۳۔ چونکہ مسلمانوں پر شفقت اور ان کی اصلاح کی فکر مولانا پر بہت غالب تھی، اس لئے وہ ہمیشہ ان کو گمراہیوں سے بچانے میں بجان و دل ساعی رہتے تھے، اردو میں شاہ عبد القادر صاحب اور حضرت شاہ رفیع الدین صاحب کے جو ترجمے شائع تھے وہ بالکل کافی تھے، مگر نئے زمانہ میں پہلے سر سید نے بضمن تفسیر اور پھر شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد صاحب نے اپنے نئے اردو ترجمے شائع کئے، تو انہوں نے پہلی دفعہ یہ کوشش کی کہ اپنے جدید عقائد کو پیش نظر رکھ کر ترجمے کریں اور اولین توجہ زبان کی طرف رکھیں اور اقوال سلف کی پرواہ نہ کریں، اس طرز عمل نے علماء کو مضطرب کر دیا، اور ان کو ضرورت محسوس ہوئی، کہ اس کی اصلاح کی جائے، مولانا نے اپنا ترجمہ اسی ضرورت سے مجبور ہو کر کیا، مگر اسی پر کفایت نہیں کی؛ بلکہ مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم کے ترجمہ کو بغور پڑھا، اور اس کے اغلاط پر نشان دیکر ایک رسالہ اس ترجمہ کی اصلاح پر لکھا جس کا نام اصلاح ترجمہ دہلویہ ہے،

۴۔ مولوی نذیر احمد صاحب کے ترجمہ کی عام اشاعت نے دہلی کے ایک بلند بانگ اخبار نویس مرزا حیرت کو حیرت میں ڈال دیا، اور انہوں نے پہلے تو ڈپٹی نذیر احمد صاحب کے ترجمہ پر اعتراضات شروع کئے، اور پھر اپنا ترجمہ چھپوایا جس کی نسبت عام طور سے مشہور ہے کہ وہ لکھنؤ کے ایک عالم کا کیا ہوا ہے، لیکن نام سے وہ مرزا صاحب کے چھپا ہے کیونکہ مرزا صاحب خود عربی سے نابلد تھے، بہر حال مولانا نے اس ترجمہ کے اغلاط کو

اصلاح پر بھی ایک رسالہ تالیف فرمایا جس کا نام اصلاح ترجمۂ حیرت ہے،

۵۔ بعض معاصر علماء نے اردو مین قرآن شریف پر حواشی لکھے ہیں جن میں ربط آیات کا خاص طور سے اظہار کیا گیا ہے، اور آیات کو بتاویل و اعتبار سیاسی مسائل پر منطبق کیا ہے اور اس تاویل و اعتبار میں کہیں کہیں حدِ اعتدال سے قلم باہر نکل گیا ہے، مولانا نے ان تاویلات بعیدہ پر تنبیہات لکھیں، جن کا نام التقصیر فی التفسیر ہے)

۶۔ لاہور کے ایک بزرگ نے قرآنی مطالب کو کئی جلدون مین تفصیل البیان فی مقاصد القرآن کے نام سے جمع کیا ہے، اس کے مولف کی درخواست پر اس میں جو شرعی نقائص نظر آئے وہ مولانا نے الہادی للحیران فی وادی تفصیل البیان کے نام سے ظاہر فرمائے۔

۷۔ مولانا کے خاندان کی بعض لڑکیوں نے مولانا سے قرآن مجید کا ترجمہ پڑھا تھا، اور اکثر آیات کی تفسیر و تقریر کو ضبط تحریر میں کر لیا تھا، وہ ایک مجموعہ ہو گیا اور اس کا نام تقریر بعض البنات فی تفسیر بعض الآیات رکھا مگر چھپا نہیں،

۸۔ رفع البنا فی نفع السماء، اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً کی تفسیر ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ آسمان سے کیا کیا فائدے ہیں، یہ درحقیقت ایک سوال کے جواب میں ہے،

۹۔ احسن الاثاث فی النظر الثانی فی تفسیر المقامات الثلث۔ سورہ بقرہ کی تین آیتون کی تفسیر پر نظر ثانی فرمائی ہے،

۱۰۔ اعمال قرآنی۔ قرآن مجید کی بعض آیات کے خواص جو بزرگوں کے تجربون مین آئے، ان کو بیان کیا گیا ہے،

۱۱۔ خواص فرقانی، اس کا موضوع بھی وہی ہے، اس کا ایک اور حصہ ہے جس کا نام آثار تبیانی ہے، ان رسائل سے مقصود عوام کو ناجائز غیر شرعی تعویذ گنڈون اور عملیات سفلی سے بچا کر قرآنی آیات کے خواص کی طرف ملتفت کرنا ہے،

اور اس قسم کے بعض خواص احادیث مین بھی مروی ہین)

۳. علوم القرآن | علوم القرآن کے متعلق مختلف مباحث و مسائل تو مولانا کی ساری تصانیف مواعظ، ملفوظات اور رسائل مین ملتے ہین، اگر ان کو کوئی یکجا کر دے تو اچھی خاصی ضخیم کتاب ہو جائے، مگر ان پر مستقل طور پر بھی بعض کتابیں تصنیف فرمائی ہین جن میں سے اول سبق الغایات ہے،

۱. سبق الغایات فی نسق الآیات، یہ قرآن پاک کے آیات و سور کے ربط و نظم پر عربی میں ۱۵۶ صفحوں کی کتاب ہے، جس کو ۱۳۱۶ھ میں ڈھائی مہینوں مین تصنیف فرمایا، اس مین مولانا نے سورۂ فاتحہ سے سورۃ الناس تک تمام سورتون اور ان کی آیتون کے ربط پر کلام فرمایا ہے، اور اس کا بڑا حصہ امام رازی کی تفسیر کبیر اور مفتی ابو السعود بغدادی المتوفی ۹۵۱ھ کی ارشاد العقل السلیم الی مزایا القرآن الکریم سے ماخوذ و مستنبط ہے، جس کی تصریح کتاب کے دیباچہ میں کر دی گئی ہے، ان دو کے علاوہ مولانا نے خود اپنے اضافون کو "قال المسکین" کہکر بیان فرمایا ہے، یہ حصہ بھی اچھا خاصہ ہے، اور اخیر کی سورتون مین زیادہ تر اضافات ہی ہین، جن مین مولف نے ان سورتون کے موضوع اور عمود کی تعیین فرمائی ہے، چونکہ یہ امور زیادہ تر ذوقی ہین، اس لئے ان ذوقیات کی نسبت ہمیشہ رائین مختلف ہو سکتی ہیں، تاہم ان سے مولانا کے ذوق قرآنی کا اندازہ بہت کچھ ہو سکتا ہے،)

تفسیر البیان مین بھی ربط و نظم پر گفتگو التزام کے ساتھ کی گئی ہے۔

۲. اشرف البیان لما فی علوم الحدیث والقرآن، مولانا کے چند مواعظ سے اون کے ایک معتقد و خادم نے ان اقتباسات کو یکجا کر دیا ہے جن میں آیات قرآنی اور احادیث کے متعلق لطیف نکات و تحقیقات ہین، افسوس ہے کہ اس کام کو اگر زیادہ پھیلاؤ کے ساتھ کیا جاتا تو اس کے کئی حصے مرتب ہو سکتے تھے،

۳. دلائل القرآن علی مسائل النعمان، مولانا کو حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ

کی فقہ سے جو شدید شغف تھا، وہ ظاہر ہے، ان کا مدت سے خیال تھا کہ احکام القرآن ابوبکر جصاص رازی اور تفسیرات احمدیہ ملا جیون کی طرح خاص اپنی تحقیقات اور ذوق قرآنی سے ان آیات اور ان کے متعلق مباحث و دلائل کو یکجا کر دیں جن سے فقہ حنفی کے کسی مسئلہ کا استنباط و اخراج ہو، لیکن یہ کام انجام نہ پاسکا، آخر میں یہ خدمت انھوں نے اپنے مسترشد خاص مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی کو سپرد فرمائی کہ وہ ان کی ہدایت کے مطابق اس کو تالیف فرمائیں، چنانچہ مفتی صاحب اس کام میں مصروف ہو گئے، جب وہ مدرسہ سے الگ ہوئے، تو خانقاہ امدادیہ میں جاکر خاص اس کام کی تکمیل میں لگ گئے، مولانا روزانہ کی مجلس میں اس کے متعلق جو جو نکتے ان کو یاد آجاتے تھے، بیان فرماتے، اور جناب مفتی صاحب اس کو اپنے مقام پر آکر قلمبند فرما لیتے، یہ تصنیف اس طور سے جاری تھی، کہ مولانا کا مرض الموت شروع ہوا، اور کام ناتمام رہ گیا، [۱]

مولانا عبد الباری صاحب ندوی کی روایت میں نے سنی ہے جن کو خود بھی ماشاء اللہ قرآن پاک کے فہم کا ذوق ہے، وہ نقل کرتے تھے کہ مجلس میں مولانا ان آیات پر جب گفتگو فرماتے تھے، اور فقیہانہ دقت نظر سے کسی حنفی مسئلہ کی صحت پر استدلال کرتے تھے تو اچنبھا ہوتا تھا، کہ یہ مسئلہ اس میں موجود تھا، لیکن اب تک ادھر اس حیثیت سے نظر نہیں پڑی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بادل چھٹ گیا اور آفتاب نکل آیا، اسی کے ساتھ وہ مفتی صاحب موصوف کے حافظہ کی تعریف کرتے تھے، کہ مولانا سے سنکر اپنے مستقر پر پہونچ کر اس کو بعینہ اسی طرح قلمبند کر لیتے تھے جس طرح مولانا نے اس کی تقریر فرمائی تھی،

۴۔ تصویر المقطعات لتیسیر بعض العبارات، تفسیر بیضاوی میں حروف مقطعات کا جو مجمل و مغلق بیان ہے، اس رسالہ میں بزبان عربی اس کو آسان کر کے بیان کیا گیا ہے،

---

[۱] (حضرت کی وفات کے بعد یہ کتاب چار جلدوں میں شائع ہوئی)

جس سے حروف مقطعات کی تاویل کا ایک طریق معلوم ہوتا ہے'

۵۔ ۶، مولانا کے دو رسالے علم القرآن سے متعلق اور ہیں' اور ان دونوں کا تعلق سلوک سے ہے' ایک کا نام مسائل السلوک من کلام ملک الملوک اور دوسرے کا نام تائید الحقیقۃ بالآیات العتیقۃ ہے' ان دونوں رسالوں کا موضوع قرآن پاک کی اُن آیتوں کی تفسیر ہے' جن سے سلوک کے مسائل مستنبط ہوتے ہیں' اس دوسرے رسالہ کی بنا ایک سابق مولف کی تالیف ہے جس کا قلمی رسالہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو ۱۳۲۷ھ میں بھاولپور میں ملا تھا' اس پر مزید اضافہ کر کے یہ رسالہ مرتب ہوا ہے'

۳۔ علوم الحدیث | حضرت حکیم الامۃ رحمۃ اللہ علیہ کو علوم الحدیث میں جو مہارت حاصل تھی' اس کی شہادت ان کے مواعظ و رسائل و تالیفات کے ہزاروں صفحات دے رہے ہیں' جن میں بے شمار احادیث کے حوالے' اشارے اور تلخیصات' ان کے مشکلات کی شرح' ان کے دقیق مطالب کے حل اور ان کے نکات ولطائف کا بیان ہے' خصوصیت کے ساتھ شیخ کے مواعظ میں جو زبانی تقریریں ہیں برمحل حدیثوں کے حوالے اور اکثر احادیث کے بعینہ الفاظ مع ان کی تخریجات اور کتابوں کے حوالوں کے اس کثرت سے ان میں ہیں' کہ ان کو دیکھ کر کسی انصاف پسند کو ان کے حافظ الحدیث ہونے میں شبہ نہیں ہو سکتا'

اس کے بعد اُن کی اُن تصانیف کو لیجئے جو گو فقہ و فتاوی اور احکام و مسائل یا اصلاح رسوم اور سلوک میں ہیں لیکن ان کی بنیاد احادیث پر ہے' اُن میں احادیث کے حوالے دلائل کی مضبوطی اور صحت بیان کی تائید و شہادت کے لیے آئے ہیں' جو مولف کے علم و معرفت پر دلیل قاطع ہیں'

حضرت حکیم الامۃ کو فن سلوک کی تجدید کی جو توفیق عنایت ہوئی تھی' اس کا ایک مبارک اثر یہ ہے کہ حضرت نے احادیث کی کتابوں سے ان تمام حدیثوں کو یکجا فرمایا، جن میں اس فن شریف کے مسائل متفرق تھے' اگرچہ بعض حضرات محدثین نے اپنی

کتابوں میں بعض ابواب زہد و رقاق کا تذکرہ کیا ہے، تاہم ان کی حیثیت فن کی نہیں، قدما میں سے صرف ایک بزرگ حضرت امام عبداللہ بن مبارک المتوفی ۱۸۱ھ کا نام ہم کو معلوم ہے جنھوں نے کتاب الزہد والرقاق کے نام سے مستقل تصنیف فرمائی ہے، مگر یہ ہیچمدان اس کی زیارت سے محروم رہا ہے، اس لئے اس کی نسبت کچھ عرض نہیں کرسکتا، مگر قیاس یہ ہے کہ وہ ابن ابی الدنیا کی کتاب کی طرح زہد و رقاق اور مذمت دنیا کے مضامین کی احادیث پر مبنی ہوگی،

اہل سلوک نے جن روایات احادیث سے کام لیا ہے وہ عموماً ضعیف بلکہ موضوع تک ہیں، اسی لئے علمائے سلوک کو اس فن میں کمزور سمجھا گیا ہے، اور اسی بنا پر اہل حدیث و روایت نے یہ پرخود غلط خیال قائم کرلیا ہے کہ فن سلوک اور اس کے مسائل احادیث نبوی سے ثابت نہیں، اور صدیوں سے ان کا یہ اعتراض قائم تھا، گو بعض محدثین نے ادھر توجہ فرمائی، اور اس سلسلہ میں کچھ کام انجام دیا، مثلاً امام ابن ابی جمرہ اندلسی المتوفی ۶۹۹ھ نے صحیح بخاری کی شرح بہجۃ النفوس کے نام سے لکھی جس کی پہلی جلد چھپ کر شائع ہوچکی ہے، اس میں اس کا التزام کیا ہے کہ احادیث کی شرح میں سلوک کے مسائل و نکات کی طرف بھی اشارے کرتے جائیں، حضرت حکیم الامۃ نے اس کام کو مستقل طور سے انجام دیا، اور حقیقۃ الطریقۃ من السنۃ الانیقۃ، التشرف بمعرفۃ احادیث التصوف کے نام سے دو کتابیں تالیف فرمائیں،

حقیقۃ الطریقۃ | ۱۳۲۷ھ میں تالیف پائی ہے، اور یہ درحقیقت حضرت کی کتاب التکشف عن مہمات التصوف کا آخری جزء ہے، اور ساتھ ہی مستقل تصنیف بھی ہے، اس میں تین سو تیس احادیث سے جو عموماً صحاح میں مذکور ہیں سلوک و تصوف کے مسائل کو مستنبط کیا گیا ہے، اور ان کو اخلاق، احوال، اشغال، تعلیمات، علامات، فضائل، عادات، رسوم، مسائل، اقوال، توجیہات، اصلاح اور متفرقات کے دس ابواب پر تقسیم کیا گیا

ہے، یہ اہل علم کے مطالعہ کی خاص چیز ہے،

التشرف | یہ کتاب چار حصوں میں ہے، ان میں اُن احادیث کی تحقیق ہے جو تصوف کی کتابوں میں یا صوفیہ کے کلام میں آتی ہیں، اور یہ دکھایا ہے کہ اصول وفن حدیث کے رو سے یہ حدیث کس درجہ کی ہے، اور حدیث کی کس کتاب میں ہے اور جو روایات ان میں دراصل حدیث نہ تھیں بلکہ عوام نے غلط فہمی سے ان کو حدیث سمجھ رکھا ہے، اگر وہ اقوال، نتیجہ کے طور پر کسی دوسری حدیث یا آیت پاک سے ثابت ہیں تو ان احادیث وآیات اور اُن سے ان اقوال کی صحت کے طریق واستنباط پر گفتگو فرمائی،

حصہ اول تشرف میں امام غزالی کی احیاء العلوم کی احادیث کی تخریج ہے، اس حصہ کا ماخذ زیادہ تر امام غزالی کی تخریج احیاء العلوم ہے جس کا حوالہ دیا گیا ہے، اور اس کے علاوہ احادیث کی دوسری کتابیں ہیں، جن کا ماخذ ہر روایت کے ساتھ بتایا گیا ہے، یہ حصہ ۱۳۴۱ھ میں لکھا گیا ہے، حصہ دوم میں دفتر اول مثنوی مولانا روم اور اس کی شرح کلید مثنوی میں آئی ہوئی احادیث وروایات کی تخریج کی گئی ہے، ان احادیث کی تحقیقات زیادہ تر امام سخاوی کی المقاصد الحسنہ سے التقاط کی گئی ہے، یہ حصہ ۱۳۴۹ھ میں زیر قلم آیا، حصہ سوم وچہارم، ان دونوں حصوں میں حافظ سیوطی کی جامع صغیر سے جو احادیث کی ساری کتابوں کا بہ ترتیب حروف تہجی مجموعہ ہے، اُن احادیث کو یکجا کیا گیا ہے جن سے مسائل سلوک مستنبط ہیں، اور ان کو بہ ترتیب حروف تہجی ترتیب دیا گیا ہے، ساتھ ہی تحقیقات خاصہ کا جابجا اضافہ اور احادیث کے مطالب کی تشریح وتطبیق اور بعض مشکلات کا حل کیا گیا ہے، حصہ سوم صرف الف کی روایتوں پر مشتمل ہے، اور ۱۳۵۰ھ میں ترتیب پایا ہے، اور حصہ چہارم میں بقیہ حروف کی روایتیں ہیں، اور وہ محرم ۱۳۵۲ھ میں تکمیل کو پہنچا ہے،

جامع الآثار | حضرات اہل حدیث کے اس فرقہ کی طرف سے جو غالی ہے، اکثر حضرات حنفیہ پر یہ طعن کیا گیا ہے کہ حنفی مسائل کی تائید میں احادیث بہت کم ہیں، اور چونکہ کتب

حدیث زیادہ تر محدثین اور حضرات شوافع کی تالیف ہیں' اس لئے اون میں حنفیہ کی مؤید حدیثیں یکجا نہیں ہیں' گو امام محمد کی موطا اور آثار' اور قاضی ابو یوسف کی کتاب الآثار اور مسند ابی حنیفہ مرتبہ خوارزمی اور امام طحاوی کی تصانیف سے ان کا جواب دیا جاتا رہا ہے' مگر کتب صحاح و مسانید و مصنفات سے جو رائج اور محدثین میں مقبول ہیں چن کر ان احادیث و روایات کو یکجا نہیں کیا گیا تھا جن سے مسائل حنفیہ کی تائید ہوتی تھی'

یہ ضرورت گو ہمیشہ سے تھی' مگر اس زمانہ میں اہل حدیث کے ظہور و شیوع سے اس ضرورت کی اہمیت بہت بڑھ گئی تھی' چونکہ اس تحریک کا آغاز پورب (عظیم آباد پٹنہ) سے ہوا' اسی لئے اس ضرورت کا احساس بھی پہلے یہیں کیا گیا' چنانچہ حضرت مولانا عبدالحئی صاحب فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد رشید مولانا محمد بن علی ظہیر احسن شوق نیموی عظیم آبادی نے آثار السنن کے نام سے کتب حدیث سے التقاط کر کے اس قسم کی حدیثوں کو شائع کیا' اس کے دو ہی حصے شائع ہو سکے' اس کا دوسرا حصہ ۱۳۲۲ھ میں شائع ہوا' علمائے احناف نے اس کتاب کا بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا' یہاں تک کہ مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے جو اس زمانہ میں مدرسہ امینیہ دہلی میں مدرس تھے' اس کی مدح میں عربی قصیدے لکھے' افسوس ہے کہ مولانا نیموی کی وفات سے ان کا یہ کام ناتمام رہا'

احیاء السنن حضرت حکیم الامۃ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس ضرورت کو محسوس فرمایا اور احیاء السنن کے نام سے اس قسم کی احادیث کا مجموعہ مرتب فرمایا' اور اس کی ترتیب ابواب فقہیہ پر رکھی' لیکن افسوس کہ اس کا مسودہ ضائع ہو گیا'

جامع الآثار کچھ دنوں کے بعد پھر اس موضوع کا خیال آیا' اور دوبارہ ایک جدید اسلوب پر اس قسم کی حدیثوں کا مجموعہ جامع الآثار کے نام سے مرتب فرمایا' لیکن یہ سلسلہ ابواب الصلوٰۃ سے آگے نہیں بڑھا' تاہم جتنا مرتب ہو گیا' وہ چھپ کر شائع ہو گیا'

تابع الآثار یہ بھی اسی موضوع پر ہے' اور اس کو جامع الآثار کا ضمیمہ بنایا گیا.
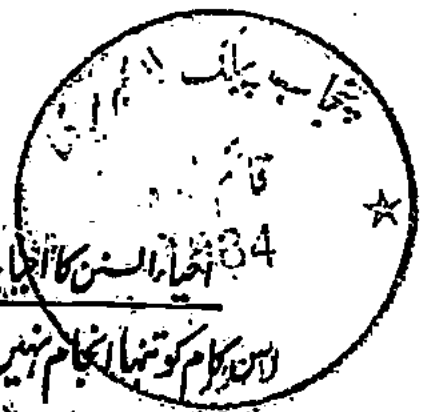
احیاء السنن کا اجراء | ۱۳۳۱ھ میں یہ خیال ہوا کہ یہ کام اتنا بڑا ہے، کہ حضرت والا خود اس کام کو تنہا انجام نہیں دے سکتے، اس لئے یہ قرار پایا کہ اس کے لئے بعض مستند علماء کو رکھ کر کام لیا جائے، چنانچہ مولانا محمد حسن صاحب سنبھلی کو اس کام کیلئے مقرر کیا گیا، اونھوں نے کام شروع کیا، جو کام وہ کرتے جاتے مولانا کی نگاہ سے گزارتے جاتے تھے، اس طرز سے کتاب الحج تک کام ہوا، اور اس کا نام دوبارہ احیاء السنن رکھا گیا، تاکہ مرحوم احیاء السنن کی یادگار ہو، اس کے دو حصے شائع ہوئے تھے کہ بعض اسباب سے اس کتاب کے بعض مضامین سے مولانا کی تشفی نہیں ہوئی، اور اس پر استدراک لکھوانے کا خیال ہوا، اور آئندہ کام کے لئے مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی کا انتخاب ہوا،

الاستدراک الحسن | مولانا ظفر احمد صاحب نے حضرت حکیم الامۃ رحمۃ اللہ کے زیر ہدایت اس کام کو بڑی دیدہ ریزی، وسعت نظر اور تحقیق و تنقید کے ساتھ انجام دینا شروع کیا، سب سے پہلے احیاء السنن کے شائع شدہ حصہ پر دوبارہ نظر کر کے اسکو الاستدراک کے نام سے شائع کیا گیا،

اعلاء السنن | اس کے بعد احیاء السنن کے نام کو بدل کر اعلاء السنن کے نام سے اس کام کو شروع کیا گیا، اور اس وقت تک اس کی بارہ جلدیں شائع ہو چکی ہیں[1] جن میں مذہب حنفی کی موئید حدیثوں کو بڑے استیعاب کے ساتھ جمع کیا گیا، اور محدثین اور اہل فن کی تحقیقات اوس کے شروح و حواشی میں یکجا کئے گئے ہیں،

الخطب الماثورة من آثار المشہورہ | جمعہ و عیدین کے خطبوں میں اس درجہ تکلف و تصنع اور مضامین کے ابتذال سے کام لیا گیا ہے، کہ یہ بازاری خطبے زبان اور طرز ادا اور مضامین و مطالب کے لحاظ سے عہد نبوت اور خلفائے راشدہ کے اسلوب سے ہٹ کر ملغاء اور خطباء

---

[1] بعد میں یہ کتاب اٹھارہ جلدوں میں بزبان عربی طبع ہو کر شائع ہوئی۔

کے اظہار قابلیت کا دنگل بن کر رہ گئے ہیں، حکیم الامتؒ کی اصلاحی نظر سے محراب و منبر کا یہ گوشہ بھی مخفی نہیں رہا، چنانچہ الخطب الماثورہ من آثار المشہورہ کے نام سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے خطبات کو احادیث صحیحہ سے انتخاب فرما کر ایک جگہ جمع کر دیا، تاکہ خطبائے مساجد ان مسنون خطبوں کو پڑھ کر ان تکلفات باردہ کے گناہ سے محفوظ رہیں،

خطبات الاحکام | جمعہ اور عیدین کے پچاس خطبوں کا یہ مجموعہ تالیف فرمایا جس میں احادیث و آثار و آیات سے ترغیب و ترہیب کے مضامین کے علاوہ عقائد و اعمال و اخلاق کے مضامین درج فرمائے،

مناجاۃ مقبول | احادیث میں وارد شدہ اوراد و اذکار مسنونہ کے لئے حصن حصین و حزب اعظم ملا علی قاری وغیرہ کتابیں رواج پذیر ہیں، مگر وہ طویل ہونے کی وجہ سے سب کے کام کی نہیں، حضرت حکیم الامتؒ نے عام مسلمانوں کے فائدہ کے لئے ان سب سے تلخیص کر کے مناجات مقبول قربات عند اللہ و صلوات الرسول کے نام سے ایک مختصر مجموعہ تالیف فرمایا ہے، جو اپنے اختصار اور جامعیت کے لحاظ سے بیحد مقبول ہے،

۵۔ علوم الفقہ | حضرت حکیم الامتؒ کو مسائل فقہیہ کی تلاش و تحقیق کا خاص ذوق تھا۔ اور یہ ذوق ان کو اپنے شیوخ و اساتذہ کرام سے ورثہ میں ملا تھا، چنانچہ ابھی وہ تعلیم سے فارغ بھی نہیں ہوئے تھے، کہ حضرت مولانا یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے فتویٰ نویسی کی خدمت لینی شروع کر دی تھی، اگر حضرت حکیم الامۃ رحمۃ اللہ کی فقہی خدمات کا آغاز ۱۳۰۱ھ سے بھی کیا جائے تو ۱۳۶۲ھ تک بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ پورے ساٹھ سال اس فن شریف کی خدمت میں بسر کئے، اس طویل عرصہ میں ہزاروں مسئلوں کے جواب دیئے، ہزاروں فتوے اور سیکڑوں چھوٹے بڑے فقہی رسالے لکھے، متعدد ضخیم جلدوں میں امداد الفتاویٰ اور تتمہ امداد الفتاویٰ کے نام سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے فتاویٰ کے

مجموعے جمع کئے گئے، جس کی نظیر ہندوستان میں کم از کم نہیں ملتی، ذٰلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء،

حوادث الفتاوٰی کے نام سے اون فتاوی کا مجموعہ ہے جو اس زمانہ کے نئے مسائل اور نئے مصنوعات سے متعلق ہیں، جن کے جوابات گذشتہ کتب فتاوی سے بآسانی حاصل نہیں کئے جا سکتے،

بہشتی زیور کی دس جلدیں جو کو عورتوں کی ضروریات کے لئے ہیں، مگر ان میں تمام ابواب فقہیہ کے مسائل مندرج ہیں، جن کے جوابات ہندوستان کے حالات اور ضروریات اور اصلاحات کے مطابق صرف انہی کتابوں سے معلوم ہو سکتے ہیں۔

ترجیح الراجح، یہ وہ مجموعہ ہے جس کی نظیر سلف صالحین میں تو ملے گی، مگر متاخرین کے یہاں یہ سلسلہ بالکل مسدود ہے، اس مجموعہ میں حضرت حکیم الامۃ نے اپنے ان مسائل کو جمع فرمایا ہے، جن میں از خود یا کسی دوسرے کے توجہ دلانے سے کوئی تسامح نظر آیا، تو اس سے رجوع فرما کر مسئلہ کی مزید تحقیق فرما کر تصحیح کر دی، یہ سلسلہ حضرت کی انصاف پسندی، تواضع اور عدم نفسانیت کا بین ثبوت ہے، یہی حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضرات تابعین و تبع تابعین اور مجتہدین عظام کا طریق تھا، جس کو اس زمانہ میں حضرت حکیم الامۃ نے زندہ کیا، اور اپنے کو بارِ آخرت سے بچایا،

فتاوی اشرفیہ کے نام سے مسائل دینیہ کے تین حصے الگ شائع ہوئے جو مختصر رسائل ہیں،

بہشتی گوہر، بہشتی زیور کے سلسلہ کا مردانہ حصہ ہے جس میں خاص طور سے ان مسائل کا بیان ہے جو مردوں سے خاص ہیں، جیسے جمعہ، جماعت، عیدین وغیرہ،

ان کے علاوہ مسئلہ حجاب، مسئلہ ربا، مسئلہ رشوت، مسئلہ بنک، سینما اور فلم اور ریڈیو وغیرہ کے مسائل پر فقہی تحقیقات ہیں، اور بعض موضوعوں پر بار بار کئی رسالے تالیف فرمائے،

۶۔علم کلام | علم کلام وعقائد وتوحید پر متعدد رسالے قلم بند فرمائے، جو شائع ہو
ذرائع ہیں، خاص نئے زمانہ کے حالات کا خیال کر کے خود چند کتابیں تالیف فرمائیں، اور
دوسروں سے ترجمہ کرائیں، مثلاً

اسلام اور سائنس کے نام سے الحصون الحمیدیہ کا مولانا اسحاق صاحب سے
ترجمہ کرایا، یہ عربی کی ایک جدید کلامی تصنیف ہے، اس کے مصنف علامہ جسری ہیں جنھوں
نے سلطان عبدالحمید خان کے عہد میں اس کو ملک شام میں تصنیف فرمایا تھا اور جو نئے
حلقہ میں بہت پسند کیا گیا تھا، اس کی خاص صفت یہ ہے کہ اس میں تاویل فاسد کا
دروازہ نہیں کھولا گیا ہے،

المصالح العقلیہ للاحکام النقلیہ تین حصوں میں ترتیب پایا ہے جس میں اسلامی
احکام ومسائل کے مصالح وحکم بیان کئے گئے ہیں، پہلے حصہ میں نماز وزکواۃ، دوسرے میں
روزہ عیدین، صدقہ فطر، قربانی، حج، نکاح وطلاق وغلامی وغیرہ کے مسائل کی حکمتیں بیان کی گئی
ہیں، تیسرے حصہ میں خرید وفروخت ومعاملات، حدود وقصاص، فرائض، عذاب قبر اور معاد
کے متعلق اسلامی تعلیمات کے مصالح ہیں،

الانتباہات المفیدہ عن الاشتباہات الجدیدہ، یہ بھی علم کلام ہی کا باب ہے، اس
میں جدید تعلیم یافتہ اصحاب کے مذہبی خدشوں اور وسوسوں کے تشفی بخش جوابات درج ہیں
اشرف الجواب بھی اسی قسم کا ایک مجموعہ ہے جو مواعظ وملفوظات سے جمع
کیا گیا ہے جس میں بہت سے نئے اور پرانے شبہات اور خطرات کے جوابات فراہم کئے گئے ہیں،

۷۔علم سلوک وتصوف | علم سلوک وتصوف روح شریعت کا نام ہے، جس میں
اخلاص دین اور اعمال قلب کے احکام اور دقائق سے بحث کی جاتی ہے، قدماء صوفیہ نے
اس فن پر جو کتابیں لکھی ہیں، مثلاً رسالہ قشیریہ امام قشیری، قوت القلوب ابوطالب مکی، کتاب
اللمع ابونصر عبداللہ بن علی سراج الطوسی، کتاب الصدق ابوسعید خراز، فتوح الغیب شیخ
نے آجکل کے تعلیم یافتہ حضرات کے مطالعہ کیلئے بے نظیر کتاب ہے انکا انگریزی ترجمہ بھی اب شائع ہو گیا ہے

سہروردی اور غنیۃ الطالبین شیخ عبدالقادر جیلانی اور متاخرین میں تصانیف امام شعرانی
ان کو پڑھنے سے اس فن کی جو حقیقت ظاہر ہوتی ہے' افسوس ہے کہ مصنوعی اور دکاندار
صوفیہ اور مبتدعہ کی تلبیس نے اس پر ایسا پردہ ڈال دیا تھا کہ وہ بدعات کا مجموعہ
بلکہ بطلان و ضلالت کا ذخیرہ معلوم ہوتا ہے' پھر ہندوستان میں ہندوؤں کے جوگ اور
ویدانت کے اثر سے اس میں بہت سے ایسے مسائل شامل ہو گئے جو اسلام کی روح کے تمامتر
منافی ہیں' حتیٰ کہ وحدت وجود' وحدت شہود و لطائف و دوائر کے مباحث و اعمال بھی
اصل فن سے قطعاً الگ ہیں' جو یا تو علم کلام و فلسفہ یا اوہام و خیالات و احوال سے وابستہ ہیں
جن کا تعلق نفسیات سے ہے'

اصل شئی جو اخلاص فی الدین' طلب رضا' حصول قرب اور اعمال و اخلاق قلب و مقامات
ہیں' اور جن سے مقصود رذائل سے پاکیزگی اور فضائل سے آراستگی ہے' تمام تر متروک ہو گیا
تھا' صدیوں کے بعد حضرت حکیم الامۃ کے تجدیدی مساعی نے اس فن کو پھر سلف صالحین کے
رنگ میں پیش کیا' اور ہر قسم کے اضافوں اور آمیزشوں سے پاک کر کے کتاب و سنت کے
نور میں اس تاریک زمانہ کے اندر پھر ظاہر کیا' اور زبان و قلم سے ان مسائل پر اتنا کچھ لکھا' اور
بیان فرمایا کہ اب طالب پر اصل طریق کا کوئی گوشہ اندھیرے میں نہیں رہا وللہ الحمد!

اس سلسلے میں پہلی چیز قصد السبیل ہے جو پچاس ساٹھ صفحوں کا مختصر رسالہ ہے' لیکن
اس کوزہ میں دریا بند ہے' فن سلوک کے وہ تمام حقائق و تعلیمات جو سالہا سال میں معلوم ہو سکتے
ہیں' اور جن کے نہ جاننے سے سالکین و طالبین غلط راستوں پر پڑ کر منزل مقصود کو گم کر دیتے
ہیں' اس میں لکھ دیئے گئے ہیں' اگر کوئی طالب صادق صرف اسی ایک رسالہ کی تعمیل و تکمیل
میں عمر صرف کر دے تو اس کے لئے ان شاء اللہ کافی و وافی ہے'

جاہل پیروں اور دکاندار صوفیوں نے ایک مسئلہ یہ گھڑا ہے' کہ شریعت اور طریقت دو
چیزیں ہیں' اور اس زور شور سے اس کو شہرت دی ہے کہ عوام تو عوام خواص تک پر اس کا

زنگ چھا گیا ہے، حالانکہ یہ تمام تر لغو اور بے معنی ہیں، حضرت حکیم الامتؒ نے تمام عمر لوگوں کو یہی تلقین فرمائی کہ طریقت عین شریعت ہے، احکام الٰہی کی باخلاص تمام تحصیل و تکمیل ہی کا نام طریقت ہے ۔ اور یہی خواص امت کا مذہب ہے اور جس نے اس کے سوا کہا وہ دین کی حقیقت سے جاہل اور فن سلوک سے نا آشنا ہے، اس بارگاہ کے ایک حلقہ بگوش کا شعر ہے،

اب تو ے نوشی ہے عین شرع بر فتوائے شیخ

اب وہی ہوگا فقیہہ شہر جو مے نوش ہے

حضرت حکیم الامتؒ نے اس فن کے مسائل کو سب سے پہلے کلام پاک سے مستنبط فرمایا، اور اس کے متعلق مسائل السلوک من کلام ملک الملوک اور تائید الحقیقۃ بالآیات العتیقہ نامی دو رسالے تالیف فرمائے ہیں، جن کا ذکر اوپر گذر چکا پھر ان مسائل سلوک کی تشریح فرمائی جن کا ماخذ احادیث نبوی اور سنت صحیحہ ہے، اور یہ التشرف اور حقیقۃ الطریقہ من السنۃ الانیقہ میں مدون ہیں،

اہل تحقیق کے لئے اس فن شریف پر ایک جامع کتاب التکشف بمہمات التصوف تالیف فرمائی، جو پانچ حصوں میں منقسم ہے، یہ حقیقت طریقت حقوق طریقت تحقیق کرامت اور دیگر مضامین تصوف پر مشتمل ہے،

طریق اور سلوک کے اسرار و رموز اس قدر دقیق اور نازک ہیں کہ ذرا ان کے سمجھنے میں بے احتیاطی کی جائے تو ہدایت کے بجائے وہ ضلالت کا ذریعہ بن جائیں، اس سلسلہ میں حضرت مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ کی مثنوی معنوی، جو سرو و نواز حقیقت ہے خاص اہمیت ہے اور اسی لئے وہ اس سلسلہ کے اکابر کے خانقاہی درس میں رہی ہے حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ کو اس سے خاص ذوق تھا، اور وہ بھی خاص خاص لوگوں کو اس کا درس دیتے تھے، چنانچہ حضرت حاجی صاحب کے ایما سے مولانا احمد حسن صاحب کانپوری نے بڑے اہتمام سے اس کا حاشیہ لکھا، اور منشی رحمت اللہ رعد مرحوم کے مطبع نے اس کو

چھاپا۔ اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ مولانا بحرالعلوم کے بعد مثنوی کی حکیمانہ شرح اس سے بہتر نہیں لکھی گئی،

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خلفا میں سے حضرت حکیم الامتؒ نے اس مثنوی کی خدمت محض فن کی حیثیت سے فرمائی، سلوک کے مسائل' طریقت کی تعلیمات اور مثنوی کے بیانات کی قرآن و حدیث سے اس خوبی کے ساتھ کلید مثنوی میں تطبیق فرمائی کہ اب فن کا مبتدی بھی چاہے، تو اس کلید کے ذریعہ سے مثنوی کے خزانہ کو کھول سکتا ہے۔

دیوان حافظ کی پرجوش و مردافگن شراب نے بھی بہت سے بے احتیاط مے نوشوں کو راہ سے بے راہ کر دیا تھا، بدگمانوں کو تو اس شراب معرفت پر شیراز کے بادۂ انگور کا شبہہ ہوا، اور بے احتیاط خوش گمانوں نے اس سے اباحت کی تعلیم حاصل کی کہ

بہ مے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغان گوید
کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسم منزلہا

حضرت حکیم الامتؒ کی معرفت اس تیز و تند شراب کے "منافع واثم" سے پوری طرح باخبر تھی، حضرت نے عرفان حافظ کے نام سے اس کی ایسی شرح لکھی، کہ اس پھول سے ہر کانٹا الگ ہو گیا،

ساقی پلائے پھول تو کانٹا نکال کے

طالبین و سالکین کی تعلیم و تربیت کے لئے تربیۃ السالک و تنبیۃ الہالک کا سلسلہ الگ مرتب فرمایا، جس میں سالکین کے مشکلات راہ، ذاکرین و شاغلین کے شبہات و خطرات راہ کے لئے ہدایات مندرج ہیں، یہ کہنا بے جا نہیں کہ علوم مکاشفہ و معاملہ کے متعلق کلیات و جزئیات اور احوال شخصی پر ایسی حاوی کتاب کی نظیر تصوف کے سارے دفتر میں موجود نہیں، ۱۲۷۴ صفحوں میں یہ کتاب تمام ہوئی ہے،

ایک دوسرا اہم سلسلہ ملفوظات کا ہے، بزرگوں کے ملفوظات مرتب کرنے کی

رسم قدیم زمانہ سے قائم ہے یہاں تک کہ چشتیہ حضرات میں حضرت سلطان خواجہ معین الدین اجمیریؒ حضرت قطب الدین بختیار کعکیؒ اور حضرت سلطان الاولیا نظام الدین دہلوی رحمہم اللہ تعالیٰ کے ملفوظات بھی موجود ہیں لیکن افسوس ہے کہ اہلِ شوق اس کام کو پورے استیعاب سے نہ کر سکے کیونکہ ان اکابر کے جو ملفوظات قلم بند ہو سکے، وہ چند سال بلکہ چند ماہ سے زیادہ کے نہیں ہیں اور نہ ان کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ لکھنے والوں نے ان کو ان بزرگوں کی نظر کیمیا اثر سے گذارنا بھی تھا، تاہم چونکہ لکھنے والے خود اہلِ کمال و اہلِ احتیاط تھے، اس لئے ان کی صحت میں کوئی شک نہیں کیا جا سکتا، اور وہ اس اختصار پر بھی ہمارے لئے بڑی خیر و برکت کی چیزیں ہیں۔

حضرت حکیم الامتہ کے ملفوظات کا سلسلہ تقریباً ساٹھ مجلدات اور رسائل میں مدوّن ہوا ہے اور ان میں سے ہر ایک ان کی نظر سے گذر ان کر چھاپا گیا ہے، اور جن میں سے اکثر حسن العزیز وغیرہ ناموں سے چھپ کر شائع ہو چکے ہیں۔ ان ملفوظات میں بزرگوں کے قصّے، سنجیدہ لطیفے، قرآن و حدیث کی تشریحات، مسائلِ فقہیہ کے بیانات، سلوک کے نکتے، اکابر کے حالات، طالبوں کی ہدایات و تنبیہات، آداب و اخلاق کے نکات، اصلاحِ نفس و تزکیہ کے مجربات وغیرہ اس خوبی و دلچسپی سے درج ہیں کہ اہلِ شوق کے دل اور دماغ دونوں اس آبِ زلال سے سیراب ہوتے ہیں۔

۸۔ اصلاحیات | حضرت حکیم الامتہ رحمۃ اللہ علیہ کے معارف کا یہ آخری باب ہے، اور خاصہ اہم باب ہے، مسلمانوں کی اصلاح کی جو دقیق نظر اُن کو بارگاہِ الٰہی سے عنایت ہوئی تھی، اس کا اندازہ ان کی اصلاحی کتابوں سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ اصلاح کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ بچوں، طالب علموں اور عورتوں سے لیکر مردوں اور علماء و فضلاء کے حلقہ تک پھیلا ہوا ہے، اور سب کے لئے مفید ہدایات کا ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے، دوسری طرف ان اصلاحات کی وسعت یہ ہے کہ مجالس و مدارس اور خانقاہوں سے شروع ہو کر شادی و غمی کے رسوم اور روزمرہ کی زندگی تک کو وہ محیط ہیں۔ غرض ایک مسلم جد ھر اپنی زندگی ...

خرچ کرے ان کے قلم نے شریعت کی ہدایات کا پروگرام تیار کر رکھا ہے،

اس سلسلہ میں حضرت کی سب سے اہم چیز **مواعظ** ہیں، واعظ تو بحمد اللہ زمانہ خیر کے بعد اسلام کی دس بارہ صدیوں میں بے شمار گذرے ہوں گے، مگر شاید واعظین میں ابن نباتہ اور ائمہ سلوک میں حضرت شیخ الشیوخ عبدالقادر جیلانی کے مواعظ کے سوا کوئی دوسرا مستند اور مفید مجموعہ موجود نہیں، لیکن یہ ان بزرگوں کے صرف چند مواعظ پر مشتمل ہیں، اللہ تعالیٰ نے اس اخیر دور میں امت اسلامیہ کی اصلاح کے لئے بہت بڑا فضل یہ فرمایا کہ حضرت کے مستفیدین کے دل میں یہ ڈالا کہ وہ حضرت کے مواعظ کو جو شہر بشہر ہوئے ہیں عین وعظ کے وقت لفظ بہ لفظ قید تحریر میں لائیں، اور حضرت کی نظر سے گذران کر ان کو دوسرے مسلمانوں کے عام فائدہ کی غرض سے شائع کریں، چنانچہ اس اہتمام اور احتیاط کے ساتھ تقریباً چار سو مواعظ جو احکام اسلامی، رد بدعات، نصائح دلپذیر اور مسلمانوں کی مفید تدابیر و تجاویز پر مشتمل ہیں، اور جن میں حقائق کے ساتھ ساتھ دلچسپیوں کی بھی کمی نہیں مرتب ہوئے، اور اکثر شائع ہوئے، اور مسلمانوں نے ان سے فائدے اوٹھائے،

سلسلہ اصلاح و تربیت میں حضرت کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ عموماً واعظین صرف عقائد و عبادات پر گفتگو فرماتے ہیں، حضرت ان چیزوں کی اہمیت کے ساتھ مسلمانوں کے اخلاق و معاملات اور عملی زندگی کے کاروبار کی اصلاح پر زور دیتے ہیں، بلکہ اپنی تربیت و سلوک کی تعلیم میں بھی ان پر برابر کی نظر رکھتے تھے، حالانکہ عام مشائخ نے اس اہم سبق کو صدیوں سے بھلا دیا تھا،

حیات المسلمین | مواعظ کے علاوہ اس سلسلہ کی اہم کڑی ان کی کتاب حیوۃ المسلمین ہے، جس میں قرآن پاک و احادیث نبویہ کی روشنی میں مسلمانوں کی دینی دنیاوی ترقی و فلاح کا مکمل پروگرام مرتب فرمایا ہے، حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے بارہا ارشاد فرمایا کہ انھوں نے اپنی ساری تصنیفات میں اس کتاب کی تالیف میں جو محنت اٹھائی، وہ کسی میں نہیں

پیش آئی' اور اسی لئے یہ بھی ارشاد ہے کہ میں اپنی ساری کتابوں میں اس کتاب کو اپنے لئے ذریعہ نجات گمان کرتا ہوں'

اس سلسلہ کی دوسری کتابیں اصلاح الرسوم' صفائی معاملات' اصلاح امت' اصلاح انقلاب امت' وغیرہ ہیں' اور ہر ایک کا منشا یہ ہے کہ مسلمانوں کی اخلاقی' اجتماعی' معاشرتی زندگی' خالص اسلامی طریق اور شرعی نہج پر ہو' اور ان کے سامنے وہ صراط مستقیم کھل جائے' جو ہدایت کی منزل مقصود کی طرف جاتی ہے'

افسوس کہ اس مضمون کو جس استیعاب اور اہتمام کے ساتھ یہ ہیچمدان لکھنا چاہتا تھا' اپنی علالت و عدم صحت کی سبب سے اس کو اس طرح پورا نہ کر سکا' تاہم جو کچھ ہوا وہ اگر مسلمانوں کے لئے فائدہ بخش ثابت ہو تو بہت ہے'

طوفانِ اشک لانے سے اے چشم فائدہ
دو اشک بھی بہت ہیں اگر کچھ اثر کریں

ہیچمدان سلیمان ندوی

"معارف" اعظم گڈھ

علامہ سید سلیمان ندوی رح کا یہ معرکۃ الآرا مضمون رسالہ معارف اعظم گڈھ کے ۱۳۶۳ھ ۱۹۴۴ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔

ذکرِ مجذوب رحمہ اللہ

تذکرۂ خواجہ عزیز الحسن مجذوب غوری رح

پروفیسر احمد سعید

الفیصل
ناشران و تاجرانِ کتب
غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

مقالہ نمبر ۱۹
حضرت تھانوی
علیہ الرحمۃ
بحیثیت
مفسر
حضرت مولانا مفتی عبدالشکور صاحب ترمذی
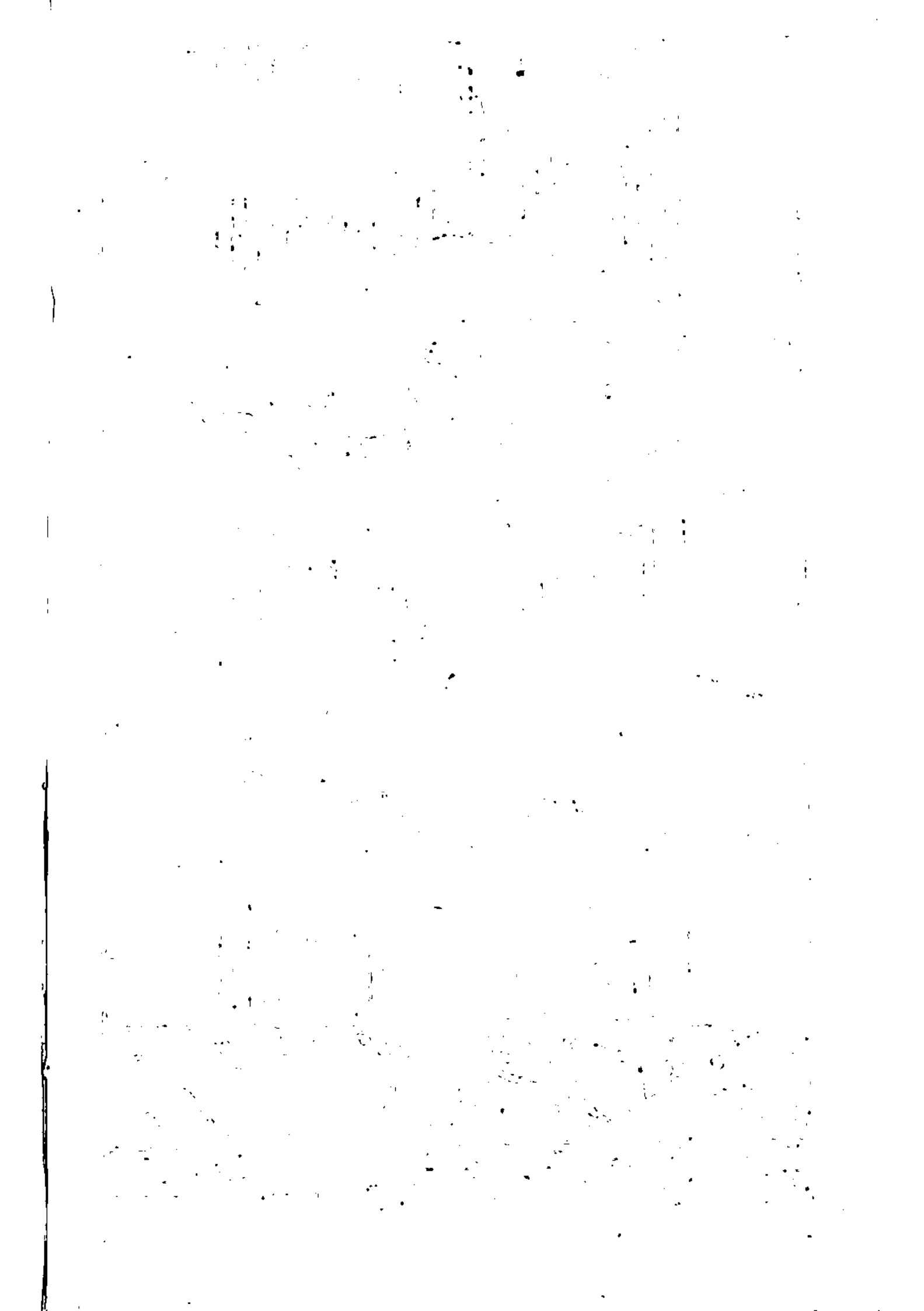
اعترافِ تقصیر

اور انتساب

زیرِ نظر یہ مختصر تفسیری مقالہ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ کے مفسّر ہونے کی حیثیت اور فنِ تفسیر میں آپ کے مقام و مرتبہ کو واضح کرنے کے لیے مرتب کیا گیا ہے۔

اس مقالہ اشرف میں حکیم الامت تھانویؒ کی بے نظیر تفسیر "بیان القرآن" اور آپ کی تفسیری خدمات کے تعارف کے ساتھ، بیان القرآن اور حضرت ممدوح کے مواعظ و ملفوظات سے قرآن کریم کی بعض نادر تفسیری تحقیقات اور متعدد ابحاث لطیفہ اور نکاتِ دقیقہ کا نمونہ دکھلایا گیا ہے۔ احقر کو اپنی کوتاہی علم و فہم اور تقصیر کا اعتراف ہے کہ جس درجہ کے علم اور فہم کی ایسے بلند پایہ علمی مقالہ کے لیے ضرورت تھی احقر کا دامن اس سے یکسر خالی ہے، یقیناً اس مقالہ کا اس حقیر سے حق ادا نہیں ہو سکا، ناظرین کرام سے امید ہے کہ احقر کی لفظی اور معنوی کوتاہیوں اور لغزشوں سے درگزر اور مسامحت کا معاملہ فرمائیں گے کہ اپنی حالت اس شعر کے مصداق ہے۔

؎ نہ بنقش بستہ مشوشم نہ بحرف ساختہ سرخوشم
نفسے بیاد تو میکشم چہ عبارت وچہ معانیم

یہ جو کچھ پیش کیا جا رہا ہے چونکہ حضرت حکیم الامتؒ تھانوی کے فیوضات و افادات کا مجموعہ ہے اس لیے احقر اپنی اس حقیر سعی کو حضرت ہی کے نام نامی اور اسم "اشرف" سے منسوب کرتا اور "اشرف المقالات" کے عنوان سے معنون کرنے کا شرف حاصل کرتا

ہے کہ یہ سب آں ممدوح کے ہی فیوضات کا صدقہ اور آپ کی ہی برکات عالیہ کا ثمرہ ہے۔
احقر کی حیثیت محض ناقل و مرتب کی ہے۔

اھدی لمجلسه الکریم و انما
اھدی له ماحزت من نعمائه
کالبحر یمطره السماء و مائه
فضل علیه فانه من مائه

مواعظ اور ملفوظات کے علاوہ حضرت حکیم الامت کی تفسیر بیان القرآن کا تو ہر ہر مقام اور ہر ہر تحقیق ہی نہایت عجیب و غریب اور نفیس و لطیف بیان کے قابل اور پیش کرنے کے لائق ہے مگر بعض بعض مقامات تو بہت ہی قابلِ قدر اور مستحق توجہ ہیں۔ ان میں سے چند مقامات کا تذکرہ اس زیر نظر مقالہ میں آ بھی گیا ہے۔ مگر پھر بھی بہت سے مقامات ایسے ہیں جن کو بیان القرآن کی خصوصیات میں شمار کیا جانا چاہیے اور ان کا ذکر اس مقالہ میں نہیں آسکا مثلاً قصہ ہاروت و ماروت میں جس توسط اور اعتدال کی راہ کو اختیار فرمایا گیا۔ اسی طرح آیت لیغفر لك الله ما تقدّم من ذنبك وما تاخر اور سورۂ عبس کی ابتدائی آیات کی تفسیر میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام و مرتبہ کی رعایت کے ساتھ عتابِ قرآنی کا ذکر کیا گیا اور آیتِ کریمہ ولقد همّت به وهمّ بها کی تفسیر میں ایک نبی علیہ السلام کی عصمت کا کامل تحفظ کیا گیا ہے، نیز حضرت ایوب علیہ السلام کے واقعہ (پ ۲۳) میں حضرت حکیم الامتؒ نے جس احتیاط سے کام لیا ہے وہ حضرت تھانویؒ کی علمی بصیرت اور فقہی مہارت کے کمال کا عظیم نمونہ ہے۔ اور اسی طرح کے بہت سے مقامات کی تفسیر میں بڑے ہی جامع اور تشفی بخش معقول و دلنشیں

اسلوب بیان کو اختیار فرمایا گیا ہے جن کی طرف اہل علم کو خصوصی توجہ کرنے اور خصوصیت کے ساتھ حضرت حکیم الامتؒ کے علوم و معارف قرآنیہ سے مستفید ہونے اور ان کی قدر کرنے کی ضرورت ہے غرضیکہ اس تفسیر کے محاسن اور خوبیوں پر نظر کرتے ہوئے ہر طرح سے شعر ذیل اس کے مناسب حال معلوم ہوتا ہے۔

؎ داماں نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار گلچین بہار تو ز داماں گلہ دارد

اب دعا ہے کہ حق تعالے جل شانہ اس مقالہ اشرف کو حسن قبول سے نوازیں اور اس کا نفع ہر خاص و عام کے لیئے عام و تام فرمائیں آمین بحرمت سید المرسلین صلی اللہ تعالے علیہ وعلی آلہ اصحابہ اجمعین۔

بحمد اللہ آج ۷، المحرم الحرام ۱۴۰۷ھ بروز سہ شنبہ بوقت چاشت اس مقالہ پر نظر ثانی سے فراغت حاصل ہوئی۔ تلک اللہ الحمد اولاً و اٰخراً و ظاھراً و باطناً۔ فقط

عبد الشکور ترمذی عفی عنہ
جامعہ حقانیہ ساہیوال۔ سرگودھا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہ بحیثیت مفسر اور آپ کی تفسیری خدمات

حمد و صلوٰۃ کے بعد، ہیچمدان عرض گذار ہے کہ مجلس صیانۃ المسلمین پاکستان نے حضرت اقدس حکیم الامت مجدد ملت مولانا شاہ محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہ السامی کی دینی خدمات کے مختلف موضوعات پر تعارفی مقالات لکھنے کی تجویز منظور کی اور جن علماء کے سپرد یہ خدمت کی گئی ازراہ حسن ظن اس ناکارہ کو بھی ان میں شمار کر لیا، اور احقر کی نا اہلی اور علمی بے بضاعتی کے باوجود اس "علمی مذاکرہ" اور "بزم اشرف" میں شرکت کا حکم دیا۔

اپنی حالت کے پیش نظر تو اس خدمت سے عذر کر دینا ہی مناسب تھا اور اسی لیے اس تجویز کے علم کے بعد اس سلسلے میں کوئی کام شروع نہیں کیا گیا، مگر مولانا وکیل احمد صاحب سلمہ کے مکرر اصرار نے مجلس کی تجویز کی تعمیل پر طبیعت کو آمادہ کیا اور اس "کار اشرف" میں شرکت کی جرأت دلائی۔

چنانچہ مولانا موصوف سے استشارہ کے بعد ارادہ کر لیا کہ حضرت حکیم الامت تھانویؒ کی مختلف النوع جلیل القدر دینی خدمات میں سے علم تفسیر میں جو خدمات جلیلہ حضرت ممدوحؒ نے انجام دی ہیں اور اس فن شریف کی بحیثیت مفسر جو عظیم خدمت حضرت موصوفؒ کی زبان و قلم سے ظہور میں آئی ہے اس کو بہت ہی محدود وقت میں اپنی محدود و ناقص معلومات کے مطابق مرتب کر کے پیش کر دیا جائے اور آں ممدوحؒ کی تفسیری تالیفات و مقالات کا اجمالی تعارف کرا دیا جائے۔

تعارف کا مقصد اور موضوع کی اہمیت

اس عظیم موضوع کو اختیار کرنے اور حضرت ممدوحؒ کی تفسیری معیاری حیثیت اور تفسیری خدمات عظیمہ کے تذکار و تعارف کا مقصد ناظرین پر ان خدمات جلیلہ کی اہمیت و نافعیت کا واضح کرنا اور ان سے خصوصی طور پر استفادہ کرنے کی ضرورت کا احساس دلانا ہے۔

فتنۂ کبریٰ اس دورِ فساد و الحاد میں تفسیر قرآن کریم کی شرائط اور سلف صالحین کی تفسیروں سے آزاد و بے نیاز ہو کر زبان و بیان کے نام سے بعض اہل قلم نے قرآن کریم کے معنی اور مقصد میں تحریف و تبدل کرنے اور تفسیر بالرائے کا فتنہ برپا کیا ہوا ہے۔

حق تعالیٰ نے اپنی اس سنّتِ قدیمہ کے موافق کہ ہر فتنے کے مقابلے و اصلاح کے لیے اس وقت کے اکابر اہل اللہ کے قلب و دماغ میں داعیہ پیدا کر دیا جاتا ہے۔ حضرت حکیم الامت تھانویؒ کے حساس قلب و دماغ میں تحریفِ قرآن اور تفسیر بالرائے کے اس فتنۂ کبریٰ کے استیصال و اصلاح کے لیے تقاضا پیدا فرما کر حضرت ممدوح کو اس کے مقابلے کے لیے مخصوص و موفق فرما دیا۔

حق تعالیٰ جل شانہ نے حضرت حکیم الامت تھانویؒ سے چودھویں صدی ہجری میں جس طرح عمومی طور پر پورے دین کے تحفظ و احیاء اور اس کے ہر شعبہ۔ عقائد اور اعمال و اخلاق سے لے کر معاملات و معاشرت تک میں تجدید و اصلاح کا بڑا ہی قابلِ قدر کام لیا ہے۔ اسی طرح خصوصیت کے ساتھ تفسیر بالرائے کے اس فتنۂ کبریٰ کے استیصال اور تحریفِ قرآن کے مقابلے میں بھی حضرت موصوفؒ کو بہت سی گرانقدر تجدیدی و اصلاحی تفسیری خدمات انجام دینے کی توفیق بخشی تھی۔

حضرت حکیم الامت تھانویؒ نے تقاضائے وقت کے مطابق اس اہم قرآنی خدمت جلیلہ کی طرف خصوصی توجہ فرمائی اور بعض معاصرین کے تفسیری اغلاط اور خلافِ احتیاط ترجموں کی اصلاح کا فرض انجام دیا، اور بعض آزاد خیال لوگوں کے شبہات و اشکالات کو بھی رفع فرمایا۔

حضرت حکیم الامتؒ کے اصلاحی اور تفسیری رسائل

اس اصلاحی اور تجدیدی عظیم خدمتِ تفسیر کے تفصیلی تعارف کے لیے حضرت حکیم الامت تھانویؒ کے تفسیری رسائل ذیل کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔

التقصیر[1] فی التفسیر۔ اصلاح ترجمۂ[2] دہلویہ۔ اصلاح ترجمۂ[3] مرزا حیرت۔ توحید[4] الحق۔ اصلاحِ تفسیر[5] سرسید۔ تنزیہ[6] علم الرحمٰن عن سمۃ النقصان مع ضمیمہ۔ الہادی[7] للحیران فی وادی تفصیل البیان۔ رسالہ تمہید[8] الفرش فی تحدید العرش۔ رسالہ[9] التواجہ بما یتعلق بالتشابہ۔ رسالہ شق[10] الجیب عن حق الغیب۔ رسالہ ملاحۃ[11] البیان فی فصاحۃ القرآن۔ رسالہ القاء[12] السکینہ فی تحقیق ابداء الزینہ۔

پہلے تین رسالے کتابی شکل میں علیحدہ شائع ہو کر اب تقریباً نایاب ہو چکے ہیں۔ البتہ ان کے بعد کے چار رسائل اور رسالہ "ملاحۃ البیان" "امداد الفتاویٰ" کا جزو ہو کر اور باقی رسائل "بوادر النوادر" حصہ دوم میں شامل ہو کر بحمد للہ شائع ہو رہے ہیں۔ ایک اور رسالہ "رفع[13] البناء فی نفع السماء" بیان القرآن جلد اوّل کا جزو بنا دیا گیا ہے۔ اسی طرح رسالہ "مسائل[14] السلوک" جس میں سلوک کے مسائل پر آیات قرآنیہ سے نصاً یا استنباطاً استدلال کیا گیا ہے۔ بیان القرآن کے حاشیہ پر طبع ہو رہا ہے۔ دوسرا رسالہ وجوہ[15] المثانی جس میں قراۃ سبعہ کے اختلاف سے معانی میں جو اختلاف ہوتا ہے اس کی توجیہ کی گئی ہے۔ بیان القرآن کی ہر جلد کے ساتھ لگایا گیا ہے۔ ایک رسالہ "تائید[16] الحقیقۃ بآیات العتیقۃ" التکشف کا جزو بنا دیا گیا ہے۔ ہمارے عزیز نوجوان طلباء علوم دینیہ کو خصوصیت سے ان

نادر تحقیقات اور قیمتی جواہرات کے مطالعے کی سخت ضرورت ہے، مگر ہر شخص کو ان تمام رسائل کا دستیاب ہونا بھی مشکل ہوتا ہے اس لیے اگر کوئی صاحب ہمت فرمائیں اور ان دینی علمی قیمتی جواہر پاروں کو جمع کر کے مجموعی شکل میں یکجا شائع کرنے کا اہتمام کر دیں، تو حضرت حکیم الامت تھانوی رح کی اس دینی اور تفسیری اصلاحی خدمت سے استفادہ عام اور سہل الحصول ہو کر یہ خدمتِ قرآن بہت زیادہ نافع اور مفید ہو سکتی ہے۔ واللہ الموفق والمعین

تفسیر بیان القرآن

اس مذکورہ اصلاحی اور تجدیدی عظیم تفسیری خدمت کے علاوہ حضرت حکیم الامت تھانوی رح نے یہ نہایت بلند پایہ تفسیری خدمت انجام دی کہ سلف صالحین کے مسلک کے عین مطابق ایک معیاری تفسیر بنام "بیان القرآن" لکھی جس میں تفسیر کے ساتھ صحیح اور بامحاورہ اُردو ترجمہ لکھ کر امت پر احسانِ عظیم فرمایا اور قرآنِ کریم کے صحیح معانی و مطالب کی تبیین و توضیح اور بیان و تشریح کا حق ادا کر دیا۔ جزاھم اللہ خیرا۔

تفسیر بیان القرآن کی زبان اور اس کا اسلوب بیان خالص علمی اور اصطلاحی ہے۔ یہ تفسیر اپنی جامعیتِ مضامین اور طرزِ استدلال کی نفاست و معقولیت کے لحاظ سے زمانۂ حاضرہ کی تفاسیر میں اشرف التفاسیر کہلانے کی مستحق ہے۔ قرآنِ حکیم کے اسرار و حکم اور حقائق و معارف، نکات و لطائف کے بیان اور قرآنی دقائق و غوامض اور مشکلات کے حل کرنے میں یہ تفسیر حد درجہ مفید اور اپنی نظیر آپ ہے۔

تبیان

یہ تفسیر بیان القرآن کے متعلق حضرت حکیم الامت تھانوی رح کے ان تقریری افادات کا مجموعہ ہے جن کو مولانا سعید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہمشیرزادہ حضرت موصوف رح نے اس تفسیر کے پڑھتے وقت تحریر میں ضبط کر لیا تھا، مگر نامکمل ہے۔ اگر مکمل ہو جاتا تو ناظرین کے ہاتھ میں بیان القرآن کی عجیب و غریب شرح آ جاتی۔ حضرت تھانوی رح اس کا تعارف کراتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں: "یہ تبیان ایک

مختصر مجموعہ ہے احقر کی بعض تقریرات کا جو میرے ہمشیرہ زادہ عزیزی مولوی سعید احمد مرحوم نے مجھ سے تفسیر کے مختلف مقامات پڑھتے وقت ضبط کر لی تھیں مگر ان کی وفات ہو جانے سے اس کی تکمیل کی نوبت نہ آئی" (حاشیہ بیان القرآن)

تفسیری مواعظ

حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ کے اس تفسیر کے علاوہ سینکڑوں کی تعداد میں مطبوعہ مواعظ بھی موجود ہیں جو اکثر و بیشتر قرآنی آیات کی تشریح و استنباط پر مبنی اور عجیب و غریب الہامی تفسیری حقائق و نکات پر مشتمل ہیں اور لطف یہ ہے کہ قرآنی مشکلات اور دقائق کا بہ نسبت بیان القرآن کے ان مواعظ میں آسان زبان اور عام فہم طریقہ سے حل اور بیان فرمایا گیا ہے، کاش کوئی صاحب ہمت فرما کر ایسے مضامین کا مختصر مجموعہ تیار کرتا اور ترجمہ قرآن کے حاشیہ پر یہ مجموعہ طبع ہو جاتا تو بہت سے بندگانِ خدا کے لیے نافع اور مفید ہوتا۔

تفسیر سے خصوصی مناسبت

حضرت اقدس حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ کو حق تعالےٰ نے جملہ علوم نقلیہ شرعیہ اور فنونِ عقلیہ میزانیہ میں کامل مہارت اور تبحر کی نعمت عطا فرمائی تھی، مگر منجملہ دوسرے انعاماتِ الٰہیہ کے ایک خصوصی انعام حضرتِ اقدس پر یہ تھا کہ حضرتِ ممدوح کو علومِ قرآن اور تصوّف کا خصوصی ذوق مرحمت فرمایا گیا تھا، اور علمِ تفسیر اور تصوّف کے ساتھ امتیازی اور معیاری مناسبت سے حضرت موصوف رحمہ اللہ کو نوازا گیا تھا۔

علمِ تفسیر اور تصوّف حضرت موصوف رحمہ اللہ کے خصوصی فن تھے ان دونوں علوم میں آپ کی تصانیف بیان القرآن کے علاوہ "التکشف عن مہمات التصوف" اور "التشرف بمعرفۃ احادیث التصوف"، "مسائل السلوک" نیز دوسرے رسائل اور سینکڑوں کی تعداد میں آپ کے مواعظ آپ کی اس خصوصی مناسبت پر شاہد عدل ہیں جو علوم قرآن و تصوف سے لبریز اور مشکلاتِ قرآنی کے حل سے پُر ہیں۔

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رح کی بشارت

علم تفسیر و تصوف کے ساتھ خصوصی مناسبت کے حصول کی بشارت

حضرت ممدوح کے پیر روشن ضمیر عارف باللہ حضرت قطب عالم حاجی امداد اللہ شاہ صاحب مہاجر مکیؒ قدس سرہٗ نے پہلے ہی دے دی تھی۔ اور اس مرشد عالم نے اپنی نگاہِ بصیرت سے اس مخفی جوہر اور پوشیدہ استعداد کو پہلے ہی تاڑ لیا تھا۔ بعد میں حضرت تھانویؒ کی تصانیف اور مواعظ وغیرہ کے ذریعہ جب اُن کا ظہور ہوا تو سب نے کھلی آنکھوں دیکھ لیا کہ حضرت شیخ عارف کی نگاہِ بصیرت کس قدر صحیح تھی اور یہ بشارت حضرت تھانویؒ کے حق میں کیسی مبنی بر حقیقت تھی۔

حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی رح کا فیضِ صحبت

پھر چونکہ حکیم الامت کو حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ دار العلوم دیوبند کے پہلے شیخ الحدیث اور اپنے زمانے کے شاہ عبد العزیزؒ ثانی کے فیضِ صحبت سے فیضیاب ہونے کا شرف بھی عرصہ دراز تک حاصل رہا ہے اور "حضرت الاستاذ" کے تفسیری ذوق اور خصوصی وہبی علوم کا بھی وافر حصہ حضرت ممدوحؒ کو میسّر آگیا تھا۔ اس طرح بھی فطری صلاحیت و مناسبت اور ذاتی استعداد و قابلیّت میں اضافہ ہوا اور اس شرفِ مجالست و مصاحبت نے مزید جلا بخشا۔ حضرت اقدس تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ " خدا تعالےٰ نے مشائخ ہی ایسے دیئے تھے جن کی باتوں سے ایسی تسلی آجاتی تھی جس سے کتب بینی سے استغناء ہو گیا"۔ (اشرف السوانح) اس لیے یہ کہنا بجا ہو گا کہ حکیم الامت تھانویؒ حضرت الاستاذ مولانا یعقوب نانوتویؒ کے تفسیری ذوق کے وارث اور صحیح جانشین اور اُن کے علوم و معارف کے امین و محافظ تھے۔

زیرِ نظر مقالہ میں حضرت حکیم الامت تھانویؒ کو مفسّر ہونے کی حیثیت میں کھلانے

کی مختصر طریقے سے ہی کوشش کی گئی ہے اور جہد المقل دموعہ کے طور پر حضرت حکیم الامت کے علوم و معارفِ قرآنیہ کی ادنیٰ سی جھلک اس میں دکھلائی گئی ہے جس سے مجلس صیانۃ المسلمین پاکستان کی تجویز پر عمل اور اس کے حکم کی تعمیل مقصود ہے۔ ورنہ حضرت حکیم الامتؒ علوم و معارفِ قرآنیہ کے بحرِ ذخار اور سمندر ناپیدا کنار تھے تفصیلی طور پر آپ کی تفسیری حیثیت کسی ایک مقالے میں کیونکر پیش کی جاسکتی ہے اور حضرت ممدوح کے مفسّر ہونے کی حیثیت کو کسی ایک تحریر سے پورے طور پر کیسے واضح کیا جاسکتا ہے۔

مفسّر کے شرائط

قرآنِ کریم کی تفسیر کے لیے مفسّر کو جن علوم وفنون میں مہارت تامہ کا ہونا ضروری ہے اور ماہر اساتذہ اور تجربہ کار اہلِ فن کی نگرانی میں ان علوم کی تحصیل کیے بغیر علمِ تفسیر میں قدم رکھنا جائز نہیں ہے۔ وہ علوم حسب تصریح علامہ سیوطیؒ پندرہ ہیں۔ لغت[1]، نحو[2]، صرف[3]، اشتقاق[4]، معانی[5]، بیان[6]، بدیع[7]، علم قرأت[8]، اصولِ دین[9]، اصولِ فقہ[10]، اسبابِ نزول[11]، ناسخ و منسوخ[12]، فقہ[13]، حدیث[14]، علوم الموہبۃ[15]۔

علم الموہبت

علم الموہبت سے مراد وہ موہوب علم ہے جو اپنے علم پر عمل کرنے کے صلہ میں بطور ثمرۂ عمل قلب پر القاء فرمایا جاتا ہے، اور اکتساب کے دخل کے بغیر اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل والطاف سے ان علوم و معارف کا انکشاف اپنے بندے کے دل پر بطور کرامت الہام فرماتے ہیں۔ ایسی حالتِ کشفیہ کے لیے جس سے معارفِ لدنیہ اور حقائق علمیہ منکشف ہوتے اور علوم وہبیہ عطا فرماتے جاتے ہیں، شرط ہے کہ اس کا قلب بدعت، دعویٰ، اور کبر، حبِّ دنیا وغیرہ۔ رذائل سے پاک صاف ہو۔ بغیر تزکیۂ نفس اس کرامت موہبت سے کسی کو مشرف نہیں کیا جاتا۔ اس کرامت کا حصول باطنی تزکیہ پر موقوف ہوتا ہے۔ اس لیے باوجود محض موہوب ہونے، اور بغیر اکتساب کے محض فضل الٰہی سے حاصل ہونے کے پھر بھی اس علمِ الموہبت کی تحصیل بندے کی قدرت کے تحت ہے۔ کیونکہ اس کے اسباب کی تحصیل

میں بندے کے عمل اور قدرت کا دخل ہوتا ہے۔ اس علم الموہبت کے عطا کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ تفسیر کے بارے میں کسی قول پر دلیل کے بغیر اعتماد نہ کرتا ہو ورنہ علم موہوب سے محرومی ہوگی۔

اس علم موہوب کی طرف حدیث ذیل میں بھی اشارہ ہے۔

"من عمل بما علم ورثه الله علم مالم يعلم" جس نے اپنے علم پر عمل کیا اللہ تعالیٰ اس کو نامعلوم علم کا وارث بنائیں گے۔"

حضرت حکیم الامت تھانویؒ قدس سرہٗ ان تمام علوم ضروریہ متعلقہ تفسیر اور شرائط مفسر کے جامع اور حامل تھے حضرت ممدوحؒ نے ان تمام ہی علوم و فنون کو اپنے زمانے کے ماہر اساتذہ کرام اور فضلائے عظام کی تربیت و نگرانی میں حاصل کیا تھا اور اپنے وقت کے اہل اللہ اور مشائخ طریقت سے تربیت باطنی اور تزکیہ نفس کے اعلیٰ مراحل طے کیے تھے۔ بفضلہ تعالیٰ حضرت ممدوحؒ اپنے اساتذہ اور مشائخ طریقت کی تعلیم و تربیت کی برکت سے ماہر علوم عقلیہ و نقلیہ اور تمام اصول و فروع کے فاضل اور ورع و تقویٰ کے اعلیٰ مقام پر فائز تھے، علم و عمل اور ورع و تقویٰ کی جامعیت کے سبب خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے علم الموہبت بھی حضرت ممدوحؒ کو اس درجہ کا عطا فرمایا گیا کہ اس کی نظیر اس زمانے میں تو کیا پہلی صدیوں میں بھی بہت ہی کمیاب ہے۔

بیان القرآن کا اجمالی تعارف اور اس کے محاسن و خصوصیات

حضرت حکیم الامت تھانویؒ نے ضروریات زمانہ کی رعایت سے بنام بیان القرآن ایک ایسا ترجمہ مع مختصر تفسیر لکھا جس کی زبان اور طرز بیان نیز تقریر مضامین میں زمانہ کی حالت و ضرورت اور مذاق طبیعت کا لحاظ رکھا گیا اس کے ساتھ ہی ایسے ضروری مضامین جن کا تعلق قرآن کریم سے ہے سب کو اس میں جمع کر دیا گیا یہ ترجمہ و تفسیر آخر ربیع الاول ۱۳۲۰ھ کو شروع ہوا۔ مگر

پارہ اوّل کا ربع لکھنے کے بعد کافی عرصے تک درمیان میں توقف رہا پھر وسط محرم ۱۳۲۳ھ سے لکھنے کا کام دوبارہ شروع ہوا اور ۱۳۲۵ھ میں اس بے نظیر تفسیر اور ترجمے کا کام مکمل ہوا۔ (بیان القرآن)

اکابر کی آرا حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب محدث دار العلوم دیوبند قدس سرہٗ اپنے مقدمہ ترجمہ قرآن مجید میں اس ترجمہ کے بارے میں فرماتے ہیں۔

"بندہ کے احباب میں بھی اوّل مولوی عاشق الٰہی صاحب سلمہٗ ساکن میرٹھ نے ترجمہ کیا اور اس کے بعد مولانا اشرف علی صاحب سلمہٗ اللہ نے ترجمہ کیا۔ احقر نے دونوں ترجموں کو تفصیل سے دیکھا جو ان خرابیوں سے پاک اور صاف اور عمدہ ترجمے ہیں (مقدمہ ترجمہ شیخ الہند ص ا)

حضرت تھانویؒ کے اس ترجمہ کو تفصیلی مطالعہ کے بعد حضرت شیخ الہندؒ (جو حضرت تھانویؒ اور دوسرے اکابر علماء دیوبند کے استاذ گرامی بھی تھے اور حضرت تھانویؒ فرطِ عقیدت کی بنا پر ان کو شیخ العالم کہا کرتے تھے) کی طرف سے اس ترجمے کے عمدہ اور جملہ خرابیوں سے پاک صاف ہونے کی شہادت بڑی وزنی اور وقیع ہے اور اس ترجمے کی معیاریت اور عظمت کے لیے بہت بڑی سند کی حیثیت رکھتی ہے۔

حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ دوسرے تمام مقتدر علمائے کرام کی نگاہ میں بھی اس ترجمے اور تفسیر کا مقام بہت بلند اور اس کی معیاری حیثیت سب کے نزدیک مسلم ہے حضرت علامہ مولانا محمد انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کا تاثر بھی یہی تھا کہ اس تفسیر کی افادیت کا دائرہ صرف عوام اُردو دانوں تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ یہ تفسیر عوام سے بڑھ کر خواص اور علماء کے لیے زیادہ نافع اور قابلِ مطالعہ ہے چنانچہ علامہ سید سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں۔

"مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو دیکھا تو فرمایا کہ میں سمجھتا تھا کہ اُردو میں یہ تفسیر عوام کے لیے ہوگی مگر یہ تو علماء کے دیکھنے کے قابل ہے۔" (از ماہنامہ معارف

ماہِ صفر ۱۳۶۳ھ)

مولانا انظر شاہ لکھتے ہیں بیان القرآن یعنی قرآن حکیم کی تفسیر جسے مولانا تھانوی کے علم ریز قلم نے تیار کیا جب اس کا مطبوعہ نسخہ دیوبند پہنچا اور شاہ صاحبؒ نے بالاستیعاب اس کا مطالعہ کیا تو طلباء سے درس بخاری میں ارشاد فرمایا کہ "میں نے اپنے ذوقِ علمی کو محفوظ رکھنے کے لیے اردو مطالعہ میں ہمیشہ پرہیز کیا تا آنکہ اپنی نجی مراسلت کی زبان بھی عربی اور فارسی ہی رکھی اور ہمیشہ یہ سمجھتا رہا کہ اردو کا دامن علم و تحقیق سے خالی ہے لیکن مولانا تھانویؒ کی تفسیر کا مطالعہ کرنے کے بعد مجھے اپنی رائے میں ترمیم کرنا پڑی اور اب سمجھتا ہوں کہ اُردو بھی بلند پایہ علمی تحقیقات سے بہرہ ور ہے یہ واقعہ ہے کہ "بیان القرآن" جیسی چست تفسیر دیکھنے میں نہیں آئی۔"

(نقشِ دوام صـ۲۷۶)

علامہ سید سلیمان ندویؒ اس ترجمے اور تفسیر کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"قرآن کریم کا سلیس بامحاورہ اُردو ترجمہ جس میں زبان کی سلاست کے ساتھ بیان کی صحت کی احتیاط ایسی کی گئی جس سے حقیر کی نظر میں بڑے بڑے تراجم خالی ہیں قرآن پاک کا سب سے صحیح اردو ترجمہ حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمہ ہے لیکن وہ بہت ہی لفظی ہے اس لیے تمام اردو خوانوں کے فہم سے باہر ہے مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے اس ترجمے میں دونوں خوبیاں یکجا ہیں یعنی ترجمہ صحیح اور زبان فصیح ہے اس ترجمے میں ایک خاص بات اور ملحوظ رکھی گئی ہے کہ اس زمانے میں کم فہمی یا ترجموں کی عدمِ احتیاط کی وجہ سے جو شکوک قرآن پاک کی آیات میں عام پڑھنے والوں کو معلوم ہوتے ہیں ان کا ترجمہ ہی ان میں ایسا کیا گیا ہے کہ کسی تاویل کے بغیر وہ شکوک ہی اس ترجمے کے پڑھنے سے پیش نہ آئیں اور پھر قرآن پاک کے لفظوں سے

عدول بھی ہونے نہ پائے اس لیے کہیں کہیں مزید تفہیم کی غرض سے قوسین میں ضروری تفسیری الفاظ بھی بڑھائے گئے ہیں یہ مولانا تھانویؒ کی عظیم الشان خدمت ہے۔"

(از معارف مذکور)

نیز علّامہ سید سلیمان ندویؒ ہی تفسیر بیان القرآن کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اس تفسیر کی حسب ذیل خصوصیتیں ہیں سلیس و با محاورہ حتی الوسع تحت اللفظ ترجمہ نیچے ف کے اشارہ فائدہ سے آیت کی تفسیر میں روایات صحیحہ اور اقوال سلف صالحین کا التزام کیا گیا ہے، فقہی اور کلامی مسائل کی توضیح کی گئی ہے۔ لغات اور نحوی ترکیبوں کی تحقیق فرمائی گئی ہے۔ شبہات و شکوک کا ازالہ کیا گیا ہے۔ صوفیانہ اور ذوقی معارف بھی درج کیے گئے ہیں۔ تمام کتب تفسیر کو سامنے رکھ کر ان میں کسی قول کو دلائل سے ترجیح دی گئی ہے ذیل میں اہل علم کے لیے عربی لغات اور نحوی تراکیب کے مشکلات حل کیے گئے ہیں (معارف مذکور)

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے بیان القرآن کا تعارف ذیل کے الفاظ میں کرایا ہے۔

سیدی حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہٗ نے اصل تفسیر بیان القرآن کو اس انداز میں لکھا ہے کہ متن کے ترجمہ کے ساتھ ساتھ ہی اس کی تفسیر و توضیح قوسین کے درمیان فرمائی ہے، ترجمہ کو اس کے اوپر خط دے کر اور تفسیر کو بین القوسین لکھ کر ممتاز کر دیا ہے اس طرح خط کشیدہ الفاظ میں ترجمہ قرآن ہے۔ بین القوسین اس کی تفسیر"

(از معارف القرآن)

حضرت مفتی صاحبؒ اور لکھتے ہیں۔

حضرت تھانوی قدس سرہٗ کی تفسیر بیان القرآن میں لغت، نحو، ادب، بلاغت

کے علاوہ فقہ، عقائد، کلام فلسفہ، اور ہیئت، تصوف اور متعلقہ روایات کے عنوان حواشی میں ارقام فرمائے گئے ہیں ان عنوانات کے تحت میں بڑی بڑی کتابوں کی مبسوط و مفصل بحثوں کا خلاصہ اور نتیجہ نکال کر رکھ دیا گیا ہے۔"

حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی رح لکھتے ہیں

"ہندوستان کے مسلمانوں کے ہاتھوں میں ان تین علماء ربانیین اور راسخین فی العلم (شاہ ولی اللہ دہلوی رح، شاہ عبد القادر دہلوی رح شاہ رفیع الدین دہلوی رح) کے تین نہایت صحیح اور بے مثال ترجمے پہنچ گئے تو اب اس منزل کے طے ہونے کے بعد ضرورت اس کی تھی کہ اردو زبان میں قرآنِ کریم کی کوئی مختصر اور جامع تفسیر لکھی جائے۔ جس میں فقط حل مطالب اور ربط آیات کا خاص اہتمام کیا جائے، اور شیخ جلال الدین سیوطی کی طرح اقوال مختلفہ میں سے ارجح الاقوال پر اکتفا اور اقتصار کیا جائے اور لطائف و نکات اور مذاہب باطلہ کی تردید کی تفصیل سے گریز کیا جائے تاکہ خاص و عام اس سے نفع اٹھا سکیں یہ خدمت اور یہ سعادت من جانب اللہ حکیم الامت حضرت مولانا حافظ محمد اشرف علی صاحب تھانوی رح متوفی ۱۳۶۲ھ قدس اللہ سرہ کے حصہ میں آئی اور بیان القرآن کے نام سے ۱۳۲۵ھ میں ایک تفسیر لکھی جو اپنی افادیت اور جامعیت اور مقبولیت میں ثری سے ثریا تک پہنچ گئی۔

(معارف القرآن ص ۵)

ایک مشہور اہلِ قلم اور صاحب طرز ادیب لکھتے ہیں۔

"حضرت تھانوی رح کے ترجمے میں زبان و بیان کی جو لطافت اور شیرینی ہے اس میں بھی وہ اپنی نظیر آپ ہے، رہے علمی نکات اور تفسیری لطائف ان کا تو ذکر ہی کیا۔"

مزید لکھتے ہیں۔

"یہ کرامت آپ کے بیان القرآن ہی میں دیکھی کہ پختہ مسلمانوں کے لیے تو ہے

ہی لیکن ساتھ ہی بدمذہبوں اور مذبذبین سب کی رعایتیں موجود ہیں۔" (نقوش)

بیان القرآن کا تفصیلی تعارف

حضرت حکیم الامت تھانویؒ نے تفسیر بیان القرآن کی تمہید میں ترجمہ اور تفسیر کی جن خصوصیات اور التزامات کا ذکر فرمایا ہے اسی سے بیان القرآن کا تفصیلی تعارف بھی ہوجاتا ہے۔ ذیل میں ان خصوصیات اور التزامات کا خلاصہ پیش کیا جارہا ہے۔

۱۔ ترجمہ قرآن مجید آسان قابلِ فہم ہونے کے ساتھ تحت لفظی ہونے کی بھی رعایت کی گئی ہے، پھر کبھی تو مترادف لفظ کے ساتھ ترجمہ کیا گیا ہے اور کبھی حاصل کے ساتھ ترجمہ کر دیا گیا۔ جیسا کہ حضرت شیخ المشائخ شاہ عبدالقادر صاحب دہلویؒ نے بھی یہی طریقہ اختیار فرمایا ہے، اس کی کئی مثالیں بیان القرآن کے حاشیہ میں دے دی گئی ہیں۔

۲۔ ترجمے میں خاص محاورات استعمال نہیں کیے گئے بلکہ کتابی زبان لی ہے کہ فصاحت کے ساتھ اس میں سلاست بھی ہے۔ خالص محاورات استعمال نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ محاورات ہر مقام کے جدا جدا ہوتے ہیں۔ مثلاً دہلی اور لکھنؤ کے محاورات جدا جدا ہیں۔ اتباعِ محاورے کی بہ نسبت ترجمے میں ترکیب کی رعایت زیادہ کی گئی ہے۔

۳۔ نفسِ ترجمے کے علاوہ جس مضمون پر ترجمے کی توضیح موقوف تھی یا کوئی شبہ مضمون سے ظاہراً پیدا ہوتا تھا اس کا جواب یا مضمون قرآنی کسی مشہور تحقیقات کے خلاف معلوم ہوتا تھا اس کی تحقیق یا اس قسم کی کوئی ضروری بات ہوئی اس کو ف بنا کر بڑھا دیا۔ محض حل قرآن ورفع ضرورت مقصود ہے۔

۴۔ جس آیت کی تفسیر میں مفسرین کے بہت سے اقوال ہیں ان میں سے جس کو ترجیح معلوم ہوئی صرف اس کو لے لیا بقیہ سے تعرض نہیں کیا۔

۵۔ مطلب قرآنی کی تقریر کہیں تو اس طرح کی ہے کہ مضمون کا ارتباط خود ظاہر ہوجائے

اور کہیں ایک سرخی ربط کی لکھ کر اس کی تقریر کر دی گئی۔

۶۔ اختلافیات کی تفسیر میں صرف مذہب حنفی لیا گیا ہے اور دوسرے مذاہب بشرط ضرورت حاشیے میں لکھ دیئے گئے۔

۷۔ چونکہ عوام کے ساتھ افادۂ خواص کا بھی خیال ملحوظ رہا اس لیے ان کے فائدہ کیلئے ایک حاشیہ عربیہ بڑھایا ہے جس میں مکیت اور مدنیت سور و آیات وغیرہ مشہور لغات و ضروری وجوہ بلاغت اور مغلق ترکیب و خفی الاستنباط فقہیات و کلامیات و اسباب نزول اور روایات و اختلاف قرأت مغیرہ ترکیب یا حکم و توجیہ ترجمہ و تفسیر ایجاز کے ساتھ مذکور ہیں جس کو متوسط درجے کا طالب علم سمجھ سکتا ہے۔ یہ حاشیہ درس و تدریس کے وقت بہت کام آسکتا ہے اس طرح بحمد للہ یہ تفسیر مختصر یا ترجمہ مطول کہہ دیجئے عوام و خواص سب کے کام کا ہو گیا۔ اگر اہل علم اول صرف قرآن کریم کا مطالعہ کر کے بطور خود غور کریں اور اس میں جو امور ذہن میں مجمل رہیں یا جو اشکالات واقع ہوں ان کو مستحضر کر کے پھر اس تفسیر کا ملاحظہ فرمائیں۔ تو انشاء اللہ تعالےٰ دوبالا لطف اور حظ حاصل ہو۔

۸۔ قرآن مجید کے اول سے آخر تک ہر سورۃ اور ہر آیت کا ربط ماقبل کے ساتھ نہایت سہل اور قریب تقریر میں بالالتزام بیان کیا گیا اور اکثر سورتوں کے شروع میں ان سورتوں کا خلاصہ بھی بیان کیا گیا۔

۹۔ جتنی آیتوں کی تفسیر بوجہ اتحاد یا تقارب یا تناسب مضامین کے ایک جگہ مجتمع لکھی گئی ہے ان کے اول میں ان مضامین کا ایک جامع عنوان بطور سرخی کے لکھ دیا گیا ہے جس سے اجمالاً ان تمام آیات کا خلاصہ ذہن میں مستحضر ہونے کے بعد مفصل تفصیل سے جو کچھ نفع اور حظ حاصل ہوتا ہے، ناظرین اس کو خود ملاحظہ فرما رہے ہیں۔ پھر ان آیات کی تفسیر ایسی کی گئی ہے کہ سب ایک مسلسل تقریر معلوم ہوتی ہے۔

۱۰۔ جن روایات پر تفسیر کو مبنی کیا ہے ان میں صحیح روایات کا التزام کیا گیا ہے البتہ جس

جگہ کی تفسیر کسی روایت پر مبنی نہ تھی اور لفظ قرآن فی نفسہ بھی اس وجہ کو محتمل تھا تقویت احتمال کے لیئے اشتراطِ صحت میں تسامح کیا گیا ہے۔

۱۱۔ شبہات کے جواب دینے میں صرف ان شبہات کو خاص کیا گیا ہے جن کا منشار کوئی دلیل صحیح تھی، اور بہت سے شبہات نفس تقریر ترجمہ سے مندفع ہو گئے ہیں۔

۱۲۔ ہر جگہ تفسیر میں اتباع سلف صالح کا کیا ہے۔ متاخرین کے اقوال کو جو سلف کے خلاف تھے نہیں لیا۔

۱۳۔ تقریر مدلول آیات میں قواعدِ میزانیہ منطقیہ کی پورے طور سے رعایت کی گئی ہے، اس کا لطف اذکیا علماء ہی اٹھا سکتے ہیں۔

۱۴۔ اس تفسیر سے پورا لطف حاصل ہونے کی شرط علوم متعارفہ میں مہارت اور اس میں جبکہ کسی مقام پر تحیر و مراجعت تفاسیر کے بعد اس تفسیر کو ملاحظہ کرنا ہے۔

۱۵۔ دو مقام ایسے ہیں جیسا جی چاہتا تھا ویسا شرح صدر نہیں ہوا اس موقع پر اس کی تصریح کر دی ہے تاکہ اگر کسی کو اس سے اچھی تقریر و تفسیر میسر ہو جائے اسی کو راجح سمجھے۔

(از بیان القرآن)

حقیقت یہ ہے کہ بیان القرآن تمام علوم متعلقہ قرآن کی جامع اور تفسیری علوم کی حاوی نادرہ روزگار تفسیر ہے اور اس کی افادیت و نافعیت کا دائرہ بہت وسیع ہے اور عوام سے لے کر اہل علم و کمال تک کے لیئے کار آمد اور مفید ہے یہ تفسیر قرآنی مشکلات کے حل کرنے میں خاص طور پر اپنی نظیر آپ ہے۔ اس کے محققانہ طرز استدلال اور حکیمانہ اسلوب بیان سے قرآن مجید کے مطالب اس طرح حل اور دل نشین ہوتے جاتے ہیں جن سے تمام شکوک و شبہات کا ازالہ ہو جاتا ہے، مگر اس تفسیر کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ ایسے ہی حضرات کو ہوتا ہے جنہوں نے مطالب قرآنیہ کے سمجھنے سمجھانے اور تفسیر قرآن کا گہری نظر سے مطالعہ کرنے میں عمر کا ایک حصہ صرف کیا ہو، جس شخص کی نظر میں مشکلات قرآنی کے حل کے لیئے

متقدمین و متاخرین کے تراجم اور کتب تفسیر کی ورق گردانی ناکافی ہو چکی ہو پھر بیان القرآن کی بین القوسین کی کسی مختصر عبارت سے تمام اشکالات کا حل اور شبہات کا ازالہ ہو گیا ہو ایسے شخص کو اس تفسیر کی صحیح عظمت و وقعت کا اندازہ ہوتا ہے، اس زمانے میں اس شان اور اس پایہ کی تفسیر کا وجود اہل علم کے لیے نعمتِ عظمیٰ اور غنیمتِ کبریٰ ہے جو شخص جس قدر تفسیر بیان القرآن میں تدبر کرے گا اور غور و فکر سے کام لے گا اسی قدر اس پر حضرت حکیم الامت تھانویؒ کی تفسیر کی جامعیت و نافعیت اور افضلیت و اشرفیت دوسری تفسیروں پر ظاہر ہوتی چلی جائے گی۔ اور جس قدر بھی بیان القرآن کا گہری اور عمیق نظر سے مطالعہ کیا جائے گا اسی قدر اس تفسیر کا فہم مطالب قرآنی کے لیے کافی وافی اور حل اشکالات اور رفع شبہات کے لیے شافی ہونا ظاہر ہوتا چلا جائے گا۔

حضرت مفسر رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر کے لکھنے میں بڑی محنت و مشقت برداشت فرمائی ہے بعض بعض مقامات کی تفسیر لکھنے میں آپ کو آدھ آدھ گھنٹہ تک غور و تفکر اور دعا کے بعد شرح صدر ہوا اور تفسیر سمجھ میں آئی۔ اس کے باوجود بھی جب تک اس کی تائید سلف صالحین کی تفسیر میں نہیں ملی اس پر اطمینان نہیں کیا۔ (از اشرف السوانح)

اس التزام میں اگرچہ بہت زیادہ محنت کرنی پڑی اور بہت وقت صرف ہوا اور ہر مقام کے لیے بہت سی تفاسیر دیکھنی پڑیں مگر یہ فائدہ ہوا کہ حضرت مفسر تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے علوم قرآن کی مطابقت سلف صالحین کے علوم سے واضح ہو گئی۔ بظاہر تو یہ تفسیر سلف کی تفاسیر سے ماخوذ ہے لیکن حقیقت میں سراسر خود حضرت مفسر تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے فہم قرآن کا ثبوت اور علوم تفسیریہ سے آپ کی مناسبت تامہ کی روشن دلیل ہے۔

پھر جن دو مقامات[1] کے بارے میں حضرت مفسر علام کو شرح صدر نہیں ہو سکا وہاں

حاشیہ [1]: سورۃ براءۃ پارہ ۱۰ رکوع اوّل و دوم اور سورۃ الحشر پارہ ۲۸ کی پہلی پانچ آیات۔

صفائی سے اس کا اظہار فرمادیا کہ اگر اس سے بہتر تفسیر کہیں مل جائے تو اس کو اختیار کیا جائے یہ بات حضرت مفسر تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی خصوصیات اور مناقب خاصہ میں سے ہے ورنہ عام طور پر اہل علم اس طرح سے اعترافِ تقصیر کے عادی نہیں ہوتے بلکہ اس طرح کے اظہار سے عار مانع ہوتا ہے۔ اور جس جگہ حضرت مفسر علام کو اپنی تفسیر کی کوئی صریح تائید سلف سے باوجود تلاش کے نہیں ملی اس کو لکھ کر اس کے آگے ہٰذا من المواہب لکھ دیا ہے۔

حضرت حکیم الامت تھانویؒ کا طرزِ نگارش

حضرت حکیم الامت تھانویؒ اگرچہ آجکل کی اصطلاح میں اُردو ادب کے صاحبِ طرز ادیبوں میں شمار نہیں کیے جاتے تھے مگر پھر بھی حضرت تھانویؒ کا یہ ترجمہ مستند ترجمے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور بڑے بڑے صاحبِ طرز ادیب اس کی ادبیت کے معترف ہیں جس کی کچھ تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔ اور تفسیری فوائد کے بیان میں جو لفظی فصاحت و بلاغت اور معنوی لطافت کی رعایت کے ساتھ عجیب و غریب حکیمانہ اندازِ بیان اختیار فرمایا گیا، اور عقائد و کلام کے مباحث میں جس طرح کی بالغ نظری کے ساتھ استدلال کا منطقی اور عقلی طریقہ اپنایا گیا ہے وہ تو اہلِ علم و نظر کے لیے بڑا ہی وجد آفریں ہے۔

زمانۂ حال کے صاحبِ طرز ادیب مفسر جس بات کو اپنی طویل تشریحی عبارتوں میں بیان کرتے ہیں حضرت تھانویؒ کا اسے نہایت ہی مختصر الفاظ میں بیان کر کے ناظرین کے دل و دماغ میں اتار دینا ایسا امتیازی وصف ہے جو حضرت تھانویؒ کے طرزِ نگارش کو دوسرے ادیبوں اور مفسروں سے ممتاز اور جدا کرتا ہے۔ حضرت تھانوی کا طریقہ تحریر اور طرز نگارش متین اور باوقار ہوتا ہے عامیانہ اردو نویسی حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی اعلیٰ شانِ علمی کے شایانِ شان نہیں تھی ایسے محقق اور متبحر جید عالم اور عالی مقام عارفِ کامل سے عامیانہ اردو نویسی کی توقع رکھنی ایسی ہے جیسے کسی شہبازِ عرش سے بالائے زمین اڑنے کی فرمائش۔

سورتوں اور آیات کے درمیان ربط

قرآنی سورتوں کے درمیان ترتیب اگرچہ اجتہادی ہے اور مرفوع و موقوف مختلف روایتیں سورتوں کی ترتیب میں وارد ہوئی ہیں اور بعد میں صحابہ کرامؓ کا اجماع و اتفاق موجودہ ترتیب پر ہوگیا اب اس کی مخالفت قطعاً ناجائز ہے۔

لیکن آیات کی ترتیب توقیفی اور وحی کے ذریعے قائم کی گئی ہے اس ترتیب میں کسی کے اجتہاد کو مطلقاً دخل نہیں ہے، اس کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جو کہ تفسیر روح المعانی میں آیت "واتقوا یوما ترجعون فیہ الی اللّٰہ" کے تحت مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے پاس جبرئیل آئے اور کہا کہ اس آیت کو بقرہ کی دو سو اسی ۲۸۰ آیت کے بعد رکھا جائے اور دوسری روایت میں ہے کہ اس کو آیت الربوا اور آیت دین کے بعد رکھا جائے اس سے صاف ظاہر ہے کہ آیتوں کی ترتیب وحی پر موقوف ہے اور وحی کے ذریعے ہی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمائی ہے۔

آیات کے درمیان ربط

حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک آیات کے درمیان ایک مناسبت اور ربط بھی قائم ہے اور اس پر دلیل یہ ہے کہ اگر آیات کے درمیان ربط و مناسبت کا اعتبار نہ کیا گیا ہوتا تو ترتیب تلاوت ترتیب نزول سے مختلف نہ ہوتی۔ حالانکہ ترتیب تلاوت کا ترتیب نزول سے مختلف ہونا محقق اور ثابت ہے اگر آیات میں کسی ربط اور مناسبت کا لحاظ نہ ہوتا تو ترتیب نزول کو کیوں بدلا جاتا۔ (حاشیہ بیان القرآن)

سبق الغایات فی نسق الآیات

اس نام سے حضرت تھانوی علیہ الرحمہ نے عربی میں ایک مستقل رسالہ بھی تحریر فرمایا ہے۔

جس کے ڈیڑھ سو صفحات ہیں اس میں سورۃ فاتحہ سے لے کر والناس تک اہلِ علم وفہم کے لیے ربطِ آیات کے بارہ میں بعض عجیب عجیب ارشادات فرماتے گئے ہیں اور بیان القرآن میں بھی آیات کے درمیان ربط کا خصوصی طور پر لحاظ رکھا گیا ہے۔ بقول مولانا عبدالباری صاحب ندوی بیان القرآن نے یہ خدمت بقدر ضرورت پوری فرمادی کہ ہر چھوٹا بڑا حصہ اور ہر چھوٹی بڑی آیت دوسری سے اس طرح مربوط ہوگئی ہے کہ متن قرآن اور اس کے تحتانی ترجمہ کے بعد ہر آیت کا قوسین کے ساتھ جو تفسیری ترجمہ فرمادیا گیا ہے، اگر اس کو آدمی پڑھتا چلا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایک بے تکلف مسلسل ومربوط کتاب پڑھ رہا ہے۔ (تجدید دین کامل)

ربط کی ایک مثال

ولقد ارسلنا الی امم من قبلك . . . . . والحمد لله رب العالمین (پ ۷) کا ربط اوپر کی آیت قل ارءیتم ان اتکم عذاب الله . . . . . . وتنسون ما تشرکون ؕ سے بیان القرآن میں اس طرح تحریر فرمایا گیا ہے

"اوپر مشرکین پر وقوع عذاب فرض کرکے اس بنا پر ان کے دعویٰ شرک کو باطل کیا گیا تھا۔ آگے اس فرض کا غیر مستبعد ہونا ثابت کرنے کے لیے بعض امم سابقہ کا معذب وہلاک ہونا بیان فرماتے ہیں تاکہ مخاطبین کو اس فرض کے غلط کہنے کی گنجائش نہ ہو اور اس ہلاکت کا ذکر بھی ایک خاص طور سے فرمایا ہے جس سے کفار موجودین کے منشاء انکار کا جواب بھی ساتھ ساتھ ہوجاوے کیونکہ بڑا منشاء انکار کا یہ ہوتا ہے کہ بعض مصائب آآکر ٹل جاتے ہیں تو نادان کو دھوکا ہوتا ہے کہ یہ سزائے اعمال نہ تھی ورنہ ٹلتی نہیں اس لیے بتادیا تاکہ ان ہالکین کی دار وگیر کی ترتیب بھی یہی ہوتی تھی کہ اوّل نزول بلیات ہوا کہ تضرع کریں پھر استدراجاً نزول نعم فرمایا گیا جب خوب کفر بڑھ گیا پھر ہلاک کردیئے گئے تو تم بعض بلیات کے ٹلنے سے دھوکہ مت کھانا (بیان القرآن جلد ۳ صـ۹۱)

بعض اور مثالیں

قل لست علیھم بوکیل کا ترجمہ "کہہ دو کہ میں تمہارے اوپر نگہبان یا داروغہ نہیں ہوں" کر دینے سے جیسا کہ اکثروں نے کیا نہ مطلب کھلتا ہے نہ ربط معلوم ہوتا ہے، بخلاف اس کے کہ حضرت علیہ الرحمۃ نے یہ فرمایا کہ "آپ کہہ دیجئے کہ میں تم پر تعینات نہیں کیا گیا ہوں" اور تفسیری ترجمہ میں یوں فرمایا کہ "کہہ دیجئے کہ میں تم پر عذاب واقع کرنے کے لیے تعینات نہیں کیا گیا ہوں کہ مجھ کو مفصل اطلاع ہو یا میرے اختیار میں ہو البتہ ہر چیز کے وقوع کا وقت اللہ کے علم میں ہے اور جلد ہی تم کو معلوم ہو جائے گا کہ عذاب آیا"

اسی طرح آگے وما علی الذین یتقون من حسابھم من شیئ پ کا ترجمہ بالعموم یہ کر دیا جاتا ہے کہ "جو لوگ پرہیزگاری کرتے ہیں ان پر ان کا کچھ حساب نہیں" حضرت تھانویؒ نے ترجمہ فرمایا کہ "جو لوگ احتیاط رکھتے ہیں ان پر ان کی بازپرس کا کوئی اثر نہ ہوگا" اور تفسیری ترجمہ میں یوں فرمایا کہ "جو لوگ منہیاتِ شرعیہ سے جن میں بلاضرورت ایسی مجالس (خائضین فی آیات اللہ) میں جانا بھی ہے احتیاط رکھتے ہیں ان پر ان (طاغیین اور مکذبین) کی بازپرس (اور گناہ طعن) کا کوئی اثر نہ پہنچے گا (یعنی بضرورت وہاں جانے والے گنہگار نہ ہوں گے)" (بیان القرآن صـ ۱۰۴/۳)

وانذر بہ الذین یخافون ان یحشروا الی ربھم لیس لھم من دونہ ولی ولا شفیع لعلھم یتقون (پ) اس آیت کا ترجمہ مع تفسیر اس طرح کیا گیا ہے اور ایسے لوگوں کو (کفر و معصیت پر عذاب الٰہی سے خاص طور پر) ڈرائیے جو (اعتقاداً یا احتمالاً) اس بات سے اندیشہ رکھتے ہیں کہ (قیامت میں) اپنے رب کے پاس (قبروں سے زندہ کرنے کے بعد) ایسی حالت سے جمع کیے جائیں گے کہ جتنے غیر اللہ (کفار کے

زعم میں مددگار اور مستقل شفیع سمجھے جاتے) ہیں (اس وقت) نہ کوئی ان کا مددگار ہوگا اور نہ کوئی مستقل شفیع ہوگا (اور ایسے لوگوں کو) اس امید پر (ڈرائیے) کہ وہ (عذاب سے) ڈر جائیں (اور کفر و معصیت سے باز آجاویں کیونکہ نہ ڈرنا کسی ولی و شفیع کے بھروسے ہوتا ہے اور وہ معدوم ہے)" (بیان القرآن ص۹۶ جلد۳)

ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر پڑھنے والا شخص یہ محسوس کرے گا کہ وہ ایک مسلسل اور مربوط کتاب پڑھ رہا ہے جس کا ہر جملہ دوسرے جملہ سے ملا ہوا ہے اور جڑا ہوا ہے۔

ولا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل الآیہ۔ اکثر لوگوں کو یہ گمان ہوگا کہ قرآن شریف کی اس آیت اور پہلی آیت میں ربط نہیں ہے کیونکہ اوپر کی آیت میں احکام روزے کے بیان ہیں اور یہاں ہے کہ حرام مال سے بچو اس میں جوڑ کیا ہے یہ لیکن اگر غور کیجئے تو آپس میں بڑا جوڑ ہے روزہ میں فرماتے ہیں وکلوا واشربوا۔ ثم اتموا الصیام الی اللیل یعنی جب تک صبح صادق نہ ہو اس وقت تک کھاؤ پیو اور جب صبح صادق نکل آوے تو اس وقت کھانا پینا چھوڑ دو پھر جبکہ سورج غروب ہو جائے اس وقت روزے کو ختم کر دو سو روزہ تو موقت ہے کہ اس میں جو چیزیں چھڑائی گئی ہیں وہ ایک وقتِ خاص تک چھڑائی گئی ہیں کھانے پینے کی چیزیں خاص وقت تک حرام کر دی گئیں مگر حرام سے بچنے کا روزہ کبھی ختم نہیں ہوتا گویا ایک روزہ کے ساتھ دوسرے روزہ کا ذکر فرمایا خیال تو فرمائیے کتنا لطیف ربط ہے (احکام الجاہ)

ولن یجعل اللہ للکفرین علی المومنین سبیلا ۵پ یعنی حق تعالےٰ کافروں کو مسلمانوں پر ہرگز غلبہ نہ دیں گے، اگر اسی آیت کے الفاظ پر نظر کو مقصور کر دیا جائے تو اس پر اشکال ہوتا ہے کہ یہ تو خلافِ مشاہدہ ہے ہم تو دیکھتے ہیں بعض دفعہ کفار کو مسلمانوں پر غلبہ ہو گیا ہے۔ اس کا جواب بھی دیا گیا ہے اور اچھا جواب ہے کہ غلبہ سے غلبہ فی الحجت مراد ہے مطلب یہ ہوا کہ حجت میں کافروں کو کبھی غلبہ نہ ہوگا

مشاہدہ اور مشاہدے کے موافق ہے حجت میں ہمیشہ اسلام ہی کو غلبہ ہوا ہے اور ہوتا ہے گو یہ جواب فی نفسہٖ صحیح ہے مگر کیا اچھا ہو کہ اشکال ہی نہ پڑے جو جواب دینے کی ضرورت ہو تو سیاق میں نظر کرنے سے معلوم ہوا کہ یہاں اوپر سے فیصلہ قیامت کا ذکر ہے اور یہ جملہ اس فیصلہ کے متعلق ہے۔ پوری آیت یوں ہے۔ فاللّٰہ یحکم بینکم یوم القیٰمۃ ولن یجعل اللّٰہ للکٰفرین علی المومنین سبیلا (پ ۵) یعنی اللہ تعالیٰ تمہارے درمیان فیصلہ کریں گے۔ قیامت کے دن اور حق تعالیٰ کافروں کو مسلمانوں پر ہرگز غلبہ نہ دیں گے، دیکھئے سیاق میں نظر کرنے سے یہ فائدہ ہوا کہ اشکال وارد ہی نہیں ہوتا کیونکہ یہاں غلبہ فی الدنیا کا ذکر ہی نہیں بلکہ فیصلہ قیامت میں غلبہ نہ ہونے کا ذکر ہے (التراحم)

ربط کی ایک عجیب مثال

سورۂ قیامۃ میں حق تعالےٰ نے قیامت کا حال بیان فرمایا ہے کہ انسان اس وقت پریشان ہوگا اور بھاگنے کا موقع ڈھونڈے گا۔ اس سلسلے میں ارشاد فرماتے ہیں:۔ ینبؤ الانسان یومئذ بما قدم واخر بل الانسان علیٰ نفسہ بصیرۃ ولو القیٰ معاذیرہ ؕ ترجمہ: اس روز انسان کو اس کا سب اگلا پچھلا کیا ہوا جتلا دیا جاتے گا (اور انسان کا اپنے اعمال سے آگاہ ہونا کچھ اس جتلانے پر موقوف نہیں ہوگا بلکہ انسان خود اپنی حالت پر بوجہ انکشاف ضروری کے خود مطلع ہوگا گو باقتضائے طبیعت اس وقت بھی اپنے حیلے حوالے پیش لاوے۔

یہاں تک تو قیامت کے بارے میں مضمون تھا آگے ارشاد فرماتے ہیں: لاتحرک بہٖ لسانک لتعجل بہٖ ان علینا جمعہ وقرانہ ۔ فاذا قرانٰہ فاتبع قرانہ ؕ ثم ان علینا بیانہ ؕ ترجمہ: یعنی حضور کو ارشاد ہے کہ قرآن

نازل ہوتے وقت اس کو یاد کرنے کے خیال سے زبان نہ ہلایا کیجئے۔ قرآن کا آپ کے دل میں جما دینا اور زبان سے پڑھوا دینا ہمارے ذمّہ ہے تو جب ہم قرآن نازل کریں تو اس وقت فرشتے کی قرأت کا اتباع کیجئے پھر یہ بھی ہمارے ذمہ ہے کہ آپ کی زبان سے اس کو بیان کرا دیں گے۔"

اس کے بعد پھر قیامت ہی کا ذکر ہے۔ وجوہٌ یومئذٍ ناضرۃ ٥ الیٰ ربھا ناظرۃ۔ ترجمہ بہت سے چہرے تو اس روز بارونق ہوں گے۔ اپنے پروردگار کی طرف دیکھتے ہوں گے۔

تو اوپر بھی قیامت کا ذکر اور بعد کو بھی اس کا ذکر اور درمیان میں یہ مضمون کہ قرآن پڑھتے ہوتے جلدی یاد کرنے کے لیے زبان کو حرکت نہ دیا کیجئے لوگ اس مقام کے ربط میں تھک گئے اور بہت سی توجیہات کی گئیں مگر سب میں تکلّف ہے لیکن جس کو حق تعالیٰ کے اس تعلق کا علم ہے جو حق تعالیٰ کو حضورؐ کے ساتھ ہے اس کو صاف نظر آتا ہے کہ اس کلام کا درمیان میں کیا موقع اور ربط ہے چنانچہ بیان القرآن میں اس کا جو ربط تحریر فرمایا ہے وہ یہ ہے ینبؤا الانسان یومئذٍ بما قدم واخر اور بل الانسان علی نفسہ بصیرۃ سے دو مضمون مستفاد ہوتے ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ تمام اشیاء کے عالم اور محیط ہیں دوسرا یہ کہ حق تعالیٰ کی عادت ہے کہ جو حکمت مقتضی ہوتی ہے تو علوم غائبہ کثیرہ کو ذہنِ مخلوق میں حاضر کر دیتا ہے گو ان علوم غائبہ کا حاضر ہو جانا خلافِ عادتِ طبعی ہو جیسا کہ قیامت میں اس کا وقوع ہوگا۔"

اب آگے اس کا ربط ملاحظہ ہو

"جب یہ بات ہے تو آپ وحی کے نزول کے وقت جیسا کہ اب تک آپ کی عادت ہے اس قدر مشقت کہ سنتے بھی پڑھتے بھی ہیں دھیان بھی رکھتے ہیں محض اس

احتمال سے کیوں برداشت کرتے ہیں کہ شاید کچھ مضمون میرے ذہن سے نکل جائے کیونکہ جب ہم نے آپ کو نبی بنایا ہے اور آپ سے تبلیغ کا کام لینا ہے تو یہاں مقتضائے حکمت یہی ہوگا کہ وہ مضامین آپ کے ذہن میں رکھے جائیں اور ہمارا اسی ہونا تو ظاہر ہی ہے اس لیے آپ یہ مشقت برداشت نہ کیا کیجئے۔" (بیان القرآن ص۱۲/۱۱)

یہ چند مثالیں تو آیات کے درمیان ربط کی پیش کی گئی ہیں اب ذیل میں ایک ایسی مثال پیش کی جاتی ہے جس میں ایک ہی آیت کے اجزاء میں بڑا ہی عجیب اور نفیس ربط بیان فرمایا گیا ہے۔

چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے ولو یواخذ اللہ الناس بظلمھم ما ترك علیھا من دابۃٍ (پ ۱۴) ترجمہ "اور اگر اللہ تعالےٰ لوگوں پر ان کے ظلم کے سبب داروگیر فرماتے تو سطح زمین پر کوئی حرکت کرنے والا نہ چھوڑتے۔"

بظاہر اس کلام میں ربط معلوم نہیں ہوتا کہ مؤاخذہ تو صرف لوگوں سے کیا جاتا اور ہلاک جانوروں کو بھی کر دیا جاتا حضرت تھانویؒ نے بیان القرآن میں اس آیت کی تقریر اس طرح فرمائی ہے۔

"تقریر ملازمت شرط و جزا میں احقر کے نزدیک یہ ہے کہ ظالم تو اپنے ظلم کی وجہ سے ہلاک ہوتے اور غیر ظالم اس لیے کہ حکمت خداوندی باعتبار اکثر اوقات کے اس عالم مجموعے کے آباد کرنے کو مقتضی ہے ورنہ نیکوں کی آبادی زمین پر بغیر ظالموں کے مثل آبادی ملائکہ کے آسمان پر ہوتی پھر آبادی زمین کو جدا کیوں کیا جاتا اور اس مضمون کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جس میں ارشاد ہے لو لم یذنبوا لذھب اللہ بکم الخ یعنی لو لم یکن فیکم مذنبون۔ اس لیے نیک بھی نہ رہتے۔" اور چونکہ حیوانات انسان ہی کے منافع کے لیے مخلوق ہوتے ہیں۔ یہ نہ ہوتے تو وہ بھی نہ ہوتے۔ ھذا من المواھب وللہ الحمد اور اکثر اوقات

کی قید اس لیے لگائی کہ بعض اوقات دنیا میں صرف غیر ظالم ہی رہیں گے جیسے زمانہ عیسیٰ علیہ السلام میں" (بیان القرآن ص ۴۹ ج ۱۲)

اس کی تفصیل حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ایک وعظ میں نظر سے گزری وہ بھی افادہ عام کے لیے پیش ہے حضرت فرماتے ہیں۔

"بظاہر یہ کلام بے جوڑ سا معلوم ہوتا ہے۔ مقدم (لو یؤاخذ اللہ الناس) اور تالی (ما ترك علی ظهرها من دابة) میں بظاہر علاقہ نہیں معلوم ہوتا بلکہ ظاہر تو یہ ہے کہ یوں فرماتے کہ اگر آدمیوں سے مؤاخذہ فرماتے تو زمین پر کسی آدمی کو نہ چھوڑتے نہ کہ مؤاخذہ تو صرف آدمیوں سے فرماتے اور ہلاک جانوروں کو بھی کر دیتے، بظاہر یہ بالکل بے جوڑ معلوم ہوتا ہے بات یہ ہے کہ عین عتاب میں بھی ان کا شرف بتلایا ہے کہ مقصود بالخلق انسان ہی ہے، اور دوسری چیزیں اسی کے واسطے بنائی گئی ہیں، تو اگر ان سے مواخذہ کرتے تو ان میں سے کسی کو نہ چھوڑتے اور جب ان کو نہ رکھتے تو جانور رہ کے کیا کرتے کیا رحمت ہے کہ عتاب میں بھی ہمارا اشرف بیان کیا جا رہا ہے کہ انسان ہی اشرف المخلوقات ہے۔" (الصلوٰۃ ص ۱۱)

ربط کی ایک اور انوکھی مثال اور منصب نبوت کا احترام

سورۃ صٓ کے دوسرے رکوع میں حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس ان کے عبادت خانے میں دیوار پھاند کر اہل مقدمہ کے آنے کا ذکر کیا گیا ہے اور قصے کے اخیر میں فرمایا گیا ہے وظن داؤد انما فتنه فاستغفر ربه فتنه - کی تفسیر میں قول مشہور کسی عورت سے نکاح کرنے کے واقعہ کو محققین نے باطل قرار دیا ہے اور بعض نے داؤد علیہ السلام کا لقد ظلمك بلا تحقیق کہہ دینا اس کی تفسیر میں کہا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ ان کی گستاخیوں پر غصہ آ گیا تھا اس سے استغفار کیا مگر

غصہ آنا ثابت نہیں کر سکتے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ داؤد علیہ السلام کے صبر و تحمل کا امتحان مقصود تھا کہ آیا زور سلطنت میں متواتر گستاخیوں پر دار و گیر کرتے ہیں یا غلبۂ نور نبوت سے عفو فرماتے ہیں۔ چنانچہ اس میں صابر ثابت ہوتے لیکن انبیاءؑ کی جلالت شان عدل کے جس درج علیا اور ذروۂ قصوی کو مقتضی ہے اس سے بظاہر ایک گونہ بعید اتنا خفیف سا یہ امر پیش آگیا کہ بعد قیام برہان شرعی کہ وہ بیّنہ ہو یا اقرار بجائے اس کے کہ صرف ظالم سے خطاب فرماتے کہ تو نے ظلم کیا اس مظلوم سے خطاب فرمایا کہ تجھ پر ظلم کیا جس سے ایک طرف کی طرفداری متوہم ہوتی ہے۔ اور گو مظلوم ہونے کی حیثیت سے یہ طرفداری بھی عبادت ہے خصوص مقدمہ ختم ہو چکنے کے بعد لیکن فریق مقدمہ ہونے کی حیثیت سے اور عدم تبدل مجلس تخاصم اور مجلس واحد کے جامع المتفرقات ہونے کی حیثیت سے اس توہم طرفداری کا بھی نہ ہونا اعدل و اکمل تھا سو داؤد علیہ السلام غایت تقویٰ سے اتنی بات کو بھی مخل کمال صبر و منافی ثبات فی الامتحان سمجھے اور انہوں نے اس سے بھی اپنے رب کے سامنے توبہ کی۔ الخ ۔۔۔

حضرتؒ فرماتے ہیں کہ" بندہ نے جو تفسیر کی ہے اس کا مبنی خود منصوص قرآنی ہے اور اصبر علے مایقولون کے ساتھ اس قصے کا یاد دلانا قرینہ ہے کہ اس میں بھی صبر علی الاقوال تھا گو دونوں جگہ اقوال میں کفر اور سوء ادب کا اختلاف ہے۔ البتہ یہ امر مظنون ہے کہ داؤد علیہ السلام نے اسی کو مبنی سمجھا ہو سو چونکہ اور تفسیروں کا مبنی بھی قرآن میں نہیں اس لیے یہ تفسیر اوروں سے اقرب ہے۔" (بیان القرآن ص۱)

مطلب یہ کہ اس کے مبنیٰ کا قرآن میں منصوص ہونا تو متیقن ہے مگر یہ امر محض مظنون ہے کہ داؤد علیہ السلام نے اس کو مبنیٰ سمجھا ہو اور وہ مبنیٰ یہ قول ہے لقد ظلمك (حاشیہ بیان القرآن ص۱)

بعض علما نے یہ کہا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کا امتحان در اصل اس بات میں تھا

کہ انہوں نے ایک دن عبادت کے لیے اس طرح خاص کر لیا تھا کہ اس دن وہ مخلوق سے بے تعلق ہو جاتے تھے ایک دن کو عبادت الٰہی کے لیے اس طرح خاص کر لینا کہ ان کا تعلق مخلوقِ خدا سے منقطع ہو جاتے منصب نبوت اور منصب خلافت کے منافی تھا اور حضرت داؤد علیہ السلام جیسے اولوالعزم پیغمبر اور خلیفۃ اللہ کے لیے کسی طرح موزوں نہیں تھا چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام کی اس روش کو ختم کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو اس طرح آزمائش میں مبتلا کیا"، (قصص القرآن جلد۲ ص۸۷)

اور بعض اکابر نے لکھا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی آزمائش ان کی عاجزی اور بندگی میں تھی کیونکہ حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنی عبادت کے پروگرام کا بارگاہِ حق میں اظہار کیا اور اس اظہار میں عجب وبڑائی کا شائبہ تھا اس پر گرفت کی گئی اور دو آدمی خلافِ معمول اندر آ گئے اور حضرت داؤد علیہ السلام متنبہ ہوتے کہ خدا تعالےٰ کی توفیق کے بغیر آدمی کچھ نہیں کر سکتا۔

یہ دونوں توجیہیں بھی اگرچہ درست ہو سکتی ہیں مگر قرآنِ کریم کے کسی لفظ میں ان کی طرف اشارہ نہیں پایا جاتا اور اوپر کی آیات سے ان کا کوئی ربط ظاہر نہیں ہوتا اس کے برخلاف حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی اختیار کردہ توجیہہ کا ذکر خود لفظ قرآنی **لقد ظلمك** میں بھی موجود ہے اور اس کا ربط اوپر کی آیت **اصبر علی مایقولون** سے بھی قائم ہو جاتا ہے، اس لیے اس توجیہہ کا سب توجیہات سے الطف واولیٰ ہونا بعد امعان نظر کے ثابت ہوتا ہے فللہ در حکیم الامت التھانویؒ ما ابھی درره وامعن نظره واللہ اعلم۔

منصب نبوت کے احترام اور عظمت پیغمبرانہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے حضرتؒ نے آیات کا باہمی ربط اور حضرت داؤد علیہ السلام کی انابت واستغفار کرنے کے ساتھ غیر مستند روایات اور غلط توجیہات کی تردید بھی فرما دی۔ تفسیر بیان القرآن میں حضرت تھانویؒ نے اسرائیلی روایات سے حتی الامکان احتراز کیا ہے اور قرآن مجید کی تفسیر خود قرآن

کی آیات اور مستند روایات سے ہی فرمائی ہے خاص طور پر منصبِ نبوت کے احترام اور انبیاء علیہم السلام کے واقعات کی وضاحت میں اسرائیلی خرافات سے پرہیز کرنے میں یہ تفسیر خصوصی امتیاز رکھتی ہے، بیان القرآن میں انبیاء علیہم السلام کے تمام واقعات کی تفسیر میں ایسے کسی واقعہ کو نقل نہیں فرمایا اور نہ کسی ایسی روایت کو تفسیر کی بنیاد بنایا جس سے اسلام کے مسلمہ عقائد پر زد پڑتی ہو یا حضرات انبیاء علیہم السلام کا احترام و مقام مجروح ہوتا ہو، ذٰلک فضل اللّٰہ یؤتیہ من یشاء۔

قرآن مجید میں اس واقعہ کے بعد دو واقعے حضرت سلیمان علیہ السلام کے بیان فرمائے گئے ہیں ارشاد ربانی ہے۔

وَوَهَبْنَا لِدَاوُدَ سُلَيْمَانَ ط نِعْمَ الْعَبْدُ اِنَّهٗ اَوَّابٌ اِذْ عُرِضَ عَلَيْهِ بِالْعَشِيِّ الصّٰفِنٰتُ الْجِيَادُ فَقَالَ اِنِّيْ اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ عَنْ ذِكْرِ رَبِّيْ حَتّٰى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ رُدُّوْهَا عَلَيَّ فَطَفِقَ مَسْحًا بِالسُّوْقِ وَالْاَعْنَاقِ ه وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمٰنَ وَاَلْقَيْنَا عَلٰى كُرْسِيِّهٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْ بَعْدِيْ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ،

(پ ۲۳ سورہ ص)

اور ہم نے داؤد کو سلیمان عطا کیا بہت اچھے بندے تھے کہ بہت رجوع ہونیوالے تھے جبکہ شام کے وقت ان کے روبرو اصیل عمدہ گھوڑے پیش کیے گئے تو کہنے لگے میں اس مال کی محبت میں اپنے رب کی یاد سے غافل ہو گیا یہاں تک کہ آفتاب پردہ مغرب میں چھپ گیا، ان گھوڑوں کو ذرا میرے سامنے لاؤ سو انہوں نے ان کی پنڈلیوں اور گردنوں پر ہاتھ صاف کرنا شروع کیا اور ہم نے سلیمان کو ایک اور امتحان میں ڈالا اور ہم نے ان کے تخت پر ایک دھڑ لا ڈالا پھر انہوں نے رجوع کیا کہا اے میرے رب میرا قصور معاف کر اور مجھ کو ایسی سلطنت دے کہ میرے سوا کسی کو میسر نہ ہو آپ بڑے دینے والے ہیں ؟

بیان القرآن میں ان دونوں واقعات کی ایسی تفسیر بیان کی گئی ہے جس میں ایسی غیر مستند اسرائیلی روایات وخرافات سے مکمل طور پر پرہیز کیا گیا ہے جو انبیاء علیہم السلام کی شان عالی اور منصب نبوت کے قطعی طور پر لائق نہیں ہیں۔ حضرت تھانویؒ نے اپنی تفسیر کی بنیاد روایات صحیح پر رکھی ہے۔ پہلے واقعہ کے متعلق حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں۔

(وہ قصہ ان کو یاد کرنے کے قابل ہے) جبکہ شام کے وقت اس کے روبرو اصیل (اور) عمدہ گھوڑے (جو بغرض جہاد وغیرہ رکھے تھے) پیش کیے گئے (اور ان کے ملاحظہ کرنے میں اس قدر دیر ہو گئی کہ دن چھپ گیا اور کچھ معمول از قسم نماز فوت ہو گیا۔ کذا فی الدر المنثور عن علیؓ اور بوجہ ہیبت اور جلالت کے کسی خادم کی جرأت نہ ہوئی کہ مطلع ومتنبہ کرے کذا فی الدر عن ابن عباسؓ پھر جب خود متنبہ ہوا) تو کہنے لگے کہ افسوس، میں اس مال کی محبت میں لگ کر اپنے رب کی یاد سے (یعنی نماز سے) غافل ہو گیا یہاں تک کہ آفتاب پورا (مغرب) میں چھپ گیا (پھر حشم وخدم کو حکم دیا کہ) ان گھوڑوں کو ذرا پھر تو میرے سامنے لاؤ (چنانچہ لائے گئے) سو انہوں نے ان (گھوڑوں) کی پنڈلیوں اور گردنوں پر (تلوار سے) ہاتھ صاف کرنا شروع کیا (کذا فی الدر مرفوعا بسند حسن یعنی ان کو ذبح کر ڈالا اس کو اصطلاح تصوف میں غیرت کہتے ہیں کہ جو چیز سبب غفلت عن اللہ ہو جاوے اس کو اپنے پاس نہ رہنے دیں۔ (ص ۱۱)

پھر فائدہ میں اس کی وضاحت اس طرح فرمادی کہ:

یہ نماز چھوڑ گئی تھی اگر نفل تھی تو کوئی اشکال نہیں مگر انبیاء کی شان اعظم ہوتی ہے اس لیے انہوں نے اس کا بھی تدارک کیا۔ اور اگر فرض تھی تو نسیان میں گناہ نہیں ہوتا اور یہ قطع کرنا سوق واعناق کا اتلاف مال نہ تھا بلکہ بطور قربانی کے تھا، اور قطع سوق کو شاید خروج دم اور زہوق روح میں آسانی ہونے کی وجہ سے اختیار کیا ہے۔ کذا فی الروح مگر ہماری شریعت میں قطع سوق مشروع نہیں للنھی عن النخع کذا فی

تخریج الزیلعی عن الطبرانی وھذا مثلہ (صـ۹/ج۱۰)

اس وضاحت سے بڑی خوبی کے ساتھ تمام اشکالات کا حل اور ذہنوں میں پیدا ہونے والے ہر سوال کا جواب ہو گیا کہ نسیان فرض میں گناہ نہیں اگر فرض کر لیا جائے کہ وہ فرض نماز تھی، اور قطع سوق واعناق بظاہر اتلاف مال معلوم ہوتا ہے، وہ بطور قربانی کے تھا جو کہ مالی اور جانی عبادت ہے اور اب ہماری شریعت میں قطع سوق مشروع نہیں ہے۔

اس تفسیر سے حضرت تھانویؒ کی فقہی بصیرت اور جامعیت اور ہر پہلو پر عمیق نظر کا ہونا ثابت ہو رہا ہے اور احترام نبوت کا لحاظ بھی بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔

دوسرے قصہ کے بارہ میں فرماتے ہیں کہ (حدیث شیخین میں ہے کہ ایک بار سلیمان علیہ السلام اپنے امراء لشکران کی کسی کوتاہی جہاد پر خفا ہوئے اور فرمانے لگے کہ میں آج کی رات اپنی ستر بیبیوں سے ہمبستر ہوں گا کہ ان سے ستر مجاہد پیدا ہوں گے فرشتہ نے قلب میں القاء کیا کہ انشاء اللہ کہہ لیجئے آپ کو کچھ خیال نہ رہا چنانچہ صرف ایک عورت حاملہ ہوئی اور اس سے بھی ایک ناقص الخلقت بچہ پیدا ہوا جس کے ایک طرف کا دھڑ نہ تھا) اور (اسی کی نسبت کہا گیا ہے کہ) ہم نے ان کے تخت پر ایک (ادھورا) لاڈالا (یعنی قابلہ نے آپ کے سامنے تخت پر لا رکھا کہ یہ پیدا ہوا کذا فی الروح) پھر انہوں نے (خدا کی طرف) رجوع کیا (اور ترک انشاء اللہ سے توبہ کی اور توبہ کرنا ایسے امر سے چونکہ دلیل ہے کمال ثبات فی الدین کی اس کو امتحان میں پورا اترنا کہیں گے (صـ۹/ج۱۰) ان توجیہات کی تائید مستند احادیث سے ہو رہی ہے اور منصب نبوت کا ان میں پورا پورا احترام ملحوظ ہے اور بعض بے سروپا اسرائیلی قصے جو بعض کتب تفسیر میں نقل ہو گئے ہیں اور ان میں عظمت پیغمبرانہ کو ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ ایسے قصوں سے

اپنی اس تفسیر کو مکمل طور پر محفوظ رکھا۔

ربط کے بارے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی محققانہ تحقیق

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ربط کے سلسلہ میں عربی رسالہ بھی لکھا اور اپنی تفسیر بیان القرآن میں بھی آیات اور سورتوں کے درمیان ارتباط کا لحاظ رکھا اور واقع میں بھی ترتیب نزولِ آیات اور ترتیب تلاوت کے مختلف ہونے سے ربط کی ضرورت ثابت ہوتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ باہم آیات میں کوئی مناسبت اور تعلق ضرور ہے، لیکن اگر آیات میں ربط نہ بھی ہو تب بھی قرآن کریم پر اعتراض کی گنجائش نہ تھی۔ کہہ سکتے تھے کہ قرآن میں طرزِ تصنیف نہیں اختیار کیا گیا بلکہ نصیحت مع لحاظِ شفقت اختیار کیا گیا ہے اور اس میں ضرورتِ مخاطب کے لحاظ سے گفتگو کی جاتی ہے، جس کی بے ربطی ہزار ربط سے افضل ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر سمجھئے کہ نصیحت کرنے والا ایک تو استاذ ہوتا ہے اور ایک باپ ہوتا ہے۔ استاذ تو ضابطہ پری کر دیتا ہے مگر باپ ضابطہ پری نہیں کر سکتا نصیحت کرتے ہوئے اس کا خیال رکھتا ہے کہ بیٹے کو ایسے عنوان اور ایسے طرز سے نصیحت کروں جو اس کے دل میں گھر کر لے۔ اسی لئے باپ کا کلام نصیحت کے وقت کبھی بے ربط و بے ترتیب ہو جاتا ہے مثلاً باپ بیٹے کو کھانا کھاتے ہوئے نصیحت کرے کہ بُری صحبت میں نہیں بیٹھا کرتے اسی درمیان میں اس نے دیکھا کہ بیٹے نے ایک بڑا سا لقمہ کھانے کو لیا ہے تو وہ فوراً پہلی نصیحت کو قطع کر کے کہے گا کہ یہ کیا حرکت ہے لقمہ بڑا نہیں لیا کرتے اس کے بعد پہلی بات پر گفتگو شروع کر دے گا۔ اب جس کو شفقت کی اطلاع نہ ہو وہ کہے گا کہ یہ کیسا بے ترتیب کلام ہے بری صحبت سے منع کرنے میں لقمہ

کا کیا ذکر مگر جو شخص کبھی کسی کا باپ بنا ہے وہ جانتا ہے کہ یہ ترتیب کلام مرتب و مرتبط کلام سے افضل ہے۔ شفقت کا مقتضٰی یہی ہے کہ بات کرتے ہوئے اگر دوسری بات کی ضرورت ہو تو ربط کا لحاظ نہ کرے دوسری بات کو بیچ ہی میں کہہ کر پہلے بات کو پورا کرے یہی راز ہے اس کا کہ خدا تعالیٰ کا کلام ظاہر میں کہیں بے ربط بھی معلوم ہوتا ہے اس ظاہری بے ربطی کا منشاء شفقت ہی ہے کہ حق تعالیٰ مصنفین کی طرح گفتگو نہیں کرتے کہ ایک مضمون پر کلام شروع ہو تو دوسرے باب کا کوئی مضمون اُس میں نہ آ سکے۔" (وعظ سبیل النجاح ص۳۳۵ وغیرہ)

اس نصیحت و شفقت کے پیش نظر اللہ تبارک و تعالیٰ ہر سورت میں بہت سے احکام بیان فرما کر اخیر میں ایسی بات بیان فرماتے ہیں جس میں ساری سورت کا مضمون اجمال کے ساتھ مذکور ہوتا ہے اور تھوڑے سے مختصر لفظوں میں بڑا مضمون ادا کر دیا جاتا ہے، جس کو بلاغت میں ایجاز کہتے ہیں اس طرح تمام احکام پر عمل کرنے میں سہولت ہو جاتی ہے۔ چنانچہ سورۂ آل عمران میں مختلف ابواب کے احکام بیان فرما کر کلام کو ختم نہیں کیا بلکہ اخیر کی آیت میں بطور میزان الکل کے ایک بات ایسی بتا دی جو سب کو جامع ہے اس طرح یہ آیت اخیرہ " یاایہا الذین امنوا اصبروا وصابروا ورابطوا واتقوا اللہ لعلکم تفلحون "، تمام سورت کے احکام کو اجمالاً جامع ہے جس میں بالاجمال جملہ احکام مذکور داخل ہیں اور دیکھنے میں دو تین باتیں ہیں جن پر عمل بہت آسان ہے۔

سورتوں کے درمیان ربط آیتوں کے درمیان ربط کے علاوہ سورتوں کے درمیان ربط کا بھی حضرت رحمۃ اللہ

علیہ نے اکثر اہتمام فرمایا ہے مثلاً سورۂ فاتحہ سے سورۂ بقر کا ربط اس طرح بیان فرمایا گیا ہے۔

"سورۂ فاتحہ سے اس سورت کا یہ ربط ہے کہ اس میں راہِ ہدایت کی درخواست کی گئی تھی اور اس میں اُس درخواست کی منظوری ہے کہ یہ کتاب ہدایت ہے اس پر چلو" (بیان القرآن ص۲)

اور سورۂ بقرہ کے ختم پر سورۂ آل عمران سے ربط اس طرح ذکر کیا ہے فرماتے ہیں۔

"میرے نزدیک وہ تمام سورت جملہ فانصرنا علی القوم الکفرین سے مرتبط ہے کیونکہ اس سورت کے زیادہ اجزاء میں کفار کے ساتھ مجاہدہ باللسان و بالبنان مذکور ہے جیسا تتبع سے معلوم ہوتا ہے"

(بیان القرآن جلد ا ص۱۷۶)

اگر آیتوں اور سورتوں کے روابط کو تفسیر بیان القرآن سے علیحدہ جمع کر کے شائع کر دیا جائے تو طلباء علوم دینیہ کے لئے نہایت درجے مفید ہو سکتا ہے پھر کسی اور جگہ سے ربط کے تلاش کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہ سکتی۔

حضرت حکیم الامتؒ کی بعض خاص تفسیری تحقیقات

اردو عربی محاورے کا فرق

حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں بعض الفاظ لغت عربی میں کسی معنی خاص میں صریح نہیں ہیں مگر اردو محاورہ میں وہ اس معنی میں صریح ہو گئے ہیں اب ان الفاظ کو قرآن میں دیکھ کر بعض جاہلوں کو قرآن پر اشکال ہوتا ہے کہ اس میں تو غیر مہذب

الفاظ ہیں مثلاً ذکر عربی میں (نر) کو کہتے ہیں جو انثی (مادہ) کا مقابل ہے وذکر وانثی عربی میں نر ومادہ کو کہتے ہیں اور کبھی کنایۃً عضو مخصوص کو بھی کہتے ہیں یہ تو عربی کا استعمال ہے مگر اردو میں ذکر کا استعمال عضو ہی کے لئے ہونے لگا۔ اب اگر کوئی قرآن میں للذکر مثل حظ الانثیین دیکھ کر اعتراض کرنے لگے کہ اس میں غیر مہذب الفاظ ہیں یہ اس کی حماقت ہوگی کیونکہ جو لفظ تمہارے محاورے میں غیر مہذب ہے وہ عربی میں اس معنی کے لئے موضوع ہی نہیں۔

اسی طرح قرآن کریم میں والحافظین فروجہم اور احصنت فرجہا بعض جہلاء اس کو غیر مہذب سمجھتے ہیں یہ بھی حماقت ہے کیونکہ عربی میں لفظ فرج شرمگاہ عورت کے لئے موضوع نہیں بلکہ اس کے اصل معنی شگاف کے ہیں کنایۃً کبھی شرمگاہ کے لئے بھی بول دیا جاتا ہے۔ چنانچہ احصنت فرجہا کا ترجمہ ہے کہ مریم علیہا السلام اپنے گریبان کو دست اندازی غیر سے بچانے والی تھیں۔ اس کا مرادف یہ ہے کہ پاکدامن تھیں کتنا نفیس عنوان ہے جس میں بتلائیے کون سا لفظ غیر مہذب ہے؟ اور نفخنا فیہ من روحنا کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے ان کے گریبان میں دم کر دیا جس سے وہ حاملہ ہوگئیں بتلائیے اس میں کیا اشکال ہے (المورد الفرسخی)

چنانچہ بیان القرآن میں اس لفظ کا اس طرح ترجمہ کیا گیا ہے "وہ جنہوں نے اپنے ناموس کو (حرام اور حلال دونوں سے) محفوظ رکھا (بیان القرآن ص ۲۳ ج ۱۲)

مگر محض ترجمہ سے یہ باتیں تھوڑا ہی معلوم ہو سکتی ہیں ترجمہ دیکھنے والے ایک لفظ کا ترجمہ اپنے محاورہ کے موافق کر کے قرآن کریم پر اشکال کرنے لگتے ہیں۔ قرآن کریم عربی کلام ہے اور اس کی بلاغت وفصاحت

اور اس کے معانی و مطالب کو وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو عربیت کا پورا ماہر ہو اور عربی زبان پر پوری قدرت رکھتا ہو۔ قرآن کریم کو اسی زبان میں سمجھتا ہو جس میں قرآن نازل ہوا ہے (المورد الفرسحق)

اردو زبان کی تنگ دامانی

اردو میں جب عربی زبان کا ترجمہ کیا جاتا ہے تو چونکہ اردو، عربی زبانیں مختلف ہیں دونوں کے محاورات الگ ہیں اس لئے اگر کسی کو عربی میں علم کافی نہیں ہے اس کے ترجمے میں بعض دفعہ ابہام رہ جائے گا جس سے شبہات پیدا ہوں گے اور بعض جگہ ترجمہ غلط ہو جائے گا۔

مثلاً سورہ والضحیٰ میں ضالاً کا ترجمہ بعض نے گمراہ کر دیا۔ جو باوجود فی نفسہ صحیح ہونے کے ایک عارض کے سبب غلط ہو گیا وہ عارض یہ ہے کہ ضال لفظ عربی ہے اس کا عربی میں مختلف استعمال ہوتا ہے یعنی اس میں بھی جس کو وضوح دلیل نہ ہوا ہو اور اس میں بھی جو بعد وضوح دلیل کے مخالفت کرے گمراہ ہمارے محاورہ میں صرف اس کو کہتے ہیں جو وضوح دلیل کے بعد حق کا اتباع نہ کرے۔ اور لغت عربیہ کے اعتبار سے لفظ ضال دو معنیٰ کو جیسا کہ مذکور ہوا عام ہے ایک معنیٰ ضال کے وہ ہیں جو ہمارے محاورے میں گمراہ کے آتے ہیں اور دوسرے معنیٰ بے خبر کے ہیں اور بے خبر اس کو کہتے ہیں جس پہ دلائل ظاہر ہی نہیں ہوئے اور ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ظہور حق کے بعد اس کا اتباع نہ کرنا محال ہے لہٰذا اس جگہ گمراہ ترجمہ کرنا غلط ہے بلکہ بے خبری سے ترجمہ کرنا مناسب ہے۔

اور گو بے علمی بھی بے خبری کا مرادف ہے مگر اس سے بھی ترجمہ مناسب نہیں کیونکہ ہمارے محاورہ میں بے علم جاہل کو کہتے ہیں جو علوم صحیحہ سے بالکل

عاری ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نبوت سے پہلے گو علوم نبوت سے بے خبر ہوں مگر علوم عقلیہ میں کامل تھے۔ پس بے علمی سے بھی ترجمہ مناسب نہیں بلکہ بے خبری ہی سے ترجمہ کرنا مناسب ہے اور کسی بات سے بے خبری کچھ عیب نہیں کیونکہ ذاتی اور علم محیط سوائے خدا تعالیٰ کے کسی کو نہیں۔ ہر شخص علم میں تعلیم الٰہی کا محتاج ہے بالخصوص علوم سمعیہ نقلیہ میں جن کے ادراک کے لئے عقل محض ناکافی ہے اور ہر شخص کو جو علم حاصل ہوتا ہے معلوم کرنے سے پہلے وہ غیر معلوم ہی ہوتا ہے۔ پس علم بعد عدم علم کوئی عیب نہیں۔ مناسب ترجمہ ضالاً کا اس جگہ ناواقف ہے اس لفظ کا یہ صحیح ترجمہ موجود تھا مگر مترجمین کی نظر اس پر نہیں پہنچی اور وہ ضالاً کا ترجمہ گمراہ کر گئے حاصل یہ کہ الفاظ عربیہ کا ترجمہ ہر جگہ کافی نہیں ہوتا۔ اور مقصود کے سمجھنے میں غلطی واقع ہو جاتی ہے اس لئے ترجمہ کے لئے خود عربی کا بھی پوری طرح جاننا اور اس زمانے کے محاورات سے بھی جس میں ترجمہ کیا جا رہا ہے پورا واقف ہونا ضروری ہے۔ (تزکوۃ النفس)

آجکل اردو میں محاورہ بدل گیا گمراہ کا استعمال پہلے ہی معنی میں ہوتا ہے۔ دوسرے موقع میں ناواقف اور بے خبر کہا جاتا ہے۔

اسی طرح لا تکونن من الجاہلین ترجمہ دیکھنے والوں کو خیال ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے سخت لفظ سے خطاب فرمایا گیا یہ شبہ اصل میں غلط محاورہ سے ہوا ہے ہمارے محاورہ میں جاہل بہت سخت لفظ ہے اور اس کا اگر ترجمہ کیا جائے تو آسان لفظ ہو جاتا ہے جاہل کا ترجمہ نادان ہے یہ کتنا پیارا لفظ ہے اس سے توہین لازم نہیں آتی بلکہ شفقت کے موقع پر بھی بولا کرتے ہیں ظاہر ہیں تو جاہل کا لفظ کتنا سخت ہے مگر ترجمہ کے بعد اس کی حقیقت بالکل آسان ہے یہ اشکالات غلط محاورہ سے ہوتے ہیں۔
(آداب التبلیغ)

محاورہ کے درپے ہونا لیکن اس کے ساتھ ہی قرآن کریم کے ترجمے میں یہ ضروری ہے کہ قرآن کا مدلول باقی رہے۔ آج کل کے ترجموں میں ان کو با محاورہ کرنے کے درپے ہو کر اس کا بالکل خیال نہیں کیا جاتا حالانکہ قرآن مجید کے ترجمہ میں محاورہ کی اتباع کی اتنی ضرورت نہیں ہے جتنی مدلول کے باقی رکھنے کی ضرورت ہے۔

زمانہ حال کے بعض ترجمہ کرنے والوں نے محاورات کے اتباع کی پابندی میں اصل مدلول قرآنی کا لحاظ نہیں رکھا اور بعض ایسے محاورات استعمال کئے جو فصاحت کے مقام سے گرے ہوئے ہیں حالانکہ ترجمہ قرآن کریم میں زبان فصیح ہونی چاہیئے اور محاورہ بھی شاہانہ انداز کا استعمال کرنا چاہیئے جس سے کلام کی عظمت و ہیبت قلوب میں باقی رہے اور عامیانہ بازاری محاوروں سے کلام کی وقعت متاثر ہو سکتی ہے مگر عامیانہ طبائع ایسے ہی محاورات پر فریفتہ اور لٹو ہیں۔

مثلاً ایک ایسے ہی مترجم صاحب نے جن کی محاورات دانی پر لوگ فریفتہ ہیں یعمھون کا ترجمہ "ٹامک ٹوئیاں مارنا" لکھا ہے اور ذھبنا نستبق میں استباق کا ترجمہ "کبڈی کھیلنا" کیا ہے۔ یہ ترجمہ لغت کے بھی خلاف ہے اور عقل کے بھی خلاف ہے۔ لغت میں استباق کے معنی آپس میں اس طرح دوڑنے کے ہیں کہ ایک دوسرے سے آگے نکلنا مقصود ہو۔ اور عقلاً بھی یہ ترجمہ غلط ہے اس لئے کہ کبڈی کھیلنے میں بھی اتنی دور نہیں جایا کرتے جس سے محافظ بچے کی نسبت بھیڑیے کے کھا جانے کا احتمال ہو اگر ایسا ہوتا تو حضرت یعقوب علیہ السلام اس پر ضرور جرح فرماتے۔ اسی طرح وعلی الذین یطیقونہ فدیۃ کی تفسیر میں اس مفسر نے لکھ دیا "کہ جو شخص روزہ

نہ رکھے وہ فدیہ دے دے" یہ تفسیر اس آیت کی بالکل غلط ہے (وعظ الصوم)
حالانکہ روزہ کے بدلے میں فدیہ کا یہ حکم شروع اسلام میں مشروع تھا پھر
فمن شهد منكم الشهر فليصمه سے منسوخ ہو گیا البتہ جو شخص بہت
بوڑھا ہو یا ایسا بیمار ہو کہ اب صحت کی توقع نہیں ایسے لوگوں کے لئے یہ حکم اب
بھی باقی ہے مگر روزہ کی طاقت رکھنے والوں کے لئے یہ حکم منسوخ ہے جیسا کہ
بیان القرآن ص ۱۰۳ ج ۱ مع حاشیہ میں مذکور ہے۔
قرآن کریم کے سمجھنے کے لئے عربی لغت اور صرف، نحو، کے علاوہ دوسرے
قواعد (عقلیہ) منطقیہ جاننے کی ضرورت بھی ہے کیونکہ آجکل عقول سلیمہ بہت
کم ہیں اگر عقلِ سلیم ہو تو نتیجہ نکالنے کا سلیقہ اور اس کی غلطیاں خود معلوم
ہو جاتی ہیں مگر جب عقلِ سلیم نہ ہو تو قواعدِ منطقیہ کی ضرورت ہے۔ اس سے
صحتِ استدلال اور نتیجے کا صحیح و غلط ہونا معلوم ہو جاتا ہے بدون اس کے
قرآن میں بعض جگہ غلطی ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ مثال کے طور پر ارشادِ باری
تعالیٰ ہے ولو علم الله فيهم خيرا لاسمعهم ولو اسمعهم
لتولوا وهم معرضون۔ یہاں اشکال ہوتا ہے کہ ان دونوں مقدموں سے
نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ لو علم الله فيهم خيرا لتولوا وهم معرضون۔ اور
اس کا بطلان ظاہر ہے اس اشکال کا حل علمِ معقول جاننے والا جلد دے
سکتا ہے کہ یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں کیونکہ صحتِ نتیجہ تکرارِ حدِ اوسط پر موقوف
ہے اور یہاں حدِ اوسط مکرر نہیں۔ کیونکہ مطلب یہ ہے۔
ولو علم الله فيهم خيرا لاسمعهم۔ سماع قبول۔ ولو اسمعهم
سماع عدم قبول لتولوا وهم معرضون اور اس پر کوئی اشکال نہیں اس
لئے بقدرِ ضرورت علم معقول کی بھی ضرورت ہے (المورد الفرسخی)

بیان القرآن کے عربی حاشیہ میں حضرتؒ نے اس اشکال اور جواب کی تقریر ان لفظوں میں کی ہے "اندفع بھذا ما یوھم من الشرطیتین من استلزام علم اللہ منھم خیرا التولیھم بناء علی ان لازم اللازم لازم وجہ الاندفاع ظاھر فان الاسماع اللازم غیر الاسماع اللازم وقد رایت التصریح بھذا المعنی فی الدر المنثور عن ابن زیدؓ نصہ ھکذا ولو اسمعھم بعد ان یعلم ان لاخیر فیھم ما نفعھم بعد ان علم بانھم لا ینتفعون بہ اھ (ص۳۷ ج۴)

اسی طرح آیت انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء میں علماء کو یہ شبہ ہوا کہ ہم عالم ہیں تو ہم میں خشیت بھی ہے اور جب خشیت بھی ہے تو اس فضیلت میں داخل ہوئے حالانکہ یہ غلط ہے کیونکہ محض علم سے خشیت ہونا ضروری نہیں اس کے لئے تدبیر مستقل کی حاجت ہے اور عوام کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ قرآن شریف کی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ علم سے خشیت ہوتی ہے حالانکہ ہم نے تو بہت سے عالم دیکھے ہیں کہ اُن کو خوفِ خدا کچھ بھی نہیں۔ عوام کے اعتراض کا اکثر یوں جواب دیا جاتا ہے کہ جس عالم کو خوفِ خداوندی نہ ہو اس کا علم معتد بہ نہیں ہے پس جہاں علم معتد بہ ہوگا وہاں خشیت ضروری ہے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ جواب فی نفسہ تو صحیح ہے مگر اس مقام پر نہیں چلتا۔ حضرتؒ کی تقریر سمجھنے کے لئے علوم الٰہیہ اور اصطلاحاتِ منطقیہ کی ضرورت ہوگی۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ اس پر مفہوم آیت کا یہ ہوگا کہ خشیت علم پر ضرور مرتب ہوگی اور علم سے مراد علم مع الخشیت ہوگا۔ پس خشیت مرتب ہوگی خشیت پر۔ پس تقدم الشی علی نفسہ لازم آئے گا اور یہ دور صریح ہے۔ خلاصہ یہ ہوا خوف کا پیدا کرنا ضروری ہے اور اس کا موقوف علیہ ہے علم اس کو حاصل کرو لیکن علم حصولِ خشیت کی

علت تامہ نہیں ہے بلکہ اس علت کا ایک جزو ہے دوسرا جزو تقویٰ ہے۔ غرض دو چیزوں کی ضرورت ہوئی ایک تو علم دین کی کیونکہ یہ نہ ہو تو خشیت ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ اذا فات الشرط فات المشروط اور دوسری چیز خلوت ہے (فضائل العلم والخشیت)

اب ظاہر ہے کہ ان دونوں آیتوں کا مطلب اور مقصد بغیر قواعدِ منطقیہ کے کیسے سمجھا جا سکتا ہے؟

دوسری مثال قرآن کریم کی آیت " ولقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکر ان الارض یرثھا عبادی الصلحون"۔ اور ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد یہ لکھ دیا ہے کہ اس زمین کے وارث و مالک میرے نیک بندے ہوں گے"۔ کے بارہ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک عالم نے سوال کیا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ زمین کے مالک کفار ہو گئے؟ حضرت نے جواب میں فرمایا کہ "مولانا آپ تو عالم ہیں مگر ذرا یہ تو دیکھئے کہ یہ قضیہ دائمہ ہے یا مطلقہ۔ چونکہ وہ عالم تھے اتنی ہی بات سے سمجھ گئے (حاصل جواب کا یہ ہوا کہ آیت میں یہ نہیں کہا گیا کہ زمین کے مالک ہمیشہ نیک ہی بندے ہوں گے بلکہ اس میں اطلاق کے ساتھ یہ وعدہ ہے کہ میرے نیک بندے زمین کے وارث ہوں گے اور اطلاق کے صدق کے لئے ایک بار وقوع کافی ہے۔ چنانچہ صحابہؓ کے زمانے میں اس کا وقوع ہو چکا۔ یہ جواب اس تقدیر پر ہے کہ آیت میں ان الارض سے مراد یہی دنیا کی زمین ہے ورنہ ظاہراً آیت کے سیاق و سباق سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد ارضِ جنت ہے اور جنت کی زمین کے مالک نیک بندے ہوں گے اس پر کچھ بھی اشکال نہیں۔

(النعم المرغوبہ)

بیان القرآن میں حضرتؒ نے اس زمین سے جنت کی زمین ہی مُراد لی ہے
فرماتے ہیں کہ" اس زمین (جنت) کے مالک میرے نیک بندے ہوں گے"
(ص۵۹ ج۷) اور اسی صفحہ کے حاشیہ عربیہ میں فرماتے ہیں کہ جنت کے لفظ سے اشارہ
اس طرف ہے کہ الارض محمول ہے ارضِ جنت پر جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد
و اورثنا الارض نتبوء من الجنة حيث نشاء میں الارض سے مُراد
جنت کی زمین ہے"

تیسری مثال

" اور مسئلہ رویت باری تعالیٰ کی دقیق تحقیق "

ایک صاحب نے سوال کیا فلما تجلی ربہ الی خر موسیٰ
سے معلوم ہوتا ہے کہ خرور بعد تجلی کے ہوا پس رویت ثابت ہو گئی پھر لن ترانی
کے کیا معنی ؟ جواب یہ دیا کہ تقدم زمانی نہیں تقدم ذاتی ہے۔ پس تجلی اور خرور
میں کوئی زمانہ نہیں ہوا جس میں رویت ہو (ملفوظ ۹۳ از مقالاتِ حکمت)

ایک اور سوال و جواب جو حضرت موسیٰ کلیم اللہ کی رویت کی توضیح کے لئے
مفید معلوم ہوتا ہے۔ سوال کیا گیا کہ وادی ایمن میں موسیٰ علیہ السلام کو جو نور نظر
آیا وہ اگر نور مخلوق نہ تھا تو رویت میسّر ہو گئی پھر رب ارنی انظر الیک کی
درخواست کی کیا وجہ ؟ اور اگر نور مخلوق تھا تو موسیٰ علیہ السلام میں اور ہم میں
کہ دوسرے انوار مخلوقہ کو مثل نورِ شمس و قمر دیکھتے ہیں کیا فرق ہوا ؟ جواب دیا
" کہ وہ نور غیر مخلوق نہ تھا مخلوق تھا مگر چونکہ مخلوق بلاواسطہ تھا اس لئے
اس کو بنسبت دوسرے انوار کے حق تعالیٰ کے ساتھ زیادہ تلبس و تعلق تھا کہ
اس تلبسِ زائد سے اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کرنا یعنی ایک معنی کر
نورِ حق کہنا بھی صحیح ہے جیسے کلام لفظی کہ ماتریدیہ کے نزدیک مخلوق ہے مگر
اس خاص تلبّس کی وجہ سے اس کو کلام اللہ کہنا صحیح ہے۔ بخلاف کلامِ زید و عمرو

کہ اس کو کلام اللہ کہنا جائز نہیں پس سب اشکالات رفع ہو گئے۔"
(ملفوظ صہ ۸۴)

واقعی وادئ ایمن میں نورِ حق نظر آنے کے بعد رویت کی وجہ اور دونوں رؤیتوں میں اور پھر اس رویتِ نورِ وادی ایمن اور دوسرے انوار میں فرق کو بڑی عجیب مثال کلام لفظی سے واضح فرما کر ہر طرح کے اشکالات کو رفع کر دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ علم کلام سے پوری مناسبت اور اس میں مہارت تامہ کے بغیر ایسے دقیق علوم کا سمجھنا سمجھانا ممکن نہیں۔ اسی طرح کی دقیق تحقیق مسئلہ رؤیت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق بیان القرآن میں کی گئی ہے جو قابلِ ملاحظہ ہے جس سے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی دقتِ نظر اور علوم عقلیہ منطقیہ میں بھی کامل مہارت کا اندازہ ہو سکتا ہے فرماتے ہیں "حضرت موسیٰ علیہ السلام سے حق تعالیٰ نے کلام فرمایا مگر یہ کہ اس کی حقیقت کیا تھی اللہ ہی کو معلوم ہے جن احتمالاتِ عقلیہ کی شریعت نفی نہ کرے ان سب کے قائل ہونے کی گنجائش ہے لیکن بلا دلیل عدم تعین اسلم ہے تفصیل اس کی کتبِ کلامیہ میں ہے البتہ قرآن مجید کے ظاہر الفاظ سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اس کلام کو بنسبت اس کلام کے جو عطائے نبوت کے وقت ہوا تھا۔ کچھ زیادہ اختصاص متکلم سے ہے چنانچہ یہاں مطلق کلمہ ربہ ہے۔ وہاں نودی من شاطئ الواد الایمن فی البقعۃ المبارکۃ من الشجرۃ آیا ہے اور غالباً زیادہ اختصاص کے سبب یہ کلام مورث اشتیاق رویت ہوا وہ نہیں ہوا۔ واللہ اعلم۔

اس تقریر سے دونوں کلاموں میں فرق واضح ہو کر سوال رویت کی وجہ بھی معلوم ہو گئی کہ زیادت اختصاص تکلم ہے۔ اور آگے فرماتے ہیں۔

"پہاڑ پر تجلی ہونے کے معنی واللہ اعلم یہ سمجھ میں آتے ہیں کہ حق تعالیٰ کا نور خاص بارادۂ خداوندی خلائق سے محجوب ہونے کے جو وسائط ہیں وہ حجب اور موانع ہیں تعیین ان کی اللہ کو معلوم بس غالباً ان حجب میں بعض حجب مرتفع کر دیئے ہوں اور چونکہ وہ حجب مرتفعہ قلیل تھے اس لئے ترمذی کی حدیث مرفوع میں تمثیلاً اس کی علت گو انملہ خنصر سے تشبیہہ دی ہے ورنہ صفات الٰہیہ تجزی و مقدار سے منزّہ ہے۔ اور چونکہ افعال حق تعالیٰ کے اختیاری ہیں اس لئے ممکن کہ وہ حجب جبل کے اعتبار سے مرفوع ہوئے ہوں اور موسیٰ علیہ السلام اور دیگر خلق کے اعتبار سے مرتفع نہ ہوئے ہوں یہ معنی ہو جاویں گے للجبل کے، صفاتِ حق اور افعالِ حق کے درمیان فرق واضح فرما کر صفات الٰہیہ میں تجزی کے سخت اشکال کو حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے بہت ہی مختصر اور جامع لفظوں میں حل فرمادیا ہے۔ کہ عقل حیران ہے۔ اب تجلی للجبل کے معنی بھی واضح ہو گئے اور صفاتِ الٰہیہ کی تجزی کا اشکال بھی رفع ہو گیا۔" آگے فرماتے ہیں۔

"اور چونکہ ارتفاع حجب کا خاصہ احراق ہے جیسا کہ حدیث میں ہے

لو حرقت سبحات النور ما انتھی الیہ بصرہ۔ اس لئے پہاڑ کی یہ حالت ہوئی اور یہ ضرور نہیں کہ سارے پہاڑ کی یہ حالت ہو جائے کیونکہ تجلی فرمانا باختیار خود کسی خاص قطعہ پر ممکن ہے اور موسیٰ علیہ السلام کی بے ہوشی اُن پر تجلی فرمانے سے نہ تھی چونکہ ظاہر اللجبل کے خلاف ہے بلکہ پہاڑ کی یہ حالت دیکھ کر نیز محل تجلی کے ساتھ ایک گونا تعلق و تلبس ہونے سے یہ بے ہوشی ہوئی۔"

سبحان اللہ کیا عجیب علمی تحقیق ہے ورنہ تو نظر اس تجلی کا حضرت موسیٰ پر ہونا بھی ثابت ہوتا ہے لیکن حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی نگاہِ بصیرت نے اس کو للجبل کی قید سے خارج سمجھا اور یہ اشکال بھی اس سے مرتفع ہو گیا کہ جس طرح

جبل پر تجلی ہوئی ایسے ہی ایک گونا حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی تجلی کے مورد ہوئے اور کسی نہ کسی درجے میں گو ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ کیوں نہ ہو رویت ہو گئی اور یہ لن ترانی کے خلاف ہے۔ حضرت رحمہ اللہ کی اس تقریر بلیغ سے سمجھ میں آگیا کہ تجلی صرف پہاڑ پر تھی اور یہ تجلی فرمانا چونکہ فعل حق تھا اور افعالِ حق اختیاری ہیں اسی لئے پہاڑ کے علاوہ دوسری کسی مخلوق سے یہ حجابات مرتفع نہیں کئے گئے۔

آگے استقرارِ جبل کی تقریر رویت کے وقوع اور عدم استقرار کی تقریر پر رویت کے عدم وقوع میں باہم علاقہ کی تحقیق فرماتے ہیں۔ "وظاہراً فان استقر مکانہ فسوف ترانی سے استقرار کی تقدیر پر رویت کا وقوع اور عدم استقرار کی تقدیر پر رویت کا عدم وقوع مفہوم ہوتا ہے اس میں قابلِ تحقیق یہ امر ہے کہ ان میں باہم علاقہ کیا ہے سو عدم استقرار اور عدم وقوع رویت میں تو علاقہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ حاسہ بصریہ موسویہ ترکیب عنصری میں جبل سے اضعف والطف ہے جب اقوی واشد متحمل نہ ہوا تو اضعف کیسے متحمل ہو گا اور اس تقریر پر گو استقرار مستلزم تحمل بصر موسوی عقلاً نہ ہو گا لیکن اس کو وعدے پر محمول کرنے سے اشکال رفع ہو جائے گا یعنی باوجود دونوں کی عدم تساوی ہم تبرعاً وعدہ کرتے ہیں کہ اگر یہ متحمل ہو گیا تو تمہارے حاسہ بصریہ کو بھی متحمل کر دیا جائے گا۔"

واقعۃً یہ اشکال بڑا وزنی معلوم ہوتا ہے کہ استقرارِ جبل سے رویت کا تحمل کیسے لازم ہو گا اور ان دونوں میں عقلاً کیا ملازمہ ہے کہ استقرارِ جبل سے رویت کا تحمل بھی ثابت ہو سکے۔ جب یہ ملازمہ ثابت نہ ہو گا تو اشکال رویت پر رہے گا لیکن حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے استقرارِ جبل اور رویت موسوی میں بنا بر وعدہ عطائے تحمل کے مساوات اور ملازمہ ثابت کر کے اس اشکال کی

اساس کو ہی منہدم کر دیا۔

نیز فرماتے ہیں "وقوعِ تجلی سے وقوعِ رویت کا شبہ نہ کیا جاوے کیونکہ دونوں مترادف یا متلازم نہیں ہیں بلکہ تجلی کا معنی کسی شے کا ظہور ہے گو دوسرے کو اس کا ادراک نہ ہو پس تجلی کا انفکاک رویت سے ممکن ہے جیسے آفتاب کو متجلی و طالع کہہ سکتے ہیں لیکن خفاش کو رائی اور مدرک کہنا لازم نہیں آتا چونکہ ممکن ہے کہ مبادی تجلی کے سبب چشمِ خفاش معطل ہو جاتی ہو تجلی کے قبل بہ قبلیتِ زمانیہ یا تجلی کے ساتھ بمعیتِ زمانیہ وقبلیتِ ذاتیہ" (بیان القرآن ص ۴۱ ج ۴) وقوع تجلی سے وقوع رویت کے شبہ کو کس طرح واضح مثال کے ساتھ دور فرمایا گیا ہے کہ باید و شاید، واقعی سخت سے سخت تر شبہ کا حل کر کے پھر اس کو ذہن نشین کر دینا حضرت ؒ ہی کی خصوصیات میں سے ہے۔

اس بحث کے متعلق آیت لاتدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار (پ) کے تحت حضرت ؒ فرماتے ہیں۔ "حاصل مقام کا یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے سوا کوئی مبصر و مرئی خواہ کیسا ہی اکبر و اعظم ہو ایسا نہیں کہ اُس کا احاطہ کسی رائی کی بصر سے خواہ وہ کیسا ہی اصغر و احقر ہو محال ہو چنانچہ اس کا امکان باقتضائے عقل ظاہر ہے بخلاف حق تعالیٰ کے باوجودیکہ دنیا میں عقلاً مبصر ہونا فی حد ذاتہٖ ممکن ہے جیسا کہ رب ارنی کی درخواست سے ظاہر ہے گو شرعاً ممتنع ہے جیسا کہ لن ترانی سے یقینی ہے۔ نیز احادیث میں علی الاطلاق اس کی تصریح ہے اور آخرت میں مبصر ہونا واقع ہے لیکن احاطہ ہر حالت میں محال ہے، اور یہ امر خواص باری تعالیٰ سے ہے پس یہ شبہ دفع ہو گیا کہ بعض اجسام عظیمہ پر بھی یہ امر صادق آتا ہے کہ لاتدرکہ الابصار وجہ دفع ظاہر ہے کہ وہاں ادراک بمعنی الاحاطہ محال تو نہیں پس نفی ادراک مذکور فی الآیت

مرتبہ استحالہ میں خواص واجب سے ہوا اور احاطہ عقلیہ کا محال ہونا مستقلاً بھی کتب کلامیہ میں مذکور ہے اور لاتدرکہ الابصار بھی بالاولیٰ اس پر دال ہے۔ اس کی تقریر اثنائے ترجمہ میں کردی گئی اور یدارک الابصار میں تخصیص ابصار کی باقتضائے خصوصیت مقام ہے کہ مقام بیان ابصار کا ہے خصوصیت حکم کی مقصود نہیں۔ کیونکہ عموم دوسرے دلائل سے ثابت ہے اور اس کا مضمون خواص واجب سے اس طور پر ہے کہ ممکنات میں کوئی چیز ایسی نہیں کہ دوسری چیز کا اسکو محیط ہونا محال ہو اور اس کا احاطہ اس دوسری چیز کو واجب ہو پس لاتدرکہ الابصار میں نفی مرتبہ استحالہ میں معتبر ہوگی اور یدارک الابصار میں اثبات مرتبہ وجوب میں معتبر ہوگا۔ اب دونوں حکموں کا خواص باری میں سے ہونا ظاہر و متیقن ہوگیا (بیان القرآن صہ ۱۱ ج ۳)

اس آیت مبارکہ کی تفہیم میں مسائل کلامیہ اور قواعد میزانیہ کے علم کی سخت ضرورت ہے، ورنہ اس کی صحیح تفسیر و تفہیم ممکن نہیں لاتدرکہ الابصار کے ظاہر سے یہ عقلی شبہ ہوتا ہے کہ بعض اجسام عظیمہ کا بھی ادراک ابصار سے نہیں ہوتا تو پھر اس میں باری تعالیٰ کی کیا خصوصیت ہوئی؟ مگر حضرتؒ کی تقریر بالا سے یہ شبہ دور ہو کر اللہ تعالیٰ کے ساتھ خصوصیت واضح ہوگئی کہ ایک تو کسی ممکن چیز کا منفی ہونا اور اس کے وقوع کی نفی کرنا ہے اور ایک اس کا محال ہونا ہے، اس آیت میں ابصار سے احاطہ کے وقوع کی صرف نفی مقصود نہیں بلکہ ادراک کا محال ہونا ثابت کرنا مقصود ہے۔ اور یہ باری تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے کہ اس کا ادراک ابصار سے محال ہے بعض اجسام عظیمہ کا احاطہ اور ادراک ابصار سے اگرچہ منفی اور غیر واقع ہو مگر غیر ممکن اور محال نہیں ہے۔ حاصل یہ کہ ادراک کی نفی مرتبہ استحالہ میں معتبر ہے جیسا کہ ھو یدارک الابصار میں

اثبات ادراک مرتبہ وجوب میں معتبر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ باری تعالےٰ کے خواص میں سے ہے کہ ابصار سے اس کا ادراک محال ہے اور ابصار کا ادراک باری تعالیٰ کے لئے مرتبہ وجوب میں ثابت ہے۔ اور وھو یدرک الابصار میں جو بظاہر یہ شبہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ابصار کے علاوہ اور سب چیزوں کا بھی احاطہ کئے ہوئے ہے پھر صرف ابصار کے ادراک واحاطے کا اس جگہ خصوصیت سے کیوں ذکر فرمایا گیا۔ تو اس تخصیص ذکری کی وجہ مقام کی خصوصیت ہے کہ مقام بیان ابصار کا ہے خصوصیت حکم کی مقصود نہیں کیونکہ عموم اور اللہ تعالیٰ کا ہر چیز کو محیط ہونا دوسرے دلائل سے ثابت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس مقام پر ابصار سے احاطہ کی نفی کا ذکر تھا تو باری تعالیٰ کے لئے اسی کے احاطہ اور ادراک کا اثبات فرمادیا گیا۔

لا تدرکہ الابصار کا ترجمہ "اس کو کسی کی نگاہ محیط نہیں ہو سکتی" فرمایا گیا ہے اس کے بارے میں حضرتؒ ارشاد فرماتے ہیں "اور ادراک کا جو ترجمہ کیا گیا اس سے معتزلہ کا استدلال دربارہ انکار رویت الٰہیہ کے اہل جنت کے واسطے ساقط ہو گیا اور ادراک کے یہ معنی ابن عباسؓ سے منقول ہیں۔ چنانچہ در منثور میں ہے۔

اخرج ابن جریر عن ابن عباسؓ لا تدرکہ الابصار ولا یحیط بصر احد باللہ تعالیٰ آھ اور روح میں ہے۔ والیہ ذھب الکثیر من ائمۃ اللغۃ وغیرھم پس مطلق رویت ثابت اور احاطہ منفی۔ اور حدیثوں میں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس سوال کے جواب میں ھل رأیت ربک دو جواب آئے ہیں ایک "نور انی اراہ" دوسرا "رأیت نورا" پہلے جواب میں احاطہ مراد ہے دوسرے میں مطلق رویت (بیان القرآن ص۱۱ ج۳)

رویت اور عدم رویت کی حدیثوں میں تطبیق کی یہ کیسی عجیب و غریب صورت تجویز فرمائی گئی ہے جس میں نقلی اور عقلی ہر ہر پہلو کی رعایت کے ساتھ مذہب اہلسنت والجماعت کی موافقت بھی حاصل ہے۔ آگے ایک اور شبہ کا جواب ارقام فرماتے ہیں جو بظاہر اس تقریر پر ہوتا ہے کہ باری تعالیٰ کی رویت دنیا میں شرعاً ممتنع ہے فرماتے ہیں۔

"اور جاننا چاہیئے کہ لیلۃ المعراج میں آپؐ کا اللہ تعالیٰ کو دیکھنا جیسا کہ جلالین سے بتخریج مستدرک حاکم بروایت حضرت ابن عباسؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد منقول ہے رأیت ربی عزوجل الحدیث وہ اس حکم امتناعی شرعی فی الدنیا سے مخصوص ہے اور شیخ اکبر رحمۃ اللہ سموٰت و ما فوقہا کو دنیا سے خارج فرماتے ہیں اور آخرت میں داخل کرتے ہیں اس بناء پر کہ آخرت کا ایک زمانہ ہے جو قیامت میں آوے گا اور ایک مکان ہے جو اوپر مذکور ہوا پس یہ رویت آخرت میں ہوئی تھی فلا حاجۃ الی القول بالتخصیص (بیان القرآن ص ۱۱۸ ج ۳)۔

شروع میں گزر چکا ہے کہ تفسیر قرآن کے لئے بہت سے علوم کی ضرورت ہے جیسا کہ تفصیل مذکور سے ناظرین پر واضح ہو چکا بغیر علوم عربیہ اور قواعد ضروریہ کے قرآن کریم کی آیات کا صحیح مفہوم و مطلب نہیں سمجھا جا سکتا بلکہ تعارض اور اشکالات کا دروازہ کھل جاتا ہے اور انسان شبہات میں گھر جاتا ہے اس کی ایک مثال اور پیش ہے۔ ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے قد افلح من زکھا (جس نے اپنے نفس کو پاک کیا وہ کامیاب ہو گیا) فرمایا ہے جس سے تزکیہ کا مدار فلاح اور مامور بہ ہونا ثابت ہوتا ہے اور دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے۔ فلا تزکوا انفسکم (تم اپنے کو مقدس مت سمجھا کرو) اس

کا ترجمہ ناواقف یوں کرے گا کہ اپنے نفسوں کا تزکیہ نہ کرو کیونکہ لا تزکوا نہی کا صیغہ ہے مشتق تزکیہ سے تو اب اس کو اشکال واقع ہوگا کہ ایک جگہ تو تزکیہ کا امر ہے اور ایک جگہ اس سے نہی ہے؟ جواب اس کا یہ ہے کہ اگر اس آیت میں لا تزکوا انفسکم کو اس کے مابعد سے ملا کر غور کیا جائے تو شبہ حل ہو جائے گا۔ قرآن کریم میں اکثر شبہات ماسبق او مابعد کو نہ ملانے سے پیدا ہوتے ہیں اگر شبہ وارد ہونے کے وقت آیت کے ماسبق او مابعد میں غور کر لیا جائے تو خود قرآن ہی سے شبہ رفع ہو جایا کرے تو اس جگہ شبہے کا جواب موجود ہوگا۔ چنانچہ لا تزکوا انفسکم پر جو قد افلح من زکیھا سے تعارض کا شبہ ہوا تھا اس کا جواب اسی جملے کے ساتھ ساتھ دوسرے جملے میں مذکور ہے یعنی ھو اعلم بمن اتقٰی کیونکہ اس میں نہی مذکور کی علت کا ذکر ہے اور ترجمہ یہ ہے کہ تم اپنے نفسوں کا تزکیہ نہ کرو کیونکہ حق تعالیٰ خوب جانتے ہیں کہ کون متقی ہیں اس میں حق تعالیٰ نے دو باتیں بیان فرمائی ہیں ایک اپنا زیادہ علیم ہونا دوسرے من اتقٰی کے ساتھ اپنے علم کا متعلق ہونا اور نصوص شرعیہ میں غور کرنے سے یہ بات ظاہر ہے کہ تقویٰ باطنی عمل ہے۔ نیز تقویٰ کے معنی لغتہً ڈرنے اور پرہیز کرنے کے ہیں یعنی معاصی سے بچنا اور ڈرنا تو ظاہر ہے کہ باطن کے متعلق ہے اور معاصی سے ڈرنا خود اصلاح باطنی ہے۔ لہٰذا تقویٰ اور تزکی دونوں مرادف ہوئے آیت کا حاصل یہ ہوا ھو اعلم بمن تزکّٰی ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔ اب یہ سمجھو کہ اس میں تزکی کو عبد کی طرف منسوب کیا گیا ہے جس سے اس کا داخل اختیار ہونا مفہوم ہوتا ہے تو وہ مقدور ہوا پھر یہ کہ اَعْلَمُ فرمایا ہے افلاذ نہیں فرمایا اس سے بھی اشارۃً معلوم ہوا کہ بندہ کی قدرت کی نفی نہیں ہے پس اس سے بھی تقویٰ اور تزکی کا مقدور عبد ہونا مفہوم

ہوا اور نہ اعلم نہ فرماتے بلکہ اقدر علی جعلکم متقین یا اس کے مناسب اور کچھ فرماتے جب تقویٰ اور تزکی ایک ٹھہرے اور مقدور عبد ٹھہرنے اب غور کرنا چاہیئے کہ ھو اعلم بمن اتقی لا تزکوا انفسکم کی علت بن سکتی ہے یا نہیں اگر لا تزکوا کے معنی یہ لئے جائیں کہ نفس کا تزکیہ نہ کیا کرو یعنی نفس کو رذائل سے پاک کرنے کی کوشش نہ کرو تو ھو اعلم بمن اتقی اس کی علت نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ ترجمہ یہ ہوگا کہ اپنے نفسوں کو رذائل سے پاک نہ کرو اس لئے کہ اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں کہ کس نے تزکی اور تقویٰ کیا ہے اور یہ ایک بے جوڑ سی بات ہے۔ یہ تو ایسا ہوا جیسے یوں کہا جائے کہ "نماز نہ پڑھو کیونکہ اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں کس نے نماز پڑھی ہے ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کا بندے کے کسی فعل کو جاننا اس کے ترک کی علت نہیں ہوسکتی ورنہ پھر سب افعال کو ترک کردینا چاہیئے کیونکہ حق تعالیٰ بندہ کے سب افعال کو جانتے ہیں بلکہ اس کے مناسب یہ علت ہوسکتی تھی کہ ھو اقدر علی جعلکم متقین یعنی یوں فرماتا کہ تم نفس کو رذائل سے پاک نہ کرو کیونکہ تم کو متقی بنانے پر حق تعالیٰ زیادہ قادر ہیں تم پورے قادر نہیں پھر کیوں کوشش کرتے ہو۔ جب یوں نہیں فرمایا بلکہ اعلم بمن اتقی فرمایا ہے تو معلوم ہوا کہ یہاں تزکیہ کے وہ معنی نہیں بلکہ کچھ اور معنی ہیں جس کے ترک کی علت ھو اعلم بن سکے سو وہ معنی یہ ہیں کہ اپنے نفسوں کو پاک نہ کہو یعنی پاکی کا دعویٰ نہ کرو کیونکہ حق تعالیٰ ہی کو معلوم ہے کہ کون متقی ہیں اور کون پاک ہوا ہے یہ بات تم کو معلوم نہیں اس لئے دعوی بلا تحقیق مت کرو اب کلام میں پورا جوڑ ہے اور علت معلول میں کامل ارتباط ہے (وعظ زکوٰۃ النفس)

لا تزکوا انفسکم پر جو قد افلح من زکھا سے تعارض کا شبہ

ہو رہا تھا تقریر مذکور سے وہ رفع ہوگیا اور آیت کے اگلے حصے ھو اعلم بمن اتقیٰ میں غور کرنے کے بعد یہ شبہ جاتا رہا حسب تقریر سابق علت و معلول میں ارتباط اور کلام میں اتصال سے یہ ثابت ہوگیا کہ تزکیہ کے دو معنی ہیں پاک کرنا، اور پاک کہنا، ایک آیت میں ایک معنی مراد ہیں اور دوسری میں دوسرے معنی۔ اگر دونوں آیتوں میں ایک ہی معنی مراد لیے جائیں تو تعارض پیدا ہوتا ہے اب تزکیہ کے دو معنی ہونے کی علت اور اس کی حقیقت حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی زبان فیض ترجمان سے سنئے۔ فرماتے ہیں۔

"اور حقیقت اس کی یہ ہے کہ تزکیہ باب تفعیل کا مصدر ہے اور تفعیل کی خاصیتیں مختلف ہیں جس طرح اس کی ایک خاصیت تعدیہ ہے اسی طرح ایک خاصیت نسبت بھی ہے۔ پس قد افلح من زکھا میں تزکیہ کا استعمال خاصیت تعدیہ کے ساتھ ہوا اس کے معنی یہ ہیں کہ جس نے نفس کو رذائل سے پاک کیا وہ کامیاب ہوگیا اس میں نفس کو رذائل سے پاک کرنے کا امر ہے اور لا تزکوا انفسکم میں تزکیہ کا استعمال خاصیت نسبت کے ساتھ ہوا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اپنے نفسوں کو پاک نہ کہو۔ اس میں نفس کو پاک کہنے کی ممانعت ہے۔ اب ان دونوں میں کچھ بھی تعارض نہیں، کیونکہ جس چیز کا ایک جگہ امر ہے دوسری جگہ اس کی ممانعت نہیں۔ بلکہ ایک نئی چیز کی ممانعت ہے حکم تو نفس کے پاک کرنے کا ہے۔ اور ممانعت پاک کہنے سے ہے (زکوٰۃ النفس) مگر اس حقیقت کو وہی سمجھے گا جو عربیت اور ابواب کی خاصیات سے واقف ہوگا اس لئے فہم قرآن کے لئے لغت اور صرف و نحو وغیرہ جاننے کی سخت ضرورت ہے۔ ایسے علوم کے حاصل کئے بغیر قرآن کا صحیح ترجمہ نہیں سمجھا جا سکتا، جو شخص خاصیت ابواب کو نہ جانتا ہوگا وہ دونوں آیتوں میں ایک ہی

معنی سمجھے گا اور شبہات میں پڑے گا۔ اور جو شخص جانتا ہوگا وہ سمجھ لے گا کہ بابِ تفعیل کی خاصیت جس طرح تعدیہ ہے اس کی ایک خاصیت نسبت بھی ہے۔ اور پاک نہ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنے کو تزکیہ کی طرف منسوب نہ کرو یعنی یہ دعویٰ نہ کرو کہ ہم پاک ہو گئے یعنی گفتن کے دو معنی ہیں ایک تو مطلق کہنا کہ بقصد قبول حق کے دوسرا کمال کا دعویٰ کرنا پس لا تزکوا میں تزکیہ بمعنی پاک گفتن سے مراد دعویٰ پاکی کردن ہے (زکوٰۃ النفس)

علمِ باریؒ کی وسعت

ولقد خلقنا الانسان ونعلم ما توسوس به نفسه ونحن اقرب اليه من حبل الوريد کی تفسیر میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ ارقام فرماتے ہیں۔

"یہ گردن کی رگیں ورید اور شریان دونوں کو محتمل ہیں مگر شریان مراد لینا زیادہ مناسب ہے کیونکہ ان میں روح غالب اور خون مغلوب رہتا ہے اور ورید میں بالعکس یہاں جس کو روح میں زیادہ دخل ہوا اس کا مراد لینا مناسب ہے۔ اور سورۂ حاقہ ہیں وتین بمعنی رگ دل سے تعبیر کرتا اس کا مؤید ہے کیونکہ جو رگیں قلب سے ثابت ہیں شرائین ہیں اور گو قرآن میں لفظ ورید ہے مگر معنی لغوی اس کے عام ہیں پس مطلب یہ ہوا کہ ہم باعتبار علم کے اس کی روح اور نفس سے بھی نزدیک تر ہیں یعنی جیسا علم انسان کو اپنے احوال کا ہے ہم کو اس کا علم خود اس سے بھی زیادہ ہے۔ چنانچہ علم حصولی میں انسان کو اپنی بہت سی حالتوں کا علم نہیں ہوتا اور جن کا علم ہوتا ہے بعض اوقات ان کا نسیان یا ان سے ذہول ہو جاتا ہے اور حق تعالیٰ میں یہ احتمالات گنجائش ہی نہیں رکھتے اور علم حضوری میں گو حضور معلوم کا لازم ہے مگر بوجہ حادث ہونے کے خود وہ وجود معلوم سے متاخر ہے ما اور حق تعالیٰ کا علم جو اس سے متعلق ہے جو اس کے وجود سے

متقدم ہے اور ظاہر ہے کہ جو علم ہر حالت میں ہو اس کا تعلق بہ نسبت اس کے
کہ ایک حالت میں ہو زیادہ ہوگا غرض علم باری کا جمیع احوال انسانیہ کے ساتھ
متعلق ہونا بھی ثابت ہو گیا (بیان القرآن صـ۵۳ ج ۱۱)

اور سورۂ الحاقہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں

"اور سورۂ ق میں جان کو رگ گردن سے تعبیر فرمایا اور یہاں رگِ دل
سے جس سے ظاہر مراد شرائین ہیں جن کا منبت قلب ہے بات یہ ہے کہ
اسی رگِ قلب کی شاخیں گردن تک بھی پہنچی ہیں پس دونوں تعبیروں کا حاصل
ایک ہی ہے" اور اگر وہ مراد ہوں جن کا منبت کبد ہے اور وہ دل میں ہو کر
بدن میں پھیل گئی ہیں اور اسی لئے اس کو رگِ دل کہہ دیا ہو تو اس کی شاخ بھی
گردن میں گئی ہے (بیان القرآن صـ۳۸ ج ۱۲)

لغوی تحقیق کے ساتھ دونوں آیتوں میں مطابقت کیسے اچھے اور عمدہ طریقے
سے فرمادی گئی ہے علم لغت میں مناسبت اور مہارت کے بغیر ایسی عجیب تحقیق
اور حسین تطبیق کا سمجھنا اور لکھنا ممکن نہیں ہے۔

قربِ حق کی تحقیق

اسی آیت کے سلسلے میں مزید تشریح سنئے حضرت
فرماتے ہیں۔

"حق تعالیٰ کو بندہ سے جتنی محبت ہے اتنی بندہ کو حق تعالیٰ سے نہیں
ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ محبت موقوف ہے معرفت پر اور ظاہر ہے کہ
جیسی معرفت بندہ کی خدا کو ہے بندہ کو خدا کی نہیں اور یہی معنی ہے آیت
ونحن اقرب الیہ من حبل الورید کے کہ علماً و معرفۃً بندہ سے ہم قریب
ہیں۔ ونعلم ما توسوس بہ نفسہ اسی وجہ سے نحن اقرب فرمایا ہے کہ
ہم قریب ہیں۔ انتم اقرب الینا نہیں فرمایا کہ تم بھی ہم سے قریب ہو۔ سو

اگر اس سے قربِ حقیقی مراد ہوتا تو دونوں طرف سے قرب ہوتا چونکہ یہ قرب نسبِ متکررہ سے ہے اگر ایک طرف سے قرب ہوگا تو دوسری سے بھی ضرور ہوگا۔ رہا قربِ علمی سو اس میں یہ ضرور نہیں کہ اگر ایک طرف سے قرب ہو تو دوسری طرف سے بھی ہو تو قربِ علمی خدا کی طرف سے تو ہے اس لئے اُن کا علم کامل ہے اور بندہ کی طرف سے نہیں چونکہ بندہ ہے غافل۔ پس بندہ تو خدا سے دور ہوا اور اللہ تعالیٰ بندہ سے قریب (الصلوٰۃ ص۱۴)

چونکہ "قربِ حق کا یہ مسئلہ نہایت دقیق اور عمیق تھا اور اس کی کُنہ اور حقیقت و کیفیت تک رسائی ناممکن تھی اس لئے قربِ علمی مراد لے کر تفسیر کی جاتی ہے اور اسی سے یہ اشکال بھی حل ہوجاتا ہے کہ قرب تو نسبت متکررہ سے ہے جس میں دونوں طرف سے قرب کا تحقق ہونا چاہیئے یہاں ایسا نہیں اس کا حل حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر مذکور سے اچھی طرح واضح ہوگیا کہ قربِ علمی میں یہ بات ضروری نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک طرف سے قرب علمی ہو اور دوسری طرف سے نہ ہو یہ تقریر تو عام فہم اور علمی اصطلاحی تھی جو علمائے کرام میں مشہور اور متعارف ہے۔ آگے ایک نہایت عجیب و غریب تحقیق اور بڑی ہی لطیف تقریر سنیئے ارشاد ہوتا ہے۔

"اب رہا یہ سوال کہ (اقرب الیہ من حبل الوریدا) "رگِ گردن سے زیادہ قریب" کیسے ہیں؟ اس کا حقیقی جواب یہ ہے اس مسئلہ کو کوئی حل نہیں کرسکتا۔ چنانچہ بعض نے تو یہ کہہ دیا ہے کہ یہاں قربِ علمی مُراد ہے مگر من حبل الوریدا کا لفظ بتلا رہا ہے کہ یہاں قربِ علمی سے زیادہ کوئی دوسرا قرب بتلانا مقصود ہے کیونکہ حبل الورید ذی علم نہیں ہے کہ اس سے اقرب ہونا اقربیت فی العلم پر دال ہو کیونکہ یہاں قرب ذات پر دلالت مفہوم ہوتی

ہے۔ مگر اس کیفیت کو ہم بیان نہیں کر سکتے چونکہ حق تعالیٰ کیفیت سے منزہ ہیں ان کا قرب بھی کیفیت سے منزہ ہے مگر تقریب فہم کے لئے اتنا بتلائے دیتا ہوں کہ ہم کو جو اپنی ذات سے قرب ہے یہ قرب وجود کی فرع ہے اگر وجود نہ ہوتا تو نہ ہم ہوتے نہ ہم کو اپنی ذات سے قرب ہوتا۔ اور ظاہر ہے کہ وجود میں حق تعالیٰ واسطہ ہیں اس سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ ہمارے اور اس تعلق کے درمیان میں واسطہ ہیں جو ہم کو اپنی جان کے ساتھ ہے تو ہم کو اوّل حق تعالیٰ سے تعلق ہے پھر اپنی جان کے ساتھ تعلق ہے اس تقریر کے استحضار سے قرب حق کا مشاہدہ گو بہت کچھ ہو جائے گا مگر کیفیت اب بھی واضح نہ ہوگی۔ البتہ عقلاً یہ معلوم ہو جائے گا کہ حق تعالیٰ کو ہمارے ساتھ ہماری جان سے بھی زیادہ قرب و تعلق ہے اور یہی مقصود ہے۔" (وعظ عصم ص۲۰)

اس تقریر انیق کی خصوصیت اور اس کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ قرب سے علمی قرب کے علاوہ غیر معلوم الکیفیت قرب مراد ہے، صفاتِ الٰہیہ کے کلامی مسائل میں دسترس اور ان میں عبور و مہارت حاصل کئے بغیر اس تقریر کی تہہ تک نہیں پہنچا جا سکتا اور اس کی دقت و غموض تک رسائی نہیں حاصل ہو سکتی۔

رحمۃٌ للعالمین کا مطلب

"وما ارسلنٰك الا رحمة للعالمين" اور ہم نے (ایسے مضامین نافعہ دے کر) آپ کو اور کسی بات کے واسطے (رسول بنا کر) نہیں بھیجا مگر دنیا جہان کے لوگوں (یعنی مکلفین) پر (اپنی) مہربانی کرنے کے لئے (وہ مہربانی یہی ہے کہ لوگ رسول سے ان مضامین کو قبول کریں اور ہدایت کے ثمرات حاصل کریں اور جو قبول نہ کرے یہ اس کا قصور ہے اس مضمون کی صحت میں کوئی خلل

نہیں پڑتا) (بیان القرآن ص ۱۲۳)

اس پہ ایک طالب علمانہ اشکال عام طور پہ ہوتا ہے اس کی تقریر اور رفع اشکال ذیل میں پڑھیئے۔ اگرچہ اس تفسیر پر جو اوپر کی گئی ہے کوئی اشکال متوجہ نہیں ہوتا "یہاں ایک طالب علمانہ اشکال ہے۔ وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب رحمۃ للعلمین ہیں تو ابوجہل پر بھی کچھ رحمت ہونا چاہیئے کیونکہ عالمین میں تو وہ بھی داخل ہے یہ تو ہوا اشکال اب اس کا جواب سنئے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں "یہاں رحمت سے مراد رحمت تبلیغ وارسال ہے، نجات وآخرت کے اعتبار سے رحمت مراد نہیں۔ دلیل یہ ہے کہ الا رحمۃ اس جگہ ارسال کی غایت ہے یہ اس کا قرینہ ہے کہ یہاں رحمت سے وہی مراد ہے جو ارسال پر مرتب ہوتی ہے۔ نیز اس سے پہلے ارشاد ہے ان فی ھذا لبلاغا لقوم عابدین۔ یہ بھی اس کا قرینہ ہے کہ یہاں تبلیغ کی برکات کا ذکر ہے پس مطلب یہ ہوا کہ ہم نے جو آپ کو نبی بنا کر بھیجا ہے اس سے اہل عالم پر مہربانی کرنا منظور ہے کہ آپؐ کے ذریعے سے لوگوں کی طرف وحی پہنچائیں اور ظاہر ہے کہ یہ رحمت تمام عالم کو ہے کوئی فرد بشر اس سے محروم نہیں رہا چاہے کوئی ہدایت قبول کرے یا نہ کرے۔ (المورد الفرسخی)

حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے بیان القرآن میں تفسیر ہی ایسے طریقے سے کر دی ہے جس پر کوئی اشکال وارد ہی نہیں ہوتا جس کے جواب کی ضرورت ہو اور عام طور جو اشکال الفاظ کے اطلاق کی وجہ سے ذہنوں میں پیدا ہو سکتا ہے اس کا حل حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی اس واضح تقریر و بیان سے ہو جاتا ہے۔

ملحقات الترجمہ عربی میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی توجیہ بیان کرتے ہوئے جو کچھ ارقام فرمایا ہے اس کا حاصل مطلب اس طرح ہے کہ ترجمے میں

(اور کسی بابت کے واسطے) بڑھا کر اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ رحمت علت اور مفعول لہٗ ہے اور تمام علتوں میں سے ایک علت رحمت مستثنیٰ ہے مطلب یہ ہے کہ آپ کے رسول بنا کر بھیجنے کی سوائے رحمت کے اور کوئی وجہ نہیں اور مہربانی سے پہلے (اپنی) کا لفظ بڑھا کر اشارہ اس طرف ہے کہ رحمت مصدر کا فاعل اللہ ہے (بیان القرآن صفحہ مذکور)

ظاہر ہے اس تقریر کو علم نحو میں مناسبت کے بغیر اچھی طرح ذہن نشین نہیں کیا جا سکتا۔ یہ مسئلہ علم نحو کا ہے کہ مفعول لہٗ کا فاعل وہی ہوتا ہے جو اس کے فعل عامل کا فاعل ہوتا ہے اور وما ارسلنٰك میں ارسال فعل عامل کا فاعل اللہ تعالیٰ ہیں اس لئے مفعول لہٗ کا فاعل بھی اللہ ہے اس نحوی قاعدہ کو حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے مفعول لہٗ کے ترجمے سے پہلے اپنی کا لفظ بڑھا کر ظاہر کر دیا ہے۔

ایک آیت کی تفسیر میں علم معانی کی رعایت

آیت ذیل کی تفسیر میں علم بیان و معانی اور قواعد عربیت کی رعایت جس عجیب انداز سے کی گئی ہے وہ اہل علم کی توجہ کی طالب ہے۔ فرماتے ہیں "والذین اجتنبوا الطاغوت ان یعبدوھا وانابوا الی اللہ لھم البشریٰ۔ جو لوگ شیطان سے بچتے ہیں یعنی اس کی عبادت سے بچتے ہیں اس ترجمے ہی سے معلوم ہو گیا کہ ان یعبدوھا الطاغوت سے بدل ہے اور طاغوت سے مراد شیطان ہے جو ہر شیطان کو شامل ہے۔ وانابوا الی اللہ یہ تقابل بدیع ہے یعنی وہ لوگ شیطان کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہوتے ہیں اور اسی کو مقصود و معبود سمجھتے ہیں۔ اس کے بعد مبتداء کی خبر ہے۔ لھم البشریٰ کہ جن کی یہ شان ہے بشارت سنانے کے مستحق ہیں۔ جیسا کہ مفہوم ہے لام کا اس کے بعد ہے فبشر عباد الذین یستمعون القول کہ اچھا پھر

ان کو بشارت سنا ہی دیجئے۔ سبحان اللہ قرآن بھی کس قدر بلیغ ہے کہ اوّل تو ان کا مستحق بشارت ہونا بیان فرمایا پھر بشارت فرمانے کا حکم دیا کہ انکو بشارت سنا ہی دیجئے اس طرز تشویق کا جس درجے مخاطب پر اثر ہوتا ہے اہلِ ذوق پر مخفی نہیں۔

اب یہ سمجھئے کہ یہاں عباد الذین یستمعون القول سے مراد وہی لوگ ہیں جن کا اوپر ذکر ہوا ہے کہ وہ شیطان سے بچتے ہیں اور اس کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہوتے ہیں کیونکہ عربیت کا قاعدہ ہے اذا اعیدت المعرفۃ معرفۃ کانت الثانیۃ عین الاولیٰ کہ جب معرفہ کو دوبارہ معرفہ ہی بنا کر اعادہ کیا جائے تو ثانی سے مراد وہی ہوگا جو اولیٰ سے مراد ہے مگر اعادۂ معرفہ کی بھی ظاہر صورت یہ تھی کہ یہاں ضمیر لائی جاتی اسم اشارہ یعنی فبشرھم یا فبشر ھؤلاء فرمایا جاتا مگر اللہ تعالیٰ نے ضمیر کو چھوڑ کر وضع الظاہر موضع المضمر اختیار کیا۔ اس میں نکتہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو اس عنوان سے تحصیل کمالات کا طریقہ بتلایا ہے اور یہ بتلایا ہے کہ تحصیل کمالات میں ترتیب ہے حاصل اس ترتیب کا یہ ہے کہ تم کو اوّل استماع القول لازم ہے جس کا حاصل طلبِ علم ہے۔ اس کے بعد اس کا اتباع لازم ہے اس کا حاصل عمل ہے خلاصہ یہ ہوا کہ تحصیل کمال کا طریقہ علم و عمل ہے"۔

(وعظ الاستماع والاتباع)

اس آیت مبارکہ کی کیا ہی عجیب و غریب اور مربوط و مرتبط نفیس تفسیر فرمائی گئی ہے جس سے پوری آیت کا مفہوم بڑا ہی وجد آفرین ہو جاتا ہے اور علم معانی و بیان اور دوسرے قواعد عربیت کی ضرورت کس درجہ واضح ہو جاتی ہے وہ اہل علم کے غور کرنے کی چیز ہے۔ اب رہا یہ کہ القول سے مراد آیت مبارکہ

ہیں کونسا قول ہے۔ اور اس کی کیا دلیل ہے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ اس کے بارہ میں ارشاد فرماتے ہیں۔

"اب سمجھیئے کہ یہاں یستمعون القول قول سے مراد کلام اللہ ہے دو وجہ سے ایک یہ کہ اس میں لام عہد کا ہے اور یہاں معہود کلام اللہ ہی ہے دوسرے قاعدہ عربیت کا ہے المطلق اذا اطلق یراد بہ الفرد الکامل کہ مطلق سے مراد فردِ کامل ہوتا ہے پس یہاں بھی مطلق قول سے مراد قول کامل ہونا چاہیئے اور قولِ کامل قرآن ہی ہے۔ یہ تو عقلی دلیل تھی القول سے قرآن کی مراد ہونے کی اور اس آیت کے چند آیات بعد ہی نقلی دلیل بھی مذکور ہے کیونکہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اللہ نزل احسن الحدیث کتابا متشابہا مثانی۔ اس میں قرآن کو احسن الحدیث کہا گیا ہے اور یہاں احسنہ فرمایا جس کا مرجع قول ہے تو حاصل احسن القول ہوا اور احسن الحدیث و احسن القول کے ایک ہی معنی ہیں اور اس سے یعنی قرآن کو احسن الحدیث کہنے سے یہ معلوم ہو گیا کہ فیتبعون احسنہ میں احسن کی اضافت تغائر کے لئے نہیں ہے بلکہ بیانیہ ہے۔ یہاں تک یہ بات ثابت ہو گئی کہ طریقہ تحصیل کمال کا یہ ہے کہ اوّل علمِ قرآن حاصل کیا جائے پھر اس پر عمل کیا جائے اور علم قرآن کو استماع سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جس سے شبہ نہ کیا جائے کہ صرف الفاظ کا سننا مراد ہے معنی کا جاننا مطلوب نہیں کیونکہ آگے فیتبعون احسنہ بھی ہے اور اتباع الفاظ مجردہ کا نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اتباع بعد علم معانی کے احکام کا ہو گا۔ اس قرینہ سے معلوم ہوا کہ مراد تو علم معانی ہیں مگر اس کو استماع سے اس لئے تعبیر کیا گیا کہ معانی کا سمجھنا اس پر موقوف ہے کہ اوّل الفاظ کو غور سے سنا جائے جو شخص تحصیلِ علم کے وقت معلم کی تقریر کو توجہ سے نہیں سنتا وہ مراد

بھی نہیں سمجھ سکتا۔" (الاستماع ص۲۲)

مسائل سائنس

مسائل سائنس کے بارہ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق درج ذیل کی جاتی ہے جس سے معلوم ہوگا کہ یہ مسائل قرآن کریم کے موضوع لہ نہیں ہیں اس لئے ان مسائل پر تفسیر قرآن کی بنیاد رکھنا درست نہیں۔ ویسے بھی یہ مسائل یقینی نہیں ہیں محض ظن وتخمین کے درجہ کی چیزیں ہیں جو آئے دن تجربات کے بدلنے سے بدلتی رہتی ہیں اس وجہ سے بھی قرآن کریم کی تفسیر مسائل سائنس پر مبنی نہیں کرنی چاہیئے۔
حضرت رحمۃ اللہ علیہ ارشاد فرماتے ہیں۔

"آج کل لوگوں نے قرآن کے ما وُضِعَ لہٗ کو بالکل نہیں سمجھا قرآن میں وہ چیزیں تلاش کی جاتی ہیں جو کہ قرآن کا موضوع نہیں ہے پھر جب کوئی فلسفہ کی نئی تحقیق ظاہر ہوتی ہے تو اس کو زبردستی قرآن مجید میں ٹھونس کر بڑے فخر سے بیان کیا جاتا ہے قرآن نے تیرہ سو برس پہلے ہی اس کی خبر دی ہے اور اس سے قرآن کی بلاغت ثابت کی جاتی ہے۔ قرآن کریم ایک قانون کی کتاب ہے سائنس وغیرہ کا ذکر اگر اس میں آئے گا تو مقصود کے تابع ہو کر آئے گا۔ چنانچہ سائنس کے متعلق جو گفتگو ہوگی محض اس قدر کہ یہ سب مصنوعات ہیں اور ہر مصنوع کے لئے ایک صانع کی ضرورت ہے لہٰذا ان کے لئے بھی کسی صانع کی ضرورت ہے مگر اس استدلال کے لئے اس کی ضرورت نہیں ہے کہ اس چیز کی حقیقت بھی دریافت ہو جائے بلکہ مجملاً ان کا علم ہونا کافی ہے۔"

"قرآن کریم نے توحید کا دعویٰ کیا اس کی دلیل میں ان فی خلق السموٰت والارض الآیہ فرمایا جس سے مطلب یہ ہے کہ ان کائنات میں بھی توحید کے

دلائل ہیں تو اِن کائنات میں چند حیثیتیں ہیں اوّل ان کا دلیل توحید ہونا دوسرے اُن کے پیدا ہونے کے طریق اور تیسرے اُن کے تغیرات کے ڈھنگ قرآن کریم کو صرف پہلی حیثیت سے ان سے تعلق ہے اس کے بعد اگر کوئی یہ سوال کرنے لگے کہ بادل کس طرح پیدا ہوتے ہیں اور بارش کیونکر ہوتی اور اس قسم کے حالات تو قرآن سے اُن کا تلاش کرنا غلطی ہے" (ضرورت العلم)

کائنات سے وجود صانع پر بیان القرآن میں اس طرح عقلی استدلال فرمایا گیا ہے۔

"اس استدلالِ عقلی کا مختصر طریق یہ ہے کہ یہ اشیاء مذکورہ سب ممکن الوجود ہیں بعض تو بداہتۃً بہ سبب مشاہدہ وجود بعد العدم یا تغیر و تبدل احوال کے اور بعض بدلیل ترکیب من الاجزا یا افتقار بعض الی البعض کے اور ممکن بوجہ متساوی الوجود والعدم ہونے کے محتاج ہوتا ہے کسی مرجح کا وہ مرجح اگر ممکن ہے تو اس میں پھر یہی کلام ہوگا تو قطع تسلسل محال کے لئے انتہاً واجب ہے کسی واجب الوجود کی طرف یہ تو دلیل ہے وجود صانع کی"

تقریر توحیدِ صانع آگے رہا اس کا واحد ہونا سو اس کی تقریر یہ ہے کہ اگر نعوذ باللہ متعدد مثلاً دو فرض کئے جاویں تو ان میں سے کسی کا عاجز ہونا ممکن ہے یا دونوں کا قادر ہونا ضرور ہے، شق اوّل محال ہے کیونکہ عجز منافی ہے وجوبِ وجود کے اور شق ثانی پر اگر ان میں سے ایک نے کسی امر کا مثلاً ایجادِ زید کا ارادہ کیا تو دوسرا اس کے خلاف ارادہ کر سکتا ہے یا نہیں اگر نہیں کر سکتا تو اس کا عجز لازم آوے گا جو منافی وجوب وجود کے ہے، اور اگر ارادہ کر سکتا ہے تو اس پر ترتیب مراد کا ضروری ہے یا نہیں اگر ضروری نہیں تو تخلف مراد کا ارادہ قادر مطلق سے لازم آوے گا جو

کہ محال ہے، اور اگر ضروری ہے تو دو مختلف مرادوں کا اجتماع لازم آوے گا کیونکہ ایک واجب کے ارادے پر ایک مراد مرتب ہوا دوسرے واجب کے ارادے پر دوسرا، اس مرادِ اوّل کی ضد مرتب ہوا تو اجتماعِ ضدین لازم آیا۔ اور وہ محال اور مستلزم محال کو محال ہے تو تعدد واجب کا محال ہے، پس وحدت واجب ہے اور یہی مطلوب تھا خوب سمجھ لو" (بیان القرآن صنہ ۹۲/ج ۱)

حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں "اگر دلائلِ توحید میں سائنس کے مسائل مذکور ہوتے تو توحید کو سمجھنا ان کے علم پر موقوف ہوتا اور مسائل سائنس خود نظری ہیں تو توحید بدون اُن کے سمجھے ہوئے ثابت نہ ہوتی اور مخاطب اُن دلائل کے عرب کے بادیہ نشین تک ہیں تو وہ توحید کو کیسے جانتے یہ نقصان ہوتا سائنس کے مسائل کو قرآن میں داخل کرنے کا کہ اصل مقصود ختم ہو جاتا۔"

ایک مثال "یہی وجہ ہے کہ قرآن میں جگہ جگہ سموٰات اور ارض (مذکور) ہیں لیکن سمٰوات بصیغہ جمع اور ارض بصیغہ واحد لایا گیا تاکہ مقدمات میں شغب نہ ہونے لگے پھر مستقل دلیل سے بتلا دیا کہ زمین بھی سات ہیں چنانچہ بعض کو اس پر بھی اعتراض ہے کہ ہم تو سب جگہ پھرے ہم کو تو کوئی دوسری زمین نہیں ملی اور ارض کا ترجمہ حدیث تعدد ارض میں اقلیم کا کیا ہے۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب قرآن شریف میں بعد سبع سمٰوات کے من الارض مثلھن فرمایا ہے تو اقلیم ترجمہ کرنے کی گنجائش کہاں ہے اور حدیث میں صاف آگیا ہے کہ آسمان سات ہیں اور ہر دو آسمانوں کے درمیان پانچ سو برس کی راہ ہے پانچ سو برس سے مراد کثرت ہے اس کے بعد زمین کے متعلق بھی فرمایا اب اقلیم کی تاویل کیسے چل سکتی ہے۔"

باوجودیکہ یہ ثابت تھی مگر پھر بھی قرآن نے ارضین نہیں فرمایا بلکہ ارض

بصیغۂ واحد ارشاد فرمایا وجہ اس کی یہ ہے کہ مقصود صرف یہ ہے کہ ان مصنوعات سے توحید پر استدلال کیا جائے اور استدلال مقدمات مسلمہ سے ہوا کرتا ہے تو اگر ارضین فرماتے تو اصل مقصود تو ثابت نہ ہو سکتا اور مسئلہ گفتگو کے قابل ہو جاتا۔ اور اب یہ ہوا کہ جو واقف ہیں وہ لفظ ارض ہی سے جو کہ اسم جنس ہے قلیل کثیر سب کو شامل سمجھ لیتے ہیں اور جو لوگ واقف نہیں وہ بھی بوجہ ایک ارض کے محسوس ہونے کے نفسِ استدلال کو بخوبی سمجھ گئے، تو معلوم ہوا کہ قرآن میں کسی ایسے مسئلہ سے کام نہیں لیا گیا جس سے سامع کو الجھن ہو اگر سائنس کے مسئلے اس میں ہوتے تو سامعین اُن کی تحقیق میں پڑ جاتے اور ہر شخص کو اس کے آلات و ذرائع کی تحصیل ممکن نہ تھی تو ہر شخص ایک اُلجھن میں پڑ جاتا۔ نیز ان میں اختلاف اس قدر ہے کہ آج تک بھی کوئی بات محقق نہیں ہوئی۔

خاتمہ

دل چاہا کہ، اس "مقالۂ اشرف" کو حضرت حکیم الامت رح کی بیان کردہ اس لطیف مناسبت اور عجیب و غریب ارتباط کے بیان پر ختم کیا جائے جس کو حضرت رح نے قرآن مجید کے آغاز سورۂ فاتحہ اور انجام سورۃ الناس کے مضامین میں بیان فرمایا ہے، حضرت حکیم الامت رح تفسیر بیان القرآن کے خاتمہ پر ارشاد فرماتے ہیں۔

"اور ایک عجیب لطیفہ اس سورت میں جس سے قرآن کا حسنِ آغاز و انجام بھی ظاہر ہوتا ہے یہ ہے کہ اس کے اور فاتحہ کے مضامین میں غایت درجے کا تقارب کہ حکم اتحاد میں ہے متحقق ہے۔ چنانچہ ربّ

الناس کے مناسب رب العالمین اور ملک الناس کے مناسب
مالک یوم الدین اور الہ الناس کے مناسب ایاک نعبد اور استعاذہ
کے مناسب ایاک نستعین اور الوسواس الخناس الخ کے مناسب
اھدنا الخ ہے ۔" (بیان القرآن ص ۱۲۷، ج ۱۲)

اللھم اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین
انعمت علیھم واعذنا من شر الوسواس الخناس
الذی یوسوس فی صدور الناس من الجنۃ والناس۔
وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد وعلی آلہ و
اصحابہ اجمعین الی یوم الدین۔ سبحان ربک رب
العزۃ عما یصفون۔ وسلام علی المرسلین۔
والحمد للہ رب العالمین

سید عبدالشکور ترمذی عفی عنہ
مدرسہ عربیہ حقانیہ ساہیوال ضلع سرگودھا
۲۶ رجب المرجب ۱۴۰۴ھ
۲۹ اپریل ۱۹۸۴ء

★

مجلس صیانۃ المسلمین

کا

تاریخی پس منظر

اور اس کی

تبلیغی و اصلاحی خدمات

مرتب

وکیل احمد شیروانی

مدرس و نائب مفتی جامعہ اشرفیہ لاہور

مجلس صیانۃ المسلمین

دفتر: جامعہ اشرفیہ، فیروز پور روڈ، لاہور

مقالہ نمبر
۲۰
حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رح
بحیثیت
مفسر
از
حضرت مولانا مفتی سید عبدالشکور صاحب ترمذی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

حضرۃ تھانویؒ کی تفسیری خدمات

حضرۃ تھانویؒ کی فقہی خدمات سے متعلق مبسوط مقالہ میں مختصراً اس کی وضاحت کی گئی ہے کہ حق تعالیٰ نے حضرت کو علوم وفنون میں جامعیّت کی ایک خاص شان عطا فرمائی تھی۔ حضرت علوم متداولہ علوم آلیہ اور علوم عالیہ سب میں کمال مہارت بلکہ اجتہادی مقام وبصیرت پر فائز تھے جیسا کہ حضرت کی تالیفات وافادات اور بطور تحدیث نعمت، حضرت کی تصریحات وارشادات بھی شاہد ہیں اور حق سبحانہ کا حضرت پر یہ بھی ایک انعام خاص ہے کہ حضرت کو امتیاز اور تفوق وتخصص صرف ایک علم میں نہیں بلکہ دین کے تین اہم علوم میں حاصل تھا جن میں سے ایک "علم تفسیر" ہے۔

علوم دینیہ میں علم تفسیر کا مقام واہمیّت

علوم دینیہ میں تفسیر کا کیا مقام ہے، اور اس سے واقفیّت اور بالخصوص اس پر کمال کے لیے کیا چیزیں درکار ہیں، اہل علم اس سے بخوبی واقف ہیں اسلام کا اصل ومکمل دستور، اور اسلامی احکام کا اصل منبع وسرچشمہ قرآن کریم ہی ہے، اسی اہمیّت کی وجہ سے اس کے الفاظ اور مطالب بھی حق تعالیٰ کے نازل کردہ ہیں اور تفسیر کا حاصل قرآن کریم کے الفاظ کے معانی ومطالب سے اپنی وسعت

کی بقدر واقف ہونا اور ان کا بیان کرنا ہے۔

اور چونکہ قرآن کریم زبان وبیان دونوں کے اعتبار سے بیشمار خوبیوں کا حامل ہے اس لیے اس کے سمجھنے کے لیے محض سرسری طور پر عربی زبان کا جاننا ہی کافی نہیں بلکہ اس کے لیے تمام علوم عربیت میں بھی کمال کی ضرورت ہوتی ہے اور منشاء خداوندی کے مطابق معانی ومطالب کو سمجھنے کے لیے مختلف علوم دینیہ میں درک وبصیرت کی ضرورت ہوتی ہے، اور تفسیر کے نورایمانی کے ساتھ ہی خداوند فہم وبصیرت ان سب کے ساتھ اس کے مناسب وشایان شان ملکہ مستقل ایک اہم شرط ہے، اسی اہمیت کی بناء پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات ہیں اور حضرات صحابہؓ سے اس سلسلہ میں بہت سی احتیاطی چیزیں منقول ہیں۔

حضرت تھانویؒ کی علم تفسیر سے مناسبت

یہ بات بار بار کہی گئی ہے اور خود حضرت نے بھی بطور تحدیث نعمت اس کا اظہار واعتراف فرمایا ہے کہ حق تعالیٰ نے حضرت کو جن علوم دینیہ سے خصوصی مناسبت عطا فرمائی تھی، ان میں نمایاں وامتیازی دو علوم ہیں۔ تفسیر و تصوف اگرچہ جیسا کہ اپنے موقع پر وضاحت کی گئی ہے، علم فقہ میں حضرت کا مقام وخدمات بھی امتیازی درجہ کی ہیں جیسے کہ حدیث وکلام سے خصوصی مناسبت مخفی نہیں ہے، مگر خود حضرت نے جن علوم میں امتیاز، اور خصوصی مناسبت کا اعتراف کیا ہے وہ تفسیر وتصوف ہیں۔

کسی فن سے خصوصی مناسبت کا مصداق دراصل فن سے متعلق وہ ملکہ

کہلاتا ہے جس کی بنا پر انسان اس علم وفن میں مجدّدانہ ومجتہدانہ شان کے حامل کارہائے نمایاں انجام دیاکرتا ہے، اور تصوّف وغیرہ کی طرح علم تفسیر میں حضرت کو بلاشبہ یہ ملکہ حاصل تھا، جس کا سب سے واضح اور بین ثبوت اور شاہد یہ امر ہے کہ حضرت نے مشکل سے مشکل مقامات میں ایسی محتاط، صاف وبے داغ اور دل کو لگتی توجیہات فرمائی ہیں کہ بے اختیار زبان سے تحسین نکلتی ہے۔ اور بڑے بڑے اشکالات کو محض چند لفظوں اور جملوں میں حل فرمایا ہے کہ جو بسا اوقات متعدد تفسیری کتب اور ہزارہا اوراق کے مطالعہ سے بھی حل نہیں ہوتے اور نہیں ہوتے، جیساکہ خود حضرت نے خطبہ میں تصریح کی ہے اور علّامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ جیسے وسیع النظر ومتبحر عالم کے جو تاثرات بیان القرآن سے متعلق منقول ہیں ان سے ظاہر ہے جیساکہ آگے تفصیل سے آرہا ہے۔

پھر جبکہ حضرت نے اس قسم کے اشکالات کے جو حل یا جوابات تحریر فرمائے ہیں ایسا نہیں ہے کہ کتابوں میں مسطور ومرقوم معلومات پر نظر کر کے بربنائے ترجیح کسی ایک کتاب سے کوئی قول ورائے لے کر لکھ دی ہو بلکہ بے شمار چیزیں محض وہبی طور پر اسی خداداد بصیرت کی بنیاد پر تحریر فرمائی ہیں، اور ازروئے دیانت وتقویٰ پر ایسے موقع پر اس کا اظہار بھی کر دیا ہے، اور اس کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی کہ حضرت کے پاس تفسیر کا وہ وافر ذخیرہ نہیں تھا جو آج مہیا ودستیاب ہے، اور جو ذخیرہ مہیّا تھا۔

وہ خود درپیش بہت سے اشکالات کے جوابات سے خالی تھا، اس لیے

حضرت نے اپنی تفسیر میں سلف کی کمال اتباع کے اہتمام کے باوجود اس ملکہ سے کام لیا، اور نہ جانے کتنے دلوں و ذہنوں کو ان کی علمی الجھنوں سے نکال کر ان کو طمانیت قلب اور بصیرت سے سرفراز فرمایا۔

خصوصی مناسبت کا راز و باعث

یوں تو علم دین کا حصول و تحصیل فضل خداوندی ہے، اور اس کے کسی شعبہ سے خصوصی مناسبت فضل بر فضل ہے مگر اس دنیا میں عموماً ظاہری اسباب کی ضرورت ہوتی ہے اور واقعات و حالات کا رشتہ و تعلق اسباب سے ہی جوڑا جاتا ہے۔

حضرتؒ کو تفسیر سے جو خصوصی مناسبت تھی، ظاہری اسباب کی نسبت سے دو امر خصوصیت سے اس کے باعث بنے، اور ان دونوں کا تذکرہ خود حضرت نے ہی فرمایا ہے۔

ایک تو حضرت حاجیؒ کی آپ کے حق میں اس کے لیے دعا و پیشینگوئی حاجی صاحبؒ نے تفسیر و تصوّف سے خصوصی مناسبت کی آپ کے لیے دعا کی تھی اور پیشینگوئی بھی فرمائی تھی حتیٰ کہ حضرت فرمایا کرتے تھے کہ میں چوک گیا۔ ورنہ دیگر شعب دینیہ خصوص حدیث و فقہ کی مناسبتِ خاصہ کے لیے بھی حضرت حاجی صاحب سے دعا کرا لیتا۔[1]

دوسرا امر خواب میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی زیارت ہے یعنی روحانی

---

[1] اشرف السوانح ج ۱ ص ۱۹۰

طور پر اس باب میں ان سے کسب فیض ہے، حضرت نے ہی ایک سلسلۂ کلام میں ارشاد فرمایا ہے کہ کانپور کے قیام کے زمانہ میں میں نے کلام پاک کے ترجمہ وتفسیر کے سنانے کا سلسلہ شروع کیا تو شروع شروع میں مجھکو اس سلسلہ سے کچھ خاص مناسبت نہ تھی۔

ایک دن خواب میں حضرت ابن عباس رضؓ کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔ میں نے اس زیارت کو اس کی طرف اشارہ سمجھا۔ چنانچہ اس کے بعد تفسیر سے مناسبت کھلتی اور بڑھتی چلی گئی[1]۔ حتیٰ کہ حق تعالےٰ نے آپ کو اس فن شریف میں وہ مقام عطا فرمایا کہ بعد کے اکابر مفسرین بھی آپ کے تفسیری افادات سے استفادہ واستفاضہ سے مستغنی نہیں رہ سکے اور نہ رہیں گے۔

---

[1] اشرف السوانح ج ۱ ص ۳۸ وغیرہ

حضرتؒ کی قرآنی خدمات

حضرت کی تفسیری و قرآنی خدمات

یہ بات تو معلوم ہے کہ حضرت کے امتیازات میں سے مختلف علوم فنون میں حضرت کے تالیفی مآثر ہیں جو کہ ہر فن و باب سے متعلق متعدد ہیں یہ بھی حضرت کی خصوصیّت ہے، قرآن کریم و تفسیر سے متعلق یوں تو حضرت کی مایۂ ناز و اہم خدمات دو ہیں اولاً و اصلاً مکمل بیان القرآن جس کا تفصیلی ذکر آگے آرہا ہے اور ثانیاً احکام القرآن کے افادات، احکام القرآن کا تفصیلی تعارف فقہی خدمات سے متعلق مقالہ میں پیش کیا گیا ہے لیکن ان دو کے علاوہ اور بھی متعدد چیزیں ہیں اور موضوع و محتویات کے اعتبار سے اپنی جگہ پر اہم و گرانقدر حضرت کی یہ تالیفات دو حصوں میں منقسم ہو سکتی ہیں۔ حصہ اول تجوید و قرأت سے متعلق، دوم قرآن کریم کی تفسیر و بیان مطالب سے متعلق۔

تجوید و قرأت سے متعلق بھی اردو عربی میں حضرت کی کل ۸ تالیفات ہیں

۱۔ تجوید القرآن، اس میں مسائل تجوید کو منظوم پیش کیا گیا ہے۔
۲۔ جمال القرآن، اس میں تجوید کے عام مسائل نثر میں مذکور ہیں۔
۳۔ تنشیط الطبع فی اجراء السبع، اس میں قرأت سبع اور ان کے رواۃ وغیرہ کا بیان ہے، یہ تینوں کتابیں اردو میں ہیں اور تجوید کے

تعلیم وتعلم میں بالخصوص دوسری وتیسری رائج ومتداول ہیں۔

۴۔ رفع الخلاف فی حکم الاوقاف، اوقاف قرآنیہ کے بارہ میں قراء کے درمیان جو اختلاف ہے، اس کی توجیہ وتطبیق اس میں کی گئی ہے

۵، ۶۔ آداب القرآن و یادگار حق القرآن، دونوں قرآن کریم کی تلاوت کے آداب ومسائل سے متعلق ہیں۔

۷۔ وجوہ المثانی مع توجیہ الکلمات والمعانی، اس میں قرارت مشہورہ کے اختلافات کو ترتیب سور کے مطابق جمع کیا گیا ہے، اخیر میں تجوید و قرارت کے قواعد بھی مذکور ہیں یہ بیان القرآن کی نظر ثانی کے بعد کی اشاعت میں اس کے ساتھ ملاکر، ہر جلد کا حصہ اس کے ساتھ اخیر میں ملحق کر کے شائع ہوا ہے اور ہو رہا ہے، اور ابتداءً مستقلاً بھی شائع ہوا ہے۔

۸۔ زیادات علی کتب الروایات، اس میں روایات غیر مشہورہ کی سندیں ہیں، یہ وجوہ المثانی کے ساتھ ملحق ہو کر شائع ہوا ہے۔ یہ دونوں کتابیں عربی میں ہیں۔

تفسیری خدمات

اور تفسیر و بیان مطالب سے متعلق تالیفات حسب ذیل ہیں۔

۹۔ سبق الغایات فی نسق الآیات، اس میں پورے قرآن مجید کی آیات کے باہمی ربط کو بیان کیا گیا ہے، اور مختصر مگر نہایت گرانقدر و وقیع چیز ہے اس پہلو پر امت کے کم افراد نے اور پھر مستقل کتابی صورت میں کچھ لکھنے

پر تو شاذ و نادر ہی توجہ ہوئی ہے، اصل تفسیر بیان القرآن میں حضرت نے اس کے مضامین کو اردو میں "ربط" کے عنوان کے تحت ہر ہر ٹکڑے کے ساتھ بیان فرمایا ہے اور خود رسالہ عربی میں ہے۔

۱۰۔ تصویر المقطعات لتیسیر بعض العبادات، نصاب میں شامل تفسیر کی معروف کتاب بیضاوی کے شروع میں حروف مقطعات سے متعلق جو ایک عجیب و غریب بحث آئی ہے اس رسالہ کے اندر سلیس عربی میں اس کو آسان کر کے بیان کیا گیا ہے۔

۱۱۔ ظہور القرآن من صدور البیان، یہ چند حکایات کا ایک مختصر مجموعہ ہے جس سے قرآن مجید کے وجوہ اعجاز میں سے ایک خاص وجہ کا اثبات مقصود ہے اور وہ ہے قرآن کریم کے حفظ کا اتنا آسان ہونا کہ نہایت کم عمر بچے جو کہ حافظ ہونے کے قابل نہیں ہوا کرتے، وہ بھی اس کے حافظ ہوتے ہیں۔ حضرت نے اس میں اپنے وقت کے ایسے چند بچوں کے واقعات درج فرماتے ہیں۔

۱۲۔ تقریر بعض البنات فی تفسیر بعض الآیات، حضرت نے خاندان کی بعض بچیوں کو کلام پاک کا ترجمہ پڑھایا تھا تو ان بچیوں نے حضرت کی تقریر کو جمع کیا تھا، جو اکثر آیات سے متعلق ہے۔

۱۳۔ رفع البناء فی نفع السماء، اس رسالہ میں آیت الذی جعل لکم الارض فراشا والسماء بناء کی تفسیر کرتے ہوئے آسمان کے منافع ذکر کیے گئے ہیں عام مفسرین نے زمین کے منافع تو بہت سے

گناتے ہیں مگر اس پر روشنی کم ہی ڈالی ہے، یہ بیان القرآن کی جلد اوّل کے ساتھ ملحق ہے۔

۱۴۔ احسن الاثاث فی النظر الثانی فی تفسیر المقامات الثلاث یہ سورۃ بقرہ کی تین آیات کی تفسیر پر نظر ثانی کے بعد تحریر کردہ مضمون ہے۔

۱۵۔ تمہید العرش فی تحدید العرش اس میں "استوا علی العرش" کے معنی اور تفسیر و تفصیل مذکور ہے۔ نیز معترضین کے اعتراضات اور جوابات بھی نہایت بسط کے ساتھ آگئے ہیں اور عامی کے فہم سے اعلیٰ ہے، اہل علم ہی اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

۱۶۔ القاء السکینۃ فی تحقیق ابداء الزینۃ اس رسالہ میں آیت لا یبدین "زینتھن الا ما ظہر منہا" کی صحیح تفسیر و تحقیق فرمائی گئی ہے اور ان لوگوں کا جواب دیا گیا ہے جو کہتے ہیں کہ چہرہ اور ہتھیلیوں کا ڈھانکنا و چھپانا واجب نہیں ہے۔

۱۷۔ احسن التفہیم بمقولہ سیدنا ابراہیم سورۃ انعام میں اثبات توحید سے متعلق حضرت ابراہیمؑ کی جو تقریر نقل کی گئی ہے اس رسالہ میں مختصراً اسی کی توجیہ و تفسیر کی گئی ہے۔ تفسیر کے سلسلہ کی ہی بعض وہ تالیفات بھی ہیں جو در اصل بعض ایسے کاموں سے متعلق بطور تنقید تحریر کی گئی ہیں

۱۸۔ التقصیر فی التفسیر بعض عصری تفاسیر کے مندرجات پر تنقید و تنبیہ ہے۔

۱۹۔ الہادی للحیران فی وادی تفصیل البیان ”تفصیل البیان فی مقاصد القرآن“ نامی ایک کتاب کے نقائص کے بیان پر مشتمل ہے۔

۲۰۔ اصلاح ترجمہ دہلویہ ڈپٹی نذیر احمد دہلوی کے ترجمہ کی غلطیوں پر تنبیہ، ان کے ترجمہ میں بکثرت ایسی اغلاط ہیں جن سے مسائل شرعیہ اور عقائد اسلامیہ کے سمجھنے میں دھوکہ ہوتا ہے۔

۲۱۔ اصلاح ترجمہ حیرت مرزا حیرت دہلوی نے ڈپٹی صاحب کے ترجمہ کو پسند نہ کر کے جو ترجمہ کیا، خود اس میں غلطیاں کیں، اس میں انہیں غلطیوں کو واضح کیا گیا ہے۔

جیسے کہ سر سید احمد کے معتقدات باطلہ کا ایک چارٹ حضرت نے تیار کیا تھا جو زیادہ تر ان کی تفسیر میں مذکور ہیں۔

۲۲۔ مسائل السلوک من کلام ملک الملوک اس کتاب میں تصوف سے متعلق بدگمانی و برگشتگی کو دیکھتے ہوئے تصوف و سلوک کے مسائل کو آیات قرآنیہ سے ثابت کیا گیا ہے اور تصوف کے ہر شعبہ کی کتاب اللہ سے تائید نقل کی ہے، یہ کتاب مخالفین تصوف کے لیے اتمام حجت اور محبین سلوک کے لیے ازدیاد محبت ہے۔ اور بلاشبہ یہ شریعت کی روح اور طریقت کی جان ہے، یہ کتاب عربی میں ہے۔

۲۳۔ رفع الشکوک من مسائل السلوک یہ مسائل السلوک کا اردو ترجمہ ہے، یہ دونوں کتابیں اب بیان القرآن

کے متداول نسخ کے ساتھ حاشیہ پر شائع ہورہی ہیں نظر ثانی کے بعد سے اس کو حاشیہ پر کردیا گیا ہے، عربی متن اوپر اور اردو نیچے ہے۔

دو کتابیں حضرت کی مزید قرآنی خدمات سے متعلق ہیں۔

۲۴۔ اعمال قرآنی ۲۵۔ خواص قرآنی ان دونوں میں آیات قرآنیہ کے خواص درج ہیں کہ جن کی بنیاد پر انسان اپنی دنیوی مشکلات کے دفعیہ میں ان آیات کا سہارا لے سکتا ہے یہ اُلٹے سیدھے تعویذ گنڈوں سے حفاظت کا ذریعہ ہے۔

۲۶۔ البیان یہ حضرت کے تفسیری افادات کا ایک مجموعہ ہے جسے مولانا سعید احمد صاحب تھانوی نے مرتب کیا تھا۔

یہ تو مستقل تالیفات ورسائل کا بیان ہے، امداد الفتاویٰ کی جلد پنجم میں تفسیر سے متعلق جو ۵۵ صفحات ہیں، وہ اور دیگر تالیفات ومواعظ میں حسب موقع جو چیزیں آگئی ہیں وہ مزید برآں ہیں، جیسے کہ کانپور کے زمانہ قیام میں تفسیری خدمات کا ایک سلسلہ یہ بھی رہا کہ آپ مسجد میں عوام کے لیئے درس دیا کرتے تھے اور بطور سبق کانپور وتھانہ بھون دونوں جگہوں میں طلباء کو تو مستفید فرماتے ہی رہے تفسیر کی کتابیں پڑھا کر بھی اور براہ راست قرآن کریم کا ترجمہ وتفسیر پڑھا کر بھی،

جن تالیفی خدمات کا تذکرہ کیا گیا ہے، ان میں سے بعض کی مستقلاً اشاعت کی نوبت نہیں آئی اور بعض مستقلاً اب تک شائع ہورہی ہیں جیسے کہ تفسیر سے متعلق اکثر رسائل، بوادر النوادر، امداد الفتاویٰ یا بیان القرآن میں شامل ہیں اور بعض سے متعلق بعض حضرات نے تسہیل وغیرہ کا بھی کام کیا ہے۔ یہ خدمات فی الحال احقر

سکے علم میں آسکی ہیں بعض چیزیں مزید بھی ہوسکتی ہیں جو میرے علم میں نہیں آسکی ہیں۔

بیان القرآن (۲۷)

بیان القرآن کی تالیف کا داعی و باعث

امام دہلوی شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اپنی تحریک اصلاح میں جو ایک سلسلہ عوام وخواص کو قرآن کریم کی طرف کما حقہ توجہ دلانے کا شروع کیا تھا، اس نے حضرت امام کے عہد سے ہی اثر دکھانا شروع کر دیا تھا جو کہ برابر بڑھتا ہی رہا، عوام میں بھی اور خواص میں بھی، اس کا نتیجہ خواص میں مدارس کے نصاب میں اہتمام کے ساتھ ترجمۂ کلام پاک اور متعدد کتب تفاسیر کا شمول ہے، اور عوام میں پورے ملک کے طول و عرض کے مختلف علاقوں کی مساجد میں درس قرآن و تفسیر کا زبانی سلسلہ، اسی عام توجہ کا اثر یہ تھا کہ طبائع تحریری صورت میں قرآن کریم کے سلیس و مفید ترجمے اور تفاسیر کی طالب تھیں اور اس کا احساس کر کے لوگ خامہ فرسائی کر کے بزعم خود اس ضرورت کو پورا بھی کر رہے تھے مگر حقیقت یہ ہے کہ اس صدی کے آغاز میں اس انداز کے جو بعض کام سامنے آتے تھے جیسا کہ اکابر نے تنقیح و تنقید کے ذریعہ وضاحت کی ہے، وہ کام مفید ہونے سے زیادہ مضر ثابت ہو رہے تھے جیسے کہ آج تک برابر کچھ نہ کچھ لوگ اسی انداز کے کام کرتے جا رہے ہیں۔ اور ان کی وجہ سے کم از کم ان کے اثرات بد کے ازالے کے لیے حالات کے مطابق اس کام کو کرتے رہنے کی

ضرورت برابر باقی رہی ہے اور لوگ ضرورت کا لحاظ کرکے اس کو پورا بھی کرتے رہے ہیں، بہرحال ضرورت و عام طلب' اور موجود و متداول چیزوں کی مضرت' حضرت کے لیے اس گرانقدر کام کی انجام دہی کے لیے محرّک بنی۔ حضرت نے خود بیان القرآن کے مقدمہ میں فرمایا ہے "بہت روز سے خود بھی اور احباب کے اصرار کی وجہ سے بھی گاہ گاہ خیال ہوا کرتا تھا کہ کوئی مختصر تفسیر قرآن مجید کی لکھی جائے جو ضروریات کو حاوی اور زوائد سے خالی ہو مگر تفاسیر و تراجم کی کثرت کو دیکھ کر اس امر کو زائد سمجھا جاتا تھا اسی اثنار میں نئی حالت یہ پیش آئی کہ بعض لوگوں نے محض تجارت کی غرض سے نہایت بے احتیاطی سے قرآن کے ترجمے شائع کرنے شروع کیے جن میں بکثرت مضامین قواعد شرعیہ کے خلاف ہیں جن سے عام مسلمانوں کو بہت مضرت پہنچی ہر چند کہ چھوٹے چھوٹے رسالوں سے ان کے مفاسد پر اطلاع دے کر ان مضرتوں کی روک تھام کرنے کی کوشش کی گئی مگر چونکہ کثرت سے ترجمہ بینی کا مذاق پھیل گیا ہے وہ رسالے اس غرض کی تکمیل کے لیے کافی ثابت نہ ہوتے تا وقتیکہ ابنار زمانہ کو کوئی ترجمہ بھی نہ بتلایا جاوے جس میں مشغول ہو کر ان تراجم مبتدعہ مخترعہ سے بے التفات ہو جائیں، ہر چند کہ تراجم و تفاسیر محققین سالفین کے بالخصوص خاندان عزیزیہ کے ہر طرح کافی دوافی ہیں مگر ناظرین کی حالت و طبیعت کو کیا کیا جائے بعض تفاسیر میں عربی یا فارسی نہ جاننے کی مجبوری بعض تراجم میں اختصار یا زبان بدل جانے کا عذر مانع دلچسپی ہوا، تامل و مشورے سے یہی ضرورت ثابت ہوئی کہ ان لوگوں کو کوئی نیا ترجمہ دیا جائے جس کی زبان و طرز بیان و تقریر مضامین میں ان کے مذاق و

ضرورت کا حتی الامکان پورا لحاظ رہے، اور ساتھ ہی اس کے کوئی ضروری مضمون خواہ جزو قرآن ہو یا اس کے متعلق ہو، رہ نہ جائے،

بہر حال حضرت کے ان الفاظ سے ہم نے جو کہا ہے وہ ظاہر ہے کہ اس کی ایک عام ضرورت وطلب بھی محرک تھی ساتھ ہی جو کچھ موجود تھا اس کی مضرت بھی مقتضی تھی اور حضرت کا جو فیضِ عام جاری ہو چکا تھا اور حضرت کو اپنے حلقہ میں اعتماد و استناد حاصل ہو چکا تھا اس کی وجہ سے متعلقین کا تقاضا و اصرار اس تحریک کو مزید تقویت پہنچا رہا تھا۔

لہ خاندان عزیزیہ سے دراصل ولی اللہی خانوادہ اور امام دہلوی کے اخلاف، خلف اکبر شاہ عبد العزیز صاحب دہلوی ۱۲۳۹ھ اور ان کے برادران خورد مراد ہیں کہ حق تعالےٰ نے اس پورے گھرانہ سے جس پیمانہ پر علم و دین کی خدمت کا کام لیا ہے۔ اظہر من الشمس ہے، اور اس خانوادہ کی ایک نمایاں اور عمومی افادہ کی خدمت جس کا براہِ راست افادہ اب تک جاری ہے وہ قرآن کریم سے متعلق ان کی خدمات میں ایک تو خود امام دہلوی کا ترجمہ و مختصر تفسیر جو دراصل ان حضرات کی خدمات کی بنا رہے، پھر ان کے صاحبزادگان عالیشان میں سے تین کے تراجم و تفاسیر، شاہ عبد العزیز صاحب کی تفسیر عزیزی جس کے متعلق علامہ انور شاہ صاحب نے فرمایا ہے کہ یہ مکمل ہوتی تو امت کے سر سے تفسیر قرآن کا قرض اتر جاتا۔ (مشکلات ص ۴۰) شاہ عبد القادر صاحب ۱۲۳۰ھ کا ترجمہ و حواشی بالخصوص ترجمہ جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اردو میں پہلا با محاورہ و مستند ترجمہ ہے جو چالیس سال کے عرصہ میں تیار ہوا، مولانا یعقوب صاحب نے اس کو الہامی قرار دیا ہے

(معارف القرآن مقدمہ ۶۸) حضرت نانوتوی نے اس کے متعلق فرمایا کہ اگر قرآن پاک اردو میں نازل ہوتا تو ایسا ہی ہوتا یا قریب قریب (تعارف حواشی شبیریہ پاک) اسی لیے یہ ترجمہ تمام معتمدین کے نزدیک بعد کو بنا، ترجمہ قرار پایا، شاہ رفیع الدین صاحب کا ترجمہ جو کہ لفظی سمجھا جاتا ہے، قاضی ثناء اللہ پانی پتی کی تفسیر مظہری (عربی جس کا اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے وہ) بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے کہ قاضی صاحب امام دہلوی کے بعض تلامذہ میں سے تھے"۔ الا بعدی

تالیف کا آغاز و اتمام

جیسا کہ تفصیل سے ذکر کیا گیا کہ حالات نے حضرت کو اس کام کی شدید ضرورت کا احساس دلایا اور حضرت نے ایک اہم علمی و دینی ضرورت محسوس کر کے اس کام کو شروع کر دیا اور حق تعالے نے چند سال کے عرصہ میں جبکہ حضرت ارشاد ربانی بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً" کے آس پاس تھے، حق تعالے نے اس کو تکمیل کے مرحلہ تک پہنچا دیا، اور نہ صرف یہ بلکہ حضرت کی حیات میں اس کی اشاعت ہوئی، حضرت نے مقبولیت دیکھی، اور اللہ نے عمر میں اتنی برکت دی کہ ایک طویل عرصہ کے بعد حضرت نے نظر ثانی فرما کر گویا اس کو ایک نئی تفسیر بنا دیا حضرت خود فرماتے ہیں۔ "چند روز تک یہ رائے تجویز و پیرایہ تذکرہ میں رہی آخر جب احباب کا تقاضا زیادہ ہوا اور خود بھی اس کی ضرورت روزانہ مشاہدہ میں آنے لگی آخر بنام خدا محض توکلاً علی اللہ پھر اس اطمینان پر کہ اگر میں کسی قابل نہیں ہوں تو کیا ہوا بزرگان عصر اصلاح فرما کر اس کو دیکھنے کے قابل کر دیں گے۔ آخر ربیع الاوّل ۱۳۲۰ھ میں اس کو شروع کرتا ہوں اور اللہ تعالے سے امید

تمام اور نفعِ انام رکھتا ہوں۔"

حضرت کی تصریح کے مطابق حضرت نے اس کام کا آغاز ربیع الاوّل ۱۳۲۰ھ میں کیا۔ اور یہ مبارک سلسلہ ۱۳۲۵ھ کے وسط میں انتہا کو پہنچا۔ بظاہر اس میں پانچ سال لگے مگر اصلاً کل ڈھائی سال لگے اس لیے کہ ۱۳۲۰ھ میں کام شروع ہو کر صرف ربع پارہ تک ہو سکا تھا کہ بند ہو گیا اس کے بعد وسط محرم ۱۳۲۳ھ سے حضرت نے دوبارہ اس کو ہاتھ لگایا اور بالآخر نصرت خداوندی کے طفیل صرف ڈھائی سال کے قلیل عرصہ میں ایسا مہتم بالشان کام انجام پایا۔

اس کے بعد اس کی اشاعت کا سلسلہ جاری رہا، اشاعت کے بعد خود سے نیز دوسرے حضرت کی گذارشات کی بنا پر جو امور و مواقع لائق توجہ اور ترمیم و اصلاح کے مناسب معلوم ہوئے ان کے لیے حضرت نے تقریباً بیس سال کے عرصہ پر ۱۳۵۳ھ میں اپنے آپ کو فارغ فرما کر پوری تفسیر پر نظر ثانی کی اور حسب توقع ترمیم و اضافے کے ذریعہ اس کو ایک نئے لباس میں کر دیا اور بقول حضرت کے بعض رسائل وغیرہ سے ملا لینے کی وجہ سے اب جو تفسیر ہمارے سامنے ہے وہ مکمل "بیان القرآن" ہے

بیان القرآن کی اشاعت

حضرت کے متعلق تو یہ بات معروف ہے کہ حضرت کے علمی افادات کے سلسلہ کو جو عموم قبول حاصل رہا ہے وہ آج کے اس دور میں بھی نایاب ہے کہ حضرت کی کوئی چھوٹی سے چھوٹی تحریر اور معمولی سے معمولی ملفوظ بھی ضائع نہیں ہوا قدر کرنے والوں نے قید قرطاس کر کے ہر چیز کو دوام بخش دیا۔ حضرت کو خود اہتمام تھا

اور خدام بھی میسّر تھے کہ وہ ہر چیز کی اشاعت کا اوّلین فرصت میں انتظام کر دیتے اور پھر بیان القرآن کی جو ضرورت و اہمیّت تھی اس کے پیش نظر اس میں کیوں تاخیر ہوتی، کام پورا ہوا اور کتاب اشاعت کے مرحلہ میں پہنچ گئی، سہولت کی خاطر، اس کو ڈیڑھ ڈیڑھ سو اور پونے دو، دو سو صفحات پر مشتمل بارہ اجزاء میں کرکے اس کو شائع کرنے کا اہتمام کیا گیا اور جیسا کہ گذر چکا ہے کہ حضرت کی حیات میں اس کے دو مختلف ایڈیشن شائع ہوئے ایک اولین، دوسرا نظر ثانی کے بعد۔

پہلا ایڈیشن ۱۳۲۵ھ میں کتاب کی تکمیل کے بعد ۱۳۲۶ھ میں شائع ہوا اس وقت تک مولوی شبیر علی صاحب رح کا مطبع اشرف المطابع، قائم نہیں ہوا تھا، اس لیے یہ ایڈیشن دہلی کے مشہور مطبع، مجتبائی سے اس کے مالک شیخ عبدالاحد مرحوم کی نگرانی میں منظر عام پر آیا۔

نظر ثانی کے بعد جو ایڈیشن شائع ہوا وہ تھانہ بھون کے اشرف المطابع سے شائع ہوا، بلکہ اس مطبع کے مالک مولوی شبیر علی صاحب ہی خاص طور سے نظر ثانی کے محرک بنے کہ انہوں نے اپنے مطبع سے اس کی اشاعت کا قصد کیا تو حضرت سے اس کام کے کر ڈالنے کی خواہش ظاہر کی، جس کا متعلقین کو تو تقاضا تھا ہی حضرت کو بھی خیال تھا اور ضرورت بھی تھی، یہ ایڈیشن بھی بارہ اجزاء میں ہے۔

اس کے بعد مختلف مطابع نے اس کے مثل کتابت کرا کے اس کو شائع کیا ہے اور آجکل دیار پاک میں جو ایڈیشن متداول ہے وہ قرآن کریم و تفاسیر

کو شائع کرنے کی سعادت حاصل کرنے والے وہاں کے مشہور مطبع 'تاج کمپنی لاہور' کا ہے' اور بلاد ہند میں تاج پبلشرز' دہلی کا جو اشرف المطابع کے نسخہ کا عکس ہونے کی وجہ سے طباعت وکتابت کی صحت ونظامت میں "اشرف المطابع" کے نام کے مطابق "اشرف النسخ" کہلانے کا مستحق ہے۔

بیان القرآن کے خصائص

بیان القرآن کے خصائص یعنی بیان القرآن میں ملحوظ امور

حضرت کی یہ تفسیر جس کی نسبت خود حضرت نے بڑے اعتماد ووثوق کا اظہار فرمایا ہے جیسا کہ آگے آرہا ہے اس اعتماد ووثوق کی بنیاد دراصل وہ امور ہیں جن کا حضرت نے اس کی تالیف وترتیب میں لحاظ فرمایا ہے اور کتاب کے خطبہ میں خود حضرت نے نہایت اہتمام اور پوری وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔

ا۔ محض ضروری مضامین پر اکتفاء

بطور تفسیر محض انہیں مضامین کو ذکر کیا گیا ہے جنہیں کسی وجہ سے ضروری خیال کیا گیا ہے' اور ضروری ہونے کی مختلف وجوہ ہو سکتی ہیں (الف) ایسا مضمون جس پر ترجمہ کی توضیح موقوف ہے (ب) قرآن کے ظاہری مضمون سے پیدا ہونے والے کسی شبہ کا جواب (ج) مضمون قرآنی کا بظاہر کسی مشہور ومسلم تحقیق کے خلاف ہونا (د) مضمون قرآنی سے نکلنے والا' یا اس سے متعلق کوئی اہم فقہی حکم ومسئلہ وغیرہ۔

ایسے مضامین کے امتیاز کے لیے یہ کیا گیا ہے کہ ان کے ذکر سے پہلے حرف (ف) لکھ کر پھر مضمون لکھا گیا ہے، کہیں یہ مضامین ایک سلسلۂ مضمون کی تمام آیات کے بعد آئے ہیں اور کہیں درمیان درمیان،

۲۔ ارتباطی مضامین و جملے تفسیر کے ساتھ ترجمہ ذکر کرتے ہوئے آیات کے ترجمہ کے درمیان حسب موقع توضیحی وارتباطی کلمات و جملے ذکر کیے گئے ہیں جو فوائد سے الگ ہیں۔ یہ توضیحی وارتباطی کلمات وہ ہیں جو بطور متعلقات بعض مختصر عربی تفاسیر میں ذکر کیے گئے ہیں یا نحوی توجیہات ہیں ان کا اعتبار ہوتا ہے، مثلاً واذ قلتم یموسیٰ لن نصبر علی طعام واحد، کے تحت حضرت فرماتے ہیں۔ اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب تم لوگوں نے (یوں) کہا کہ اے موسیٰ (روز کے روز) ہم ایک ہی قسم کے کھانے پر کبھی نہ رہیں گے، یہ ارتباطی مضامین اور ٹکڑے و جملے نمبر (۱) کے تحت ذکر کردہ مضامین سے بظاہر الگ ہیں جیسا کہ احقر سمجھا ہے اس لیے کہ ان کے لیے (ف) کے بعد ذکر کا اہتمام والتزام نہیں کیا گیا ہے بلکہ وہ مضامین ان سے الگ ہیں، مگر امتیاز کے لیے بین القوسین کر دیا گیا ہے۔

۳۔ غیر ضروری مضامین سے اگرچہ مفید ہوں، احتراز جو مضامین بہت سی تفاسیر میں اہتمام سے آئے ہیں اور وہ اگرچہ مفید ہی ہوں مگر طول سے احتراز کے پیش نظر ان کو نہیں لیا گیا ہے، مثلاً حسب موقع عبادات والفاظ کے لطائف ونکات، یا طویل وعریض حکایات فضائل اور بکثرت مسائل وغیرہ، ہاں شاذ و نادر کسی خاص فائدہ کے پیش نظر

کہیں کہیں کوئی چیز لے لی گئی ہے۔

۴۔ مرفوع، وراجح، نیز متقدمین کے قول پر اکتفا

جن مواقع میں متعدد اقوال وتفسیرات منقول ہیں وہاں اگر کوئی چیز مرفوعاً ثابت ہے تو اسی کو لیا گیا ہے ورنہ متقدمین کے قول پر اکتفا کیا گیا ہے، اور اگر ان کا قول نہیں مل سکا ہے تو حسب موقع روایت وعربیت کی رُو سے جس قول کو راجح سمجھا گیا ہے اسی کو لیا گیا ہے۔

اور اگر کسی جگہ ترجیح نہیں دی جاسکی اور دونوں وجوہ مساوی معلوم ہوئیں تو دونوں وجوہ ذکر کر دی گئی ہیں، جیسے کہ جہاں تفسیر کسی روایت پر مبنی نہیں اور لفظ فی نفسہ اس کو متحمل تھا وہاں اشتراط صحت میں تسامح کیا گیا ہے۔

۵۔ مضامین قرآنیہ کے درمیان ربط وارتباط کا بیان

اس کا پورا اہتمام کیا گیا ہے کہ ایک سورت کی آیت کے باہمی ربط وتعلق کو اور خود سورتوں کے باہمی ربط وتعلق کو خواہ کلی طور پر یا ابتداء وانتہا کے اعتبار سے واضح کیا جائے۔

جس کے لیے کہیں کہیں تو یہ صورت اختیار کی گئی ہے کہ مطلب قرآنی کی تقریر ہی اس انداز سے کی گئی ہے کہ ربط واضح ہو جائے اور اکثر بالخصوص ایک سلسلہ کے ختم ہونے کے بعد دوسرے سلسلۂ مضمون کے شروع ہونے پر اس سے پہلے (ربط) کا عنوان وسرخی قائم کر کے وجہ ربط کی تقریر کی گئی ہے۔

۶۔ فقہی اختلافات میں مذہب حنفی پر اکتفا

بلاد ہند کے عامۃ المسلمین کا عام فقہی مذہب چونکہ حنفیت

ہے اس لیے فقہی و فروعی اختلافات میں مذہب حنفیؒ کے اقوال و آراء کو ہی بیان کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے وہ بھی بقدر ضرورت، ان کی تحقیق کی گئی ہے ایسے ہی معاملہ کلامی مسائل کا بھی ہے

۷۔ خلاصۂ مضامین کا بیان

اکثر سورتوں میں یہ کیا گیا ہے کہ ان کے شروع میں ان کے سارے مضامین کا خلاصہ بیان کر دیا گیا ہے، جیسے کہ ایک سلسلۂ مضمون کی آیات کے مضامین کا خلاصہ وجہ ربط میں آگیا ہے یا ان سے متعلق جو سرخی قائم کی گئی ہے، ان میں آگیا ہے، تاکہ پوری سورت و آیات کے ملاحظہ سے پہلے اجمالاً خلاصۂ تفسیر ذہن میں مستحضر رہے کہ اس کی وجہ سے مفصل تفسیر کا نفع و حظ کچھ اور ہی ہوتا ہے۔

۸۔ مبنی بر دلیل صحیح شبہات کے جوابات پر اکتفا

شبہات کے جوابات میں یہ بات ملحوظ ہے کہ یوں تو بے شمار شبہات پیدا ہوتے رہتے ہیں مگر ہر شبہ لائق اعتنا نہیں ہوتا۔ اسی لیے انہیں شبہات کے جواب کا اہتمام کیا گیا ہے۔ جن کا منشاء کوئی دلیل صحیح ہو یعنی ان کی بناء کسی آیت یا حدیث پر ہو یا کوئی ایسا امر ہو جو کہ عقل یا حس سے ثابت ہو اور جو شبہ محض دعویٰ بلا دلیل ہے اس کا جواب دینے سے گریز کیا گیا ہے کہ اس کے رد کے لیے یہ کافی ہے کہ شبہ کے ذکر کرنے والے سے بناء شبہ اور دلیل کا سوال کر لیا جائے جو اس کے پاس نہیں، جیسے کہ بہت سے شبہات کے جواب دینے کی ضرورت اس لیے ہی نہیں محسوس کی گئی کہ نفس ترجمہ و مطالب بیانی سے ان کا دفعیہ ہو گیا۔

۹۔ تفصیل وتحقیق طالب متعدد مضامین کی کسی ایک جگہ تفصیل وتحقیق

اختصار اور طول سے احتراز کے پیش نظر یہ بھی کیا گیا ہے کہ ایسے مضامین جو زیادہ تفصیل وتحقیق کے طالب ہیں اور کئی جگہ آئے ہیں، ان کو کسی ایک جگہ مفصل ومحقق لکھ دیا گیا ہے، کبھی پہلے مقام پر اور بعد میں حوالہ دے دیا گیا ہے اور کبھی پہلی جگہ وعدہ کر کے دوسری جگہ ایفاء کیا گیا ہے۔

پھر بھی جو مضامین مکرر آئے ہیں ان پر کلام کرنے میں ہر موقع پر کچھ نہ کچھ مختلف مضامین وفوائد ضروری آ گئے ہیں۔

۱۰۔ تقریر مضامین باندازِ معقولین

آیات کے مطالب ومدلولات کی تقریر منطق کے اصول وقواعد کی پوری پوری رعایت کو ملحوظ رکھتے ہوئے کی گئی ہے۔

۱۱۔ عدم انشراح کی بنا پر مراجعت کی ہدایت

حضرت کا جو مزاج احتیاط و تثبت کا تھا اس گرانقدر تالیف میں بھی اس کا مظہر واثر یہ موجود ہے کہ جہاں حضرت کو کمال انشراح نہیں ہوا ہے وہاں متنبہ کر دیا ہے تاکہ مراجعت سے شاید کوئی اچھی توجیہ وتفسیر ہاتھ لگ جائے اگرچہ ایسے مقامات بقول حضرت دو ہی ہیں جیسے کہ بعض مقامات پر تقریر کسی قدر تنگ یا مختصر ہے، ان مقامات کو اہل علم سے حل کرنے و سمجھنے کی تاکید کی گئی ہے، وہ دو مقامات جن میں حضرت کو پورا انشراح نہیں ہو سکا ان میں سے ایک سورت برأت میں ہے اور دوسرا سورۂ حشر میں ہے۔

۱۲، ۱۳ - دو اہم خصائص خود حضرتِ مؤلف کی نگاہ میں

حضرت نے جو امور ملحوظ ذکر فرمائے ہیں

جیسا کہ وضاحت کی گئی دراصل وہ سب اس تفسیر کے خصائص ہیں مگر دو امر ایسے ہیں کہ خود حضرت نے ان کو بطور امتیاز بعض سلسلۂ گفتگو میں ذکر فرمایا ہے،

سب سے اہم خصوصیت تقطیع و سرخیاں

یعنی ایک لمبی سورت کی آیات کو، سلسلۂ مضامین کو ملحوظ رکھتے ہوئے مختلف حصوں و ٹکڑوں میں تقسیم کرنا اور ان کے مضامین کا جو حاصل و خلاصہ ہے اس کے مطابق ان کے لیے سرخیاں تجویز کرنا۔ حضرت نے اس کو سب سے اہم خصوصیت بتایا ہے۔

نقل کیا گیا ہے کہ ایک مرتبہ مجلس میں کسی صاحب نے بیان القرآن میں ربط آیات کے اہتمام کی تعریف کی، حضرت نے فرمایا بے شک یہ بھی اللہ کا فضل ہے لیکن میرے نزدیک کوئی زیادہ اہم چیز نہیں کیونکہ ربط آیات کے بیان کی ضرورت ہی زیادہ نہیں۔

> "البتہ اس تفسیر میں ایک چیز ایسی ہے جس کو میں نے بڑی مشقت اور محنت سے جمع کیا ہے وہ اب تک کسی دوسری تفسیر میں میری نظر سے نہیں گذری۔ وہ یہ کہ مضامین قرآنیہ کی سرخیاں آیات کے شروع میں لگادی ہیں کہ اہل علم اگر قرآن کریم کے حاشیہ پر یہ عنوانات ہی لکھ لیں تو پوری تفسیر کا کام ان سے لے سکتے ہیں"۔[۱]

---

[۱] مجالس حکیم الامت از مفتی شفیع صاحب ص ۱۷۱ (طبع روز)

بیان القرآن کے خطبہ میں حضرت نے اس کا فائدہ آیات کی پوری تفسیر کے ملاحظہ سے پہلے اجمالاً ان کے خلاصہ کا ذہن میں آجانا و مستحضر رہنا ذکر فرمایا ہے نیز اس سے مفصل تفسیر کے مطالعہ پر ایک خاص نفع و حظ کا حاصل ہونا ذکر فرمایا ہے

اور حقیقت یہ ہے کہ یہ چیز واقعۃً نہایت مہتم بالشان ہے ایک تو آیات کی اس انداز پر تقطیع پھر ان کے لیے عنادین و سرخیوں کی تجویز شاید حضرت کا ہی امتیاز ہے پھر عنادین و سرخیوں کی تجویز میں ایسے جچے تلے الفاظ کا لانا کہ جو ان معنون آیات کے مضامین کا خلاصہ ہوں اور ان کا لب لباب ہوں یہ اس بات میں حضرت کا ایک مجتہدانہ کارنامہ ہے کہ چند چند لفظوں میں کئی کئی آیات کا نچوڑ حضرت نے سامنے کر دیا ہے۔

شروع سے اخیر تک یکسانی

تفسیر کی ایک دوسری اہم خصوصیت جسے خود حضرت نے ذکر فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ اس میں سارا زور صرف شروع میں نہیں صرف فرمایا گیا ہے بلکہ جو امور ملحوظ رہے ہیں ان کی شروع سے اخیر تک مکمل رعایت کی گئی ہے، بلکہ جیسا کہ اعتراف کیا گیا ہے اور خود حضرت نے تصدیق فرمائی ہے کہ کام جیسے جیسے آگے بڑھتا گیا ہے، مزید وقیع ہوتا گیا ہے، بقول حضرت کام کے آگے بڑھنے کے ساتھ مناسبت کھلتی اور بڑھتی گئی تو دماغ سے مضامین بھی زائد سے زائد اور نادر سے نادر برآمد ہوتے گئے[1]

---

[1] تالیفات اشرفیہ، ابتدائی صفحات

چار اہم علمی خصائص

یوں تو جیسا کہ خود حضرت نے وضاحت فرمائی ہے کہ بیان القرآن کا مقصود اہل علم نہیں ہیں بلکہ صاحبِ ذوق عوام و طلبہ ہیں، مگر ایک تو حضرت کا قلم فیض رقم کہ جس سے لکھا ہوا ایک ایک جملہ بحرِ علم و معرفت کا گوہر نایاب اور گرانقدر موتی ہوا کرتا ہے، پھر وہ حالات و ماحول جن میں اس کی تالیف ہوئی۔ مزید برآں اردو میں ترجمہ و تفسیر کے ذریعہ قرآن کریم کے مطالب کا بیان، کہ اس کی عظمت کی بنا پر اچھے خاصے اصحاب فضل علماء کے لیے بھی بے تکلف بامقصد ترجمہ کسی آیت کا آسان نہیں ہے کہ جس میں آیت کے جملہ نکات و لطائف ملحوظ ہوں، اس چیز کی وجہ سے کتاب اپنے عام افادات ہی کی نسبت سے اہل علم کے مطلب کی اور ان کے لیے مرکز توجہ ہے، جیسے کہ پیچھے جو عام خصائص ذکر کیے گئے ہیں خود وہ خصائص بھی اس کے مقتضی و داعی ہیں کہ ان کی بنا پر آدمی اس محنت سے کہ دسیوں کتابوں کی ورق گردانی کرتے، ذہن پر زور ڈالتے، اس سے بچتا ہے۔

مزید برآں یہ کہ کتاب کی افادیت کو عام کرنے اور عوام میں محدود نہ کرنے خواص کے ہاتھوں میں اس کو متداول بنانے کے لیے حضرت نے اس میں جن علمی حقائق کو شامل فرما دیا ہے، انہوں نے اہل علم کے لیے کتاب کی قدر و قیمت کو اس درجہ بڑھا دیا ہے کہ اس گرانقدر تفسیر سے بے نیازی نہیں برتی جا سکتی۔ ایسے اہم علمی خصائص جو کہ نہایت واضح ہیں، چار ہیں۔

۱- وہ علمی افادات جو کہ اصل تفسیر میں جا بجا بالخصوص فوائد کے عنوان کے تحت آئے ہیں جن کی اہمیت یہ ہے کہ علمی افادات کے پیش نظر حضرت

نے یہ فرمادیا ہے۔

اگر اہل علم اوّل صرف قرآن کا مطالعہ کر کے بطور خود غور کریں اور اس میں جو امور ذہن میں مجمل رہیں یا جو اشکالات واقع ہوں ان کو مستحضر کر کے پھر اس تفسیر کو ملاحظہ فرماویں تو انشاء اللہ تعالیٰ دوبالا لطف اور حظ حاصل ہو۔ اور انہیں کی بنا پر عوام اور عام طلبہ کو علماءؔ سے مراجعت وحل کرنے کی طرف خاص طور سے توجہ دلائی ہے اور اسے واجب بتاتا ہے حتیٰ کہ سبقاً سبقاً پڑھنے کو بھی فرمایا ہے پوری تفسیر کو، اور انہیں گرانقدر علمی افادات کی نسبت سے فرمایا ہے کہ بعض جگہ ایسے مضامین بھی آگئے ہیں کہ ان کا سمجھنا مخصوص اہل علم کے ساتھ ہے۔ اور پورے اعتماد و وثوق کے ساتھ فرمایا ہے کہ۔

"اس سے پورا لطف حاصل ہونے کی شرط علوم متعارفہ میں مہارت اور اس میں بھی کسی مقام پر تبحر و مراجعت تفاسیر کے بعد اس تفسیر کو ملاحظہ کرنا ہے۔

۲- وہ فنی نکات جن کو حضرت نے بصورت حاشیہ نمبر دے کر تحریر فرمایا ہے یعنی اصل تفسیر و مندرجات کے حواشی کے طور پر نفس ترجمہ یا مطلب پر نمبر ڈال کر ان کو عربی میں ذکر فرمایا ہے جن میں یہ بات نمایاں کی گئی ہے کہ کسی موقع پر متبادر مفہوم کے خلاف ترجمہ کیا گیا ہے، یا کسی لفظ و کلمہ کا اضافہ کیا گیا ہے یا ارتباطی مضمون کے طور پر جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کا منشاء و بنیاد کیا ہے۔

مثلاً **اقترب للناس حسابھم**" کے ترجمہ میں حضرت نے فرمایا ہے ان (منکر) لوگوں سے ان کا (وقت) حساب نزدیک آپہنچا۔ اس ترجمہ میں حضرت

نے (ان) اور (وقت) پر نمبر ۱؎ و ۲؎ ڈال کر حاشیہ میں بزبان عربی تحریر فرمایا ہے
۱؎ فی للناس، ان اشارۃ الی کون اللام للمعھود المشرکون فی مکۃ ۔
۲؎ فی حسابہم وقت اشارۃ الی تقدیر المضاف، ایسے ہی ھدی للمتقین ہ
کے ترجمہ پر نمبر ڈال کر تحریر فرمایا گیا ہے، ڈرنے والوں کو اقول فعلی ھذا
یکون التقوی علی معناہ الحقیقی الذی یکون قبل الایمان
دیوید تفسیر التقوی بہ ایرادہ فی مقابلۃ الاستغنار فی قولہ
فاما من اعطی واتقی الاٰیۃ فی صل التقوی الاھتمام وحاصل
الاستغناء عدم الاھتمام وھذا من المواھب

۳۔ وہ علمی مسائل جنہیں حضرت نے اصلاً کتاب کو عوام کے معیار سے بلند کر کے خواص کے معیار تک پہنچانے اور بالخصوص درس و تدریس سے متعلق لوگوں کے لیے تحریر فرمایا ہے، اس میں حسب موقع مختلف علوم و فنون سے متعلق اہم حقائق و مسائل آ گئے ہیں جنہیں بالخصوص تفسیر علمی میں ذکر کرنے کا اہتمام کیا جاتا ہے، یعنی نحوی و صرفی و لغوی توجیہات، بلاغت کے مسائل و نکات کلامی نظریات، شان نزول یا تفسیر سے متعلق روایات، اختلاف قراءت وغیرہ اس کو اصل تفسیر سے الگ لکھا گیا ہے کہ مقصود اہل علم ہیں، اسی لیے یہ عربی میں ہیں اور ان میں یہ اہتمام کیا گیا ہے کہ جس علم و فن کی بات لکھی گئی ہے اولاً ذرا جلی قلم سے اس علم و فن کا عنوان لکھ کر پھر متعلقہ چیز لکھی گئی ہے۔ مثلاً النحو اللغات، البلاغۃ، الروایات، الکلام، اختلاف القراٰۃ، اور ان امور کے ذکر کرنے میں بھی ایک خاص ترتیب ملحوظ ہے، کہ اولاً لغوی توجیہات کو ذکر فرماتے ہیں پھر نحوی

پھر نکات بلاغت کو، پھر کلامی مسائل کو، اور اخیر میں روایات کو، یہ حواشی حسب موقع طول واختصار میں مختلف ہیں، اکثر "ماقل وکفی" کا مصداق ہیں۔ اور مسئلہ کی اہمیّت وضرورت کی بنا پر طول وطویل بھی ہیں اسی لیے کہیں کہیں صفحہ کے آدھے یا اس سے زائد حصّے کو بھی گھیرے ہوئے ہیں، ان حواشی میں مذکورہ علمی دقائق کے علاوہ بعض بعض مقامات پر بعض لطائف ونکات اور فوائد بھی ذکر فرمائے گئے ہیں۔

۴۔ توضیحی حواشی، ایک چوتھی چیز توضیحی حواشی ہیں۔ جو شاذ ونادر کے درجے میں نہیں ہیں بلکہ وہ بھی ایک خاص مقدار رکھتے ہیں۔ کہیں کہیں عربی میں ہیں اور عموماً اُردو میں ہیں یہ بھی عموماً "فنی نکات" کی طرح اصل ترجمہ وتفسیر پر بطور تحشیہ ہیں، خال خال کہیں کہیں "علمی مسائل ودقائق" (جن کا نمبر تین کے تحت تذکرہ کیا گیا ہے) پر مبنی ہیں۔ ایسے مواقع پر یا خال خال عربی میں بھی ہیں۔

یہ توضیحی حواشی بھی خود حضرت ہی کے ہیں البتہ ان کے بنیادی طور پر دو حصّے ہیں کچھ حواشی ایسے ہیں جو خود حضرت نے بوقت تالیف رقم فرمائے ہیں، اور کافی حصّہ ایسا ہے جن کے ساتھ بطور مرجع "تقیا" کا تذکرہ ہے جو کہ حضرت کے ہمشیر زادہ مولانا سعید احمد صاحبؒ (برادر بزرگ مولانا ظفر احمد صاحبؒ) کا مرتب کردہ حضرت کے ان تفسیری افادات کا مجموعہ ہے جو انہوں نے حضرت سے افادۃً وتدریساً سنے تھے، اگرچہ اس کو وہ مکمل نہیں کر سکے تھے بعض حواشی دوسروں کے رقم کردہ بھی ہیں جیسے جلد اوّل کے صفحہ نمبر ا کا حاشیہ عــــہ پر مذکور ہے۔ اور نظر ثانی کی تمہید میں خود حضرت نے تصریح فرمائی ہے کہ بعض اہل علم

کی تحریر کردہ بعض چیزیں بطور حواشی مع ذکر محشی شامل کر لی گئی ہیں۔

بیان القرآن کا طریق تحریر واصطلاحات: بیان القرآن کی اشاعت میں جو انداز اپنایا گیا ہے ترجمہ وتفسیر ومتعلقات کے ذکر کا، اس کی توضیح یہ ہے کہ اولاً حوض کے اندر متن قرآن ہے جس کی ہر سطر کے نیچے ترجمہ ہے ہر صفحہ میں جتنا حصّہ اس کا لانا مقصود ہے یا جو آیا، اس کے بعد حوض کے اندر ہی تفسیر کا حصّہ ہے جس میں یہ کیا گیا ہے کہ ترجمہ سے زائد درمیانی حصّوں کو بین القوسین ذکر کیا گیا ہے، اور ترجمہ کے حصّے پر خط کھینچ دیا گیا ہے۔

ترجمہ ومختصر توضیح کے پورے ہونے پر دیگر فوائد ومسائل وتوضیحات کو ذکر کیا گیا ہے جن کے لیے ف کو بطور تنبیہ وسرخی اپنایا گیا ہے، حوض کے نیچے اصل حاشیہ میں مختلف علوم وفنون کے دقائق وضروریات مذکور ہیں جو عربی میں ہیں اور ان کے بعد فنی نکات نمبر ڈال کر مذکور ہیں اور ان کے بعد توضیحی حواشی ہیں، جن کا تفصیل سے ذکر گذر چکا ہے اور حوض کے باہر صفحات کے داہنے وبائیں کناروں پر مسائل السلوک مع ترجمہ ہے۔

آخری مہتم بالشان خصوصیت اس تفسیر کی خصوصیت یہ ہے جو کہ شاید صرف اس کے خصائص میں سے ہو ورنہ شاذ ونادر کے درجہ میں تو ہے ہی کہ ایسی تحقیق وتفصیل پر مبنی ہونے کے باوجود حضرت مؤلف قدس سرہ نے اس کی تالیف کے تقریباً بیس سال کے عرصہ کے بعد اس پر باقاعدہ نظر ثانی فرما کر حسب موقع ترمیم واصلاح کی اور اضافے فرمائے اور اب جو متداول نسخہ ہے وہ نظر ثانی کے بعد کا ہی ہے۔

نظرِ ثانی کے متعلق خود حضرت نے فرمایا ہے کہ ۱۳۲٦ھ میں تفسیر کی اشاعت کے بعد خود مجھے اس پر جابجا سے بارہا نظر کرنے کا اتفاق ہوا اور میرے بہت سے احباب نے اس کا بالاستیعاب مطالعہ کیا، اس نظر اور مطالعہ کے درمیان خود مجھ کو بھی اور احباب کے تقریراً یا تحریراً، ابتداءً یا استدعاءً متنبہ کرنے سے بھی بعض مقامات قابلِ ترمیم و اضافہ معلوم ہوئے اور مطبوعہ سابق میں حواشی وغیرہ کی طرزِ تحریر میں بھی بعض مقامات پر میری تجویز کے خلاف ترمیم کر دی گئی تھی جو مجھ کو ناپسند تھی۔ بناءً علیہ جی چاہتا تھا کہ یہ تفسیر مع ترمیم و اضافہ اسی طرز پر جس پر میں نے اصل مسودہ لکھا تھا طبع ہو جائے۔ بالآخر موقع آیا تو نظرِ ثانی اس طرح کی کہ مولوی عبدالکریم صاحب گمتھلوی اوّل تفسیر کے ان مقامات کا جو اہلِ علم کے متوجہ کرنے سے مشورہ طلب ثابت ہوتے مطالعہ کر کے مقاماتِ اشتباہ کو نوٹ کر لیتے تھے پھر ان مقامات کو میرے سامنے پیش کرتے تھے ان میں غور کر کے میں نے تفسیر میں جابجا مناسب ترمیم کر دی اور ان مقامات کا ایک حصّہ وہ بھی ہے جو ترجیح الراجح میں شائع ہو چکا ہے اور بعض اہلِ علم نے متعدد مقامات کے متعلق کچھ عبارتیں بطور حاشیہ لکھ کر پیش کیں اب ان کو حاشیہ میں داخل کر دیا گیا اور محشی کا نام بڑھا دیا گیا۔"

نظرِ ثانی میں اس پر اتنا کام ہوا ہے جیسے کہ نظرِ ثانی کے بعد کے ایڈیشن میں اصل تفسیر کے ساتھ حضرت کے دو رسالے کیا بلکہ کتابیں بھی شامل کر دی گئی ہیں۔ جن کا تعارف و تذکرہ گذر چکا ہے، ایک مسائل السلوک جس کو مع اردو ترجمہ ہر صفحہ پر لکھا گیا ہے۔ دوسرا وجوہ المثانی، اس کو اس طرح شامل کیا گیا ہے کہ اس

رسالہ کا جس قدر مضمون جس جلد کے متعلق تھا اس کو ہر جلد کے آخر میں درج کر دیا گیا ہے اور اس کے بعد اس کا نام مکمل بیان القرآن تجویز کیا گیا۔

بیان القرآن ترجمہ کے خصائص

غیر عربی زبان میں قرآن کریم کی تفسیر و تشریح کے لیے ظاہر ہے کہ خود آیات کے الفاظ کا ترجمہ اور دوسری زبان میں تفہیم ضروری ہے اس کے بغیر مقصود پورا نہیں ہو سکتا۔ جیسے کہ محض ترجمہ پر بھی اکتفا کر لی جاتی ہے، چنانچہ بہت سے حضرات نے مفید انداز و اسلوب میں محض ترجمہ ہی کیا ہے، زیادہ سے زیادہ کچھ توضیحی حواشی رقم فرما دیئے ہیں اور جن حضرات نے تفسیر کا کام کیا ہے تو یا خود ترجمہ کیا ہے یا دوسرے ترجمہ کا سہارا لیا ہے (جیسے کہ مولانا دریا آبادی و مفتی شفیع صاحب وغیرہ نے کیا ہے)

حضرت کے کام کی خصوصیت یہ ہے کہ حضرت نے حالات کا لحاظ فرما کر محض تفسیر و بیان مطالب پر اکتفا نہ کرتے ہوئے قرآن کریم کی آیات کا ترجمہ بھی فرمایا ہے، جس کے مستقل خصائص ہیں انہیں خصائص کی بنا پر بعد کے کام کرنے والوں کے لیے عموماً یہ سند کی حیثیت اختیار کر گیا ہے اور ہمارے حلقہ کے لوگ جہاں کہیں ترجمہ کے ذکر کرنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں اکثر و بیشتر حضرت تھانوی کے ترجمہ کا ہی ذکر کیا کرتے ہیں وہ موجودہ عرف و حال کے مطابق کچھ زیادہ ہی مطلب خیز اور سلیس قرار دیا گیا ہے، ترجمہ پر گفتگو کرتے ہوئے خود حضرت فرماتے ہیں

۱۔ ترجمہ نہایت آسان کیا گیا ہے جس میں قابل فہم ہونے کے ساتھ لفظی موافقت کی بھی رعایت ہے۔ اگرچہ یہ رعایت حضرت شاہ عبد القادر صاحب کے ترجمہ سے

استناد کرتے ہوئے ذرا عام ہے بایں معنی کہ کہیں پر حاصل ذکر کر دیا گیا ہے۔ اور کہیں اصل معنی کو۔

۲۔ ترجمہ میں خالص محاورات نہیں استعمال کیے گئے ہیں جس کی حضرت نے دو وجہیں ذکر فرمائی ہیں۔ اول یہ کہ محاورات شہر میں چلا کرتے ہیں، اور حضرت کا تعلق دیہات و قصبہ سے تھا، اگرچہ یہ محض تواضع پر مبنی ہے ورنہ حضرت نے دیہات میں رہ کر جس انداز کی معلومات بہم پہنچائیں اور ان سے متعلق اصلاحات فرمائیں شہروں میں پلنے و بڑھنے والوں کو ان کی ہوا بھی نہیں لگنے پاتی۔

دوسری وجہ جو اصل واہم ہے وہ یہ ہے کہ محاورات ہر مقام کے مختلف ہوتے ہیں اسی درجہ کہ دہلی کا محاورہ لکھنؤ والا، اور اس کے برعکس دہلی والا سمجھنے سے عاجز ہوتا ہے، اور ظاہر ہے کہ مقصود افادۂ عوام ہو تو ایسے محاورات مفید و عام فہم کب ہو سکتے ہیں، محاورات میں اختلاف زمان کا بھی اثر پڑتا ہے یہی وجہ ہے کہ شاہ عبدالقادر صاحب کا گرانقدر ترجمہ جو کہ الہامی قرار دیا گیا ہے، ایک زمانہ گزرنے پر اکابر علماء نے اس میں کچھ رد و بدل کی ضرورت محسوس کی اور یہ کام حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندیؒ نے کیا ہے۔

بہر حال حضرت نے اس مشکل کا احساس کر کے ایسے انداز کے ترجمہ کو پسند کیا جو تقریباً سارے بلادِ ہند کے اردو دان و اردو خواں حضرات کے لیے قابل فہم ہو، اس لیے بقول حضرت ترجمہ کی زبان کتابی، عام لکھنے پڑھنے والی ہے مگر ایسی کہ جو فصاحت کے ساتھ سلاست بھی رکھتی ہے۔

۳۔ تیسری بات جو حضرت کی بعض تصریحات سے واضح ہے وہ یہ ہے کہ اعلیٰ

ادبی تعبیرات سے احتراز کیا گیا ہے کہ یہ تعبیرات تکلف سے خالی نہیں ہوتیں یا بہ تکلف سمجھی جاتی ہیں اور کلام پاک کا جو سادہ و دلنشیں اسلوب ہے وہ اس کے منافی ہے، حضرت نے ایک موقع پر اس انداز کے ایک ترجمہ کے متعلق فرمایا۔

"اس میں جو زبان استعمال کی گئی ہے اسے اردو ادیب چاہے پسند کرتے ہوں مگر شاہانہ کلام سے بعید ہے۔[1]

۴۔ اس ترجمہ کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ بطور ترجمہ جو مفہوم ذکر کیا گیا ہے وہ ہے جو کہ سلف صالح کے مسلک کے تابع اور نزول قرآن کے مقصود کے عین مطابق اور ساتھ ہی ایسا ہے کہ اس سے دوسرے بہت سے ترجموں کی طرح شکوک و شبہات نہیں پیدا ہوتے، عربیت کے قواعد اور دیگر اصول شرع کی پوری پوری رعایت کو مدنظر رکھا گیا ہے، اور ظاہر ہے کہ جو امور تفسیر و تشریح میں ملحوظ ہیں ان کو ترجمہ میں بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔

اس ترجمہ کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ بعد کے عہد کے دو ممتاز و صاحب نظر، اور صاحب قلم و زبان، علماء و مفسرین نے اپنے تفسیری کام کے لیے حضرت کے ترجمہ کو اختیار کیا ہے، ایک تو مفتی محمد شفیع صاحب نے اپنی تفسیر معارف القرآن میں، کہ تفسیر کے ساتھ انہوں نے حضرت کے ترجمہ کو ہی لیا ہے، اگرچہ زیر متن انہوں نے حضرت شیخ الہند کا ترجمہ ذکر کیا ہے جو در اصل حضرت شاہ عبدالقادر صاحب کا ہے، جس کا مقام معروف ہے، مگر تفسیر میں حضرت کے ترجمہ کو ہی مدار بنایا ہے کہ حضرت کا ترجمہ عصر حاضر کے اعتبار سے اقرب الی الفہم اور جاذب

---

[1] مجالس حکیم الامت ص ۷۵

بھی ہے۔ دوسرے مولانا عبدالماجد صاحب دریاآبادیؒ جن کی تفسیر ماجدیؒ بالخصوص ان مآخذ کی معلومات سے بہرور ہونے کی وجہ سے جن تک عام علماء کی رسائی نہیں یعنی اصل کتاب سے متعلق معلومات براہِ راست ان کے مآخذ سے نیز مغربی مفکرین کے افکار و نظریات) ایک خاص شان کی حامل ہے اور مختلف وجوہ سے مولانا کو اہمیت حاصل ہے انہوں نے جیسا کہ خود تصریح کی ہے حضرت کے ترجمہ کو ہی مدار و سند قرار دیا ہے باوجود اس کے کہ مولانا کو اُردو زبان پر قدرت تھی اور اُردو زبان و ادب میں ان کا اور ان کی تحریرات کا جو مقام ہے وہ اظہر من الشمس ہے مگر وہ حضرت کے ترجمہ کے کس طرح قائل تھے اور اس کو انہوں نے کیا مقام دیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

اس تفسیر کے اُردو ترجمہ کا جہاں تک تعلق ہے ۷۵ فیصدی حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی نقل ہے حقیقت یہ ہے کہ پرانے ترجموں میں شاہ رفیع الدین دہلوی کا ترجمہ اور نئے ترجموں میں حکیم الاُمت کا ترجمہ بس یہ دو ترجمے باقی تمام ترجموں سے بے نیاز کر دینے والے ہیں پہلا ترجمہ لفظی ہے اور دوسرا بامحاورہ و مطلب خیز۔

غور فرمائیے کہ زبان میں ٹکسال و سند کی حیثیت رکھنے والا ایک صاحب نظر اور ادیب عصر حضرت کے ترجمہ کو "بامحاورہ" قرار دے رہا ہے اس کے بعد پھر اس ترجمہ کی قدر و قیمت کی بابت کیا تردد و شبہ ہو سکتا ہے۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ حضرت کے استاذ الاساتذ الکل حضرت شیخ الہندؒ نے بھی حضرت کے ترجمہ کو سراہا ہے اور اس کو عمدہ کہا ہے، بلکہ حضرت کے ترجمہ اور مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھیؒ کے ترجمہ کا ذکر کرتے ہوئے اپنے لیے ترجمہ کے کام کی عدم ضرورت کا ذکر فرمایا ہے۔

بیان القرآن کے مراجع

قرآن کریم کی تفسیر و ترجمہ، کلام الٰہی کی مطلب بیانی و ترجمانی ہے اور ذات خداوندی کیطرح اس کا کلام بھی عظیم ہے، اور اس کلام کی تشریح و تفسیر بھی، اس کی عظمت و اہمیت کا اندازہ اس معروف ارشاد نبوی سے لگائیے ؛

من تکلم فی القرآن برأیہ فأصاب فقد أخطأ (ابوداؤد نسائی)

من قال فی القرآن بغیر علم فلیتبوء مقعدہ من النار (ابوداؤد)

اس کے بعد کم از کم کسی محتاط آدمی کے لئے کب اس کی گنجائش رہ جاتی ہے کہ وہ کچھ محض اپنی طرف سے کہے اور سابق ذخیرہ سے صرف نظر کر کے اور آنکھ بند کر کے کہے، تفسیر سے متعلق سارے گرانقدر کام سابق منقولات و ماثورات کی بنیاد پر ہی ہوئے ہیں۔ یہ بات الگ ہے کہ ترجیح و تطبیق اور حسب موقع توجیہ کی بنا پر ان کو امتیاز و تفوق حاصل ہے، حضرت نے امور ملحوظہ کے بیان میں اپنی تفسیر کی بنیادوں کی جو وضاحت کی ہے جیسا کہ گزر چکا ہے ان کا حاصل یہی ہے کہ اس پر خودرائی و تفرد نہیں ہے بلکہ اتباع و اقتداء ہی ہے، جو کچھ لیا گیا ہے، کہاں کہاں سے لیا گیا ہے جگہ بجگہ اصل تفسیر و حواشی میں تصریح موجود ہے، مزید یہ کہ خطبہ میں حضرت نے اہتمام سے ذکر فرما دیا ہے کہ کیا کیا کتابیں سامنے رہی ہیں، وہ حسب ذیل ہیں۔

جلالین، بیضاوی، تفسیر رحمانی، معالم التنزیل، روح المعانی،

مدارک، خازن، ابن کثیر، فتح المنان، الدر المنثور، کشاف اتقان، لباب النقول، قاموس، بعضے تراجم،

بعض شروع سے رہیں بعض بعد سے حتیٰ کہ بعض بالکل اخیر میں ملیں۔ اس کے مطابق حوالہ جات آئے ہیں، اور ظاہر ہے کہ جو کام ہوا ہے وہ محض انہیں کتابوں کی بنیاد پر اور ان کے مندرجات کے سہارے نہیں ہو سکتا تھا اس لیے حسب موقع حدیث و فقہ اور سیر و مغازی کی کتابوں سے بھی مراجعت کی گئی ہے، جیسے کہ دیگر علوم و فنون کی کتب کی ضرورت پڑی تو وہ، ورنہ ان کے اصول و قواعد تنے مدد مل گئی ہے اور وہ سامنے رہے ہیں۔

اس کے ساتھ اپنے ذہن کے ذخیرہ سے بھی کام لیا گیا ہے جو ان کتابوں کی معلومات سے الگ اکابر کے استفادات کے ثمرہ و حاصل کے طور پر ذہن میں جمع تھا، چنانچہ بحیثیت مراجع، بہت سے مواقع پر استاذی، یا مرشدی کے حوالے بھی آئے ہیں، استاذی کے حوالے سے ان استاد خاص حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی کے افادات کو ذکر کیا ہے اور مرشدی کا مرجع، حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ ہیں۔

" اور اس فن عظیم کی ذمہ داریوں کا جو تقاضہ ہے ان کی نسبت سے کون یہ کہہ سکتا ہے کہ اس کام کے اس انداز میں انجام پانے کا بنیادی ذریعہ اور مرجع و ماخذ حضرت کو قدرت کا عطا کردہ ملکۂ تفسیر نہیں تھا اور اس کا کوئی دخل نہیں ہے "۔ جب عام علوم و فنون سے متعلق کسی وقیع کام کے لیے اس علم و فن کے مناسب ملکہ کی ضرورت کسی نہ کسی درجہ میں پڑتی

ہی ہے تو اس فن کا معاملہ تو نہایت ارفع و اعلیٰ ہے، حضرتؒ نے خود فرمایا ہے کہ یہ فن تو میرے خصوصی مناسبت والے فنون میں سے ہے جس کی حضرت حاجی صاحب نے دعا فرمائی تھی، "یہ خصوصی مناسبت" اگر فن کے ملکہ کا نام نہیں ہے تو اور کیا چیز ہے، بہرحال یہ ملکہ ہی وہ بنیادی چیز ہے کہ جس سے انتخاب و ترجیح میں مدد لی گئی ہے اور جس کے طفیل بہت سی مندرجات بغیر کسی ماخذ کے حوالہ اور اس سے استناد کے حضرت نے اپنی اس تفسیر میں سپرد قلم فرمائی ہیں اور ہر ایسے موقع پہ بے تکلف اظہار بھی فرما دیا ہے کہ یہ اپنے ذہن سے کہا جا رہا ہے، مگر ملکہ وہ وصف ہے کہ جس کے ہوتے ہوئے بظاہر بغیر ماخذ و سند کے جو بات کہی جاتی ہے موقع پڑنے پر مراجعت سے اس کی سند و ماخذ کی تحقیق ہو ہی جاتی ہے۔ چنانچہ حضرت کے ذکر کردہ ایسے مندرجات کی اسناد اگر تلاش کی جائیں تو ان شاء اللہ ضرور ملیں گی اور اگر کہیں نہ مل سکیں تو وہ ابتداء و اختراع کے درجہ میں بہرحال ہوں گی، اور ذکر کردہ دونوں حدیثوں کا مصداق علماء نے اسی رائے وخیال کو قرار دیا ہے جو "اختراع محض" کی حیثیت رکھتی ہو۔

یہی وہ ملکہ ہے کہ جس کی بناء پر صاحب فن کو فن سے متعلق کسی مسئلہ میں کسی رائے کے اختیار کرنے میں، کسی مسئلہ سے متعلق منقول مختلف آراء کے درمیان ترجیح میں، اور اس بات کی بابت انشراح صدر کے حاصل کرنے میں الجھن بلکہ ایک قسم کے اضطراب وبے چینی کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ جس کو یہ ملکہ حاصل ہوتا ہے اور از روئے دیانت اس کو اس پر اطمینان ہوتا ہے کہ الحمد للہ

مجھے یہ جوہر دولت حاصل ہے اس کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ فن سے متعلق پورے انشراح صدر کے ساتھ جو بات اس کے ذہن میں آتی ہے اصول و قواعد کی مکمل رعایت رکھتے ہوں، اسے پورا وثوق و اعتماد ہوتا ہے کہ یہاں یہی مطلب ہونا چاہیئے، اور یہی ہے یہ بات الگ ہے کہ اہمیت و نزاکت کا احساس کرتے ہوئے وہ دوسروں کے سامنے اس سے اظہار اور اس کی اشاعت کے لئے سلف سے اس کی سند و تائید کی تلاش میں رہتا ہے اور تائید مل جانے پر اس کا برملا اظہار کرتا ہے، اور تائید نہ ملنے پر انشراح صدر کی وجہ سے اختیار اسی کو کرتا ہے مگر ایک قسم کی کھٹک کے ساتھ، اور تائید نہ ملنے کے باوجود اس کا اظہار وہیں ہوتا ہے جہاں سلف سے اس کے موافق کوئی صریح قول نہیں ملتا اور مخالفت بھی منقول نہیں ہوتی، یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اگر سلف کی تصریحات سے اس کی تردید ثابت ہوتی تو پھر بھی اس پر اعتماد کیا جائے۔ حضرت سے بیان القرآن کے متعلق نقل کیا گیا ہے:

" تفسیر بیان القرآن کے بعض بعض مقامات کی تفسیر لکھنے کے قبل میں آدھ آدھ گھنٹہ ٹہلتا رہا اور سوچتا رہا اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا رہا، تب کہیں جاکر شرح صدر ہوا!"

نیز فرمایا " بیان القرآن میں، میں نے یہ بھی التزام کیا ہے کہ تفسیر تو وہی لکھی ہے جو خود میری سمجھ میں آئی لیکن جب تک اس کی تائید سلف صالحین کی تفاسیر سے نہیں ملی، اس پر اطمینان نہیں کیا ـــــ اور جہاں اپنی تفسیر کی کوئی صریح تائید سلف سے باوجود تلاش کے نہیں ملی وہاں بھی رکھا، میں نے اپنی تفسیر کو لیکن

اس کے آگے یہ لکھ دیا۔ وہذا من المواہب ہے

بیان القرآن کا معیار و مقام

بیان القرآن کی تالیف کا جو اصل باعث محرک ذکر کیا گیا ہے اور اس کے ذریعے اصلاً جس ضرورت کا رفع کرنا مقصود تھا اس کی نسبت سے تو یہ ایک ایسی تفسیر تھی جو عوام ہی کے لئے تھی اور اس کو انہیں کے لئے لائق اعتنا ہونا چاہئے تھا چنانچہ حضرت نے خود مقدمہ میں ضرورت و تالیف کا ذکر کرتے ہوئے جو تصریحات فرمائی ہیں وہ اس کی مظہر ہیں، یہی وجہ ہے کہ اس کی زبان اردو رکھی گئی ہے جو کہ بوقت تالیف ہند کے عوام اہل اسلام کی زبان عام بن چکی تھی، یا زیادہ سے زیادہ متوسط درجہ کے طالب علم، کہ حضرت نے خود فرمایا ہے کہ زمانہ حال کا لحاظ کر کے لکھی ہے اور طلبہ کے واسطے لکھی ہے، عوام کا لحاظ اس میں کم ہے۔

مگر واقعتاً اس میں جو کچھ آگیا ہے اور حضرت نے طول سے احتراز کے باوجود جو کچھ تفصیلات اس میں جمع کر دی ہیں ان کی وجہ سے یہ تفسیر کتنی گرانقدر و بلند معیار ہو گئی ہے اس کا اکابر و افاضل علماء کی ان تصریحات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے جو کتاب سے متعلق ان کے تاثرات کی حیثیت سے نقل و محفوظ کی گئی ہے، اور ایسا نہیں ہے کہ حضرت کو اس کا احساس تھا حضرت کو جو دقت فکر و وسعت نظر عطا ہوئی تھی اس کی بنا پر حضرت کو بخوبی احساس تھا کہ یہ تفسیر جسے انھوں نے عام ضرورت کے لحاظ سے تیار کیا ہے اور بقول خود عوام و طلباء کا افادہ پیش نظر ہے جس کا مبلغ علم و معیار معلومات کچھ زیادہ نہیں ہوتا، یہ اپنے مندرجات کی وجہ سے محض اسی مبلغ و معیار کی تفسیر نہیں

رہ گئی ہے بلکہ حضرت کے وفور علم، تبحر معلومات، علوم متداولہ وفنون اسلامیہ میں حضرت کی کمال مہارت، اور بالخصوص تفسیر سے خصوصی مناسبت کی آئینہ ومظہر بن کر اس معیار و درجہ کی چیز ہو گئی ہے کہ حضرت نے خود خطبہ میں فرمایا ہے۔" لیکن باوجود اتنی رعایت کے بھی علماء و طلبہ کے لئے بہت سے مقامات میں علماء سے استغناء نہیں ہو سکتا لہٰذا مناسب بلکہ واجب یہ ہے کہ ایسے حضرات صرف اپنے مطالعہ و فہم پر اعتماد نہ فرمائیں بلکہ حسب ضرورت علماء یا منتہی طلبہ سے اس کو سبقاً سبقاً سمجھ کر پڑھ لیں ورنہ اقل درجہ اتنا ضرور ہے کہ مطالعہ کے وقت جہاں ذرہ برابر بھی اشتباہ رہے وہاں خود غور کر کے نہ نکالیں، بلکہ پنسل سے نشان لگا کر علماء سے وہ عبارت دکھلا کر حل کر لیں اور بدون اس کے احتمال بلکہ یقین غلط فہمی کا ہے اس کا یہی وہ پہلو ہے جس نے متعدد اکابر کو یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ بیان القرآن کی تسہیل کی طرف توجہ کی جائے اور اسے عوام کے لئے بھی آسان کر دیا جائے۔

یہ تصریح و تنبیہ تو حضرت نے کتاب کی عام مندرجات اور کتاب کے اصل مضامین کی نسبت سے فرمائی ہے ورنہ جب اللہ نے حضرت سے یہ گرانقدر کام لیا اور حضرت نے اس کے لئے قلم اٹھایا تو خود حضرت کو اس کا بھی خیال رہا کہ کتاب میں اس انداز کی چیزیں شامل کر دی جائیں کہ جن کی وجہ سے افاضل و اہل علم حضرات کی نگاہوں میں بھی یہ خاص قدر و قیمت کی حامل ہو جائے، اور یوں عوام و خواص سب کی ضرورت کی ہو۔ اور سب کے لئے مفید ہو کر مقبول عند الانام ہو چنانچہ جیسا کہ تفصیل گزر چکی ہے۔ حضرت نے اس قسم کے بہت سے امور بطور اور عربی میں تحریر فرمائے ہیں اور خود فرمایا ہے کہ چونکہ نفع عوام کے ساتھ افادۂ خواص کا بھی

کریگی اس لئے ان کے فائدے کے واسطے ایک حاشیہ بڑھایا ہے..... اور فرمایا ہے کہ اس حاشیہ کی عربی کی عبارت ،عربی اس لئے تجویز کی ہے کہ عوام اس کے دیکھنے کی ہوس ہی نہ کریں اور اخیر میں فرماتے ہیں کہ :

" اب اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ یہ تفسیر مختصر با ترجمہ مطول کہہ لیجئے عوام و خواص سب کے کام کا ہوگا ۔"

اور یہ اس تفسیر کے کمال کی انتہا ہے کہ یہ عوام و خواص بلکہ جیسا کہ شواہد موجود ہیں ۔ اخص الخواص سب کے لئے یکساں مفید ہے ، اس سے عام دیندار مطالعہ و معلومات کے شائقین کے ذوق کو بھی تسلی ہوتی ہے اور دیگر تشنگان معرفت و تحقیق کی پیاس بھی بجھتی ہے ، اور جاننے والے جانتے ہیں کہ کسی علمی و تالیفی کاوش میں ایسے معیار و اسلوب کا اختیار کرنا کہ جو عوام و خواص دونوں طبقات کو یکساں طور پر اپنی طرف کھینچ سکے ، جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے کہ دونوں طبقات کے ذوق اور دونوں کے معیاروں میں زمین و آسمان کا فرق پایا جاتا ہے ۔

بیان القرآن ، خود حضرت مؤلف کی نگاہ میں

بیان القرآن کے معیار کا ذکر تفصیل سے گزر چکا ہے ، حضرات علماء نے اس کے متعلق جن تاثرات کا اظہار کیا ہے وہ تو ہے ہی ، خود حضرت نے تحدیث نعمت اور اظہار حقیقت کے طور پر اپنی اس کاوش کو نہایت مہتم بالشان اور گرانقدر قرار دیا ہے اور ان کو اس کا حق تھا کہ اللہ نے انہیں جو نور علم دیا تھا ، تفسیر کا جو خصوصی ذوق دیا بلکہ دیا تھا اور انہوں نے اپنی اس کاوش کو مفید سے مفید تر ، اور زائد سے زائد ضرورت کو پورا کرنے کا ذریعہ

بنانے کے لئے اس کے پیچھے جو کوشش و محنت کی تھی، اس کے بعد ان کی اس کاوش کو اس لائق ہونا ہی چاہئیے تھا اور خود حضرت کو اس کی بابت اس قسم کے اعتراضات کا حق تھا جو کہ کسی طرح بیجا نہ تھا۔

بیان القرآن کے معیار کو بیان کرتے ہوئے خود حضرت کی تصریح گزر چکی ہے کہ حضرت نے اس کے مندرجات کے پیش نظر عوام کے لئے کیا ہدایت فرمائی ہے نیز یہ کہ یہ تفسیر عوام و خواص سب کے لئے ہے حتیٰ کہ حضرت نے یہاں تک فرما دیا ہے:

"اگر اہل علم اوّل صرف قرآن کا مطالعہ کر کے بطور خود غور کریں اور اس میں جو امور ذہن میں مجمل رہیں یا جو اشکالات واقع ہوں ان کو مختصر کر کے پھر اس تفسیر کا مطالعہ فرمائیں تو انشاء اللہ اللہ تعالیٰ وہ بالا لطف اور حظ حاصل ہو۔"

بلکہ اس ارشاد کو ملاحظہ فرمائیے کہ کس جزم کے ساتھ ارشاد فرمارہے ہیں۔

"یہ امر یقینی ہے کہ اس سے پورا لطف حاصل ہونے کی شرط علوم متعارفہ میں متعارف و مہارت اور اس میں بھی کسی مقام پر تحیر و مراجعت تفاسیر کے بعد اس تفسیر کو ملاحظہ کرنا ہے۔"

ایک موقعہ پر یہ بھی فرمایا ہے کہ:

"واقعی اوّل و آخر سے بہتر ہوتا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید سے جیوں جیوں مناسبت زیادہ ہوتی گئی اسی قدر زیادہ مضامین دماغ سے نکلتے گئے اکثر مصنفین کا دستور ہے کہ ابتدا میں سارا زور ختم کر دیتے ہیں اور انتہا میں سست پڑ جاتے ہیں اس میں ایسا نہیں ہے۔"

مقبولیت عندالانام من الخواص والعوام

بیان القرآن کے انداز کی کسی تفسیر کی ضرورت جس انداز کی تھی گزر چکا ہے اور یہ بھی کہ اصلاً یہ کس کے لیے ہے اور اس کی کیا شان ہے اور خود حضرت نے اس کی بابت کیا فرمایا ہے، واقعہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے حضرت کی اس گرانقدر کاوش، وتالیف کی "مشکورنیت" اس دنیا میں اس کی اس مقبولیت عامہ کے ذریعہ سب کو دکھا دی جو حق تعالےٰ نے اس کو عطا فرمائی۔

کتاب کی جو ضرورت تھی اور جس انداز میں کتاب ضرورت کو پورا کرنیوالی تھی۔ خود حضرت مولف قدس سرہ کو کتاب کے سامنے آنے سے پہلے جو عام مقبولیت و ہر دلعزیزیت اور اعتماد و استناد ابین الانام من الخواص والعوام، حاصل ہو چکا تھا، اس چیز نے کتاب کی مقبولیت میں چار چاند لگا دیئے، اور کتاب کے سامنے آنے پر اس طرح لوگ اس کی طرف متوجہ ہوئے اور انہوں نے اس سے استفادہ کیا، کسی بھی طبقہ کے استثناء کے بغیر جیسے کہ پیاسوں کو پانی مل جائے۔

اور شاید میرا یہ خیال غلط نہ ہوگا کہ اس عہد میں ایسے ضخیم جو اردو متراجم اور تفاسیر موجود تھیں اور اس کے بعد بھی عرصہ تک، جو مقبولیت اس کو حاصل ہوئی بلکہ اس عہد کے کاموں میں اب تک، حضرت کے اخلاص کی بدولت یہ مقبولیت کسی دوسری کاوش کو حاصل نہ ہو گی۔ بعد میں سامنے آنے والی بعض چیزیں جماعتی نظریات کی بنیاد پر اگرچہ کچھ زیادہ چل پڑیں مگر اہل حق کے درمیان جس طرح یہ رائج رہی ہے اور اس سے ہر قسم کا فائدہ اٹھایا گیا ہے اساتذہ نے پڑھانے کے لئے طلبہ

نے مطالعہ کے لئے عوام کے معلومات کے لئے عام مصنفین و مؤلفین نے ترجمہ آیات یا حسب توقع کسی مقام سے استدلال کے لیے حتیٰ کہ بعد کے اپنے حلقہ کے مقبول و معتمد اصحاب تفسیر نے اپنی کاوشوں کو تکمیل کے مراحل تک پہنچانے کے لئے اپنی ہی حلقہ کی کسی دوسری تفسیر کو یہ مقام نہیں حاصل ہوسکا۔ اس لئے اب تک بیان القرآن کی جتنی اشاعت ہوئی ہے کسی دوسری تفسیر کی نہیں ہوئی ہے، اب مفتی محمد شفیع صاحب کی "معارف القرآن" نے ضرور پورے حلقہ کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے اور وہ جس شان کی تفسیر ہے اس کا حق بھی یہی ہے، مگر یہ بات بار بار کہی جائے گی اور کہی جا رہی ہے کہ "معارف قرآن" دراصل "بیان القرآن" اور صاحب بیان القرآن کا ہی فیض ہے، اور یہ بھی حقیقت اپنی جگہ پر مسلم ہے اور رہے گی کہ کم از کم اہل علم اب بھی "بیان القرآن" سے مستغنی نہیں ہیں۔

حضرت کی گرانقدر تفسیر

بیان القرآن اکابر اہل علم و فضل و اصحاب تفاسیر کی نگاہوں میں

بیان القرآن کے جو خصائص و امتیازات ذکر کیے گئے ہیں اور خود حضرت نے جو کچھ اس کی بابت اعتماد و استناد کا اظہار کیا ہے اس کے بعد اس کے حق میں اہل علم کے جو اعترافات اس کے فضل و کمال اور تفوق و امتیاز کی بابت ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ جہاں حق ہیں وہاں کم بھی ہیں کہ وہ اس سے بھی زیادہ کی مستحق ہیں، اور کہلانے والوں نے جو اس کو "اشرف التفاسیر" یا "سرتاج تفاسیر" کہا ہے تو بیجا نہیں کہا ہے۔

واقعہ تو یہ ہے کہ حضرت نے اپنے اظہر من الشمس کمال احتیاط اور کمال للہیت و کمال تواضع کے باوجود، شخص اخلاص و للہیت کی بنیاد پر ہی اور دیانت کا تقاضا سمجھتے ہوئے اپنی تفسیر سے متعلق اپنی تصریحات کی صورت میں جو ایک دعویٰ اس کے کمال کا فرمایا ہے حق تعالیٰ نے بمصداق اِنَّ من عباد اللہ من لو اقسم علی اللہ لاَبرّہٗ [1] اکابر اہل علم بلکہ اصحاب تفاسیر کے تاثرات کی صورت میں اسی دعویٰ کی شہادت فراہم فرما کر اپنے ایک مخلص بندے کے مخلصانہ دعویٰ کی لاج رکھی ہے۔

بیان القرآن کے متعلق کہنے والوں نے کیا کیا کہا ہے، ظاہر ہے کہ نہ سب کو جمع کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی سب کا علم ہے، ہم یہاں چند ایسے حضرات کے

---

[1] بخاری الصلح، باب الصلح فی الآیۃ

تاثرات ذکر کرنا چاہتے ہیں جن کے علم و معرفت کا سکہ عالمی بازار میں چل رہا ہے'
دیارِ ہند و پاک میں تو ان کے نام و کام کی گونج ہے ہی اور ان کے جو امتیازی
کارنامے و مآثر ہیں ان میں تفسیر سے متعلق بھی ان کی گرانقدر خدمات شامل ہیں۔

حلقۂ دیوبند کے اکابر اہل علم میں مولانا انور شاہ صاحب کا مقام معروف ہے
کہ وہ چلتا پھرتا کتب خانہ کہلاتے تھے، تفسیر میں "مشکلات القرآن" جیسے نازک موضوع
پر انہوں نے اپنی یادگار چھوڑی ہے اور یوں عام معلومات تفسیریہ کا عالم یہ تھا کہ
علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی اپنے فوائد کی تالیف کے وقت مشکلات درپیش
ہونے پر ان سے دریافت کیا کرتے تھے کہ حضرت یہ مضمون کہاں ملے گا، شاہ
صاحب نہ صرف یہ کہ کتاب بتاتے، صفحہ و سطر بھی بتاتے اور علامہ کی مشکل حل ہو
جاتی، اور خود علامہ کا جو مقام ہے، وہ بھی معلوم ہے، تفسیر میں ان کے مقام و مرتبہ
کی شہادت ان کے فوائد و حواشی پر ترجمہ شیخ الہند کی صورت میں موجود ہے۔
جس کو سید سلیمان ندوی وغیرہ نے بہت وقیع قرار دیا ہے، بہر حال مختلف
مواقع پر نقل کیا گیا ہے کہ حضرت شاہ صاحب جیسے وسیع النظر عالم نے علامہ
شبیر احمد صاحب سے قرآن کریم کے بعض مقامات سے متعلق اشکالات کے
حل نہ ہونے کی الجھن کا ذکر کیا، تو انہوں نے بیان القرآن کی طرف رہنمائی کی
شاہ صاحب نے یہ کہہ کر معذرت کی کہ میں اردو کتابیں نہیں پڑھا کرتا مگر علامہ
موصوف کی تاکید کی بنا پر مراجعت پر مجبور ہوئے اور اس کے بعد ان تاثرات کا اظہار
کیا جسے خود حضرت تھانوی ان کے مقام و مرتبہ کی وجہ سے کمال مسرت کے
ساتھ نقل کیا کرتے تھے، ان تاثرات میں یہ بھی نقل کیا گیا ہے کہ میں سمجھتا تھا کہ

اُردو میں علوم ہی نہیں ہے۔ بیان القرآن سے معلوم ہوا کہ اُردو میں بھی علوم ہیں"۔
اور یہ بھی کہ "بیان القرآن" نے بہت سی تفاسیر سے مستغنی کر دیا ہے[1]۔ اور یہ بھی کہ
"میں سمجھتا تھا کہ یہ تفسیر عوام کے لیے لکھی گئی ہے لیکن اس سے تو علماء بھی استفادہ
کر سکتے ہیں"۔ اور ظاہر ہے کہ علامہ شبیر احمد صاحب نے ان کو جو مشورہ دیا تھا
خود ذاتی مطالعہ و دقیع تاثر کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا، اور اس سے میرے اس
دعویٰ کی پوری تصدیق ہوتی ہے کہ حضرت کے فرمودات بابت تفسیر کو حق تعالیٰ
نے پورا کر کے دکھا دیا کہ حضرت نے خاص طور سے یہ بات فرمائی ہے کہ
"اشکالات و الجھنوں میں پھنس کر اور مراجعت کتب کے بعد اس کو دیکھو تو
لُطف و نفع ہو گا"۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ سے حضرت کے حلقہ کا کون آدمی ناواقف ہے
اور ان کا تبحر علمی و قرآنی معلومات سے واقفیت کس پر مخفی ہے، "ارض القرآن"
کے نام سے ان کی گراں قدر کاوش اس باب سے متعلق موجود ہے، وہ اپنے
کمالات کی وجہ سے قدیم و جدید دونوں طبقات میں محبوب و ممدوح تھے اور
دونوں پر گہری نظر رکھنے والے تھے، سیّد صاحب کی نگاہ میں حضرت کی
تفسیر کا کیا مقام تھا، سیّد صاحب کے خاص اور ان کے علوم کے امین
و راز دار مولانا اشرف خاں صاحب پشاوری نے نقل کیا ہے کہ سیّد صاحب نے
اپنی عمر کے آخری لمحات میں اپنی اس شدید خواہش کا اظہار کیا کہ بیان القرآن

---

[1] الافاضات الیومیہ ج ۷ ص ۱۱۱، حاشیہ حیات الورص ۱۲۷، وغیرہ

کو عام لوگوں کے افادہ کے لیے آسان زبان میں املا کرانے کو جی چاہتا ہے جس کو "تسہیل البیان" کا عنوان دیا جائے۔ مگر زندگی نے وفا نہ کی ! نیز حضرت تھانوی سے متعلق سید صاحب کی شاید ہی کوئی تحریر حضرت کی تفسیر کے ذکر سے خالی ہو۔"

علماء دیوبند اور حضرت کے متعلقین میں سے مفتی محمد شفیع صاحب کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ چند ہی سال پیشتر ان کی وفات ہوئی ہے اس لیے ان سے واقفیت تازہ ہے، اور آج کل "معارف القرآن" کے نام سے ان کا تفسیری شاہکار عام و متداول ہے، مفتی صاحب کی نگاہ میں حضرت کے ترجمہ و تفسیر کی عظمت و وقعت کی روشن دلیل یہ ہے کہ ان کی تفسیر "معارف القرآن" کی گویا بناء ہی اس پر ہے۔ بالخصوص خلاصۂ تفسیر کے نام سے جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بیان القرآن ہی ہے کسی قدر تسہیل و ترمیم کے ساتھ، اور معارف و مسائل میں جو کچھ ہے وہ اگرچہ مفتی صاحب ہی کی کاوش ہے مگر جگہ جگہ اس کے تحت بیان القرآن کے اہم علمی مسائل و مشکلات کو سہل کر کے پیش کیا گیا ہے اسی لیے خود مفتی صاحب اور دوسرے حضرات مثلاً مولانا بنوری صاحب وغیرہ نے اس کا بیان القرآن کا خلاصہ و سہیل ہونا امتیاز کے ساتھ ذکر کیا ہے[۱] مفتی صاحب مقدمہ میں فرماتے ہیں "زمانہ دراز سے ایک تمنا دل میں تھی کہ بیان القرآن جو کہ ایک بے نظیر، مختصر مگر جامع تفسیر اور سلف صالحین کی تفسیروں کا لبِّ لباب ہے

---

[۱] البلاغ مفتی اعظم نمبر ص ۵۸۴ و ۵۸۵

لیکن وہ علمی زبان اور علمی اصطلاحات میں لکھی گئی ہے آجکل کے عوام اس سے استفادہ سے قاصر ہو گئے ہیں اس کے مضامین کو سہل زبان میں پیش کر دیا جائے۔ معارف القرآن کی اس تحریر نے بحمد اللہ وہ آرزو بھی پوری کر دی کیونکہ اس تفسیر کی بنیاد احقر نے "بیان القرآن" ہی کو بنایا ہے"۔

مولانا عبد الماجد صاحب کا تذکرہ آچکا ہے وہ فرماتے ہیں۔

"حکیم الامّت کی تفسیر، علوم و معارف سے لبریز اردو زبان میں اپنی نظیر آپ ہے[1]"

ایک موقع پر فرماتے ہیں" اسے اگر اردو کی ساری تفسیروں کا سرتاج سمجھا جائے تو شاید مبالغہ نہ ہو[2]"

بیان القرآن مؤلَّف و مؤلِّف کا مقام

کسی آدمی کے مقام و مرتبہ کا تعین عموماً اس کے کام کی بنیاد پر ہوتا ہے اور کام کے مرتبہ و شان کا تعین کام کی افادیت کی جہت و حیثیت پر موقوف ہے یعنی افادیت کا عموم و عظمت کام کی عظمت کی بنیاد ہے اور کام کی عظمت سے آدمی کے نام کی عظمت ظاہر ہوتی ہے۔ بیان القرآن سے متعلق مختلف انداز کی معلومات گذر چکی ہیں۔ اس کے خصائص و امتیازات اور اس سے متعلق تاثرات اور خود مؤلف کی بابت بھی ابتداء میں عرض کیا جا چکا ہے، ان ساری تفصیلات کے بعد

---

[1] تفسیر ماجدی طبع پاک

[2] ایضا طبع ہند اختتامیہ

مستقلاً یہ بتانے و کہنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی کہ اس گرانقدر مؤلف اور خود اس کے مؤلف کا فن میں کیا مقام ہے، ظاہر ہے کہ ایک آدمی تمام علوم متداولہ میں کمال و مہارت رکھتا ہے اور پھر کسی فن سے خصوصی مناسبت کا دعویٰ کیا جاتا ہے، اس کے لیے اکابر اہل فیض کی دعا ہوتی ہے، اس کے بعد اس فن میں اس کے مقام و مرتبہ کی رفعت کو کیا سوچا جا سکتا ہے، جبکہ اس بات پر مختلف صورتوں میں فن سے متعلق اس کے گرانقدر افادات بطور شواہد موجود ہیں اور مؤلف کا معاملہ یہ ہے کہ بڑے بڑے صاحب نظر فن کے پورے کتب خانوں کو کھنگالنے کے بعد اپنے درد کا مداوا اسی مختصر تفسیر میں پاتے ہیں اور بعد کے گرانقدر و نمایاں کام کرنے والے، عالمی شہرت کے حامل اپنے تفسیری مآثر کی بنیادیں اسی تفسیر پر رکھتے ہیں۔ جیساکہ تصریحات گذر چکی ہیں اور حضرت کے عام زبانی و تحریری افادات کو تو بنیاد بناتے ہی ہیں۔

حق یہ ہے کہ حضرت کے اس گرانقدر تفسیری کارنامے کا مقام جیساکہ علماء اکابر کے تاثرات شاہد ہیں۔ یہ ہے کہ ایک صاحب ذوق تفسیر کی دسیوں اور بڑی سے بڑی تفاسیر کے مطالعہ اور ان پر عبور کے باوجود حضرت کی اس تفسیر اور اس کے افادات سے مستغنی نہیں ہو سکتا بلکہ تفسیر سے شغل و شغف رکھنے والا کسی مرتبہ کا آدمی اس سے بے نیاز نہیں، جیساکہ پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے، اور ایسا نہیں کہ یہ بات صرف اردو دانوں اور اردو تفاسیر کی نسبت سے ہے۔ نہیں اور ہرگز نہیں، اگر خدا نے کسی کو توفیق دی اور یہ گرانقدر تفسیر کبھی عربی کے جامہ میں ہو گئی تب بھی اس کی یہ شان و امتیاز برقرار رہے گا بلکہ پھر تو اس کا کمال و تفوق اور

نمایاں ہوگا اور مزید نکھر کر سامنے آئے گا۔

بیان القرآن کے متعلقات

یعنی بیان القرآن سے متعلق اور اس کی معلومات کی بنیاد پر انجام دی جانے والی خدمات۔

کسی علمی وتالیفی کام کی مقبولیت اس کا افادہ واستفادہ کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اور جو کام اس وصف میں جتنا فائق ہو، اس کے افادہ اور اس سے استفادہ کا سلسلہ جتنا عام وتام ہو، وہ کام اتنا ہی مقبول عند الخلائق قرار پاتا ہے اور یہی چیز اس کے مقبول عند رب الخلائق ہونے کی دلیل وقرینہ ہوا کرتی ہے۔

مگر کمال مقبولیت یہ ہے کہ دوسرے اہل علم اس سے متعلق مختلف انداز کی خدمات کی انجام دہی کی ضرورت محسوس کریں اور اسے اپنی سعادت سمجھیں اور اہل دنیا ان کے اس قسم کے کاموں کو ان کا کارنامہ شمار کریں، چنانچہ اہل علم میں برابر یہ سلسلہ جاری رہا ہے اور ہے کہ حسب موقع وضرورت دوسروں کی مؤلفات کی تشریح وتحشیہ، اختصار وتوضیح، وغیرہ کا کام کیا جاتا ہے۔

شاید اردو تفاسیر میں حضرت تھانوی کی "بیان القرآن" ہی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس سے متعلق بعض خدمات کی انجام دہی کی اکابر اہل عصر نے شدید ضرورت محسوس کی اور اسے اپنی سعادت سمجھا اور اگر کچھ کر لیا تو انہیں اس سے بے انتہا مسرت حاصل ہوتی، گذر چکا ہے کہ سید سلیمان ندوی علیہ الرحمۃ کی شدید آرزو تھی کہ اس کی تسہیل کا کام کریں۔ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب علیہ الرحمۃ کی بھی یہ دیرینہ آرزو تھی، اور حق تعالیٰ نے ان کو اس کا موقع دیا، بہر حال اس

انداز کے کام مختلف حضرات نے مختلف انداز میں انجام دیئے ہیں جیسے کہ حضرت کی دیگر علمی و تالیفی خدمات سے متعلق بہت سے حضرات نے مختلف انداز کے کام خود حضرت کی حیات میں انجام دیئے ہیں۔

(۱) تلخیص البیان یہ بیان القرآن کی تلخیص ہے، جو مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی کا کارنامہ ہے۔ مولانا نے ایک سال کا عرصہ لگا کر اس کو مکمل کیا اور خود حضرت کے سامنے پیش ہوا تو حضرت نے بہت پسند فرمایا، اور "اشرف المطابع تھانہ بھون" سے حمائل شریف کے حاشیہ پر یہ طبع بھی ہوا ہے۔ اور بعد میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا ہے۔

(۲) معارف القرآن جو اپنی خاص ترتیب و مباحث کی وسعت و کثرت کے باوجود اصلاً بیان القرآن کی تسہیل ہے، اور اصولی طور پر اس کو جو تین حصوں میں مرتب کیا گیا ہے۔ اوّل متن مع ترجمہ شیخ الہند دوم خلاصۂ تفسیر، سوم معارف و مسائل، ان میں سے دوسرا حصہ خلاصۂ تفسیر اصل بیان القرآن ہی ہے جس کی تسہیل کر دی گئی ہے اور اس کے اہم و مشکل مباحث کو "معارف و مسائل" میں مدغم کر لیا گیا ہے۔ یہ کام مفتی محمد شفیع صاحب نے کیا ہے۔

(۳) تفسیر ماجدی میں حضرت کے زبانی افادات وغیرہ کے علاوہ مطبوعہ تفاسیر میں سے سب سے زیادہ اسی سے استفادہ کیا گیا ہے۔

(۴) المشفاء قرآن کریم پر وارد کیے جانے والے شبہات کے جواب میں تفسیر بیان القرآن کے مضامین کو سوال و جواب کے طرز پر

مرتب کیا گیا ہے اسی مجموعہ کا یہ نام ہے، یہ خدمت بھی مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی نے انجام دی ہے، یہ سلسلہ "النور" میں شائع ہوتا رہا، مگر مکمل نہ ہوسکا، ورنہ بڑی گرانقدر خدمت ہوتی۔

(۵) خلاصۃ البیان فی ترجمۃ القرآن | یہ بھی بیان القرآن کی تلخیص ہے جو حضرتؒ کے تلمیذ شاہ لطف رسول صاحب بارہ بنکویؒ نے کی ہے، مگر یہ کام صرف سورۂ بقرہ کے اخیر یعنی آیات ربوا تک ہی ہوسکا۔

۶۔ نیز حضرتؒ کے متعلقین و مجازین میں بعض اور حضرات نے بھی تلخیص کا کام کیا ہے، خود حضرت نے اپنی تالیفات کا تذکرہ کرتے ہوئے شاہ لطف رسولؒ و مولانا ظفر احمدؒ کے علاوہ مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ، مولانا عیسی صاحبؒ و مولانا جمیل احمد صاحب تھانوی کا بھی تذکرہ فرمایا ہے کہ ان حضرات نے بھی تلخیص کا کام شروع کیا ہے، اگرچہ ان کے کاموں کی انتہا کا احقر کو علم نہیں ہوسکا ہے۔ مولانا عیسی صاحب کی تلخیص کو حضرتؒ نے "بطرز عجیب" بتایا ہے۔

اس سلسلہ کی دوسری بھی بہت سی چیزیں ہوسکتی ہیں اور ہوں گی مگر احقر کے علم میں یہی چیزیں آئی ہیں وہ۔ واللہ اعلم و علمہ اتم و احکم

اس مقالہ کی تیاری میں، اشرف السوانح، البلاغ مفتی اعظم نمبر، تذکرۃ الظفر، بیان القرآن و معارف القرآن، وغیرہ سے استفادہ کیا گیا ہے۔

وجاهدوا فی اللہ حق جہادہٖ
القرآن
الجہاد الحقیقی
از افادات
عارف باللہ حضرت مولانا شاہ حافظ جلیل احمد صاحب شیروانی قدس سرہ
خلیفۂ ارشد
حکیم الامۃ مجدد الملۃ محی السنۃ
حضرت مولانا شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ
مجلس صیانۃ المسلمین پاکستان
جامعہ اشرفیہ لاہور

مقالہ نمبر ۲۱

حضرت تھانوی رحمہ اللہ

بحیثیت محدث

حضرت علامہ مولانا ظفر احمد عثمانی تھانوی

حکیم الامت مجدد الملت مولانا محمد اشرف علی صاحب محدث تھانوی نور اللہ مرقدہ

○

وہ حکیم امت مصطفیٰ وہ مجدد طرق ہُدیٰ

وہ جو بانٹتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے

شرف علی مہ ارتقا شمس المعارف والتقی، جو عمل سے اپنے نمونۂ عمل صحابہ دکھا گئے۔

اسلامیانِ ہند کی یہ بزرگ ہستی ابھی چار مہینے پہلے ہماری نظروں کے سامنے تھی، اور ہمیں فخر تھا کہ اگر کوئی ہم سے یہ پوچھتا کہ اس وقت مسلمانوں میں سلف کا نمونہ کون ہے؟ تو ہم یہ کہہ سکتے تھے۔ مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا نے ایک قدم بھی خلاف شریعت نہیں اٹھایا، آپ نے صرف اللہ پر نظر رکھ کر کام کیا، کسی والیۂ ریاست یا سلطان ولایت پر کسی وقت نظر نہیں کی، آپ کی آٹھ سو سے زائد کتابوں اور ہزار ہا خطوط میں جو مردوں کے نام بھی ہیں اور عورتوں کے بھی، کوئی بات ایسی نہیں پیش کی جا سکتی جس کو پڑھتے ہوئے تہذیب کے چہرہ پر جھینپ کے آثار نمودار ہوں[1]،

---

[1] مسائل مخصوصہ زنان اور مسائلِ طبیہ کو رہنے دیجئے کہ وہ عورتوں کے مطالعہ کے لئے ہیں، درس و تدریس کے لئے نہیں ہیں، اور ان کی ضرورت سے کسی طرح انکار نہیں ہو سکتا، پھر وہ مولانا کی تصنیف نہیں ہیں، بلکہ ان کے شاگردوں کے قلم سے نکلے ہوئے ہیں۔

مولانا ابتدائے عمر ہی سے جب کہ اٹھارہ سال کی عمر تھی، مصنف تھے، اور آخر عمر تک مصنف رہے، ایسا مصنف جس نے تقریباً ہر علم میں تصنیف کی ہو، اور اتنی کثیر مقدار میں کتابیں لکھی ہوں، امام سیوطی کے بعد مولانا کے سوا نہیں دیکھا گیا، وعظ اور خوش بیانی میں تو بے نظیر تھے ہی کہ جس جلسہ میں تقریر کو کھڑے ہوتے پھر کسی کی تقریر سامعین کو پسند نہ آتی تھی، مولانا نے اپنی تصانیف سے دنیوی نفع کبھی حاصل نہیں کیا، نہ کسی کتاب کا حق تصنیف کسی سے لیا، تمام کتابیں اللہ کے لئے اور اصلاح امت کے لئے لکھیں اور ہر شخص کو چھاپنے کی اجازت دیدی،

میں اس وقت صرف آپ کی خدمتِ حدیث پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں، کیونکہ عام طور پر مسلمان آپ کو ایک صوفی عالم، مفسر، فقیہ و واعظ کی حیثیت ہی سے پہچانتے ہیں، حالانکہ خدمتِ حدیث بھی اس زمانہ میں آپ کا عظیم الشان کارنامہ ہے، جو آپ کے تاجِ مجددیت کا درخشاں گوہر ہے، آپ نے علم حدیث کی باقاعدہ سند ملا محمود دیوبندی اور مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی، اور مولانا محمود الحسن صاحب شیخ الہند سے حاصل کی، ملا محمود صاحب اور مولانا محمد یعقوب صاحب نے شاہ عبد الغنی صاحب سے حدیث پڑھی، اور مولانا محمود حسن صاحب نے مولانا محمد قاسم صاحب سے،

حضرت حکیم الامت کو قاری عبد الرحمٰن صاحب محدث پانی پتی سے بھی سند حدیث حاصل ہے، اور مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب سے بھی بعض کتب حدیث پڑھ کر سند حاصل کی ہے، پندرہ برس تک مدرسہ جامع العلوم کانپور میں باقاعدہ حدیث کا درس دیا، اور آپ کے شاگردوں میں بکثرت محدث پیدا ہوئے، جن میں مولانا محمد اسحاق صاحب بردوانی رحمۃ اللہ علیہ کا نام سب سے زیادہ روشن ہے،

حضرت مولانا حکیم الامت نے ۱۳۱۵ھ میں توکلاً علی اللہ خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں قیام فرمایا، اس وقت سے باقاعدہ درسِ حدیث کا سلسلہ ملتوی ہوگیا، اور ہمہ تن تزکیہ وتربیتِ قلوب واصلاحِ اُمت میں مشغول ہوگئے، مگر علماء اس مدت میں بھی آپ سے حدیث کی سند حاصل کرتے رہے، علامہ محقق محمد زاہد کوثری مصری نے جو مصر کے اجلۂ علماء محققین ومصنفین سے ہیں، بذریعہ خط کے حضرت سے حدیث کی سند حاصل کی، اسانید حدیث میں مولانا کا رسالہ السبعۃ السیارہ طبع ہوچکا ہے، ترمذی پر آپ کا حاشیہ الثواب الجلی بھی طبع ہوچکا ہے، دوسرا حاشیہ المسلک کی بصورت مسودہ مکمل ہے، ایک چہل حدیث بھی طبع ہوچکی ہے۔ جس میں شریف سے چالیس حدیثیں نسخہ ہمام کی جمع کی گئی ہیں، جن کو معمر، ہمام بن منبہ سے وہ ابوہریرہ سے اور ابوہریرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں، سب حدیثوں کی سند ایک ہی ہے۔ مولانا کے مواعظ ورسائل میں میرے اندازے میں پانچ ہزار حدیثوں سے کم نہیں جن کی شرح کرکے امت کو تبلیغ کی گئی ہے،

۱۳۳۰ھ میں آپ کو دلائلِ حدیثیہ للحنفیہ کے جمع کرنے کا خیال پیدا ہوا، تو جامع الآثار اور تابع الآثار دو رسالے تصنیف فرمائے ہیں ابواب الصلوٰۃ تک وہ حدیثیں جمع کی گئیں جو حنفیہ کی دلیل ہیں، پھر تمام ابواب کے دلائل کو دستیاب کرنا چاہا، اور احیاء السنن کے نام سے ضخیم کتاب ابواب الحج تک تالیف فرمائی مگر جس عالم کو اس پر نظر ثانی کے لئے متعین کیا گیا تھا، اُس نے اپنی رائے سے اس میں اس قدر ترمیم وتنسیخ کردی، کہ مولانا کی تصنیف باقی نہ رہی، بلکہ مستقل کتاب ہوگئی، اس لئے اس کی اشاعت ملتوی کردی گئی، اور حضرت کے منشاء کے موافق دوبارہ اس مہم

کام کو انجام[1] دیا گیا۔ پندرہ سال سے کچھ زیادہ مدت میں ابواب الصلوٰۃ سے ابواب المیراث تک جملہ ابواب فقہیہ کے دلائل احکام، حدیث سے جمع کر دیئے گئے،

یہ کتاب جس کا نام اعلاء السنن ہے، بیس جلدوں میں تمام ہوئی ہے، ابتدا کی آٹھ جلدیں حرفاً حرفاً حضرت حکیم الامۃ کی نظر سے گذر چکی ہیں، بقیہ جلدوں میں مشکل اور اہم مقامات حضرت کے سامنے پیش کئے گئے ہیں، حضرت حکیم الامۃ کو اس کتاب کی تکمیل سے جس قدر مسرت ہوئی ہے، اس کو لفظوں سے بیان نہیں کیا جا سکتا، فرماتے تھے، کہ اگر خانقاہ امدادیہ میں اعلاء السنن کے سوا اور کوئی کتاب بھی تصنیف نہ ہوتی، تو یہی کارنامہ اس کا اتنا عظیم الشان ہے، کہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی، اس میں صرف حنفیہ ہی کے دلائل حدیثیہ نہیں بلکہ متن کتاب میں احادیث مویدۂ حنفیہ ہیں، اور حواشی میں بڑی تحقیق اور تفتیش سے جملہ احادیث احکام کے استیعاب کی کوشش کی گئی ہے، پھر غایت انصاف کے ساتھ محدثانہ وفقیہانہ اصول سے جملہ احادیث پر کلام کیا گیا ہے، کوشش کی گئی ہے کہ ہر مسئلہ مختلف فیہا میں حنفیہ کے سب اقوال کو تلاش کیا جائے، پھر جو قول حدیث کے موافق ہوا، اسی کو مذہب حنفی قرار دیا گیا، تحقیق کامل کے بعد پورے وثوق سے کہا جاتا ہے کہ جس مسئلہ میں حنفیہ کا ایک قول حدیث کے خلاف ہوگا، تو دوسرا قول حدیث کے موافق ضرور ہوگا، یا کوئی حدیث یا آثار صحابہ ان کے قول کی تائید میں ہوں گے۔ آپ کو

---

[1] قدر الله اتمامه واكماله على يد هٰذا العبد الغريق فى الآثام اقل الانام ظفر احمد العثمانى التهانوى وليس لى فيه غير الرسو والاسو و الشيخ نور الله مرقده هو الروح فى هذا الجسو،

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند — آنچہ استاذ ازل گفت ہمان می گویم

حیرت ہوگی کہ مسئلہ مصراۃ میں بھی امام ابوحنیفہ کا ایک قول حدیث صحیح کے بالکل موافق ہے، جس کو علامہ ابن حزم نے محلیٰ میں روایت کیا ہے، اعلاء السنن میں تقلید جامد سے کام نہیں لیا گیا، بلکہ تحقیق فی التقلید سے کام لیا گیا ہے، جس مسئلہ میں حنفیہ کی دلیل کمزور تھی، وہاں صاف طور سے ضعفِ دلیل کا اعتراف کیا گیا، یہ دوسرے مذاہب کی قوت کو تسلیم کیا گیا ہے،

جن حضرات کو مذہب حنفی پر مخالفتِ حدیث کا اعتراض ہے وہ انصاف سے کام نہیں لیتے، جس مذہب میں مرسل ومنقطع بھی حجت ہے، اور راوی مستور الحال کو قبول کیا گیا ہے، قولِ صحابی کو بھی قیاس سے مقدم مانا گیا ہے اس سے زیادہ حدیث پر عمل کرنے والا کون ہو سکتا ہے؟ بات یہ ہے کہ خبر واحد کی تصحیح وتضعیف میں جس طرح باہم محدثین میں اصولی اختلاف ہے، اسی طرح حنفیہ کو بھی بعض مقامات میں محدثین سے اصولی اختلاف ہے، مثلاً حنفیہ کے نزدیک صحت خبر واحد کے لئے یہ بھی ضروری شرط ہے، کہ وہ اصول مشہورہ کے خلاف نہ ہو، اور یہ اصول قیاسی نہیں بلکہ نصوصِ قرآنی اور احادیث مشہورہ سے ماخوذ ہیں، بعض علمائے عصر نے حنفیہ کے کلام میں موافقت اصول کی شرط دیکھ کر جو یہ دعویٰ کیا ہے، کہ حنفیہ روایت پر درایت کو مقدم کرتے ہیں، یہ صحیح نہیں ہے، حنفیہ کے نزدیک تو حدیث ضعیف اور مرسل بھی قیاس سے مقدم ہے، وہ درایت کو روایت پر مقدم کیسے کر سکتے ہیں؟ حنفیہ کی مراد موافقتِ اصول سے اُن اصول کی موافقت ہے، جو نصوص قرآنیہ اور سنتِ مشہورہ سے ماخوذ اور امت کے نزدیک مسلّم ہیں، یہ اور بات ہے کہ یہ اصول درایت وقیاس کے موافق بھی ہیں، مگر قیاس سے ماخوذ نہیں، (ملاحظہ ہو ملفوظات عزیزیہ ص ۱۱۵، ۱۱۶ مطبع مجتبائی

میرٹھ) اس قاعدہ کی بنا پر حنفیہ بعض دفعہ ضعیف حدیث کو صحیح حدیث پر مقدم کر دیتے ہیں، کیونکہ ضعیف موافق اصول ہے، اور صحیح خلاف اصول، مگر وہ کسی حدیث کو رد نہیں کرتے، بلکہ حدیث مرجوح کا بھی اچھا محمل بیان کر دیتے ہیں، جس کی تائید حدیث کے تمام طرق کو جمع کرنے سے بخوبی واضح ہو جاتی ہے، اسی طرح حنفیہ کے نزدیک آثار واقوال صحابہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد سمجھنے میں بڑا دخل ہے، وہ ہر خبر واحد کو آثار صحابہ کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ ایک اجمالی اشارہ ہے جس کی تفصیل کے لئے اعلاء السنن کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔

اس کتاب کا مقدمہ بھی مستقل کتاب کی صورت میں الگ چھپ چکا ہے جس میں حنفیہ کے اصولِ حدیث جمع کئے گئے ہیں، اور ثابت کیا گیا ہے، کہ جن اصول میں حنفیہ عام محدثین سے متفرد ہیں، ان میں بھی محدثین ان کے موافق ہیں، پھر مقدمہ فتح الباری کی ایک طویل فصل کا خلاصہ لکھ کر ثابت کیا گیا ہے، کہ امام بخاری جیسا محدث بھی بعض دفعہ حنفیہ کے اصول پر چلنے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے، پس جب تک حنفیہ کے اصولِ حدیث سے پوری واقفیت حاصل نہ ہو جائے، اس وقت تک ان کی کسی دلیل کو کسی محدّث کے ضعیف کہنے سے ضعیف نہیں کہا جا سکتا،

الحمدللہ اس کتاب کی تکمیل سے حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ کی وہ بات پوری ہو گئی، جس کو انھوں نے فیوض الحرمین میں کبریت احمر واکسیر اعظم بتلایا ہے،

قال عرفنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان فی المذهب الحنفی طریقة انیقة هی اوفق	فرماتے ہیں کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلایا ہے کہ مذہب حنفی میں ایک طریقہ بڑا عمدہ ہے،

الطرق بالسنة المعروفة التي جمعت ونقحت في زمان البخاري واصحابه وذلك ان يوخذ من اقوال الثلاثة قول اقربهم بها في المسئلة ثم بعد ذلك يتبع اختيارات الفقهاء الحنفيين الذين كانوا من اهل الحديث فرب شيئ سكت عنه الثلاثة في الاصول وما تعرضوا لنفيه ودلت الاحاديث عليه فليس بد من اثباته والكل مذهب حنفي، اه

جو اس طریق سنت کے بہت زیادہ موافق ہے، جو بخاری اور ان کے اصحاب کے زمانہ میں مدون اور منقح ہو چکا ہے وہ یہ کہ (ائمہ) ثلاثہ (ابوحنیفہ و ابویوسف و محمد رحمہم اللہ) کے اقوال میں سے اس قول کو لیا جائے، جو اس مسئلہ میں سب سے زیادہ حدیث کے قریب ہو، پھر ان فقہائے حنفیہ کے جو محدثین میں سے تھے اختیارات کا تتبع کیا جائے، کیونکہ بعض مسائل ایسے بھی ہیں جن سے ائمہ ثلاثہ نے ظاہر روایت میں سکوت کیا ہے، اور ان کی نفی سے تعرض نہیں کیا، اور احادیث ان پر دلالت کر رہی ہیں، تو ان کو ثابت ماننا ضروری ہے، اور یہ سب مذہب حنفی ہوگا، (مذہب سے خارج نہ ہوگا)

آگے چل کر ارشاد فرماتے ہیں :-

وهذه الطريقة ان اتمها الله تعالى واكملها فهي الكبريت الاحمر

(شاہ صاحب فرماتے ہیں) کہ اگر اللہ تعالیٰ اس طریقہ کو پورا کر دیں تو وہ

والاکسیرالاعظم	کبریت احمر اور اکسیر اعظم ہوگا،

الحمدللہ یہ طریقہ کبریت احمر و اکسیر اعظم شاہ ولی اللہ صاحب ہی کے سلسلہ میں حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی نوراللہ مرقدہ کے دورِ تجدید میں پورا ہوگیا، کیونکہ اعلاء السنن میں یہی کیا گیا ہے، کہ ائمہ ثلاثہ اور علماء حنفیہ کے اقوال کا پورا تتبع کرکے جو قول حدیث کے زیادہ موافق ملا، اسی کو مذہب قرار دیا گیا،

اس وقت تک اس کتاب کی گیارہ جلدیں طبع ہوچکی ہیں، نو جلدیں بصورتِ مسودہ رکھی ہوئی ہیں، جن میں سے تین کی کاپی ہوچکی ہے، کاغذ کی گرانی کی وجہ سے طباعت میں تاخیر ہورہی ہے[۱]، حضرت حکیم الامت کی جماعت کا خصوصاً اور تمام مسلمانوں کا عموماً فرض ہے کہ اس کتاب کی تکمیلِ طباعت میں پوری کوشش کریں، علامہ محمد زاہد کوثری مصری نے اس کی دس جلدوں پر نظر فرما کر اپنی طرف سے مفصل تقریظ جریدۃ الاسلام مصر میں شائع فرمائی ہے، جس کو دیکھ کر اندازہ ہوسکتا ہے کہ بیرونِ ہند کے علماء نے اس کتاب کو کس وقت کی نظر سے دیکھا ہے، ان کی تقریظ کے آخری چند جملے یہ ہیں، فرماتے ہیں،

والحق یقال انی دُھشت من ھٰذا	حق بات کہنا پڑتی ہے میں تو اس طرح
الجمع وھٰذا الاستقصاء ومن	حدیثوں کے جمع کرنے، تلاش کرنے
ھٰذا الاستیفاء البالغ فی الکلام	اور پوری طرح ہر حدیث کے متن وسند
علی کل حدیث بما تقضی بہ	پر فنِ حدیث کے موافق مفصل کلام
الصناعۃ متنا وسندا من غیر ان	کرنے سے حیرت میں رہ گیا، پھر خوبی
یبدو علیہ آثار التکلف	یہ ہے کہ اپنے مذہب کی تائید میں تکلف
فی تائید مذھبہ بل الانصاف	کے آثار کا نام و نشاں نہیں بلکہ جملہ اہل

[۱] بفضلہ تعالیٰ یہ کتاب عربی ٹائپ میں شائع ہوگئی ہے۔

وائده عند الكلام على	مذاہب کی رایوں پر انصاف کو امام
آراء اہل المذاہب فاغتبطت	بنا کر کلام کیا گیا ہے، مجھے اس کتاب
بہ غایۃ الاغتباط وھذا	سے بے انتہا خوشی ہوئی، ہمت مردانہ
تکون ھمۃ الرجال و	اسے ہی کہتے ہیں اور بہادروں کا
مبر الابطال اطال اللہ بقائہ	استقلال ایسا ہی ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ
فی خیر وعافیۃ ووفقہ	مولف کو خیر وعافیت کے ساتھ
لتالیف امثالہ من المولفات	تا دیر سلامت رکھے اور اس جیسی اور
النافعۃ ،	نافع تالیفات کی توفیق دے (آمین)

حضرت حکیم الامۃ نے ایک طرف مذہب حنفی کو احادیث کی روشنی میں منقح فرمایا اور دوسری طرف مسائل سلوک وتصوف کو قرآن کی آیات کثیرہ سے مجتہدانہ شان کے ساتھ مدون فرمایا، جس کا نام مسائل السلوک ہے پھر احادیث تصوف کو کتاب التعرف باحادیث التصوف میں جمع فرمایا اور دنیا کو بتلا دیا کہ صحیح اسلامی تصوف صرف قرآن وحدیث سے ماخوذ ہے، اس کا کوئی مسئلہ بھی کسی غیر اسلامی ماخذ سے لیا ہوا نہیں، التعرف سے پہلے احادیث تصوف میں مستقل کتاب سننے میں نہیں آئی، الحمد للہ اس کتاب نے صحیح اسلامی تصوف سے مسلمانوں کو روشناس کر دیا ہے، ضرورت ہے کہ حکیم الامۃؒ کی جماعت میں کوئی صاحب ہمت اس موضوع کی تکمیل کے لئے قدم آگے بڑھائیں کیونکہ التعرف میں ہنوز جملہ احادیث تصوف کا استیعاب نہیں ہوا۔

مجلس صیانۃ المسلمین

کا

مقصد

مکمّل دین کی اشاعت ہے

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد مالک صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ

سابق شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور

مجلس صیانۃ المسلمین پاکستان

جامعہ اشرفیہ فیروزپور روڈ لاہور

مقالہ نمبر ۲۲
حضرت تھانوی
علیہ الرحمۃ
بحیثیت
محدث
حضرت مولانا مفتی عبدالشکور صاحب ترمذی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہ
بحیثیت محدّث
اور
آپ کی حدیثی خدمات

پیش لفظ

حضرت اقدس حکیم الامت مجدد الملت جامع شریعت وطریقت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ اس صدی میں تمام کمالات علمی وعملی کی جامع شخصیت تھے، ایک طرف فقہ اور فتاویٰ کی مسند نشینی، دوسری طرف تصنیف وتالیف، اور وعظ و تذکیر کے ذریعہ دعوت وتبلیغ سے ہدایتِ خلق، اور ردّ بدعات ومنکرات، دفع وساوس وشبہات، تیسری طرف تربیتِ باطنی اور تزکیہ نفوس کی صدر نشینی، غرضیکہ تمام ظاہری اور باطنی اوصاف وکمالات اور علوم وفنون کی جامعیت اور اجتماعیت میں آپ کی شخصیت اس زمانے میں منفرد حیثیت کی حامل تھی اور منصب تجدید پر آپ فائز تھے۔

حکیم الامت تھانویؒ کی علمی خدمات اور باطنی افاضات وفیوضات پر ایک نظر ڈالنے کے بعد اس میں کسی قسم کے شک کی گنجائش نہیں رہتی کہ آپ دین کے دوسرے شعبوں کے لحاظ سے اگر حکیم الامت اور جامع المجددین ہیں تو تصوف وطریقت کے مجددِ اعظم ہیں، اور

تمام علوم منقولہ اور معقولہ، تفسیر، حدیث، فقہ، کلام، منطق و فلسفہ، ہیئت وغیرہ میں آپ کو مہارتِ تامہ اور بصیرتِ خاصہ حاصل تھی، جس طرح وہ میدانِ تدریس کے مشہور اور ماہر استاذ و معلّم تھے، اسی طرح اپنے دور کے بہت بڑے مربی، صوفیِ کامل، عظیم فقیہہ، اعلیٰ درجے کے محدّث بھی تھے،

زیرِ نظر مقالہ کا موضوع علمِ حدیث پر آپ کی تصنیفی اور تقریری خدماتِ جلیلہ کا بطور اختصار کے تعارف کرانا ہے، اس موضوع پر حکیم الامّت کے مختلف مقالات اور بہت سی چھوٹی بڑی محققانہ اور مفید تصانیف موجود ہیں جن کی کسی قدر تفصیل انشاءاللہ آگے ملاحظہ سے گزرے گی۔

عبدالشکور ترمذی

مدرسہ حقانیہ ساہیوال سرگودھا

حجیّت واہمیّتِ حدیث

دین کے نام پر شر اُٹھانے والے فتنوں کی تاریخ اسلام میں بڑی طویل ہے لیکن سنّۃ اللہ یہ رہی ہے کہ جب کبھی دینِ اسلام کے مخالفین اور مبتدعین نے دین کی تحریف کرنے یا اس کی صورت بدل کر شرک و بدعات اور رسومات کو رواج دینا چاہا، تو اللہ تعالیٰ نے اپنی سنّت کے موافق اپنے دین کی حفاظت اور فتنہ کی سرکوبی کے لئے دین کے محافظ پیدا فرمادیئے۔

چنانچہ برصغیر پاک وہند میں بھی اٹھنے والے فتنوں کی سرکوبی کے لئے ایسے رجالِ کار پیدا ہوتے رہے جنہوں نے دینِ اسلام کو تحریفات، بدعات، شرک اور خلافِ اسلام رسومات سے پاک صاف کرنے کی کوشش جاری رکھی، جب اکبر بادشاہِ ہند نے دینِ الٰہی کے نام سے ایک نئے فتنے کی بنیاد رکھی تو اصل دینِ اسلام کے احیاء کے لئے مجدّد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کو پیدا فرمادیا۔

بارہویں صدی ہجری میں اس قافلے کے سرخیل حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ تھے وہ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت شیخ ابوطاہر مدنیؒ سے مدینہ طیبہ میں حاصل کرکے آئے اور علمِ حدیث اور احیائے سنّت کا شجرہ طوبیٰ دہلی میں لگادیا، علم حدیث کے اس شجرہ کی آبیاری آپ کے تلامذہ اور تلامذہ کے تلامذہ شاہ عبدالعزیزؒ، شاہ محمد اسحٰقؒ، شاہ عبدالغنیؒ محشی ابن ماجہ شریف، وغیرہ نے کی، پھر حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری

محشی بخاری شریف، مولانا شیخ محمد محدث تھانویؒ محشی نسائی شریف، مولانا محمد مظہر نانوتویؒ،
مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ اور ان کے نامور
تلامذہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن محدّث دیوبندیؒ، مولانا خلیل احمد محدّث سہارنپوریؒ، حکیم الامت
مولانا اشرف علی محدث تھانویؒ وغیرہ نے اس شجرہ طوبیٰ کو پرورش کیا اور اسے ایک چمن بنا دیا،
نیز اپنی تالیفات جلیلہ، مواعظ حسنہ و ملفوظات طیبہ سے جہالت کی تاریکی میں گھرے
ہوئے ماحول کو علم کی شمع سے منوّر کر دیا۔

ملک میں قرآن کے نام پر جب فتنۂ انکارِ حدیث کھڑا کیا گیا، تو اسی دہلویؒ خاندان
ولی اللہی سے علمِ حدیث کا فیض پانے والوں نے اللہ تعالیٰ کی اعانت و امداد سے اس فتنے کی
سرکوبی کے لئے سر توڑ کوشش کی اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے فتنۂ انکارِ حدیث کے جال
میں پھنسنے سے مسلمانوں کو محفوظ کر دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآنِ کریم ایک منضبط اور جامع قانونِ ہدایت ہے جس کی تمام
تصریحات اور ارشادات واجب العمل ہیں، لیکن اس کا اول خطاب اس ذات بابرکات
سے ہوا جو اوّلین و آخرین کی سردار اور تمام علمی و عملی کمالات کی مظہرِ اَتم تھی جو سارے انبیاء
علیہم السلام سے پہلے نبی تھی اور سب کے مدارج کی خاتم اور احکام کی ناسخ ہوئی،
علام الغیوب نے اپنی شانِ کریمی سے اس کو وہ علوم عطا فرمائے تھے جو اس سے پہلے
کسی کو القاء نہیں کئے گئے، اور جس کا فضل اس پر سب سے زیادہ تھا، یہی وہ علومِ نبوت
تھے جن کی بناء پر قرآنِ مجید جیسی جامع کتاب اللہ کی تبلیغ و تفہیم کا فرض آپ کے سپرد کیا گیا
اور ارشاد ہوا وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیھم ولعلھم
یتفکرونؒ آپ کی طرف خدا کے ذکر و تذکیر کی عظیم الشان کتاب اس لئے بھیجی گئی ہے

کہ آپ لوگوں کو اس کے ارشادات اچھی طرح واضح کر کے سمجھایئے۔"

اس عظیم ترین جلیل القدر کتاب کے بیان اور وضاحت کی خدمت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کی گئی اور آپ کو قرآن ہی میں معلم کتاب و حکمت بھی فرمایا گیا، اور ظاہر ہے کہ معلم کی حیثیت صرف قاری ہی کی نہیں ہوتی، درحقیقت معلم کے لفظ سے آپ کی خصوصی شان تعلیم و تربیت اور حیثیتِ رسالت کو نمایاں کیا گیا ہے، مذکورہ بالا مختصر بیان سے حدیثِ رسول کی حجیت اور اہمیت اور اس کا تشریعی مرتبہ و مقام واضح ہو رہا ہے۔

کتابتِ حدیث

حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں چونکہ قرآن مجید کے جمع و کتابت کا اہتمام زیادہ ضروری تھا اس لئے اسی کو لکھا گیا اور ابتداء میں حدیث کی کتابت سے روکا بھی گیا، تاکہ قرآن و حدیث میں اختلاط نہ ہو جائے، دوسرے اس لئے بھی اس کی ضرورت نہ تھی کہ صحابہ کرامؓ کے حافظے قوی تھے، جو احادیث انہوں نے سنی تھیں، ان کے سینوں میں محفوظ تھیں، ان کے ضائع ہونے کا خطرہ نہیں تھا، اس لئے صرف لکھنے کی ممانعت کی تھی، زبانی طور سے ایک دوسرے کو حدیث روایت کرنے کی ممانعت نہ تھی چنانچہ صحیح مسلم میں ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مجھ سے سنی ہوئی چیزوں سے سوائے قرآن کے کچھ مت لکھو اور جو کچھ کسی نے لکھ لیا ہو اس کو مٹا دے، البتہ مجھ سے حدیث کی روایت زبانی کر سکتے ہو اس میں کچھ حرج نہیں ہے، اور جو شخص میری طرف سے جھوٹ بنا کر حدیث منسوب کرے گا وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنائے گا۔"

"قرونِ ثلاثہ" واضح ہو کہ قرونِ ثلاثہ سے وہ قرون مراد ہوتے

ہیں جن کی بابت سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سب زمانوں سے بہتر و برتر ہونے کی بشارت دی ہے اور یہ بھی فرمایا کہ ان تینوں کے بعد جھوٹ کی کثرت ہوگی۔"

قرنِ اوّل سے مراد زمانہ بعثتِ مبارکہ سے ۱۱۰ھ تک کا زمانہ ہے جو عہدِ رسالت اور عہدِ صحابہ کہلاتا ہے۔

قرنِ دوم ۱۱۱ھ سے ۱۷۰ھ تک ہے جو عہدِ تابعین ہے۔

قرنِ سوم ۱۷۱ھ سے ۲۲۰ھ تک ہے۔ شیخ عبدالحق وغیرہ نے قرنِ سوم کی مدت ۲۶۰ھ تک قرار دی ہے۔

"عہدِ رسالت میں کتابتِ حدیث"

اس کے بعد جب قرآن مجید کے حفاظ صحابہؓ میں کثرت سے ہو گئے اور قرآن کے ساتھ غیر قرآن کے اختلاط کا اندیشہ باقی نہ رہا تو معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ نے کتابتِ حدیث کی بھی اجازت فرما دی تھی، چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں حدیث کے نوشتوں کا بھی وجود ملتا ہے۔

بخاری شریف میں ہے کہ حضرت علیؓ کے پاس ایک صحیفہ تھا جس میں کچھ احادیث لکھی ہوئی تھیں، اور بخاری میں ہے کہ ایک دن آپ نے طویل خطبہ دیا جس میں حرمِ مکہ کا بھی بیان تھا راوی حدیث مذکور ابوہریرہؓ نے بتلایا کہ ایک یمنی شخص نے حضور علیہ السلام سے درخواست کی کہ یہ میرے لئے لکھوا دیجئے، آپ نے صحابہ سے فرمایا کہ اس کے لئے لکھ دو،

ابوہریرہؓ ہی کتاب العلم میں راوی ہیں کہ مجھ سے زیادہ کسی کو صحابہ میں احادیث یاد نہ تھیں سوائے عبداللہ بن عمروؓ کے کیونکہ وہ لکھتے تھے اور میں نہیں لکھتا تھا،

اوران ہی عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے سنن ابوداؤد میں روایت ہے کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ بھی سنتا تھا، سب لکھ لیا کرتا تھا، ان کے پاس ایک ہزار احادیث کا مجموعہ تھا جس کا نام صادقہ تھا، علامہ ابن عبدالبرؒ نے بھی جامع بیان العلم میں حضرت انس بن مالک سے روایت کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "علم کو لکھ کر محفوظ کرو"، اس کے علاوہ بھی بہت سی احادیث وارد ہیں جو سنن دارمی اور جامع بیان العلم میں دیکھی جاسکتی ہیں (تذکرۃ المحدثین از مولانا سید احمد رضا صاحب بجنوریؒ شارح بخاری)

حضرت علیؓ کے پاس کچھ احادیث لکھی ہوئی تھیں، (ابوداؤد) حضرت انسؓ کے پاس بھی کچھ احادیث لکھی ہوئی تھیں (بخاری) قبائل کے نام حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین، تحریری احکام اور معاہدات حدیبیہ وغیرہ (طبقات ابن سعد) مکاتیب مبارکہ بنام سلاطین وامراء دنیا (بخاری) صحیفہ احکام وصدقات زکوٰۃ جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر بن حزم والی بحرین کو لکھایا تھا، اس صحیفہ کو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ۹۹ھ میں آل ابن حزم سے حاصل کیا تھا، (دارقطنی) عمرو بن حزم والی یمن کو بھی ایک تحریر احکام صلوٰۃ، صدقات، طلاق وعتاق وغیرہ کی دی تھی (کنزالعمال) حضرت معاذ بن جبل کو ایک تحریر مبارک یمن بھیجی تھی جس میں سبزی ترکاری پر زکوٰۃ نہ ہونے کا حکم تھا (دارقطنی)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت سعد بن عبادہؓ اور حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ وغیرہ کے پاس بھی احادیث کے مجموعے تھے، (جامع بیان العلم وغیرہ) وائل بن حجرؓ صحابی کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز، روزہ، سود، شراب وغیرہ کے احکام لکھوائے تھے، (معجم صغیر، از تذکرۃ المحدثین)

نشرِ حدیث

اوپر کی تصریحات سے معلوم ہوا کہ کتابتِ حدیث کا سلسلہ عہدِ رسالتؐ میں ہی شروع ہو گیا تھا مگر تحدیث و روایت کے ذریعہ احادیث کی نشر و اشاعت کا اہتمام صحابہ کرامؓ میں برابر رہا اور عام طور سے کتابت کا رواج نہیں ہوا، اور نہ تدوینِ حدیث اس دور میں ہو سکی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی ترویجِ سنت و اشاعتِ حدیث کی ترغیب فرمایا کرتے تھے،

ایک بار جب وفد عبد القیس حاضرِ خدمت ہوا اور آپ نے ان کو چار باتوں کا حکم فرمایا اور چار باتوں سے منع فرمایا تو یہ بھی فرمایا کہ ان باتوں کو یاد کر لو اور دوسرے لوگوں کو بھی پہنچا دو، (بخاری باب اداء الخمس من الایمان)

ایک مرتبہ فرمایا خدا اس بندے کو خوش عیش کرے جو میری بات سن کر یاد کرے اور دوسرے تک پہنچائے کیونکہ بہت سی دین کی سمجھ کی باتیں کم سمجھ والے کے پاس ہوتی ہیں وہ دوسرے زیادہ سمجھ والے کے پاس پہنچ جائیں تو اس کو زیادہ نفع ہو سکتا ہے، (مشکوٰۃ کتاب العلم)

"ضرورتِ تدوینِ حدیث"

اسی طرح قرنِ اول گذر گیا بعد میں تدوینِ حدیث سامنے آ کر رہی، صحابہ کرامؓ جن کے حافظوں پر اعتماد تھا، فتوحاتِ اسلامیہ کی کثرت کے ساتھ دور دراز ملکوں میں منتشر ہو گئے تھے وہ اکثر وفات پا گئے، تابعین میں اس درجہ کی قوتِ حفظ و ضبط نہ تھی جو پہلوں میں تھی،

اس لئے علماء وقت نے تدوینِ حدیث اور کتابت کی منظم طور پر ضرورت محسوس کی، سب سے پہلے اس ضرورت کا احساس خلیفہ عادل حضرت عمر بن عبد العزیزؒ (متوفی ۱۰۱ھ)

کو ہوا۔ جو اُمت کے سب سے پہلے مجدد تھے اور اُن کی امامت، اجتہاد، معرفت احادیث و آثار مسلم تھی، چنانچہ آپ نے نائب والی مدینہ ابوبکر بن حزم کو فرمان بھیجا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور عمر رضی اللہ عنہ کے آثار جمع کر کے لکھو، (تنویر الحوالک)

موطا، امام محمد میں اس طرح ہے احادیث رسول اور سنن یا حدیث عمرؓ یا مثل اس کے دوسرے صحابہؓ کے آثار سب جمع کر کے لکھو، کیونکہ مجھے علم کے ضائع ہونے اور علماء کے ختم ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ تعلیم حدیث و فقہ، کے لئے تمام شہروں کو احکام بھیجا کرتے تھے ابو بکر بن حزم کو حکم دیا تھا کہ احادیث کو جمع کر کے لکھوائیں، انہوں نے بہت سی کتابیں لکھوائی تھیں، مگر عمر بن عبدالعزیزؒ کی زندگی میں ان کو نہ بھیج سکے،

جامع بیان العلم میں نقل کیا ہے کہ ابن شہاب زہری کو بھی حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے جمع احادیث کا حکم کیا تھا، اور انہوں نے دفتر کے دفتر جمع کئے جن کی نقول حضرت عمرؓ نے اپنی قلمرو میں بھجوائیں۔

حافظ ابن حجرؒ نے ذکر کیا ہے کہ امام شعبی (سنہ ھ) نے بھی احادیث جمع کی تھیں اور غالباً ان سب میں وہی متقدم تھے، پھر زہری متوفی ۱۲۰ھ اور پھر ابو بکر بن حزم (متوفی ۱۲۴ھ) نے

قرن ثانی:- قرن ثانی میں احادیث اور اقوال صحابہؓ و تابعینؒ ساتھ ساتھ ذکر ہوتے تھے جیسا کہ امام اعظمؒ کی کتاب الآثار، اور امام مالکؒ کی موطا سے ظاہر ہے،

تین بڑے بڑے فقہاء، حفاظ حدیث اور اپنے وقت کے امام و مقتدا جنہوں نے قرن ثانی میں احادیث رسول و آثار و اقوال صحابہؓ کو جمع کیا اور ان کو کتابی شکل میں مدون کیا، امام شعبیؒ، امام مکحولؒ اور امام زہریؒ ہیں (تذکرۃ المحدثین)

ان کے بعد سراج الامت فقیہہ الملت ، حافظ حدیث، امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا دور شروع ہو جاتا ہے، جو حسب تصریح اقران و معاصرین اس زمانہ کے تمام فقہاء و محدثین پر اپنے غیر معمولی حفظ، تفقہ اور کمال زہد و ورع کی وجہ سے فائق تھے، امام صاحبؒ نے حسب تصریح مورخین چار ہزار ائمہ حدیث سے احادیث کا ذخیرہ جمع کیا تھا، اور امام موفق مکیؒ کی تصریح کے موافق امام اعظمؒ نے چالیس ہزار احادیث سے منتخب کر کے کتاب الآثار کو مرتب فرمایا تھا۔ آپ سے آپ کے تلامذہ کبار امام محمدؒ۔ امام ابو یوسفؒ، امام حسن بن زیاد، امام زفرؒ وغیرہ محدثین و فقہاء نے اس کو روایت کیا ہے۔

امام صاحب نے احادیث صحاح اور اقوال صحابہ و تابعین ترتیب فقہی پر جمع کئے، پھر آپ کے بعد امام مالکؒ کی موطا، اور امام سفیان ثوریؒ کی جامع مرتب ہوئی اور ان تینوں کے نقش قدم پر بعد کے محدثین نے کتب حدیث تالیف کیں دوسری صدی کے نصف آخر میں امام اعظمؒ اور امام مالکؒ کے بڑے بڑے اصحاب تلامذہ نے حدیث و فقہ میں بہت کثرت سے چھوٹی بڑی تصانیف کیں، چنانچہ امام ابو یوسفؒ کی تالیف تو غیر معمولی کثرت سے بتائی جاتی ہیں جن میں اکثر کا ذکر فہرست ابن ندیم میں ہے اور امالی ابو یوسف کا تذکرہ کشف الظنون میں ہے کہ وہ تین سو مجلد میں تھیں۔ حافظ قرشی نے جواہر مضیئہ میں کہا کہ جن لوگوں نے امام ابو یوسفؒ کے امالی روایت کئے ہیں ان کی شمار نہیں ہو سکتی،

غرض کہ قرن ثانی ہی میں امام اعظمؒ امام مالکؒ اور ان دونوں کے اصحاب کے ذریعہ حدیث و فقہ کی خدمت تصانیف کثیرہ سے اور تدوین فقہ حنفی و مالکی احادیث اور آثار صحابہؓ و تابعینؒ کی روشنی میں ہو چکی تھی، اور ان حضرات نے پوری دنیاء اسلام کو علم فقہ و حدیث کی روشنی سے منور اس وقت کر دیا تھا کہ ابھی امام بخاریؒ و مسلم اور دوسرے محدثین اصحاب صحاح

اس دنیا میں تشریف بھی نہ لائے تھے،

خلاصہ یہ ہے کہ تدوینِ حدیث کے سلسلے میں سب سے پہلا اقدام تدوین حدیث وکتابت سنن وآثار کے لئے وہ تھا جو حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما نے کیا انہوں نے نے مجموعہ حدیث تالیف کیا جس کا نام صادقہ رکھا تھا اور اُن کی طرح دوسرے حضرات صحابہؓ نے بھی انفرادی طور سے اس خدمت کو انجام دیا۔ جیسا کہ اوپر گذرا،

دوسرا اقدام حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے دور میں ہوا اور امام شعبی، زہری، ابوبکر بن حزم نے احادیث وآثار کو جمع کیا، اگرچہ ترتیب وتبویب اس دور میں بظاہر نہ تھی۔

تیسرا اقدام امام اعظمؒ نے کتاب الآثار کی تالیف سے اٹھایا اور فتاویٰ صحابہ وتابعینؒ کو جمع کیا اور ترتیب وتبویب فقہی کی بھی طرح ڈالی جس کی متابعت میں بعد کو امام مالکؒ اور دوسرے معاصرین نے تالیفات کیں، (تذکرۃ المحدثین)

"حفاظتِ حدیث"

حکیم الامت تھانویؒ سے ایک صاحب نے سوال کیا کہ حدیث کے جوں کا توں محفوظ رہنے کی کیا دلیل ہے، وحی کے محفوظ رہنے کا سبب تو یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کو لکھا دیا کرتے تھے، مگر حدیث کے متعلق کیسے باور کیا جاوے کہ جو کچھ آپ فرماتے تھے اور لوگ اس کو سنتے تھے پس ان کو سننے سے لفظ بلفظ یاد ہو جاتا تھا، کیونکہ بہت سی حدیثیں ہیں جو بہت طویل ہیں، اگر کوئی شخص پانچ سطریں ایک مجمع کے سامنے کہے اور پھر پوچھے میں نے کیا کہا تھا، تو کوئی ان میں ایسا نہ ہوگا جو لفظ بلفظ کہہ دے کہ اس نے یہی الفاظ کہے تھے، اسی طرح جو کچھ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے ان کی نسبت یہ کس طرح

باور ہوسکتا ہے، کہ سننے والوں کو وہی الفاظ یاد رہے اور دوسو برس کے بعد جب حدیثیں جمع ہوئیں تو وہی الفاظ جوں کے توں منقول ہوتے چلے آئے لہٰذا اس امر کا دعویٰ کرنا کہ حدیث کے وہی الفاظ ہیں گویا عادۃً محال ہے؟

حضرت حکیم الامتؒ نے اس شبہ کا مفصل جواب لکھا جس کا خلاصہ حسبِ ذیل ہے۔

حدیث کے محفوظ رہنے کے بارے میں جو شبہ کیا ہے یہ نیا نہیں ہے مدت سے لوگ نقل کرتے چلے آتے ہیں، چنانچہ سید صاحب بھی اس شبہے کو بہت سے مباحث میں اپنا تمسک بناتے تھے، لیکن یہ شبہ چند امور میں غور کرنے سے محض مضمحل ہے۔

۱۔ اوّل صحابہؓ تابعینؒ ومحدثینؒ کی قوتِ حافظہ کی حکایات وقصص تواریخ میں اس قدر مذکور ہیں کہ قدرِ مشترک متواتر المعنی ہیں، چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سو شعر کا قصیدہ ایک بار سن کر بعینہٖ اعادہ فرما دیا کرتے تھے، امام بخاریؒ کا کسی مقام پر تشریف لے جانا اور ان کی خدمت میں سو سو حدیثوں کا خلط ملط کرکے پیش کرنا اور پھر ان سب کا بعینہٖ نقل کرکے پھر سب کی تصحیح کر دینا مشہور ومذکور ہے۔

اگر یہ شبہ کیا جائے کہ ایسا حافظہ خلافِ فطرت ہے اس لئے یہ حکایات غلط ہیں، سو اوّل تو آج تک اس فطرت کے حدود واصول منضبط نہیں ہوتے، جس سے یہ سمجھ لیا جائے کہ یہ فطرت کے موافق ہے یا مخالف ہے، جن امور کو بکثرت مشاہدہ کیا جا رہا ہے یقینی بات ہے کہ اگر ان کا وقوع ہوتا، مگر مشاہدہ نہ ہوتا، تو ضرور اس کو خلافِ فطرت سمجھا جاتا جس کا غلط ہونا اس کے وقوع بکثرت سے معلوم کرکے عاقل سخت افسوس کرتا اور فوراً اپنے اس بے بنیاد قاعدہ کا موجبِ مغالطہ ہونا تسلیم کر لیتا، دوسرے اس پر آج تک کوئی دلیل قائم نہیں ہوئی کہ جو خلافِ فطرت ہو وہ محال ہے اور اس کا وقوع کسی دوسرے وقت ہو ہی نہیں سکتا،

بہرحال یہ عذر محض بنا ء الفاسد علی الفاسد ہے۔ تیسرے اس کے خلافِ فطرت نہ ہونے پر دلیل مشاہدہ قائم ہے۔ چنانچہ قریب زمانہ ہوا کہ الہ آباد میں مولوی حافظ رحمت اللہ صاحب نابینا گذرے ہیں، ان کے حافظہ کے واقعات بچشم خود دیکھنے والے موجود ہیں جن کو سن کر عقل دنگ ہوتی ہے، کہاں تک کوئی تکذیب کر سکتا ہے، حافظ محمد عظیم صاحب پشاوری کی ایسی ہی حکایتیں، ایک عالم رامپور میں ابھی گذرے ہیں ایسے ہی ان کے واقعات ہیں اور احقر ان تینوں بزرگوں کو دیکھنے والوں سے ملا ہے، اور واقعات سُنے ہیں۔

۲۔ ثانی جب اللہ تعالیٰ کو کسی وقت کسی سے کوئی کام لینا ہوتا ہے اپنی قدرت و حکمت سے اس وقت کے لوگوں کے قویٰ ظاہرہ و باطنہ ایسے ہی بنا دیتے ہیں، اور یہ قاعدہ بھی منجملہ قواعد فطرت ہے، دیکھئے اس زمانہ میں کیسے عجیب و غریب صنائع ایجاد ہو رہے ہیں۔ کوئی پوچھے کہ اتنی عقل ہونا خلافِ فطرت ہے یا نہیں، شق اول پر وقوع کیسے ہوا، شق ثانی پر پہلے کیوں نہیں وقوع ہوا، اگر کہا جائے کہ طبیعت یوماً فیوماً ترقی کرتی ہے، میں کہتا ہوں کہ ترقی طبیعتِ انسانیہ میں ہونی چاہیئے، کیونکہ مقتضا باہیت کا افراد میں بدلا نہیں کرتا، پھر یہ تخصیص قوم دون قوم کیسی؟

اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس زمانہ میں ایسی چیزوں کا ایجاد کرانا منظور ہے لیسے قویٰ فرما دیئے اسی طرح اگر حق سبحانہ و تعالیٰ کو جس وقت حفاظت دین مقصود و منظور ہو اس وقت حاملانِ دین کے ایسے حافظے بنا دیئے، تو اس میں تعجب و استبعاد کیا ہے۔ اس امر کا ارتکاب تو وہی کر سکتا ہے جو خدا تعالیٰ کو علیم و قدیر نہ مانتا ہو، تو ایسے شخص سے خطاب ہی لاحاصل ہے۔

۳۔ ثالث بعض صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم احادیث بھی لکھا کرتے تھے جیسے عبداللہ

بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہم بعض کو خود حضورؐ نے حدیث لکھوا کر دی ہے، چنانچہ حدیثوں میں ہے۔

اکتبوا لابی شاہ، اور عمر بن عبدالعزیزؒ جو پہلی صدی میں ہوئے ہیں ان کا اہتمام جمع احادیث کے لئے ابو داؤد میں موجود ہے، پھر برابر اپنے طور پر لکھتے رہے، البتہ کتابی، شکل امام مالک سے شروع ہوئی جو ۹۰ھ میں پیدا ہوئے اور ظاہر ہے کہ اتنے قریب زمانہ تک نہ لکھا جانا مضر نہیں ہوتا، بلکہ اکثر ایسا ہی ہوتا ہے کہ جب کسی دیکھنے سننے والے قریب بانقراض ہونے لگتے ہیں اس وقت تدوین ہوتی ہے۔

۴۔ رابع قطع نظر قوت حافظہ کے وہ حضرات غیبی طور پر مؤید من اللہ تھے چنانچہ احادیث میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے لبسط رداء اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس میں کچھ پڑھ دینے اور پھر ان کا اس کو سینہ سے لگا لینے کا قصہ مذکور ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دعا رفقط قرآن وحدیث کی تعلیم فرمانا اور پھر ان کا آیات واحادیث کو نہ بھولنا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اس پر ایمان کامل کی بشارت دینا مروی ومنقول ہے۔

۵۔ خامس، فطری طور پر یہ بات سوچنے کے قابل ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم جیسے دلدادہ وعاشق جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قطرات وضو پر تقابل وتجاول کرنے والے آپ کے بزاق ونخاط کو اپنے ہاتھوں اور موہنوں پر لینے والے، کیا آپ کے الفاظ کو ایسا بے وقعت سمجھ سکتے ہیں، کہ اس کو مدوّن ومحفوظ نہ کریں، یوں ہی ضائع کر دیں، خصوصاً جب کہ حضورؐ فرماویں بلغوا عنی اور نضر اللہ عبدا اسمع مقالتی وحفظھا ووعاھا واداھا کما سمعھا اور یوں فرماویں لیبلغ الشاھد الغائب، اور صحابہؓ کو اس قدر اہتمام تھا کہ تناوب کا معمول کر رکھا تھا۔

یہ سب دلائل ہیں ان کی شدت اہتمام کے اور نقل و قبول میں احتیاط حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قصوں سے کہ بعض دفعہ خبر واحد پر قناعت نہیں کی، ظاہر ہے ایسی حالت میں ایسے احتمال کی کب گنجائش ہے،

پس جب محفوظ کرنا ضروریات فطرت سے ہوا تو آگے سمجھنا چاہیئے کہ محفوظیت کے دو ہی طریقے ہیں، یا کتابت یا حفظ فی الذہن، اور یہ معلوم ہے کہ کتابت کی عام عادت نہ تھی اور بوجہ احتمال خلط فی القرآن کے ناپسند بھی تھی،

پس معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اپنے حافظوں پر پورا اعتماد تھا، اگر ایسا اعتماد نہ ہوتا تو یہ ضرور لکھتے لکھواتے، بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود فرماتے کہ تم لکھتے کیوں نہیں، بدوں اس کے تبلیغ کیسے کروگے" اور کوئی اہتمام نہ کرتا تو آپ خود مثل قرآن کے اس کا اہتمام فرماتے، خصوصاً بعد اس ارشاد کے کہ دیکھو مجھے قرآن کی مثل ایک اور چیز بھی ملی ہے۔

اگر کسی کو شبہ ہو کہ یہ تو اثبات الحدیث بالحدیث ہے تو جواب یہ ہے کہ یہ ظاہر ہے کہ شبہ عدم حفظ احادیث کا باعتبار الفاظ خاصہ کے ہے نہ درجہ اطلاق کے، پس یہ واقعات جو بنائے جواب قرار دیئے ہیں ان کا بنائے جواب ہونا الفاظ خاصہ پر موقوف نہیں، ایک واقعہ کی نقل ہے جس کے الفاظ خواہ کچھ ہی ہوں ہر حال میں اس سے تمسک صحیح ہے۔

۶۔ سادس، کالشمس فی نصف النہار مشاہدہ ثابت ہے کہ حضرات محدثین رضی اللہ عنہم نے قطع نظر حفظ و ضبط کے رواۃ کے تقویٰ و طہارت و دیانت کی سخت تحقیق کی ہے، خصوصاً صفت صدق کی جب ایک شخص کا صدق یقیناً ثابت ہوا اور وہ ثابت الصدق دعویٰ کرے کہ یہ الفاظ ہیں نے اس طرح سنے ہیں اور جتنے رواۃ اس سلسلہ کے ہوں سب کا یہی دعویٰ ہو، پس دو حال سے خالی نہیں یا ایسا حفظ ممکن ہے یا ممکن نہیں ہے۔ اگر ممکن

ہے تو اب انکار کی کیا وجہ؟ اور اگر ناممکن ہے تو اتنے بڑے بڑے عقلاء نے اس کو ناممکن سمجھ کر ردّ اور کیوں نہیں تکذیب کی، اور اس کا نام فہرست صادقین میں سے کیوں نہیں خارج کیا، اور پھر جب روایات اس قاعدہ سے مقبول نہیں تو تحقیق صدق سے کیا فائدہ ہوا اور یہ کہہ دینا کہ سب کے سب مجنون تھے اپنے جنون پر دلیل قائم کرنا ہے۔

سابع، کتب حدیث میں رواۃ کا بکثرت یہ کہنا کہ یہ لفظ یا یہ لفظ بعد تسلیم ان حضرات کی دینداری کے جو مشاہدہ تواتر سے ثابت ہے واضح دلیل ہے ان کے صاحب حافظہ قویہ ہونے کی اور اس کی کہ اور الفاظ جہاں انہوں نے ایسا شک نہیں ظاہر کیا، ان کو خوب ہی یاد ہیں، اور ان کو پورا اعتماد ہے۔

اگر یہ شبہ ہو کہ پھر بھی حدیث میں مختلف رواۃ مختلف الفاظ کیوں لاتے ہیں؟

جواب یہ ہے کہ احادیث میں وارد ہے کہ اکثر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ تھی کہ ایک بات کو تین بار اعادہ فرماتے تھے، پس ممکن ہے کہ ایک نے ایک لفظ نقل کر دیا دوسرے نے دوسرا لفظ اور احیاناً سہو بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن جہاں ایسا احتمال ہو اس جگہ استدلال مسائل میں اس لفظ سے نہیں کیا گیا، بلکہ واقعہ مشترک الثبوت سے کیا گیا ہے پھر الفاظ کی کمی بیشی کیا مضر ہے؟

۸۔ ثامن، تواریخ جن کی سند احادیث کے برابر تو کیا اس سے ہزارویں حصہ میں بھی نہ متصل نہ اس میں اتنی احتیاط پھر بھی تمام عقلا اس پر مدار کار کرتے ہیں۔ احادیث جن میں اس قدر احتیاطیں کی گئیں ہیں ان کے مقبول نہ ہونے کی کیا وجہ ہے؟ تمام شبہات کا اثر صرف الفاظ احادیث کے محفوظ ہونے پر پڑتا ہے، اگر سب اجوبہ مذکورہ سے قطع نظر بھی کر لی جائے، تو اس قدر جواب کافی ہے کہ علماء نے روایت بالمعنی کے جواز کی تصریح کی

ہے اس میں کیا خلل ہے، اور اکثر استدلالات واقعات ہی سے ہیں۔

۹۔ تاسع، متواتر تمام اہلِ عقل کے نزدیک خواہ صاحب ملت ہو یا نہ ہو حجت ہے، اور حدِ تواتر کی یہی ہے کہ قلب اس کے ثبوت پر شہادت دینے لگے۔ حتیٰ کہ بعض اوقات دو تین شخصوں کے یہ اخبار کہ فلاں حاکم نے یہ لفظ کہا تھا درجہ متواتر میں سمجھا جاتا ہے، پھر ایک لفظ مختلف روایات واسانید سے تمام صحاح میں موجود ہے، فطرۃً قلب اس کے ثبوت پر گواہی دے گا ہرگز اس کے تواتر میں شبہ نہ رہے گا۔

ان امورِ عشرہ میں جو شخص خالی الذہن ہو کر نظرِ غائر سے دیکھے گا انشاءاللہ شبہ مذکور کا اس کے قلب میں نہیں رہے گا نہ اثر۔

اب اس مضمون کو ایک شبہ کے جواب پر ختم کرتا ہوں، وہ یہ کہ شاید کوئی شخص کہے کہ اگر صحابہؓ کا ایسا حافظہ تھا تو قرآن لکھنے کا کیوں اہتمام ہوا؟ جواب یہ ہے کہ قرآن کے ساتھ علاوہ اثباتِ احکام کے تحدی بھی مقصود تھی اور الفاظ متقاربہ اس کے لئے مضر تھے، بخلاف احادیث کے کہ الفاظ سے تحدی مقصود نہیں۔ لہٰذا تقاربِ الفاظ گوارا کیا گیا کہ استدلال کے لئے کافی ہے لہٰذا اس کا اہتمام کیا گیا، اس کا نہیں کیا گیا (امداد الفتاویٰ)

اوپر کی تفصیل سے واضح ہو گیا ہو گا کہ علمِ حدیث ایک بحرِ ذخار اور سمندر ناپیدا کنار ہے اور ہر زمانے میں اس کی مختلف طریقوں سے خدمت کی جاتی رہی ہے، اس کی حفاظت جمع و تدوین، تالیف و تصنیف غرضیکہ مختلف پہلوؤں پر مختلف زمانوں میں علمِ حدیث کی خدمت کا فریضہ انجام دیا جاتا رہا ہے اور یہ فرض صحابہ کرامؓ کے دور سے لے کر ہر زمانے میں تسلسل کے ساتھ انجام دیا جا رہا ہے۔

صحابہ کرامؓ کے دور میں اگرچہ زیادہ تر حفظِ حدیث اور زبانی درس و تبلیغ کے ذریعے

دوسروں تک حدیث کے پہنچانے کا کام انجام پاتا رہا۔ اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرامؓ کے حافظے ایسے بنائے تھے کہ جو بات سن لیتے تھے اس کو ان الفاظ ہی میں محفوظ کر لیتے تھے، پھر بھی صحابہ کرامؓ کے زمانے میں ہی حدیث کے متعدد مجموعے تالیف کئے گئے اور خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے بھی حدیث کے بعض مجموعے لکھ کر دوسروں تک پہنچائے گئے تھے۔

صحابہ کرامؓ کے بعد پھر تابعینؒ نے صحابہؓ سے احادیث کی تحصیل کی اور باقاعدہ کتابت حدیث اور اس کی تالیف کا دور شروع ہوا۔ مسند امام ابوحنیفہؒ، جامع الآثار، امام ابویوسفؒ، موطا امام مالک کو اس زمانے کی حدیثی خدمات میں امتیازی حیثیت حاصل ہے، پھر تیسری صدی ہجری میں امام ابن حنبل کی مسند، اور صحاح ستہ کے علاوہ مسند بزار اور مسند ابویعلیٰ موصلی وغیرہ کی تدوین عمل میں آئی،

برِّصغیر میں علمِ حدیث

برصغیر پاک و ہند میں علم حدیث کی ابتداء سندھ میں مسلمانوں کی آمد کے ساتھ پہلی صدی ہجری سے ہو گئی تھی، چوتھی صدی ہجری میں یہ سلسلہ وسیع ہو کر لاہور تک پہنچا اور شیخ محمد اسمٰعیل بخاری لاہوری سے ہوتا ہوا دسویں صدی ہجری میں شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ تک آ گیا۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے مشکوٰۃ شریف کی دو شرحیں لکھیں ایک فارسی زبان میں اشعۃ اللمعات کے نام سے دوسری عربی زبان میں لمعات کے نام سے جو تمام مدارس عربیہ میں اساتذہ اور طلباء کے زیر مطالعہ رہتی ہیں اور حدیث کے پڑھنے پڑھانے والوں کے لئے نہایت درجے مفید ہیں، حضرت شیخ کے صاحبزادے شیخ نور الحقؒ (متوفی ۱۰۷۳ھ

نے بخاری شریف کی شرح بزبانِ فارسی لکھی جس کا نام تیسیر الباری ہے۔ گیارہویں صدی ہجری میں حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ اور آپ کے صاحبزادہ حضرت خواجہ محمد معصوم ۱۰۷۹ھ نیز دوسرے محدثین بھی علمِ حدیث کی خدمات سرانجام دیتے رہے بارہویں صدی ہجری میں برِصغیر کے مسلمانوں نے حضرت شاہ عبدالرحیم فاروقی دہلویؒ کے فرزندارجمند حضرت شاہ ولی اللہ جیسے مایہ ناز نابغۂ روزگار محدثِ شہیر اور مفسرِ کبیر کو دیکھا۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے عرب وعجم کے کبار اساتذہ کرام اور محدثین عظام سے استفادہ کیا اور علوم قرآن وحدیث کی اشاعت کی اور جہالت کی تاریکی میں علم کی شمع روشن کی، ۱۱۷۶ھ میں آپ کا انتقال ہوا،

شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے تلامذہ میں سے حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ (۱۲۲۵ھ) جو اپنے زمانہ میں بیہقیِ وقت کہلائے اور شاہ عبدالعزیزؒ کے نواسہ اور تلمیذ خاص شاہ محمد اسحٰق دہلویؒ (۱۲۶۲ھ) نے علم حدیث کی خدمات انجام دیں۔

شاہ محمد اسحٰق دہلویؒ کے شاگردانِ رشید شاہ عبدالغنی مجددیؒ اور مولانا احمد علی محدث سہارنپوریؒ ۱۲۹۷ھ نے تدریس وتالیفات کے ذریعہ علم حدیث کی بڑی گراں قدر خدمات انجام دیں شاہ عبدالغنیؒ نے ابنِ ماجہ کا عربی حاشیہ بنام انجاح الحاجہ لکھا، اور مولانا محدث سہارنپوریؒ نے بخاری شریف کا حاشیہ عربی میں لکھا جس سے خلقِ کثیر کو نفع پہنچا، اور پہنچ رہا ہے، برِصغیر میں شاید ہی کوئی شخص بخاری شریف کا درس دینے والا محدث اور حاصل کرنے والا شاگرد اس کے استفادہ سے مستغنی رہا ہو۔ اساتذہ اور تلامذہ پر محدث سہارنپوریؒ کا یہ بہت بڑا احسان ہے۔

شاہ عبدالغنیؒ اور مولانا احمد علیؒ کے ارشد شاگردوں میں مولانا رشید احمد محدث گنگوہیؒ

اور مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بھی تھے، مولانا محمد قاسمؒ نے اپنے استاذ مولانا احمد علی محدث کے ارشاد پر بخاری شریف کے آخری پانچ پاروں کا عربی حاشیہ لکھا۔ انہی مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے اپنے استاذ محدث سہارنپوریؒ اور اپنے ہمدرس مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نیز دیگر اکابر دیوبند کے مشورہ سے برصغیر میں علم حدیث کی خدماتِ عالیہ کا مرکز دارالعلوم دیوبند کا سنگِ بنیاد رکھا، سلسلہ ولی اللّٰہی کے محدثین کا یہ کارنامہ امتیازی حیثیت کا حامل ہے۔

"دارالعلوم دیوبند"

۱۵ محرم ۱۲۸۲ھ کو اس کا افتتاح ہوا اور دیکھتے دیکھتے ہی ایک عظیم الشان اسلامی یونیورسٹی کی صورت اختیار کرلی۔

اس اسلامی یونیورسٹی سے محدثین، مفسرین، مصنفین، مدرسین، مشائخ طریقت، خطیب و مناظر، اور طبیب و صحافی تیار ہوکر برصغیر کے کونہ کونہ میں پھیل گئے اور جگہ جگہ علم کی شمع روشن کی۔ اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے، برصغیر پاک و ہند کا در و دیوار قال اللّٰہ و قال الرسول کی صداؤں سے گونج اٹھا، ۱۲۸۲ھ سے ۱۳۸۲ھ تک صرف ایک صدی میں دارالعلوم کے فضلاء کی تعداد ۶۵۷۲ تھی جو باقاعدہ طور پر مکمل نصاب پورا کرکے وہاں سے سندِ فراغ حاصل کرنے کے مستحق ہوئے،

اور اُن کی تعداد کا تو اندازہ ہی نہیں لگایا جاسکتا جنہوں نے دارالعلوم سے استفادہ کیا مگر تکمیلِ نصاب سے پہلے ہی تعلیم کو ترک کر دیا،

دارالعلوم دیوبند کے مایہ ناز محدثین اور قابلِ صد افتخار، مفسرین مصنفین اور مشائخ طریقت کی اس قابلِ افتخار جماعت میں دوسرے حضرات کے علاوہ۔

حکیم الامت مولانا شاہ محمد اشرف علی تھانویؒ کا نام نامی اور اسمِ گرامی ایک امتیازی حیثیت کا حامل ہے، برِصغیر میں علم حدیث کی خدمات کے سرسری جائزہ کے بعد حضرت حکیم الامت تھانویؒ کی خدماتِ حدیث کا تذکرہ کیا جاتا ہے جو اس مقالہ کا اصل موضوع ہے مگر اس سے پہلے آپ کا مختصر تعارف کرا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

حکیم الامتؒ نے ایک طرف مغرب زدہ ذہنوں کی تفسیر، حدیث اور علمِ کلام میں تصانیف کے ذریعہ اصلاح کی، تو دوسری طرف اپنے مواعظ و ملفوظات اور سینکڑوں تالیفات سے علم و عمل سے محروم لوگوں کی علمی اور عملی تربیت کا بڑا گرانقدر کارنامہ انجام دیا۔

نوٹ:۔ تعارف اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں۔

مختصر تعارف

ہندوستان کے صوبہ یو۔پی ضلع مظفر نگر، قصبہ تھانہ بھون، میں حکیم الامت ۵ ربیع الثانی ۱۲۸۰ھ مطابق ۱۸۶۳ء کو پیدا ہوئے آپ والد کی طرف سے فاروقی النسب اور والدہ کی جانب سے علوی النسب تھے، پہلے قرآنِ مجید حفظ کیا، ابتدائی تعلیم میرٹھ میں شروع کی پھر وطن مالوف تھانہ بھون آکر وہاں مولانا فتح محمد صاحب تھانویؒ سے متوسط کتابیں پڑھیں اور بعد ازاں ۱۲۹۵ھ میں درس نظامی کی تکمیل کے لئے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور ۱۳۰۱ھ میں بعمر ۲۱ سال سند فراغ حاصل کی، دارالعلوم دیوبند کے اکابر علماء محدثین، و مفسرین اور جامع معقول و منقول آپ کے اساتذہ کرام تھے جن میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ، مولانا سید احمد دہلویؒ، ملا محمود دیوبندیؒ، مولانا عبد العلیؒ، مولانا محمود الحسن شیخ الہندؒ جیسے مشاہیر شامل ہیں۔

تحصیلِ علم کے بعد کانپور کے سب سے قدیم مدرسہ فیض عام میں وہاں کے مشہور معقول عالم مولانا احمد حسن صاحبؒ کی جگہ اپنی تدریسی خدمات کا آغاز کیا، پھر وہاں کی جامع مسجد میں جامع العلوم کے نام سے مدرسہ قائم کیا اور اس میں صفر ۱۳۱۵ھ تک تقریباً ۱۴ سال تک تدریسی خدمات انجام دیں اور مدرسہ کے صدر مدرس، شیخ الحدیث اور دارالافتاء کے صدر مفتی کے فرائض سر انجام دیتے رہے اس کے ساتھ ہی عوام و خواص کی روحانی تربیت تزکیہ نفوس اور تصفیہ قلوب کا سلسلہ بھی شروع فرمایا خصوصی مجلس

بابرکت میں ملفوظات کے ذریعہ اور عمومی مجمع میں وعظ وارشاد کے ذریعہ خصوصی اور عمومی اصلاحات میں مشغول رہے، دار العلوم دیوبند میں تحصیل علم کے زمانہ ۱۲۹۹ھ ہی میں عارف باللہ شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر مکی قدس سرہ نے آپ کو بذریعہ خط اپنی بیعت میں قبول فرمالیا تھا، تعلیم سے فراغت کے بعد ۱۳۰۱ھ میں سفر حج وزیارت مدینہ منورہ کی سعادت کے ساتھ اپنے مرشد کے دست حق پرست پر بالمشافہ بیعت کا شرف بھی حاصل ہوا۔

۱۳۱۰ھ میں دوبارہ حج وزیارت سے مشرف ہوئے تو حضرت حاجی صاحبؒ کے ارشاد کے موافق حضرت حاجی صاحبؒ کی خدمت بابرکت میں چھ مہینہ قیام کر کے تربیت اور فیوضات حاصل کئے، ذکر واذکار، ریاضات واشغال کیساتھ باقاعدہ تصوف کی کتابیں مثنوی مولانا رومؒ اور حضرت حاجی صاحبؒ کی خاص تعلیمات واوراد پر مشتمل کتاب ضیاء القلوب حضرت حاجی صاحبؒ سے براہ راست سبقاً سبقاً پڑھیں، اور مثنوی شریف پر حضرت حاجی صاحبؒ کی تحقیقات خاصہ بصورت نوٹ قلم بند فرمائیں، بعد میں ان کی مدد سے ہی مثنوی شریف کی عالمانہ اور عارفانہ دونوں شانوں کی جامع بے نظیر شرح کلید مثنوی کے نام سے لکھی، حضرت حاجی صاحبؒ نے حکیم الامتؒ کی تعلیم وتربیت اور صلاحیت واستعداد کا اندازہ لگانے کے بعد آپ کو خلعت خلافت سے نوازا اور یہ وصیت فرمائی،

"دیکھو جب کبھی کانپور میں مدرسہ کی ملازمت سے برداشتہ خاطر ہو تو پھر اپنے وطن تھانہ بھون میں ہماری دیرینہ خانقاہ اور مدرسہ کو از سر نو آباد کرنا اور توکلاً علی اللہ وہاں قیام پذیر ہو جانا انشاء اللہ تم سے خلائق کثیرہ کو نفع پہنچے گا میری دعائیں اور

توجہات تمہارے شاملِ حال ہیں"۔

آخر کار حضرت حاجی صاحبؒ کی وصیت کیمطابق ۱۳۱۵ھ میں کانپور سے قطع تعلق کر کے تھانہ بھون "خانقاہ امدادیہ" اور مدرسہ "امداد العلوم" میں توکلاً علی اللہ مستقل قیام کے ارادہ سے تشریف لے آئے اور اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے یہ خانقاہ امدادیہ جس کا لقب "دکانِ معرفت" تھا اور اقطاب ثلاثہ، مولانا شیخ محمد محدث تھانویؒ، حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، حافظ محمد ضامن صاحبؒ، کے ارشاد وہدایت کا مرکز تھی پھر سے مرجع عام و خاص بن گئی۔

حکیم الامتؒ خانقاہ میں آنے والوں کی ملفوظات وتعلیمات کے ذریعہ تربیت بھی فرماتے اور مدرسہ میں زیرِ تعلیم طلبا کی تعلیم ظاہری کے ساتھ تربیتِ باطنی اور اصلاح بھی کرتے، ان دو کاموں کے علاوہ تصنیف وتالیف میں بھی مشغول رہتے اور فتاویٰ کا کام بھی انجام دیتے، پھر گاہ بگاہ ہدایت وارشادِ خلق کے لئے مواعظ کے ذریعہ ملک کے گوشہ گوشہ میں تبلیغی اسفار بھی کرتے تھے،

اللہ تعالیٰ نے حکیم الامتؒ کے اوقات میں بڑی برکت عطا فرمائی تھی تھوڑے سے وقت میں اس قدر کام کر لیتے تھے آج اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

حکیم الامتؒ اپنی تصنیفی اور تربیتی، تبلیغی، حتیٰ کہ خانگی زندگی میں بھی اوقات کے نظم وضبط اور معمولات کے بے حد پابند تھے، ہر کام کے لئے ایک وقت متعین تھا اور وہ کام اپنے متعینہ وقت پر ہی انجام دیا جاتا تھا، اس انضباط اوقات کی بدولت اللہ تعالیٰ نے آپ کے اوقات میں جو برکات عطا فرمائیں تھیں وہ تصورات سے بالاتر ہیں۔

حکیم الامت کے ایام حیوٰۃ اور آپؒ کی ہمہ جہت علمی ودینی اور اصلاحی خدمات دیکھ کر

آپ کے اوقات میں برکات کا اندازہ ہوتا ہے، کہ نصف صدی سے کچھ زائد عرصہ میں اس قدر طویل کام اور متنوع دینی خدمات کا انجام پانا اس انضباط اوقات کے بغیر ناممکن تھا۔

علم تفسیر، حدیث، عقائد و کلام، فقہ، تصوف، منطق، مناظرہ غرضیکہ ہر علم و فن میں حکیم الامتؒ کی بیش بہا قابل تصنیفات و تالیفات موجود ہیں، اور مواعظ و ملفوظات کے مجموعے بڑی بڑی مجلدات میں ان کے علاوہ محفوظ ہیں۔

علم و فن کے تنوع کے علاوہ کہ ہر علم و فن میں آپ کی تصانیف لکھی گئی ہیں، تصانیف کی افادیت کے لحاظ سے بھی تصانیف میں تنوع پایا جاتا ہے۔

بعض کتابیں خالص علمی اصطلاحی انداز میں علماء و طلباء کے افادہ کے لئے ہیں ان میں دقیق مسائل کا علمی انداز میں حل بتلایا گیا ہے۔ اور اہل علم کی رہنمائی اہم مسائل میں فرمائی گئی ہے ان کتابوں سے صرف علماء کرام اور منتہی طلباء ہی استفادہ کر سکتے ہیں جیسے تفسیر بیان القرآن، اس کی زبان خالص علمی اور اصطلاحی ہے، جب تک علوم متعلقہ حاصل نہ ہوں گے، اس وقت تک اس کے مطالب کو کماحقہ نہیں سمجھا جا سکتا۔

اور بعض کتابیں عام مسلمانوں کے فائدہ کے لئے ہیں جن کی زبان آسان اور عام فہم ہے، جیسے بہشتی زیور اس میں روزمرہ کے مسائل ضروریہ بڑے ہی آسان انداز میں بیان کئے گئے ہیں، عامۃ المسلمین کے لئے یہ کتاب دستور العمل کی حیثیت رکھتی ہے۔

اسی طرح ایک طرف المصالح العقلیہ اور الانتباہات المفیدہ عن الاشتباہات الجدیدہ کی تالیف ہے، تو دوسری طرف حیوٰۃ المسلمین بھی تالیف فرمائی اس طرح حکیم الامتؒ کی کتابوں سے خواص و عوام مستفید ہوتے چلے آرہے ہیں اللہ تعالیٰ اس چشمۂ فیض کے افاضات و افادات کو رہتی دنیا تک قائم و دائم رکھے آمین ثم آمین۔

"طرزِ تعلیم"

حکیم الامت کا طرزِ تعلیم اس درجہ سلیس اور نفیس تھا کہ جو طالب دو چار سبق بھی حضرتؒ سے پڑھ لیتا پھر کسی اور استاذ سے اس کی تسلّی نہ ہوتی تھی،

کیونکہ حضرت پڑھاتے وقت خود اپنے اوپر بہت مشقت برداشت کرتے تھے اور پڑھانے سے پہلے سبق کی تقریر کو منضبط کر لیتے تھے پھر پڑھاتے تھے، اس لئے ساری تقریر نہایت سلیس اور سہل اور مرتب ہوتی تھی اور مشکل سے مشکل مضامین بھی طالب علم کے لئے بالکل پانی اور آسانی کے ساتھ ذہن نشین ہو جاتے تھے حضرتؒ کو تقریر میں تعب ہوتا تھا مگر طالب علم کو کسی مقام کے سمجھنے میں ذرا الجھن نہیں ہوتی تھی، دوسرے کا بوجھ حضرت اپنے اوپر لے لیتے تھے،

غرضیکہ حضرت حکیم الامتؒ درس و تدریس میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے اور درس و تدریس کا سلسلہ چھوڑنے کے بعد بھی مجلس میں اکثر مضامین علمیہ علماء و طلباء کے کام کے بیان فرماتے رہتے تھے، جو آپ کے ملفوظات میں محفوظ ہوتے رہتے تھے۔

حضرت حکیم الامتؒ کی عادت پڑھانے میں یہ تھی کہ ضرورت سے زیادہ کبھی تقریر نہیں کرتے تھے صرف حل کتاب پر اکتفا کرتے تھے، استعداد اس سے ہی پیدا ہوتی ہے اور جب استعداد پیدا ہو جائے گی تو پھر نکات و دقائق خود ہی سمجھ میں آنے لگیں گے لہٰذا استاذ کا مطمحِ نظر یہی ہونا چاہیئے کہ اصل کتاب حل ہو جائے، حضرت حکیم الامت کا ارشاد ہے کہ جب کتابیں خوب اچھی طرح سمجھ کر پڑھ لی جائیں گی تو تقریر، تحریر، مناظرہ کی استعداد خود بخود ہی پیدا ہو جائے گی، اور اگر تقریر کا ایسا ہی شوق ہے تو جو طالب علم جو کتاب

پڑھ رہا ہو، اسی کے متعلق اس سے تقریر کرالی جایا کرے اس سے تقریر کی بھی مشق ہو جائے گی اور کتابیں بھی پختہ ہو جائیں گی۔

حضرت حکیم الامت ؒ نے ۱۳۰۱ھ تا آخر صفر ۱۳۱۵ھ چودہ سال جامع العلوم کانپور میں درس و تدریس کی خدمت انجام دی اور ہر علم و فن کی بڑی بڑی کتابیں کامیابی سے پڑھائیں، حالانکہ کانپور کے جس مدرسہ فیض عام میں، دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہونے کے بعد آپ کو بلایا گیا تھا وہ مدرسہ سب سے قدیم اور مولانا احمد حسن صاحب ؒ جو مشہور عالم اور ماہر معقولات تھے، کی وجہ سے مقبول عام تھا، انہوں نے کسی وجہ سے اس مدرسہ سے علیحدہ ہو کر دوسرا مدرسہ دارالعلوم کے نام سے قائم کر لیا تھا، اس چھوٹی عمر اور ناتجربہ کاری کے زمانہ میں ان کی جگہ بیٹھ کر پڑھانا کوئی معمولی بات نہیں تھی، مگر اللہ تعالیٰ کے فضل سے کوئی دقت پیش نہیں آئی بہت آسانی کے ساتھ پڑھاتے چلے گئے، وہاں کے تمام مدرسین اور اہل شہر میں بہت جلد آپ کی قابلیت کی شہرت ہو گئی اور ہر دلعزیز ہو گئے، یہاں تک کہ مولانا احمد حسن صاحب ؒ بھی بہت محبت اور وقعت سے پیش آنے لگے، اور کچھ دنوں کے بعد کانپور کی جامع مسجد میں ایک مدرسہ معقولات و دینیات کا جامع بنام جامع العلوم قائم ہو گیا جو اب تک بحمد اللہ قائم ہے اس میں آپ نے درس و تدریس کا سلسلہ جاری فرما دیا، اور تمام علوم و فنون کی کتابوں کا درس دیا، حضرت تھانوی ؒ کی وجہ سے اس مدرسہ کی ان اطراف میں اتنی شہرت ہوئی کہ اس کو دارالعلوم دیوبند کا ثانی سمجھا جانے لگا، چنانچہ یہاں سے دورۂ حدیث پڑھ کر بڑے بڑے محدث تیار ہوئے۔

مولانا محمد اسحٰق صاحب بردوانی ؒ بھی جامع العلوم کانپور کے زمانہ کے ہی حضرت حکیم الامت تھانوی ؒ کے ارشد تلامذہ اور خلفاء میں سے تھے، وہ اپنے زمانہ کے بڑے

پایہ کے محدث تھے بخاری شریف کے گویا حافظ تھے ہر روز اس کے ایک پارہ کی تلاوت کیا کرتے تھے، حج کے موقع پر ایک نجدی عالم نے ایک حدیث کے بارے میں دریافت کیا کہ یہ بخاری میں کتنی جگہ آئی ہے؟ آپ نے فرمایا چھ مقامات پر وہ عالم حیران رہ گئے کہ ہندوستان کے علماء دین بھی اتنے زبردست حافظہ کے مالک ہوتے ہیں، مولانا کا حافظہ مثالی تھا، آپ کو نحو میں کافیہ پورا حفظ یاد تھا اور قرآن کریم صرف بیاسی[۸۲] روز میں حفظ کرلیا تھا، حضرت مولانا بردوانیؒ کی علم حدیث میں جلالتِ شان کا سب سے بڑا ثبوت، محدث کبیر، فقیہ خبیر حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کا آپ کے تلامذہ میں سے ہونا ہے۔

"معقولات میں امتیازی حیثیت"

علم معقول میں بھی حضرتؒ کو امتیازی حیثیت حاصل تھی تیسیر المنطق کا حاشیہ جس سے عام طور پر درس نظامی کا ہر طالب علم مستفید ہو سکتا ہے، حضرت کی درسی زمانہ کی یاد تازہ کرا رہا ہے۔

صدرا فلسفہ کی مشہور درسی اعلیٰ درجہ کی کتاب ہے، اس کا ایک مشہور مقام مثناۃ بالتکریر ہے اس کو بہت ہی مشکل سمجھا جاتا ہے مگر حضرتؒ نے اس کی ایک سلیس تقریر فرمادی اور بہت ہی آسان کر کے تقریر کی تو طالب علم جن کا نام مولوی فضل حق تھا ان کی سمجھ میں خوب اچھی طرح آگئی اور ذہن نشین ہوگئی، اتفاق سے مولوی فضل حق کے سالانہ تحریری امتحان میں مثناۃ بالتکریر کا سوال آگیا، ممتحن مولانا عبد الغفار صاحب تھے جو کانپور کے ذکی جامع عالم تھے، مولوی فضل حق نے جوابی ایسی اچھی تقریر لکھی کہ ممتحن صاحب کو بہت پسند آئی اور اس کی بڑی تحسین فرمائی، مدرسہ والوں نے بھی اس کو طالب علموں کے لئے مفید سمجھ کر

مدرسہ میں محفوظ رکھ لیا، اگر وہ طبع ہو جاتی تو طالب علموں کے لئے بلکہ اساتذہ کے لئے بھی بڑے کام کی چیز ہوتی"۔

علم منطق اور معقولات کے اہم مسائل میں حضرت حکیم الامتؒ کی اپنی خاص تحقیق ہوتی تھی جس کی بڑے بڑے معقولی حضرات بھی تحسین و تصویب فرماتے تھے، جس نے منطق کا ایک رسالہ بھی حضرت سے پڑھ لیا اس کو منطق سے پوری مناسبت ہو جاتی تھی اس لئے تدریس چھوڑ دینے کے بعد بھی اپنے خاص تعلق والوں کو منطق کی کم از کم ایک ابتدائی کتاب خود پڑھا دیتے تھے،

تلامذہ

تمام حضرات تلامذہ کے اسماء گرامی کی تعداد کا احاطہ مشکل ہے مگر جن فارغ التحصیل حضرات کے اسماء گرامی مع پتہ اور تاریخ فراغ کا علم ہو سکا صرف ان کی فہرست اشرف السوانح ج ۲ میں درج کر دی گئی ہے۔ جن کی تعداد باون ۵۲ ہے۔

جامع العلوم کانپور کے زمانہ تدریس حدیث میں آپ سے بہت سوں نے حدیث کا علم حاصل کیا اور آپ کے شاگردوں میں بکثرت محدث پیدا ہوئے جن میں مولانا محمد اسحٰق بردوانیؒ اور مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کا نام سب سے زیادہ روشن ہوا، حضرت حکیم الامتؒ نے اگرچہ خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون کے مستقل قیام کے زمانہ میں باقاعدہ درس حدیث جاری نہیں فرمایا، مگر افادہ حدیث کا سلسلہ اس زمانہ میں بھی جاری رہا اور علماء اس زمانہ میں بھی آپ سے حدیث کی سند حاصل کرتے رہے،

علامہ محقق محمد زاہد کوثری مصر کے مشہور علماء محققین و مصنفین میں سے تھے، انہوں

نے بھی بذریعہ خط حضرت حکیم الامتؒ سے حدیث کی سند حاصل کی اس طرح آپ کے تلامذہ اور افادہ حدیث کا سلسلہ ہندوستان سے بیرونی ملک تک پہنچا۔

حکیم الامّت تھانویؒ کی تصانیف و تالیفات

حضرت حکیم الامتؒ زمانہ طالب علمی ہی سے جبکہ آپ کی عمر ۱۸ سال کی تھی مصنف تھے اور آخر عمر تک مصنف رہے اس عمر میں آپ نے مثنوی مولانا رومؒ کے طرز پر فارسی زبان میں ایک مثنوی زیر بم کے نام سے لکھی تھی، ایسا مصنف جس نے تقریباً ہر علم وفن میں گرانقدر تصانیفی خدمات انجام دی ہوں اور اتنی کثیر تعداد میں کتابیں لکھی ہوں غالباً امام سیوطیؒ کے بعد حضرت حکیم الامتؒ کے سوا کوئی نظر نہیں آتا۔

درس وتدریس کے ساتھ ہی ملک کے گوشہ گوشہ میں سفر کر کے اپنے مواعظ حسنہ اور اصلاحی پروگراموں سے بھی عام مسلمانوں کی اصلاح وتربیت فرماتے تھے، وعظ وخوش بیانی میں آپ کو ایسا بے نظیر ملکہ حاصل تھا کہ جس جلسہ میں آپ تقریر کو کھڑے ہوتے پھر کسی کی تقریر سامعین کو پسند نہ آتی تھی، اور آپ کے سامنے کسی اور کی تقریر کو اکثر اہلِ جلسہ پسند نہ کرتے۔

علم تفسیر

تفسیر کا تو کہنا ہی کیا حکیم الامتؒ کے ترجمہ اور تفسیر بیان القرآن کی سب سے بڑی

خصوصیت یہی ہے کہ عالم وغیر عالم جو بھی اس کو پڑھنے لگے، اس طرح بے تکلف سمجھتا چلا جائے گا کہ جن مقامات پر بڑوں بڑوں کو اکثر ٹھوکریں لگی ہیں وہاں یہ بھی محسوس نہ ہوگا کہ راستہ میں کوئی تنکا ہی پڑا ہے، باقی صحیح طور پر داد تو وہی اہلِ بصیرت دے سکتے ہیں جن کی خود بھی مشکلاتِ قرآنی پر نظر ہے، بیان القرآن میں قرآن کریم کے نظم و ربط کی یہ خدمت انجام دی گئی ہے کہ ہر چھوٹا بڑا حصہ اور ہر چھوٹی بڑی آیت دوسری سے اس طرح مربوط ہوگئی، کہ متن قرآن اور کے تحتانی ترجمہ کے بعد ہر آیت کا قوسین میں ساتھ جو تفسیری ترجمہ فرما دیا گیا، اگر اس کو آدمی پڑھتا چلا جائے تو معلوم ہوگا کہ بے تکلف مسلسل و مربوط کتاب پڑھ رہا ہے۔

تفقہ

فقہ دانی اور تفقہ کی بڑی کسوٹی کسی فقیہہ کے لئے اس کے فتاوٰی کی تحقیقی اور معیاری حیثیت ہوتی ہے، حضرتؒ کے فتاوٰی امداد الفتاوٰی کے نام سے ضخیم چھ جلدوں میں طبع شدہ ہیں، حضرات اہلِ فتاوٰی کی نگاہ میں وہ بڑی ہی قدر و وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں یہ فتاوٰی حضرت حکیم الامتؒ کے کمالِ تفقہ پر گواہ ہیں خصوصیت سے نو پید مسائل جدید معاملات سے متعلق حوادث الفتاوٰی کے عنوان سے حضرت کے فتاوٰی اور تحقیقات قابلِ دید ہیں۔

آلاتِ جدیدہ، فلم و سینما، گراموں فون، مسمریزم، فریمیسن، ثبوت ہلال بحر تار، طویل النہار مقامات میں حکم صوم و صلوٰۃ، ہوائی جہاز میں نماز، غرضیکہ کوئی نئی بات مشکل ہی سے ایسی ہوگی جس کی نسبت عام فتاوٰی کے علاوہ حضرت کی خاص عمیق فقہی تحقیق موجود نہ ہو بلکہ وسیع معنی میں تفقہ فی الدین ہی تو حضرت حکیم الامت کا سب سے نمایاں وصف ہے، فقہاء

حکمائے امت ہیں یہی حکیمانہ نظر و فکر حضرت کا ایسا ہمہ گیر کمال ہے جو صرف اصطلاحی فقہ تک محدود نہیں، بلکہ سارے مواعظ و ملفوظات اور ساری تعلیمات و تجدیدات کی روح ہے۔

تصوّف

حکیم الامتؒ اپنے مرشد کامل حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہ کی طرف سے اجازت پاکر مسلمانوں کو تلقین و ارشاد کے ذریعہ ظاہری تعلیم کے ساتھ باطنی تربیت و خلافت میں بھی لگے ہوئے تھے، اور آپ کی توجہ باطنی سے تربیت حاصل کرنے والوں پر عجیب و غریب حالات طاری ہوتے تھے، مگر جب ۱۳۱۵ھ میں مستقل طور پر اپنے پیر روشن ضمیر کی غیر آباد خانقاہ کو آباد کرنے کے ارادہ سے تھانہ بھون تشریف لائے، تو اس وقت ہمہ تن تزکیۂ نفوس اور تربیت قلوب اور اصلاحِ باطن میں مشغول ہوگئے اور تصوّف کے مجدد اعظم ثابت ہوئے۔

حکیم الامتؒ کا سب سے وسیع و محیط تجدیدی کارنامہ تصوّف کی کامل و جامع تجدید و اصلاح ہے حق یہ ہے کہ یہ خدمت حضرت والا سے ایسی لی گئی ہے کہ جس کی نظیر پہلے بہت کم نظر آتی ہے، تصوّف یا طریقت کی ساری تعلیمات، کلیات و جزئیات، حضرت والا کی تجدید کے بعد عین شریعت بن گئیں اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ تصوّف کے بغیر دین کامل ہی نہیں ہوتا۔ شریعت و طریقت کی دوئی کی بحث ہی انشاءاللہ ختم ہوگئی۔

اس مقالہ کے موضوع کی مناسبت سے اس وقت صرف حکیم الامتؒ کی خدمت حدیث پر روشنی ڈالی جاتی ہے اور مختصر طریقہ پر آپ کی حدیثی تالیفات، تقریرات کا تعارف کرایا جاتا ہے کہ اصل موضوع اس مقالہ کا حضرت حکیم الامتؒ کی حدیثی خدمات کا تعارف کرانا ہی ہے۔

عام طور پر آپ کو حکیم الامت اور مجدد الملت اور تصوف و طریقت کے مجدد، مفسرِ اعظم، فقیہہ ملّت اور مشہور خطیب ہونے کی حیثیت سے بھی جانا پہچانا جاتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ حکیم الامتؒ کو تمام علوم نقلیہ و عقلیہ میں بڑی دستگاہ حاصل تھی اور وہ اپنے زمانہ کی نابغۂ روزگار اور بڑی جامع اور بے نظیر شخصیت تھی، لیکن اس بات سے بہت کم لوگ واقف ہیں کہ اس زمانہ میں حکیم الامت، محدثِ اعظم بھی تھے اور خدمتِ حدیث بھی حکیم الامت کا عظیم الشان کارنامہ ہے جو آپ کے تاجِ مجددیت کا درخشاں گوہر ہے۔

حکیم الامت تھانویؒ نے جس جس انداز اور مختلف طریقوں سے علمِ حدیث کی خدمات انجام دی ہیں ان کو کئی قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، ایک قسم وہ ہے جس کو آپ نے درس و تدریس کے ذریعے انجام دیا ہے، اور دوسری قسم یہ ہے کہ وعظ و تقریر اور ملفوظات کے ذریعہ حدیث کی تشریح فرمائی ہے۔ اور تیسری قسم وہ ہے جو آپ نے اپنے قلم سے تحریری طور پر انجام دی ہے اور اس علم شریف میں خود کوئی کتاب لکھی ہے، یا اپنے فتاویٰ وغیرہ کتب میں اپنے قلم سے احادیث کی تشریح اور متعلقہ علوم حدیث کو ضبطِ تحریر میں لائے ہیں۔ اور ایک قسم آپ کی خدمتِ حدیث کی یہ ہے کہ آپ کے زیرِ اہتمام اور نگرانی میں علمِ حدیث کی خدمت انجام پائی ہے۔ ان خدمات کے تعارف کے ضمن میں اس کا بخوبی اندازہ ہوگا کہ حکیم الامتؒ تھانوی کو علمِ حدیث سے کس قدر شغف حاصل تھا، اور اس علم شریف میں آپ کو کیسی دسترس عطا فرمائی گئی تھی اور حدیث کی تشریح و توضیح کا کیسا خداداد ملکہ آپ کو ودیعت ہوا تھا۔

"سندِ حدیث"

حضرت حکیم الامتؒ کی سندِ حدیث لکھنے سے پہلے یہ معلوم کر لینا مفید ہے کہ سند

حدیث کی حیثیت اور اس کا کیا درجہ ہے۔

اسلام کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال کو سند کے ساتھ محفوظ کیا گیا ہے، اور ہر ہر قول وفعل کی سند بیان کی گئی ہے، بغیر سند کے کوئی بات قبول نہیں کی گئی یہ بات اسلام کے سوا کسی مذہب کو حاصل نہیں ہے، حافظ ابن حزم فرماتے ہیں، کہ پہلی اُمتوں میں سے کسی امت کو یہ توفیق میسّر نہیں ہوئی کہ اپنے رسول کے کلمات صحیح ثبوت کے ساتھ محفوظ کر سکے، یہ صرف اس امت کا طغرۂ امتیاز ہے کہ اس کو اپنے رسول کے ایک ایک کلمہ کی صحت اور اتصال کے ساتھ جمع کرنے کی توفیق بخش دی گئی ہے، آج روئے زمین پر کوئی مذہب ایسا نہیں ہے جو اپنے پیشوا کے ایک کلمے کی سند بھی صحیح طریقہ پر پیش کر سکے، اس کے برخلاف اسلام ہے جو اپنے رسولؐ کی سیرت کا ایک ایک شوشہ پوری صحت واتصال کے ساتھ پیش کر سکتا ہے۔

فنِ اسماء الرجال

یہ عظیم الشان فن بھی مسلمانوں کی خصوصیات میں سے ہے اور اس ضرورت سے مسلمانوں نے ایجاد کیا ہے کہ جن جن راویوں کے ذریعہ حدیث پہنچی ہے ان کے حالات کا علم ہو سکے، اور پھر ان واسطوں اور ذرائع کے معتبر یا غیر معتبر ہونے کی بناء پر حدیث پر حکم لگایا جا سکے، اس فن میں ہزاروں راویوں کے حالات درج ہیں ڈاکٹر سپرنگر لکھتا ہے "نہ کوئی قوم دنیا میں ایسی گذری نہ آج موجود ہے جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء الرجال کا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو جس کی بدولت آج پانچ لاکھ شخصوں کا حال معلوم ہو سکتا ہے"۔ (ترجمان السنۃ)

حضرت حکیم الامت تھانویؒ فن اسماء الرجال کی ضرورت ثابت کرتے ہوئے فرماتے

ہیں۔" انہوں نے راویوں کے تذکرے (اسماء الرجال) لکھے کہ کون راوی قوی الحافظہ، کون ضعیف الحافظہ ان کی ولادت و وفات کی تاریخیں اور ان کے سفرِ تحصیلِ علم کے واقعات جمع کیے کہ کس نے اُس سے سیکھا اور اُس نے کس سے سیکھا، انہیں اعتبارات سے احادیث کے بہت سے اقسام بن گئے اور اب کسی حدیث میں شبہ نہیں ہو سکتا کیونکہ خوب پرکھ لیا گیا کہ کون حدیث کس درجے کی ہے پھر حدیثوں سے احکام مستنبط کر کے مدّون کر دیئے کہ احکام کے سمجھنے میں گڑبڑ نہ ہو۔" (الدعوت الی اللہ ص۱۲)

"حکیم الامتؒ کی سندِ حدیث"

حکیم الامت نے علم حدیث کی باقاعدہ تعلیم ملا محمود دیوبندیؒ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ اور شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ سے حاصل کی اور ان حضرات سے سندِ حدیث حاصل کی۔ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ اور ملا محمود صاحبؒ نے حضرت شاہ عبد الغنی صاحب دہلویؒ سے حدیث پڑھی اور شیخ الہندؒ نے مولانا محمد قاسم نانوتویؒ سے اور انہوں نے شاہ عبد الغنی صاحبؒ اور مولانا احمد علیؒ سے۔ حکیم الامت تھانویؒ کو حضرت مولانا قاری عبد الرحمٰن محدث پانی پتی سے بھی سندِ حدیث حاصل تھی اور مولانا شاہ فضل الرحمٰن گنج مراد آبادیؒ سے بھی بعض کتب حدیث حصنِ حصین وغیرہ پڑھ کر سندِ حدیث حاصل کی تھی، مولانا قاری عبد الرحمٰن پانی پتیؒ نے حضرت مولانا شاہ محمد اسحٰق دہلویؒ سے مولانا شاہ محمد اسحٰقؒ اور حضرت شاہ فضل الرحمٰن گنج مراد آبادیؒ دونوں نے حضرت شاہ عبد العزیز دہلویؒ سے سند حاصل کی اور انہوں نے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ سے، صحاح ستہ، بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ اور موطا امام مالک کی اپنی سندیں حضرت

حکیم الامتؒ نے بزبانِ عربی اپنے رسالہ السبعۃ السیارہ میں لکھ دیں ہیں، نیز حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی سندیں ان کے استاذ شیخ محمد طاہر الکردی مدنیؒ سے لے کر امام بخاری اور دوسرے ائمہ کتب حدیث کے مصنفین تک متصل کر دی ہیں اور سلسلہ استاذ کے تمام شیوخ واساتذہ کے اسماء گرامی لکھ دیئے ہیں۔

آگے ان کتابوں کے حضرات مصنفین نے ہر ہر حدیث کی سند راوی کے نام بنام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک بیان فرما دی ہے۔

خلاصہ یہ کہ سندِ حدیث کے تین حصے ہیں، ایک حضرت حکیم الامتؒ سے لے کر حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ تک، دوسرا حصہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ سے لے کر صحاح ستہ اور موطا امام مالک کے مصنفین تک، ان دو حصوں کو تو حضرت حکیم الامتؒ نے خود تفصیل سے بیان فرما دیا، اور تیسرا حصہ ان کتابوں کے مصنفین نے ہر حدیث کے ساتھ خود ہی بیان فرمایا ہوا ہے۔

اس طرح حضرت حکیم الامتؒ سے لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک سندِ حدیث کا اتصال ثابت ہو جاتا ہے، اور حضرت شیخ الہندؒ والی سند کے لحاظ سے حکیم الامتؒ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک ۲۵ واسطے ہوتے ہیں پہلے حصہ کے پانچ دوسرے کے تیرہ اور تیسرے حصہ کے سات واسطے ہیں۔

"علوِ سند" سند کا عالی ہونا اور واسطوں کا کم ہونا بھی ایک وجہ فضیلت کی رکھتا ہے اور علوم سند باعث مزید فضیلت ہے، حضرت حکیم الامت تھانویؒ کی سندوں میں سب سے عالی سند وہ ہے جو حضرت شاہ فضل الرحمٰن گنج مراد آبادیؒ کے واسطہ سے ہے، کیونکہ اس میں سب سے کم واسطے ہیں، اس میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ تک

صرف دو واسطے ہیں ایک واسطہ خود حضرت شاہ فضل الرحمٰن صاحبؒ کا اور دوسرا واسطہ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کا ہے اور سب سے سافل سند حضرت شیخ الہندؒ والی ہے کہ اس میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ تک پانچ واسطے ہیں اور متوسط سند وہ ہے جس میں حضرت مولانا قاری عبدالرحمٰن محدث پانی پتی کا واسطہ ہے اس میں صرف تین واسطے ہیں اور جس سند میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ کا واسطہ ہے اس میں چار واسطے ہیں۔ غرضیکہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ تک دو واسطے بھی ہیں اور تین اور چار واسطے بھی ہیں اور پانچ بھی،

حکیم الامتؒ کی حدیثی خدمات

اوپر گذر چکا ہے، کہ حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے چودہ سال تک مدرسہ جامع العلوم کانپور میں تدریسی خدمات انجام دی ہیں وہاں تمام علوم و فنون کے درس کے علاوہ حدیثِ بخاری، ترمذی شریف وغیرہ کا درس بھی آپ نے دیا اور آپ وہاں کے شیخ الحدیث تھے طلباءِ علمِ حدیث نے آپ کے درس کی بعض تقریرات بھی جمع کی تھیں جن کا اجمالی ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے اور اس کے علاوہ ان کتابوں اور مضامین کا بھی تعارف کرایا جائے گا جو حدیث کے موضوع پر آپ نے تحریر فرمائی ہیں۔

① "المسک الزکی"

یہ وہ تقریر ہے جو حضرت حکیم الامت تھانویؒ جامع ترمذی شریف کے درس کے

وقت فرماتے اور آپ کے بعض شاگردوں نے اس کو اردو میں قلم بند کر لیا تھا۔

② "الثواب الحلی"

یہ المسک الذکی کا تتمہ ہے اور چونسٹھ صفحات پر مشتمل ہے، اس کی مستقل اشاعت کا پہلی مرتبہ اہتمام مولانا اشفاق الرحمٰن صاحب کاندھلوی محشی موطا امام مالکؒ نے کیا، اور دوسری مرتبہ مرکز علم و ادب کراچی نے جامع ترمذی کے ساتھ اس کو شائع کیا، اس میں ترمذی شریف کی بعض مشہور و مقبول احادیث کے حواشی حکیم الامتؒ نے اپنے قلم سے عربی میں تحریر فرماتے ہیں۔

ف، الثواب بمعنی العسل الحلی من الحلاوۃ (اشرف السوانح)

③ "ضمیمہ الثوب الحلی"

الثواب الحلی کے آخر میں المسک الذکی کا جس قدر مضمون حکیم الامت کے قلم سے لکھا ہوا تھا کچھ عربی میں زیادہ کچھ فارسی میں اس کو بھی اس کے ساتھ ہی بطور ضمیمہ کے ملحق کر کے شائع کر دیا گیا ہے۔

④ فوائد موطاء امام مالک

جلالین شریف اور ترمذی شریف کی تقریروں کی طرح موطاء امام مالک پر یہ فوائد بھی مدرسہ جامع العلوم کانپور کی یادگار ہیں ان فوائد کے جامع مولانا ناظر حسن تھانویؒ ہیں مولانا نور الحسن صاحب کاندھلوی فرماتے ہیں کہ، فوائد موطاء امام مالک کا پیش نظر

نسخہ جو حسب سابق مولانا ناظر حسن کے قلم سے ہمارے ذخیرہ کتب میں محفوظ ہے ۲۹ صفحات پر مشتمل ہے، مولانا ناظر حسن اس کی کتابت سے بارہ رجب ۱۳۱۲ھ میں فارغ ہوئے، یہ حضرت تھانویؒ کے علوم و ملفوظات کے سب سے پہلے مرتب ہیں، از مولانا نور الحسن صاحب کاندھلویؒ (ماہنامہ الحق شمارہ ۶ جلد ۲۱ (از فہرست تالیفات حکیم الامتؒ)

⑤ جامع الآثار

حضرت حکیم الامت تھانویؒ نے بعض لوگوں کے اس اعتراض کے جواب میں کہ حنفیہ کے پاس اپنے مذہب کی دلیل احادیث سے نہیں ہے، دلائل حدیثیہ کے جمع کرنے کا ارادہ کیا اور احیا السنن کے نام سے احادیث کو ابواب الفقیہ پر جمع کیا اس کا مسودہ طبع ہونے سے پہلے ہی ضائع ہو گیا، بعد میں مذہب حنفیہ کے حدیثی دلائل کو فقہی ابواب کی ترتیب پر اس کتاب میں جمع کر دیا گیا ابواب الصلوٰۃ تک وہ حدیثیں جمع کی گئی ہیں جو حنفیہ کی دلیل ہیں، اور ان احادیث کے حوالے مع صفحہ نمبر درج فرمائے، اس کے مقدمہ میں اختلاف ائمہ کے اسباب اور بعض دوسری مفید بحثیں اور استدلال کی کیفیت کا ذکر کیا گیا ہے، زبان سلیس اور نفیس ہے اہل علم کو عموماً اور طلباء و مدرسین علوم حدیث کو خصوصاً مفید ہے مطبع قاسمی دیوبند میں شائع ہوئی۔

⑥ تابع الآثار

یہ رسالہ جامع الآثار کی تعلیق ہے اس میں بھی حنفیہ کی تائیدی احادیث کو جمع

کیا گیا ہے، اور ان احادیث کی توجیہہ کی گئی ہے جو بظاہر حنفیہ کے معارض ہیں۔

⑦ احیاء السنن مع ترجمہ اطفاء الفتن

جامع الآثار اور تابع الآثار میں کتاب الصلوٰۃ تک کے دلائل حدیثیہ جمع کئے گئے تھے، اس کتاب میں حضرت حکیم الامتؒ نے تمام ابواب فقہیہ کے دلائل کا استیعاب کرنا چاہا اور ضخیم کتاب ابواب الحج تک تالیف فرمائی مکمل کتاب عربی میں ہے، کتاب الصلوٰۃ کا اردو ترجمہ بھی ساتھ ہی شائع ہوا ہے جس کا نام اطفاء الفتن ہے،

⑧ اطفاء الفتن

اسی کا اردو ترجمہ ہے، احادیث بھی ساتھ ہی درج کی گئی احیاء السنن کے آٹھویں حصہ تک یہ ترجمہ اردو پہلی طباعت میں جو ہندوستان میں ہوئی تھی شائع ہوا تھا آٹھ جلدوں کے ساتھ ان میں کتاب الصلوٰۃ مکمل ہو گئی ہے۔

⑨ توضیح الحسن

اس احیاء السنن پر حضرت نے تعلیقات لکھی تھی یہ ان تعلیقات کا نام ہے۔
معانی حدیث، تطبیق بین الروایات اور تخریج اور علم اسناد جس طرف بھی نظر کی جائے حکیم الامتؒ کی نظر بصیرت اپنی یکتائی اور انفرادی حیثیت کا اظہار کرتی نظر آتی ہے۔
تفہیم معانی میں تو اپنی مثال آپ ہیں جس کی کچھ مثالیں نظر سے گزریں گی اور ایسی مثالوں سے آپ کی کتابیں بھری ہوئی ہیں آپ کی ہر کتاب میں اس تفہیم معانی کی مثالیں

مل جائیں گی،

ایک مثال مسودہ احیاء السنن جلد ۳ صفحہ ۱۵ سے بھی بذیل حدیث حضرت عمر رضی اللہ عنہ پیش کی جاتی ہے۔

(۱) انی ابجھز جیشی وانا فی الصلوٰۃ، ترجمہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ میں نماز پڑھتے ہوئے لشکر تیار کرتا ہوں، اس کی شرح میں سنبھلی صاحب نے لکھا تھا،

الراجح عندی ان افعال عمر ہذہ کانت من غیر اختیار لغلبتہ امور الخلافۃ علیہ ابتداء ثم کانت تمتد بالاختیار وھو لا یذکر انہ فی الصلوٰۃ اھ

لیکن حضرت حکیم الامت تھانوی کے محدثانہ ذوقِ سلیم اور فقیہانہ تحقیق کے یہ بات بالکل خلاف تھی اس لئے حضرت والا نے اس پر استدراک فرمایا اور اپنی قلم مبارک سے لکھا۔

اس سے حضرات صحابہؓ کی شان میں اس موذی کی بے ادبی ظاہر ہے کہ وہ صحابہ کے مقام کو ایک ادنیٰ عارف کے مقام کے برابر بھی نہیں سمجھتا۔ صوفیہ نے فرمایا کہ حضرت عمر نماز میں غایت خشوع اور یکسوئی کے ساتھ کھڑے ہوتے تھے پھر ان کو تیاری لشکر وغیرہ کی بابت منجانب اللہ الہامات شروع ہوتے تھے، اور نماز میں عارفین کو بہت الہامات ہوا کرتے ہیں اور نماز کا الہام صحیح بھی ہوتا ہے، اس کو حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نماز پڑھتے ہوئے لشکر تیار کرتا ہوں، یعنی اس وقت مجھے اس قسم کے الہام ہوتے ہیں اور حضرت عمرؓ کا ملہم و محدث ہونا احادیث سے معلوم ہے۔ (النور ماہ رمضان ۱۳۴۱ھ صفحہ ۱۱)

حدیث کے مطلب و مفہوم کے بیان میں حضرات صحابہ کرامؓ کی شانِ صحابیت اور

ان کے مقام معرفت اور ملہم و محدث ہونے کی حیثیت کا پاس و لحاظ حضرت تھانوی کے کس قدر پیش نظر ہے وہ ناظرین پر پوشیدہ نہیں، اور ایک حدیث کی تشریح دوسری حدیث کی روشنی میں کرنے کی یہ روشن مثال ہے، اس سے حضرت تھانوی کے حفظ اور فقہ حدیث نیز سرعت انتقال ذہن وغیرہ محدثانہ اوصاف کا ثبوت واضح ہے،

(۲) اسی طرح ایک حدیث میں ہے۔

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ازواج لا یصلی فی لحف نسائہ۔ مطہرات کی لحاف بستر وغیرہ میں نماز نہیں پڑھتے تھے۔

اس کی شرح میں سنبھلی صاحب نے لکھا تھا،

وکان ترکہ تحینا منہ یدل علیہ الذوق اللسانی والوجہ ھو توھم النجاسۃ فیھا لتساہلھن فی اجتنابھا عادۃ اھ

حضرت حکیم الامت اس پر ارشاد فرماتے ہیں۔

بھلا اس موذی سے کوئی پوچھے کہ تو نے اپنی عورتوں کو ناپاکی سے تساہل کرتے ہوئے دیکھ کر حضور کی ازواج مطہرات کو ان پر کیسے قیاس کر لیا، جن کی شان یہ ہے لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم تطھیرا، بلکہ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ عورتوں کے لحاف بستر سے رنگین اور نرم ہوتے ہیں اور یہ زینت نماز کے وقت آپ پسند نہ کرتے تھے اس لئے نماز بوریہ پر پڑھتے تھے، اور کبھی ازواج کے بسترہ پر بھی پڑھ لیتے تھے چنانچہ اس قسم کی احادیث بھی موجود ہیں کہ حضور تہجد کی نماز حضرت عائشہ کے بسترہ پر پڑھتے تھے، (ایضاً ص۱۲)۔

اس حدیث کی تشریح بھی فنی طور پر حضرت نے دوسری احادیث کی روشنی میں

فرمائی کہ بعض احادیث سے بعض ازواج کے بستر پر نماز تہجد کا پڑھنا ثابت ہے، سنبھلی صاحب نے اول تو دوسری احادیث سے غفلت کی حالانکہ کسی حدیث سے ایسا مفہوم لینا جو دوسری احادیث کے خلاف ہو اصول کے خلاف ہے،

پھر ازواجِ مطہراتؓ کے بارہ میں قرآن کا بیان کردہ مقام نزاہت وطہارت قطعی طور پر نظر انداز کر دیا تیسرے کان لایصلی کے معنی سمجھنے میں ان کو غلطی لگی اور کان کو دوام واستمرار کے لئے سمجھ لیا اور صلوٰۃ فی لحف نسائہ کی دائمی طور پر نفی سمجھ گئے، حالانکہ کان ہمیشہ دوام واستمرار کے لئے نہیں آتا خصوصیت سے جب دوسری احادیث میں صلوٰۃ فی اللحف کا ثبوت ہو رہا ہے پھر تو دوام واستمرار مراد ہو ہی نہیں سکتا۔

چوتھے یہ کہ اگر کان لایصلی فی لحف نسائہ کی یہ علت ہوتی جو سنبھلی صاحب نے بیان کی ہے اور وہ علت مطرد ہوتی تو پھر بڑا اشکال واقع ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت عائشہؓ کے بستر پر نماز تہجد ادا فرمائی ہے تو پھر لحف میں نماز ادا نہ فرمانے کی یہ علت کیسے ہو سکتی ہے؟ ان تمام چیزوں سے سنبھلی صاحب نے صرفِ نظر کیا اور حفظت شیئاً وغابت عنك اشیاء کے مصداق ہو گئے۔

حضرت تھانویؒ کی بیان فرمودہ توجیہ سے تمام اشکالات کا حل ہو گیا اور متعارض حدیثوں کے معنی اپنی اپنی جگہ صحیح اور درست ہو گئے، کہ ہو سکتا ہے کہ حضرت عائشہؓ کا بستر نرم اور رنگین نہ ہوتا ہو، اس لئے اس پر نماز پڑھ لیتے تھے، اور جن ازواج مطہراتؓ کے بستر ایسے نہیں ہوتے تھے ان پر نماز نہیں پڑھتے تھے، تو لحف نسائہ سے بعض خاص لحف مراد ہوں گے، اور اضافت عہد خارجی کے لئے ہوگی کل لحف

مراد نہ ہوں گے نہ ہی اضافت جنس کے لئے ہوگی۔

(۳) ایک حدیث میں ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مسجد نبوی کی دیواروں کو نقش پتھر سے بنایا اور ستون بھی پتھر کے لگائے، چھت سال کی ڈالی، تو اس پر بعض کی طرف سے کراہت کا اظہار کیا گیا اور یہ چاہا کہ اس کو پہلی ہی حیثیت پر رہنے دیں، اس پر سنبھلی صاحب نے "احیاء السنن" جلد ۲ صفحہ ۱۷۴ میں لکھا ہے،

قلت وبه اقول وقد كان ذلك اولى مما فعله عثمانؓ اى فعل النبى صلى الله عليه وسلم وفعل عمرؓ وتاويله رضى الله عنه ضعيف وقد اول بما اول لكونه غنيا فان الذى يذهب فى الاكثر الى مايتلبس به فافهم وازهد فى الدنيا" اه

حضرت تھانویؒ نے اس پر ارقام فرمایا،

"یہ عبارت حضرت عثمانؓ کی شان میں کس قدر گستاخی لئے ہوئے ہے اوّل تو ہم جیسوں کا کیا منہ کہ ہم بے دھڑک صحابہؓ کی تاویل کو ضعیف کہہ دیں، اس پر طرہ یہ کہ اس تاویل کا منشاء خلوص وللّٰہیت کے علاوہ غنا اور تمول کو بتایا جاوے، اور ناظرین کو زہد کا اصر دے کر یہ بتلایا جائے کہ حضرت عثمانؓ کا یہ فعل نعوذ باللہ زہد کے خلاف تھا۔ اللّٰهم انا نعوذ بك من الحور بعد الكور" حقیقت یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ مسجد کی فضول زینت کو حرام سمجھتے تھے اور جس زینت میں مسجد کی مضبوطی اور پائیداری ہو یا عظمت و وقعت اس کو جائز سمجھتے تھے چنانچہ انہوں نے مسجد نبوی میں جو کچھ اضافہ کیا تھا اس سے سوائے ان مصالح کے اور کچھ مقصود نہ تھا اور کوئی زینت ایسی نہ تھی جو قلوب مصلین کو مشغول کرے یا فضول شمار ہو، اور دوسرے بعض صحابہ مطلق زینت کو مکروہ سمجھتے تھے، وہ چاہتے

تھے کہ مسجد کی دیواریں کچی رہیں اور چھت بھی کھجور کی رہے، مگر علماء امت و مجتہدین کا فتویٰ حضرت عثمانؓ کے قول پر ہے، حضرت عثمانؓ خلفائے راشدین میں سے ہیں جن کے اتباع کا اُمت کو امر ہے، اتبعوا سنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین المھدیین من بعدی، لہٰذا ان کا قول ہر حال میں قابلِ اتباع ہے"

واللہ اعلم (النور مذکور ص۱۳)

اور ظاہر ہے کہ اصل کمال معانی احادیث کا فہم اور ان سے مسائل کا استنباط ہی ہے جس کو فقہ الحدیث کہتے ہیں اور یہی صحیح معنی میں علمِ حدیث یا حدیث دانی ہے، جس کا اندازہ حدیثِ ذیل کی تشریح سے بھی کیا جا سکتا ہے۔

حضرت علیؓ سے ایک روایت ہے کہ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

رحم اللہ عمر یقول الحق وان کان مرا ترکہ الحق ومالہ من صدیق

لفظی ترجمہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ عمرؓ پر رحم فرمائے کہ وہ حق بات کہہ ڈالتے ہیں خواہ تلخ ہی ہو، اس حق گوئی کی بدولت ان کا کوئی دوست نہیں رہا۔

اس سے تین شبہے ہوتے ہیں ایک یہ کہ کیا دوسرے صحابہؓ حق گو نہ تھے، دوسرا یہ کہ کیا حضرت عمرؓ کا کوئی دوست نہیں تھا، تیسرا یہ کہ کیا حضرات صحابہؓ بھی حق گوئی کو بُرا سمجھتے تھے،

اب حکیم الامتؒ کی فہم معانی اور تفہیم کی خوبی اور کمال دیکھئے کہ ان تینوں شبہوں کا ازالہ محض قوسین میں ترجمہ کی معمولی تشریح سے کس طرح فرما دیا۔

اللہ تعالیٰ رحمت نازل فرمائے عمرؓ پر وہ حق بات کہہ دیتے ہیں اگرچہ کسی کو (عقلاً

یا طبعاً) تلخ (ناگوار) معلوم ہو (یعنی ان میں یہ صفت ایک خاص درجہ میں غالب ہے، اس درجہ کی) حق گوئی نے ان کی یہ حالت کردی کہ ان کا کوئی (اس درجہ کا) دوست نہیں رہا (جیسا کہ تسامح و رعایت کی حالت میں ہوتا) فضائل صحابہؓ کی اور بھی بکثرت ایسی احادیث موجود ہیں جن میں کسی خاص فضیلت کو کسی خاص صحابیؓ کے ساتھ خاص فرمایا گیا ہے، جس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ "ان میں یہ صفت ایک خاص درجہ میں غالب ہے" غرض یہ کہ تحق کے درجات متفاوت ہوتے ہیں، ایک درجہ یہ ہے کہ اس کا اظہار واجب ہوتا ہے، دوسرا یہ کہ اولیٰ یا مباح ہوتا ہے، سو پہلا درجہ تو سب صحابہؓ بلکہ اہلِ حق میں مشترک ہے اور دوسرے درجہ کے اعتبار سے بزرگوں کے حالات مختلف ہوتے ہیں" بعض مروت و تسامح کو مصلحت پر ترجیح دے کر سکوت فرماتے ہیں، بعض مصلحت کو مروت پر ترجیح دے کر کہہ ڈالتے ہیں، پہلا درجہ غلبہ کا ہے دوسرا نفس اتصاف کا (علیٰ ھذا دوستی کے ایک خاص درجہ کی نفی مقصود ہے، یعنی اگر حضرت عمرؓ مروت کو مصلحت پر غالب رکھ کر طرح دے جاتے تو اس حالت میں ان کے جیسے دوست ہوتے اب نہیں رہے، رہی طبعی تلخی و ناگواری تو اس کے مقتضیٰ پر اگر عمل نہ ہو تو وہ خیر کے منافی نہیں، باقی ایسے لوگ بھی ہر زمانہ میں ہوتے ہیں جن کو عقلی تلخی و ناگواری بھی ہوتی ہے اگرچہ اس وقت ایسے اقل قلیل تھے (اشرف السوانح ج ۲ ص ۶۱، و ص ۶۲)

(۱۰) "اعلاء السنن عربی"

یہ کتاب فنِ حدیث میں اس صدی کا عظیم علمی شاہکار ہے جس نے عرب و عجم کے مشاہیر علماء کرام سے خراج تحسین حاصل کیا ہے، اس میں احناف کے تمام فقہی مسائل

کو حدیث سے ثابت کیا گیا ہے، اس کی تالیف کا کام پہلے حضرت حکیم الامت تھانویؒ نے احیاء السنن کے نام سے خود ہی شروع فرمایا تھا اور دلائل حنفیہ کی احادیث کا ضخیم مجموعہ ابواب الحج تک مرتب فرمایا تھا بعد میں اپنے بھانجے حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی تھانویؒ کے ذریعے اس کی تالیف کرائی پہلے بھی اس کی طباعت ہو چکی ہے مگر اب حال ہی میں ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ کراچیؒ نے عربی کے دلکش ٹائپ پر نہایت عمدہ طباعت کے ساتھ اس کو شائع کیا ہے۔

یہ کتاب بیس جلدوں میں مکمل ہوئی ہے، پہلی آٹھ جلدیں حرفاً حرفاً حضرت حکیم الامتؒ کی نظر سے گذر چکی ہیں، بقیہ جلدوں میں مشکل اور اہم مقامات حضرت حکیم الامتؒ کے سامنے پیش کئے گئے ہیں، اس کتاب میں جابجا قال الشیخ، قال شیخی، قال شیخنا، اجاب عنہ شیخنا، سے حضرت حکیم الامتؒ کے افادات عالیہ کو بیان فرمایا گیا ہے،

اس کی تالیف و تصنیف میں اگرچہ قلم اور عبارت مولاناؒ کی ہے، مگر زبان و بیان زیادہ تر حضرت حکیم الامتؒ کا ہی ہے اس لئے اعلاء السنن جس طرح مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کی عظیم الشان خدمت حدیث ہے، اسی طرح حکیم الامتؒ کی خدمت حدیث میں بھی شمار ہوتی ہے، مولانا ظفر احمدؒ خود لکھتے ہیں،

ولیس فیہ غیر الرسم والاسم والشیخ نور اللہ مرقدہ ھو الروح فی ھذہ الجسوم

؎ درپس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند — آنچہ استاد ازل گفت ہماں می گویم

مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے اس کتاب کا تفصیلی تعارف اپنے ایک مبسوط مقالہ میں خود کرادیا ہے جو مصنف تصنیف را خود نکو میداند کا مصداق ہے، اس کا ایک اقتباس

ذیل میں ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں

"حضرت حکیم الامتؒ فرماتے تھے اگر خانقاہ امدادیہ میں "اعلاء السنن" کے سوا اور کوئی کتاب بھی تصنیف نہ ہوتی تو یہی کارنامہ اس کا اتنا عظیم الشان ہے کہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی اس میں صرف حنفیہ کے دلائل حدیثیہ ہی نہیں بلکہ متنِ کتاب میں احادیث مؤیدہ حنفیہ ہیں اور حواشی میں بڑی تحقیق وتفتیش سے جملہ احادیثِ احکام کے استیعاب کی کوشش کی گئی ہے، پھر غایتِ انصاف کے ساتھ محدثانہ وفقیہانہ اصول سے جملہ احادیث پر کلام کیا گیا ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ ہر مسئلہ مختلف فیہا میں حنفیہ کے سب اقوال کو تلاش کیا جائے، پھر جو قول حدیث کے موافق ہو اسی کو مذہب حنفی قرار دیا گیا، تحقیق کامل کے بعد پورے وثوق سے کہا جاتا ہے کہ جس مسئلہ میں حنفیہ کا ایک قول حدیث کے خلاف ہوگا تو دوسرا قول حدیث کے موافق ضرور ہوگا، یا کوئی حدیث یا آثار صحابہؓ ان کے قول کی تائید میں ہوں گے، آپ کو حیرت ہوگی کہ مسئلہ مصرات میں بھی امام ابوحنیفہؒ کا ایک قول حدیث صحیح کے بالکل موافق ہے جس کو علامہ ابن حزمؒ نے محلی میں روایت کیا ہے، (معارف) اس کی تعلیقات کا نام "اسدار المنن" ہے جس میں معانی احادیث کی توضیح اور سندوں پر بحث کی گئی ہے۔

علامہ محمد زاہد الکوثری مصری سابق نائب شیخ الاسلام سلطنت ترکیہ زیرِ عنوان "احادیث احکام کی خدمت اور بلاد اسلامیہ میں اس کے مختلف دور" علمائے ہند کی صحاح ستہ پر حواشی اور شروحِ نافعہ اور احادیثِ احکام میں ان کی تالیفاتِ مفیدہ اور نقد رجال وغیرہ فنون کی روشن خدمات کا ذکر کرتے ہوئے حضرت حکیم الامت تھانویؒ کی خدمت حدیث کا ذکر ان الفاظ میں فرماتے ہیں "اسی طرح علامہ یکتائے زمانہ اور عالم بے نظیر

شیخ مشائخ الہند محدث اعظم قدوۃ علماء صاحب نقد و بصیرت حضرت حکیم الامت مولانا محمد اشرف علی تھانوی صاحب تصانیف کثیرہ جن کا چھوٹی بڑی تصانیف کا عدد پانچ سو تک پہنچا ہے، حق تعالیٰ آپ کی حیات کو دراز فرمائے، آپ نے بھی خدمتِ حدیث کا خاص اہتمام فرمایا اور کتاب احیاء السنن اور آثار السنن اس باب میں تصنیف فرمائیں جن کے بہترین کتاب ہونے کے لئے صرف حضرت مصنف کا نام نامی کافی ہے ....

آپ کا وجود تمام دیارِ ہندیہ کے لئے برکتِ عظیم ہے اور علماء ہند میں آپ کی ایک خاص شان ہے اور اس وجہ سے آپ کا لقب خواص و عوام کی زبانوں پر حکیم الامت مشہور ہے۔

اور حضرتِ ممدوح نے اپنے شاگرد اور بھانجے کو جنہوں نے علوم حدیث آپ ہی سے حاصل کئے ایک محدث ناقد اور فقیہہ بارع ہیں۔ یعنی مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی زادت مآثرہ کو ارشاد فرمایا کہ جس قدر کتب حدیث اس وقت میسر آئیں سب سے حنفیہ کے استدلات کو ابواب فقیہہ کی ترتیب پر جمع فرما دیں اور ہر حدیث پر حدیث کے اصول کے موافق جرح و تعدیل سے کلام کریں چنانچہ یہ عالم اس عظیم الشان مہم کی خدمت میں تقریباً بیس سال اس طرح مشغول رہے کہ اس سے زائد اشتغال آج کل ممکن نہیں، یہاں تک کہ اس مہم کو انتہائی خوبیوں کے ساتھ پایہ تکمیل تک پہنچا دیا، جو آثار السنن کی تقطیع پر بیس جلدوں میں آئی ہے اور اس کتاب کا نام اعلاء السنن رکھا اور ایک مستقل جلد میں اس کتاب کا مقدمہ لکھا ہے جو اصول حدیث کی ایک عجیب نادر کتاب ہے اور سچی بات ہے کہ میں ان کے اس جمع اور استیعاب سے نیز ہر حدیث پر متناً سنداً محدثانہ کلام سے جو فن حدیث کا مقتضی تھا حیرت میں پڑ گیا، کیونکہ اس میں جو کلام کیا گیا ہے کسی جگہ اس میں تکلف کر کے اپنے مذہب کی تائید نہیں کی گئی، بلکہ ہر جگہ محض انصاف کو امام بنایا گیا

ہے، مجھے اس خاص طرزِ تصنیف سے انتہائی غبطہ پیدا ہوا اور مردوں کی ہمت اور بہادروں کی جفاکشی ایسی ہی ہونی چاہیے۔"

حضرت مفتی اعظم پاکستان مولانا محمد شفیعؒ "ہندوستان میں علم حدیث اور مذہب حنفی کی عظیم الشان خدمت" کے زیرِ عنوان اعلاء السنن کا تعارف کراتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

بقیۃ السلف حجۃ الخلف حکیم الامت مجدد الملت سیدی وسندی حضرت مولانا اشرف علی تھانوی دامت برکاتہم کی تصانیف مفیدہ جو بفضلہ تعالیٰ سات سو سے زائد ہیں (زادہا اللہ تعالیٰ امثالھا) ان میں سے چند تصانیف حجاز ومصر وغیرہ بلاد اسلامیہ میں پہنچی وہاں کے ماہر علماء نے ان کو ایک نعمتِ عظمیٰ اور مایۂ ناز علمی خدمت سمجھا،

حضرت ممدوح نے مدت ہوئی ایک تصنیف کی بنیاد ڈالی تھی جس میں حنفی المذہب مسلمانوں کے لئے مذہب امام اعظم ابوحنیفہؒ کے ہر مسئلہ پر قرآن وحدیث سے شواہد ودلائل جمع کئے گئے عرصہ دراز سے موصوف نے یہ خدمت اپنے عزیز خاص اور مجاز خاص حضرت مولانا ظفر احمد صاحب تھانویؒ کے سپرد فرمائی اور ان کی تحریر کو بالاستیعاب خود ملاحظہ فرماتے اور ضروری اصلاحات عطا فرمانے کا التزام کیا، مولانا ظفر احمد صاحبؒ مدظلہٗ نے اس جدوجہد اور دقتِ نظر سے اس کام کو انجام دیا کہ آج کل بہت ہی دشوار ہے۔ یہ عظیم الشان تصنیف...... حنفیہ کی بے نظیر تنقیح متن حدیث کی شرح اور مباحث اسناد اور اصول حدیث کے متعلق علوم سلف وخلف کا نچوڑ ہونے کی حیثیت سے علم حدیث وفقہ کی ایسی جامع کتاب ہوگئی کہ اس کی نظیر موجود نہیں۔

(رسالہ المفتی ماہ ذوالقعدہ ۱۳۵۷ھ)

اس جگہ مولانا محمد یوسف بنوریؒ کا تاثر اَعلاء السنن کے بارہ میں پیش کر دینا ناظرین کے لئے اس کتاب اور اس کے مصنف کے مقام و مرتبہ کے پہچاننے کے لئے مفید معلوم ہوتا ہے، مولانا بنوریؒ فرماتے ہیں۔ "مولانا عثمانیؒ بے شمار چھوٹی بڑی کتابوں کے مصنف تھے اگر ان کی تصانیف میں اَعلاء السنن کے علاوہ اور کوئی تصنیف نہ ہوتی تنہا یہ کتاب بھی علمی کمالات، حدیث و فقہ و رجال کی قابلیت و مہارت اور بحث و تحقیق کے ذوق محنت و عرق ریزی کے سلیقہ کے لئے بُرہان قاطع ہے اعلاء السنن کے ذریعے حدیث و فقہ اور خصوصاً مذہب حنفی کی وہ قابلِ قدر خدمت کی ہے کہ جس کی نظیر مشکل سے ملے گی، یہ کتاب ان کی تصانیف کا شاہکار اور فنی تحقیقِ ذوق کا معیار ہے، علمی جواہرات کی قدر شناسی وہی شخص کر سکتا ہے جس کی زندگی اسی وادی میں گذری ہو دور دراز مواقع اور غیر مظان سے جواہرات نکال کر خوبصورتی سے سجا کر رکھ دینا یہ وہ قابلِ قدر کارنامہ ہے جس پر جتنا رشک کیا جائے کم ہے، موصوف نے اس کتاب کے ذریعہ جہاں علم پر احسان کیا ہے وہاں حنفی مذہب پر بھی احسانِ عظیم کیا ہے علمائے حنفیہ قیامت تک ان کے مرہونِ منت رہیں گے، بلاشبہ اس بے نظیر کتاب میں حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کے انفاس قدسیہ اور توجہاتِ عالیہ اور ارشاداتِ گرامی کا بہت کچھ دخل ہے، لیکن حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کے ذریعہ اُن کا ظہور پُر نور ان کے کمال کی دلیل ہے۔ (بیّنات ذوالحجہ ۱۳۹۴ھ)

غرضیکہ مولانا نے ۱۳۳۵ھ سے ۱۳۵۷ھ تک مختلف اوقات میں عرق ریزی اور محنت شاقہ کے بعد اس کتاب میں ابواب الطہارت سے لیکر کتاب المواریث تک کے تمام مسائلِ خلافیہ مشہورہ میں ہدایہ کی ترتیب کے موافق فقہ حنفی کی تائید کے لئے بہت بڑا

ذخیرۂ احادیث جمع کردیا، تمام فقہی ابواب سے متعلق احادیث نبویہ کو جمع کرکے ان کی ایسی بے نظیر تشریح اور تفصیل فرمائی ہے جو وسعتِ معلومات اور دقتِ نظر کے لحاظ سے پورے عالمِ اسلام میں اپنی مثال آپ ہے اور جس کو دیکھ کر بڑے بڑے علمائے زمانہ اور فضلائے یگانہ حیران وششدر رہ گئے ہیں۔

اس کتاب کا ایک مقدمہ انہاء السکن ایک بار پہلے بھی طبع ہو چکا ہے، اب دوبارہ پھر کراچی سے عربی ٹائپ میں طبع ہوا ہے، اس کو شام کے محقق عالم شیخ عبدالفتاح نے مصنف علیہ الرحمہ سے اجازت لے کر قواعد فی علوم الحدیث کے نام سے قابلِ قدر تعلیقات اور گراں مایہ مقدمہ کے اضافہ کے ساتھ بھی نہایت آب و تاب کے ساتھ عربی ٹائپ میں زیورِ طبع سے آراستہ کرایا ہے، اعلاء السنن کا یہ مقدمہ بقول مولانا محمد یوسف صاحب بنوریؒ، اصول حدیث کے نوادر و نفائس پر مشتمل ہے اور تمام کتب رجال اور کتب حدیث اور کتبِ اصولِ حدیث سے انتہائی عرق ریزی کے بعد مولانا مرحوم نے وہ نفائس جمع کردیئے ہیں کہ عقل حیران ہے اور یہ مقدمہ بجائے خود ایک مستقل بے مثال کتاب ہے۔ (بیّنات مذکور) یہ مقدمہ شیخ عبدالفتاح نے داخل نصاب کرلیا ہے۔

(۱۱) الاقتصاد فی بحث التقلید والاجتہاد

تقلید شخصی اور تقلید مطلق کے متعلق افراط و تفریط سے پاک متن اور سنجیدہ عبارت میں یہ رسالہ حضرت حکیم الامتؒ نے اردو میں تحریر فرمایا ۵۶ صفحات کا یہ رسالہ احادیث نبویہ کا ذخیرہ ہے، یہ رسالہ ایک مقدمہ اور سات مقصد اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے۔

مقصد اول میں دس حدیثوں کا ترجمہ اور ان کی تشریح کی گئی ہے اور مقصد دوم

میں سات حدیثوں کا ایسا ہی بیان ہے اور مقصد سوم میں دس حدیثوں کا ذکر ہے، مقصد چہارم میں تین حدیثیں اور مقصد پنجم میں سترہ حدیثیں مذکور ہیں۔ مقصد ششم میں پچیس شبہات کے ضمن میں چھ احادیث کا ذکر کیا گیا ہے مقصد ہفتم میں پانچ احادیث مذکور ہیں۔

پھر خاتمہ رسالہ میں پندرہ مسائل جزئیہ نماز کی احادیث مؤیدہ حنفیہ کا تذکرہ فرمایا گیا اور حدیث خندق اور حدیث رؤیا کا ذکر کیا گیا ہے۔

⑫ موخرۃ الظنون عن مقدمہ ابن خلدون

اس رسالے میں امام مہدی کے بارے میں وارد شدہ احادیث کی تحقیق فرمائی گئی ہے اور منکرین عقیدۂ ظہور مہدی کی تردید کر کے اس عقیدے کو ثابت کیا گیا ہے۔

⑬ الخطاب الملیح فی تحقیق المہدی والمسیح

یہ رسالہ مدعی نبوت کاذبہ مرزا غلام احمد قادیانی کے اقوال فاسدہ اور عقائد کاسدہ کے جواب میں ہے اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات اور رفع الی السماء کی مدلل تحقیق درج ہے اور وہ آیات واحادیث جس سے قادیانی اپنے دعویٰ کو ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں ان احادیث کے صحیح معنی اور مطلب کو بیان فرمایا ہے۔ طرز تحریر محققانہ اور منصفانہ ہے۔

⑭ التشرف

تصوّف کا حاصل اور لب لباب تزکیہ نفس اور تصفیہ قلب ہے قرآن کریم میں

تزکیہ اور احادیث نبویہ میں اس کے لئے "احسان" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، حکیم الامت تھانویؒ اپنے زمانہ کے محدث اعظم ہونے کے ساتھ تزکیہ نفوس اور تصفیہ قلوب کے امام اور مجدد تصوّف بھی تھے، اس لئے آپ نے قرآن وحدیث کی روشنی میں تصوّف کے اصلی خدوخال کو واضح کیا اور بتلایا کہ قرآن وحدیث کی روشنی میں تصوّف کی کیا حقیقت ہے، چنانچہ التشرف میں حضرت تھانویؒ نے علم حدیث کی خدمت کو اسی طرز اور رنگ میں انجام دے کر بلند پایہ خدمتِ حدیث کے ساتھ دنیائے تصوّف پر بھی احسانِ عظیم فرمایا ہے۔

اس کتاب میں تصوف سے تعلق رکھنے والی احادیث کو جمع کیا اور اس کا التزام کیا کہ احادیث حروفِ تہجی کے لحاظ سے بھی مرتب رہیں چنانچہ پہلے تین حصوں میں الف سے شروع ہونے والی احادیث کو جمع کیا گیا ہے اور حدیث جس فائدہ پر متضمن ہے اس پر عنوان قائم کیا گیا ہے اس کے بعد اس فائدہ کی جانب "میں کہتا ہوں" سے اشارہ کرکے واضح فرمایا گیا کہ اس حدیث کا اس عنوان کے تحت لانا ایک خاص نقطہ نظر سے ہے۔

"مثال" اس حدیث کو طبرانیؒ اور بیہقیؒ نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے۔
طلب الحلال فریضة بعد الفریضة، "حلال روزی کمانا دینی فریضہ کے بعد بڑا فریضہ ہے"۔

امام طبرانیؒ اور بیہقیؒ نے اسے شعب الایمان میں روایت کرکے اس طرف اشارہ فرمایا کہ فرائضِ دینیہ کا ادا کرنا ضروری ہے اور ہر فرض ایمان کے ایک شعبہ کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن حدیث میں ایک اور امر پوشیدہ ہے کہ جس طرح انسان کے لئے معاد اور آخرت کی تیاری اور اس کے لئے کسب واکتساب کی ضرورت ہے اسی طرح اپنی دنیوی

معاش کے لئے بھی کسب واکتساب اور بقدرِ ضرورت اس کی ادائیگی ماموز من اللہ ہے حدیث میں مضمر ایک نکتہ کی وجہ سے حکیم الامتؒ نے اس حدیث کو عدم التنافی بین المعاد وبین المعاش الضروری، (معاد اور معاش ضروری کے درمیان منافات نہیں) کا عنوان قائم کرکے اس کے تحت تخریج فرمایا۔

اس کتاب کے ابتدائی تین حصوں میں حدیث کا عربی متن تخریج کیا گیا ہے اور عربی ہی میں فائدہ کے عنوان سے اس کی مختصر تشریح کی گئی ہے۔ بعد میں اس کے استفادہ کو عام کرنے کی غرض سے "تکمیل التعرف فی تسہیل التشرف" کے نام سے متن حدیث اور اس کی شرح کا اردو ترجمہ کیا اور وہ متوازی کالم میں لکھا گیا، البتہ چوتھے حصہ میں التشرف کو ہی عربی کی بجائے اردو میں تالیف کیا گیا ہے، اس حصہ میں صرف متن حدیث عربی میں ہے اس کا ترجمہ اور اس کی تشریح اردو میں کی گئی ہے۔

کتاب میں صحاح ستہ کی احادیث کے علاوہ، معجم طبرانی، سنن بیہقی، صحیح ابن حبان، علامہ سیوطی کی جامع صغیر اور کنوز الحقائق سے بھی احادیث لی گئی ہیں"۔

غرضیکہ التشرف میں ان احادیث کی تحقیق کی گئی ہے، جو کتب تصوف میں یا صوفیائے کرام کے کلام میں آئی ہیں، اور یہ دکھلایا گیا ہے کہ یہ حدیث کس درجہ کی ہے اور جو روایات دراصل حدیث نہ تھیں بلکہ غلطی سے عوام نے ان کو حدیث مشہور کر دیا تھا، ان کی اصلیت واضح فرمانے کے ساتھ ساتھ یہ بھی ظاہر فرما دیا ہے کہ بزرگوں کا یہ قول فلاں دلیل شرعی سے ثابت ہے یہ کتاب چار حصوں میں، چار سو چھیالیس صفحات پر مشتمل ہے اور ۱۳۴۱ھ سے ۱۳۵۲ھ تک کے عرصے میں مختلف اوقات میں لکھی گئی ہے اس کے پہلے تین حصے عربی میں ہیں اور اس کے ساتھ ہی دوسرے کالم میں اردو ترجمہ ہے، چوتھا حصہ اردو میں ہے۔ پہلے حصہ

کا ماخذ تخریج احادیث الاحیاء للعراقی ہے دوسرے حصے میں ان روایات کی تحقیق ہے
کہ جو مثنوی معنوی کے دفتر اول اور اس کی شروح وغیرہ میں آئی ہیں، اور بعض روایات
المقاصد الحسنہ کی تخریج مع تلخیص ہے اور تیسرے حصے میں زیادہ تر الجامع الصغیر للامام
السیوطیؒ اور کنوز الحقائق کی احادیث کی تخریج ہے۔

مولانا عبدالباری ندوی اس کتاب کا تعارف کراتے ہوئے رقم طراز ہیں، فنی نقطہ
نظر سے تو التشرف فی معرفۃ احادیث التصوف کے چار حصے خالص محدثانہ کارنامہ ہے"
جس میں ان احادیث اور ان کے درجات کی تحقیق و تنقید ہے، جو صوفیاء کے کلام اور
کتابوں میں پائی جاتی ہیں، نیز جو روایات دراصل حدیث نہیں اور حدیث کے نام سے مشہور
ہوگئی ہیں ان پر بحث ہے اور اگر وہ لفظ کسی بزرگ کا قول ہے تو اس کی تشریح فرمائی گئی
ہے ایک حصہ میں خاص طور پر مثنوی شریف کی حدیثوں کی تخریج ہے۔

الحاصل یہ کتاب علم حدیث اور علم تصوف و احسان کا ایک حسین امتزاج اور عجیب و
غریب مجموعہ ہے، تمام اہم مسائل، عبادات، اذکار و دعوات میں عادات و آداب، اور
توبہ و استغفار کے علاوہ مجاہدات میں حالت طالبین، اہل اللہ کو دیکھنے کا اہتمام، حفظ
مراتب مریدین، اور مراقبہ، محاسبہ، جیسے اہم مضامین احادیث سے ثابت کئے گئے ہیں۔

بعض خشک مزاج لوگوں کے ذہنوں میں تصوف کے بارہ میں جو اشکالات آتے ہیں
ان سب کا جواب اس کتاب کے مطالعہ کے بعد بڑے جامع اور بلیغ انداز میں ہو جاتا
ہے اور صحیح تصوف کا عین شریعت ہونا اور اس کی تعلیمات کا قرآن و حدیث کے مطابق ہو
ثابت ہو جاتا ہے، اس کے ساتھ ہی یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ تصوف، مابعد الطبیعاتی
کسی چیز کا نام نہیں ہے جسے ہر آدمی اختیار نہیں کر سکتا اور نہ ہی تصوف میں ایسی ریاضت

ومجاہدہ کی ضرورت ہے کہ جس میں انسان دنیا ومافیہا سے منقطع، اپنے حوائج فطریہ سے مستغنی اور بے نیاز ہو جاتا ہے۔

علاوہ ازیں تصوّف ان بدعات اور خلاف سنّت رسومات کا نام ہی نہیں ہے، جو اس زمانہ میں تصوّف کے نام پر اکثر خاندانی اور رسمی پیروں اور سجادہ نشینوں میں رائج ہو چکی ہیں۔

⑮ "حقیقت الطریقہ من السنۃ الانیقہ"

یہ کتاب بڑی تقطیع کے ایک سو ترپن ۱۵۳ صفحات پر مشتمل التکشف کے ص ۳۱۴ سے ص ۴۶۶ تک شائع ہو رہی ہے۔

⑯ التکشف

"التکشف" کو حکیم الامت کی تصانیف میں اہم حیثیت حاصل ہے، یہ کتاب تصوّف کے اساسی اصول وکلیات اور مبادیات پر مشتمل جامع تصنیف ہے، اس کا ایک حصّہ جو مستقل تالیف کی حیثیت رکھتا ہے علم حدیث کی اہم خدمت ہے اس تالیف کا نام حقیقت الطریقہ من السنۃ الانیقہ ہے۔

اس میں تیرہ عنوانات کے تحت تین سو تیس ۳۳۰ حدیثوں کا ذکر کیا گیا ہے، جو اکثر وبیشتر صحاح سے منقول ہیں، ان عنوانات میں احوال، اخلاق، تعلیمات، اشغال، علامات، رذائل، عبادات، رسومات، مسائل اور اصلاح شامل ہیں ان سب عنوانات کو تین سو تیس احادیث سے ثابت فرمایا ہے، اس کے مطالعے سے غالی صوفی کا غلو اور منکر تصوف کا انکار کافور

ہوجاتا ہے، یہ کتاب بہت ہی عجیب وغریب مضامین اور تحقیقات علمیہ پر مشتمل ہے ۱۳۲۷ھ میں یہ کتاب تالیف کی گئی ہے۔

اسلوب ۔ متنِ حدیث نقل کرنے کے بعد اس کا اردو ترجمہ کیا گیا ہے پھر اس حدیث کی مختصر تشریح کی گئی ہے۔

سببِ تالیف ۔ حکیم الامتؒ اس کا سببِ تالیف بیان کرتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں کہ اصلاحِ قلب ونفس اور عقائد واعمال کے لئے اہل اللہ کی صحبت اختیار کرنے میں افراط وتفریط پر مشتمل دو رائیں ہیں، متشددین اہلِ حق کے بعض اقوال کا پسِ منظر اور اس کی علت سمجھے بغیر ان کو مخالفِ سنت قرار دے کر ان سے کنارہ کش ہوجاتے ہیں اور ان کی برکات سے محروم رہتے ہیں دوسری جانب ضعیف الاعتقاد کم علم وفہم رکھنے والے ناقص العمل یا اہلِ باطل کی صحبت اختیار کرکے اپنا دین وایمان ضائع کردیتے ہیں لہٰذا ضرورت اس بات کی محسوس ہوئی کہ آیاتِ قرآنیہ اور احادیثِ نبویہ سے طریقت کی حقیقت وماہیت واضح کردی جائے تاکہ ہر دو فریق اس افراط وتفریط کے راستے سے ہٹ کر عدل واعتدال کی راہ پر گامزن ہوں۔

"مثال" (۱) عن عبد اللہ ابن مسعود قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذنك علی ان ترفع الحجاب وان تسمع سوادی حتی انهاك (رواہ ابن ماجہ)

ترجمہ۔ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارے لئے آنے کی یہی اجازت ہے کہ تم پردہ اٹھا دیا کرو اور میری مخفی بات سن لیا کرو جب تک میں منع نہ کروں، (ابن ماجہ ص۱۳)

(۲) عن الحسین بن علی قال سالت ابی عن دخول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

فقال کان اذا اوی الی منزلہ جزء دخولہ ثلثۃ اجزاء جزاً للّٰہ عز وجل جزء لاھلہ جزء المفنہ ثم جزء جزءہ بلینہ وبلین الناس خیر دونک ماعجاجتہ علی العامۃ ولا یدخیر عنہم شیاً کان من سیرتہ فی جزء لامۃ ایثار اصل الفضل الحدیث۔ (رواہ الترمذی فی الشمائل)

ترجمہ:۔ حضرت امام حسینؓ سے روایت ہے کہ میں نے اپنے والد سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں تشریف لے جانے کی حالت کے متعلق پوچھا (کہ آپ جب گھر تشریف لاتے تو کیا کرتے تھے) انہوں نے فرمایا کہ جب اپنے گھر میں تشریف لاتے تو اپنے اندر آنے کو تین حصوں پر تقسیم کرتے ایک حصہ اپنے گھر والوں سے (بولنے چالنے) کے لئے، اور ایک حصہ اپنے نفس کو آرام کے لئے اور پھر اپنے حصہ کو اپنے ضروری کاموں اور لوگوں کے (نفع پہنچانے کے) درمیان میں تقسیم فرمادیتے، یعنی کچھ وقت اپنے لئے صرف کرتے اور کچھ لوگوں کے کام میں رہتے اس حصہ کو (جو کہ اپنے وقت میں سے لوگوں کے لئے نکالتے تھے) خواص کے ذریعہ سے عام لوگوں پر صرف فرماتے، اور لوگوں سے کوئی چیز (کام کی) اٹھا نہ رکھتے اور آپ کی عادت شریف امت کے حصہ میں (جو باہر صرف ہوتا تھا) یہ تھی اہلِ فضیلت کو ترجیح دینا، جو حدیث میں مذکور ہے (شمائل ص۲۶)

(۳) عن ابی موسی الاشعری قال کنت مع النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم فی حائط من حیطان المدینۃ فجاء رجل فاستفتح فقال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم افتح لہ وبشرہ بالجنۃ ففتحت لہ فاذا ابوبکر فبشرتہ بما قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فحمد اللّٰہ الحدیث وفیہ مجیء عمر وعثمان کذلک متفق علیہ۔

ترجمہ: حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینہ کے ایک باغ میں تھا ایک شخص آیا اور دروازہ کھلوایا، آپ نے فرمایا کہ دروازہ کھول دو اور اس شخص کو جنت کی بشارت دے دو، میں نے دروازہ کھولا تو ابو بکرؓ تھے، میں نے ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمائی ہوئی خوشخبری دے دی، انہوں نے اللہ تعالیٰ کی حمد کی، اسی طرح حدیث میں حضرت عمرؓ و حضرت عثمانؓ کا تشریف لانا مذکور ہے، روایت کیا اس کو بخاری و مسلم نے۔ (مشکوٰۃ شریف ص۵۵۵)

ان تینوں حدیثوں کے بعد حضرت حکیم الامت نے ف کے تحت ذیل کی سرخی قائم فرمائی اور فوائد تحریر فرمائے ف، عادۃ ضبط اوقات و باز داشتن عوام در وقت خلوت و نشانیدن بواب، بزرگوں کا عموماً معمول ہے کہ اپنے اوقات منضبط رکھتے ہیں جن میں کچھ وقت خلوت کا بھی ہوتا ہے جس میں عوام سے نہیں ملتے، اور کبھی کبھی کسی خادم کو بھی بٹھلا دیتے ہیں کہ عوام کو ہجوم سے روکے اور کبھی اسی وقت میں خواص کو کسی خصوصیت سے اجازت دیتے ہیں، اہل بطالت ان معمولات پر طرح طرح کے اعتراض کرتے ہیں اور بزرگوں پر شبہ ترفع کا یا ترجیح بلا مرجح کا اور مثل اس کے کرتے ہیں بعضے خاص خادموں کو جاتا ہوا دیکھ کر خود بھی جا گھستے ہیں اور اس کے ماذون ہونے سے اپنے ماذون ہونے پر استدلال کرتے ہیں، یہ حدیثیں ان سب امور کا صاف صاف فیصلہ کرتی ہیں، حدیث ثانی سے ضبط اوقات و اہتمام خلوت اور صرف خواص کو آنے دینا۔ اور حدیث اول سے خادم کے ماذون ہونے کا عام کے ماذون ہونے کو مستلزم نہ ہونا، اور حدیث ثالث سے بواب کا بٹھلانا صاف معلوم ہوتا ہے، البتہ کسی کی ضرورت شدیدہ فوریہ کے وقت پھر ملاقات سے عذر کرنا برا ہے، ورنہ علاوہ حدیث کے خود قرآن مجید کی آیت وان قیل لکم ارجعوا

فارجعوا، اس کی اجازت دیتی ہے، کہ کسی وقت ملاقات سے عذر کر دینا بھی جائز ہے، اسی طرح حدیث انزلوا الناس منازلھم، خواص کی ترجیح کو عوام پر جائز بتلاتی ہے، یہ تمام شبہات ناواقفی سے ہوتے ہیں، تینوں حدیثوں سے مسائل کا استنباط اور معمولات صوفیاء کرام اور فوائد تحریر فرمائے گئے اور حسن حکیمانہ انداز اور منقیانہ طرز استدلال سے ان کا اثبات فرمایا گیا ہے اس کی طرف سے ہمارے اکثر اصحاب تدریس اور طلباء علوم حدیث صرفِ نظر کئے ہوئے ہیں، اور ان کے درسی افادات ان علمی جواہرات سے اکثر تہی دامن ہوتے ہیں، ان کی طرف توجہ دلانے کی غرض سے بھی یہ چند مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ احادیث سے صحیح طور پر مستفید ہونے کی توفیق عنایت فرمائیں،

"التشرف" اور "حقیقت الطریقہ" کے مضامین میں مماثلت ہونے کے باوجود فرق یہ ہے کہ التشرف میں عبادات اور تصوّف کے احکام و مسائل کی احادیث کو بیان کیا گیا ہے اور حقیقت الطریقہ میں معاشرت کے احکام سے تعلق رکھنے والی احادیث کا ذکر کیا ہے اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ایک عابد و زاہد اور صوفی متقی کے لئے ترکِ معاشرت و ترکِ حقوق کی اجازت نہیں ہے۔

⑰ "النکت الدقیقہ فیما یتعلق بالحقیقہ"

رسالہ حقیقت الطریقہ کو اصل اور اس رسالہ کو اس کے تابع کے طور پر لکھا گیا ہے۔ اسی واسطے رسالہ مذکورہ میں حدیث کو مقدم لکھا گیا ہے اور مسئلہ کو آخیر میں، اور اس رسالہ میں مسئلہ کو مقدم اور اس کی تائید میں حدیث کو بعد میں ذکر کیا گیا ہے، تاکہ اصل اور تابع میں اچھی طرح امتیاز ہو جائے، بڑی تقطیع کے صد ۱۲ کا یہ رسالہ وسط ربیع الاول ۱۳۲۷ھ

نہیں تحریر کیا گیا ہے اور التکشف کے صہ ۴۶۷ سے صہ ۴۷۵ تک شائع ہوا ہے۔اس رسالے میں کل پچیس حدیثوں کی تشریح و توضیح ہے مگر چار حدیثیں وہ ہیں جو پہلے حقیقت الطریقہ میں بھی آچکی ہیں، اس لئے ان چار کو گنتی میں شمار نہ کیا جائے تو بھی اکیس ۲۱ حدیثیں مذکور ہیں اور تین سو تیس حدیثیں اصل رسالہ حقیقت الطریقہ میں مذکور ہیں اصل اور تابع دونوں کا مجموعہ احادیث تین سو اکاون ۳۵۱ ہوگئیں حکیم الامت تھانویؒ نے اس تعداد کو بحذف کسر ایک شعر میں اس طرح بیان کیا ہے۔

ع سہ صد و پنجہ حدیث آمد دراں ـــــ شد مرتب ایں عجائب سفر دیں

النکت الدقیقہ سے مثال

حدیث من رانی فی المنام فقد رانی فان الشیطان لا یتمثل فی صورتی

ترجمہ:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کہ جس نے مجھ کو خواب میں دیکھا تو اس نے مجھ ہی کو دیکھا، کیونکہ شیطان میری صورت میں نہیں بن سکتا، روایت کیا اس کو بخاری و مسلم نے۔ (مشکوٰۃ صہ ۳۶)

حضرت حکیم الامتؒ، ف کے تحت فرماتے ہیں کہ بعض صوفیہ کے کلام میں بعض عبارات بعنوان حدیث پائی جاتی ہیں جن پر اکثر اہلِ ظاہر ان حضرات پر وضع احادیث کا طعن کرتے ہیں مگر حاشا و کلا وہ ایسے کبیرہ کے ہرگز مرتکب نہیں ہو سکتے بلکہ توجیہہ اس کی یا تو یہ ہے کہ کشف یا منام میں انہوں نے حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ ارشادات سنے ہوں اس لئے ان کو حضورؐ کی طرف منسوب کر دیا، خود محدثین نے بھی احادیث منامیہ کو حدیث کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے جیسا امام صنعانیؒ نے مشارق الانوار میں حدیث اذا وضع العشاء الخ منام کے طریق سے نقل کی ہے اسی طرح احادیث کشفیہ

کو حدیث کہنا صحیح ہے، البتہ ان میں یہ شرط ہے کہ قواعد شرعیہ کے خلاف نہ ہوں، تو محققین کے کلام میں جو اس قسم کے مضامین پائے جاتے ہیں، اس میں یہ بات متحقق ہوتی ہے کہ فی نفسہٖ وہ حق ہوتی ہے اوپر کی حدیث سے اس توجیہ کا صحیح و معتبر ہونا ثابت ہو رہا ہے۔

کبھی وہ روایت بالمعنی ہوتی ہے جیسے کنت کنزاً مخفیاً کا مضمون روایت بالمعنی حدیث ان اللہ جمیل کی ہوسکتی ہے،

اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی کتاب میں دیکھ کر یا کسی راوی سے جو بظاہر صالح تھا سن کر حسنِ ظن کی بنا پر اس کو صحیح سمجھ لیا اور نقل کر دیا، تنقید احادیث ان حضرات کا فن نہیں اس لئے یہ غلطی معفو عنہ ہے۔ (التکشف ص۴۷)

پہلے مسئلہ کا عنوان قائم فرمایا ہے "دلیل بعض احادیث غیر منقولہ در کتب احادیث" اس کے بعد متن حدیث پھر اس کا اردو ترجمہ بیان فرما کر۔ ف کے تحت اس کی تشریح فرمائی گئی ہے۔

اس تشریح سے کئی امور واضح ہوئے ایک یہ کہ

حدیث کی ایک قسم منامی بھی ہے جس کو منامات میں حاصل کیا گیا ہے، اور وہ صرف صوفیاء کی اختراع نہیں ہے بلکہ محدثین نے بھی اس کو روایت کیا اور معتبر قرار دیا ہے، امام صغانیؒ جیسے محدثین نے ایسی حدیث کو روایت کیا ہے اور شاہ ولی اللہؒ جیسے اکابر نے اپنی منامی احادیث کو الدر الثمین فی مبشرات النبی الامین، کے نام سے مستقل رسالہ میں جمع فرمایا، اس حدیث زیر عنوان سے بھی اس کا ثبوت ہو رہا ہے پھر ان احادیث منامیہ کے اعتبار کا یہ معیار ذکر فرما کر کہ ان کا مضمون قواعد شرعیہ کے خلاف

نہ ہو احادیث منامیہ کا درجہ اور دوسری احادیث سے فرق واضح کر دیا اس طرح عدل واعتدال کی راہ کی طرف رہنمائی فرما کر غلو وافراط سے حفاظت کا سامان امت کے ہاتھ میں دے دیا،

پھر اکابر صوفیائے کرامؒ کے ساتھ حسن ظن قائم رکھنے کے لئے، ایک یہ توجیہ فرمائی کہ کسی کتاب کو معتبر سمجھ کر یا راوی کے ظاہر حال کے موافق اس کو صالح سمجھ کر اس کی روایت نقل کر دی اور تنقید نہ فرمائی کیونکہ لکل فن رجال یہ تنقید کا فن ان حضرات کا نہیں تھا اور ظاہر حال کا اعتبار کرنا جائز تھا، مگر اس میں بھی عدل واعتدال کی راہ اختیار کی گئی کہ نہ تو اس روایت کی وجہ سے صوفیائے کرام کو مطعون کیا گیا بلکہ اس غلطی کو عفو قرار دیا گیا، اور نہ ہی ان کے مقام و مرتبہ کی وجہ سے اس روایت کو معتبر قرار دے کر اس کو قبول کیا گیا، بلکہ اس روایت کرنے کو غلطی قرار دیا اور راوی کے ساتھ بھی بدستور حسن ظن باقی رکھا گیا" نیز ایک قسم روایت کی روایت بالمعنی بھی ہے اس کے اثبات کے لئے حضرت حکیم الامتؒ نے حدیث مسلم ان اللہ تعالیٰ جمیل رواہ مسلم، اللہ تعالیٰ جمیل ہے اس کو مسلم نے روایت کیا ہے (مشکوٰۃ ص۴۲۵) کے زیر عنوان ف کے تحت عجیب حکیمانہ انداز سے اس طرح استدلال فرمایا ہے فرماتے ہیں۔

چونکہ جمال عادۃً مقتضی ہوتا ہے ظہور کو یعنی ظہور اس کے مناسب ہے، اور اللہ تعالیٰ حکیم ہیں کہ مناسب کی رعایت فرماتے ہیں اس لئے حکمت مقتضی ہوئی کہ ذات وصفات کا ظہور فرمائیں اور ذات وصفات کا ظہور ہوتا ہے افعال سے جو متعلق ہیں خلق کے پس مقتضی ظہور ہونا مقتضی تخلیق ہوتا ہے، اور اسی ظہور سے معرفت ہوتی ہے، پس اقتضاء ظہور اقتضاء معروفیت ہی ہے اسے اقتضاء حب سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، اور اس ظہور

سے پہلے حفاظاہر ہے پس حکم بالجمال سے کہ حدیث میں ہے بواسطہ مقدمات کے قول مشہور مذکور صوفیہ کا ثابت ہوتا ہے خوب سمجھ لو، (التکشف ص۲۷۶)

(۱۸) الادراک والتوصل الی حقیقۃ الاشراک والتوسل

اس رسالہ میں ایک حدیث کی تشریح کے ضمن میں دو معرکۃ الآراء مسئلوں کی عجیب وغریب تحقیق فرمائی گئی ہے۔ مسئلہ توسل کی شرک سے ممتاز اور جُداحیثیت کو بیان کیا گیا پھر شرک اصغر اور شرک اکبر کے درمیان معیار فرق کو واضح کر کے افراط و تفریط کی اصلاح کی گئی ہے، اس رسالہ سے اہلِ علم کو استفادہ کرنے کی ضرورت ہے، شرک اصغر اور شرک اکبر کے درمیان فرق نہ کرنے کی وجہ سے مسئلہ توحید کی حقیقت سمجھنے میں اختلافات پیش آرہے ہیں اور بسا اوقات شرک اصغر پر بھی شرک اکبر کا ہی حکم لگایا جاتا ہے وبالعکس۔

(۱۹) التصرف فی تحقیق التصرف

توجہ باطنی کے ذریعہ دوسرے شخص پر کوئی اثر ڈالنے کو اصطلاح صوفیہ میں تصرف کہتے ہیں، اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں کو قرآن وحدیث کی تصریحات وارشادات سے اس رسالہ میں واضح فرمایا گیا ہے یہ عربی رسالہ اور اس کا اردو ترجمہ بوادر النوادر میں شائع ہوا ہے

(۲۰) حفظِ اربعین

اس میں چالیس حدیثیں صحیح مسلم شریف کی جمع کی گئی ہیں جن کو معمر ہمام بن منبہ سے وہ ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں

ان سب حدیثوں کی سند ایک ہی ہے، یہ چہل حدیث کا مجموعہ شائقین حفظِ حدیث کے لئے مع اردو ترجمہ اور ضروری فوائد کے زمانہ تدریس جامع العلوم کانپور میں ۱۳۱۵ھ میں حکیم الامت تھانویؒ نے تحریر فرمایا، ان فوائد سے حضرت حکیم الامتؒ کے علمی اور روحانی مقام کا پتہ چلتا ہے ساتھ ہی آپ کے محدثانہ علمی تحقیقی مقام کا اندازہ بھی ہوتا ہے، کہ ابتداء سے ہی حکیم الامتؒ کو احادیث کے بارے میں کس قدر عمیق علوم عطا فرمائے گئے تھے۔

(۲۱) درجہ اردو

حضرت حکیم الامتؒ نے آیات قرآنیہ کے علاوہ احادیثِ نبویہ سے یہ ثابت فرمایا ہے کہ اردو زبان کی حفاظت دین کی حفاظت ہے اس لئے ہر شخص پر حسبِ استطاعت اس کی حفاظت واجب ہے اور قدرت کے باوجود اس میں سستی کرنا معصیت ہے یہ رسالہ امداد الفتاویٰ کا جزو ہو کر شائع ہو رہا ہے۔ اس سے حکیم الامتؒ کی علمِ حدیث میں وسعت اور دقتِ نظر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جس موضوع کے بارے میں عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ خالص تمدنی موضوع ہے اس کے بارے میں بھی حضرت حکیم الامتؒ آیات اور احادیث کو تلاش اور جمع کر لیتے ہیں۔

(۲۲) رسالہ اخبار بلیغ ورسالہ افکار دینی ضمیمہ اخبار بلیغ

اگرچہ اس رسالہ کا مقصد نفس اخبار کی مشروعیت کو ثابت کر کے اس کے آداب کو بتلانا ہے مگر جابجا اس سلسلہ میں احادیث سے بھی استدلال فرمایا گیا ہے، اس سے بھی حکیم الامتؒ کی شان محدثیت واضح ہوتی ہے کہ ذخیرۂ حدیث پر کتنی وسیع اور عمیق

نظر ہے، اور زندگی کے ہر گوشہ پر احادیث نبویہ سے استدلال کرنا آپ کی شانِ تفقہ اور معانی حدیث کی غواصی پر واضح دلیل ہے، اس کی نظیر ملنا تو بہت ہی مشکل ہے۔

(۲۳) "رسالہ جزل الکلام فی عزل الامام"

امام کو معزول کرنے کے بارہ میں بعض احادیث میں تعارض کا شبہ ہوتا ہے، کہ کسی حدیث میں مخالفت امام کی اجازت کفر صریح پر دی گئی ہے اور کسی حدیث میں مطلق معصیت ترک صلوٰۃ وغیرہ کا بھی اسی حکم میں داخل ہونا معلوم ہوتا ہے، اس رسالہ میں حکیم الامتؒ نے ان احادیث میں احسن طریقہ پر تطبیق اور اس کے ضمن میں اصل مسئلہ کی کافی تحقیق فرمائی ہے اور بڑے ہی محدثانہ اور فقیہانہ انداز میں ان پر بحث کر کے ان کی تشریح فرما دی ہے اس کے بعد مسئلہ کی مزید وضاحت کے لئے فقہاء کے جو اقوال نقل کئے ہیں ان میں بھی بطور استدلال کے بہت سی احادیث مذکور ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ فقہاء نے ان احادیث کے کیا معنی سمجھے ہیں آخر میں مزید افادہ کے لئے تمام امور محل امامت اور ان کے احکام اور اقسام کو بیان کر کے اور تمام شبہات کا جواب دے کر مکمل کر دیا خصوصیت سے مدرسین حدیث کے استفادہ کے قابل مجموعہ احادیث ہے اس مبحث میں یہ رسالہ بے نظیر جامعیت کا حاصل اور بڑا ہی مفید ہے۔

(۲۴) "تعدیل حقوق والدین"

اس رسالہ میں والدین کے حقوق واجبہ اور غیر واجبہ کی تعیین پھر والدین کے حقوق اور زوجہ یا اولاد کے حقوق میں تعارض وتزاحم کے وقت ان حقوق کی تعدیل کا بیان

قرآن وحدیث کی روشنی میں فرمایا گیا اور اس سلسلہ کی احادیث کی تشریح کی گئی ہے۔ اور ان کے مطلب کو واضح فرمایا گیا ہے۔

(۲۵) احکام الائتلاف

اس رسالہ میں اگرچہ اس غلطی کی اصلاح مقصود ہے جو عام طور پر پھیلی ہوئی ہے کہ ہر حال میں اتفاق اچھا سمجھا جاتا ہے اور اختلاف کو برا اس میں بتلایا گیا ہے کہ اتفاق محمود صرف وہ ہے جو حق پر ہو، ناحق پر اتفاق کرنا غلطی ہے۔

مگر اس رسالہ میں جابجا احادیث سے استدلال کیا گیا ہے اور تقریباً ۲۵ حدیثوں کی تشریح اور ان کے مفہوم و معنی اور مطالب کا بیان اس میں آگیا ہے جو اہل علم خصوصاً حدیث پر کام کرنے والوں کے لئے نہایت درجہ مفید و معین ہے۔

(۲۶) ضم شارد الابل فی ذم شارد ابل

جب شارد ا ایکٹ حکومت برطانیہ کے زمانہ میں نافذ ہوا تو حضرت حکیم الامتؒ نے مسلمانوں کی مذہبی رہنمائی کے لئے اس رسالہ میں قرآن وحدیث سے ثابت فرمایا کہ نکاح کرنا، دنیا کا کام نہیں دین کا کام اور عبادت ہے، حکومت کی اس میں قانونی مداخلت کرنی، مداخلت فی الدین ہے، اس لئے نابالغ کے نکاح میں قانونی پابندی لگانا ناروا اور نادرست ہے، اس سلسلہ میں احادیث کی تشریحات قابل ملاحظہ ہوں۔

احادیث میں بعض اعمال کی فضیلت میں وارد ہے کہ مثل اعتاق اولاد بنی اسمٰعیل علیہ السلام کے ہے، اس پر اشکال ہوتا ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے جب کہ بنی اسمٰعیل کا استرقاق

جائز نہیں اور اعتاق فرع استرقاق کی ہے۔

جواب یہ ہے کہ حریت و رق میں ولد باپ کا تابع نہیں ہوتا ماں کا تابع ہوتا ہے، تو اگر کسی قریشی نے جاریہ سے نکاح کرلیا تو اس کی اولاد ولد اسمٰعیل علیہ السلام بھی ہے اور رقیق بھی اشکال کا منشاء یہ تھا کہ اولاد اسمٰعیل کا استرقاق جائز نہیں۔ (بوادر ص۱۰۵)

اشکال کا حل اس صورت مرقومہ بالا سے یہ ہوا کہ رقیت میں اولاد ماں کے تابع ہوتی ہے اور وہ رقیقہ ہے تو اس کی اولاد بھی رقیق ہوگی خواہ قریشی سے ہی ہو، اس صورت سے رقیت اور اولاد اسمٰعیل کا اجتماع ممکن ہوگیا۔ البتہ اگر قریشی حرہ سے نکاح کرے تو پھر اس کی اولاد بھی حر ہوگی اور اس کا استرقاق جائز نہ ہوگا۔

(۲۷) "خطبات الاحکام لجمعات العام"

یہ عربی زبان میں جمعہ وعیدین کے علاوہ نکاح اور استسقاء کے پچاس خطبوں کا مجموعہ ہے اس میں سال بھر کے ہر جمعہ کے لئے الگ خطبہ ہے، خطبہ چونکہ عربی زبان میں ہوتا ہے اس لئے نہایت سلیس عربی میں مرتب فرمایا ہے، ان میں ترغیب وترہیب کے مضامین کے ساتھ عقائد واعمال اور اخلاق باطنی کے بارہ میں بھی احادیث بیان کی گئی ہیں،

ان کا ترجمہ اردو زبان میں خطبوں کے آخر میں لگا دیا گیا ہے تاکہ اردو داں حضرات بھی ان کے مضامین سے استفادہ کر سکیں، اور حسب ضرورت گاہ بگاہ امام صاحبان نماز جمعہ کے بعد یا اذان خطبہ سے پہلے لوگوں کو سنا دیا کریں۔

یہ اردو ترجمہ میرے والد محترم حضرت مولانا مفتی سید عبدالکریم گمتھلوی نے بزمانہ

قیام خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون زیر سایہ حضرت حکیم الامت تھانوی کیا تھا۔

(۲۸) "الخطب الماثورہ من الآثار المشہورہ"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفاء راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے خطبات احادیث صحیحہ سے انتخاب فرما کر ایک جگہ جمع فرما دیئے ہیں، امید ہے کہ عاشقان سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی قدر کریں گے۔

(۲۹) زاد السعید فی الصلوٰۃ والسلام علی النبی الوحید صلی اللہ علیہ وسلم

اس میں درود شریف کے فضائل کی احادیث کو جمع فرمایا گیا ہے کتاب ایک مقدمہ دس فصلوں، اور خاتمہ وغیرہ پر مشتمل ہے اس میں صلوٰۃ وسلام کے صیغے بھی بیان فرمائے گئے ہیں۔

(۳۰) "الاستبصار فی فضل الاستغفار"

اس میں استغفار کے فضائل کی احادیث کو جمع فرمایا گیا ہے،

(۳۱) حقوق الاسلام (۳۲) حقوق العلم (۳۳) حقوق البہائم

پہلے رسالہ میں مسلمانوں کے باہمی حقوق اور دوسرے میں علماء کے حقوق کی احادیث کو بیان فرمایا گیا ہے اور ادائیگی حقوق میں جو حق تلفی ہو رہی ہے ان کی اصلاح کی گئی ہے۔ تیسرے رسالہ میں جانوروں کے حقوق کا بیان احادیث سے کیا ہے جن کے

ادا نہ کرنے سے لوگ کس قدر گنہگار ہوتے ہیں اس کی ہر جانور پالنے والے کو ضرورت ہے۔

(۳۴) "حقوق العلم والمتعلم"

اس میں ۲۵ حدیثوں کی تشریح وتوضیح فرمائی گئی ہے اور بہت ہی عجیب انداز سے معلم ومتعلم کے حقوق کا نصوص سے استنباط کیا گیا ہے مولانا علامہ محمد شریف کشمیری زاد مجدہٗ محدث خیر المدارس ملتان اس کے بارہ میں لکھتے ہیں، حضرت قدس سرہٗ کی شان تجدیدی واجتہادی حدیثیہ اس عجالہ نافعہ سے بالکل عیاں وواضح ہوجاتی ہے، اور آداب کا استنباط ایسی ایسی نصوص سے کیا گیا ہے جس کی طرف وہم وگمان بھی نہیں ہوتا۔ (حقوق العلم والمتعلم)

(۳۵) "استحباب الدعوات عقیب الصلوٰۃ"

اس رسالہ میں نماز کے بعد دعاء کا ثبوت احادیث معتبرہ سے دیا گیا ہے یہ رسالہ امداد الفتاویٰ ج ا کا جز ہو کر شائع ہو رہا ہے۔

(۳۶) "اورادِ رحمانی"

اس میں سبحان اللہ، الحمد للہ، اللہ اکبر، کے فضائل وخواص بیان فرمائے ہیں اور اس سلسلہ کی احادیث کو بیان فرمایا گیا ہے۔

(۳۷) "مُناجات مقبول"

یہ ان عربی دعاؤں کا مجموعہ ہے جو قرآن و حدیث میں آئی ہیں خدا تعالیٰ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بتلائی ہوئی دعاؤں سے بڑھ کر مؤثر اور بابرکت دُعا کون سی ہو سکتی ہے آسانی کے لئے اس کی سات منزلیں کردی ہیں ہر روز کے لئے ایک منزل متعین ہے، ان کا اردو ترجمہ بھی ساتھ کرا دیا گیا ہے۔

(۳۸) "تتمہ قربات عند اللہ"

اس میں روزمرہ صبح شام، نماز، روزہ، غسل، وضو ہر حاجت کی دُعائیں درج ہیں اور مناجات مقبول کے آخر میں ملحق ہیں،

(۳۹) "شوقِ وطن"

انسان کے اصلی وطن یعنی عالم آخرت کی یاد تازہ کرنے اور شوق دلانے کے لئے یہ بے نظیر کتاب ہے، موت سے گھبرانے والوں اور دُنیا کی لذتوں میں منہمک رہنے والوں کے لئے یہ کتاب بہت ہی مفید ہے۔ اس سلسلہ کی احادیث کو اس میں جمع کر دیا گیا ہے۔

(۴۰) "کسوۃ النساء"

حکیم الامت تھانویؒ کی تالیفات میں سب سے زیادہ مشہور و مقبول عام کتاب

بہشتی زیور، دراصل مجموعی طور پر اصلاحِ اُمت کا سنگِ بنیاد اور حضرت مجدد تھانویؒ کے تجدیدی اور اصلاحی کارناموں کا بُنیادی پتھر ہے، اگر مسلمان گھرانوں میں اس کے پڑھنے سننے کا اہتمام ہو جاتے تو مسلمانوں کی دین و دُنیا کی ترقی کا قدم کہاں سے کہاں پہنچ جائے اس کا اندازہ اس کی تعلیمات پر عمل کرنے کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔

بہشتی زیور میں ایک رسالہ بنام کسوۃ النساء شائع فرمایا گیا، اس میں ایسی حدیثوں کا خلاصہ اور درجہ درج کیا گیا جس میں اللہ و رسول نے خاص کر نیک عورتوں کی خصلت اور تعریف اور درجے بیان فرمائے ہیں اس میں ایسی حدیثوں اور آیتوں کا بیان بھی ہے جس پر عمل کرنے سے میاں بی بی کے تعلقات خوشگوار رہ سکیں جو آج کل خصوصاً موجودہ تہذیب میں عنقا ہیں۔

"بہشتی جوہر" ترغیب و ترہیب کی آیات و احادیث پر مشتمل بہشتی زیور کے آٹھویں حصّہ کا ضمیمہ ہے۔

(۷۱) "التحریض علیٰ صلح التعریض"

یہ رسالہ عربی میں ہے اور دوسرے کالم میں اردو ترجمہ بھی اس کے ساتھ شائع ہو کر بوادر النوادر میں شامل ہے۔

یہ رسالہ اس حدیث کی شرح میں ہے۔ جس میں آیا ہے جو شخص اپنی دی ہوئی چیز کو واپس کرے اس کی مثال کتّے کی سی ہے کہ اوّل کھاتا ہے، یہاں تک کہ جب پیٹ بھر جاتا ہے قے کر دیتا ہے، پھر اس قے کو چاٹتا ہے، اس کی فقہی انداز میں تشریح کرنے کے بعد صوفیائے محققین کے ایک خاص طرزِ اصلاح کو ثابت فرمایا گیا ہے، جس کو وہ

اپنے متعلقین کی اصلاح میں استعمال فرماتے ہیں وہ مسئلہ یہ ہے کہ یہ حضرات بعض اوقات اپنے متعلقین کے خطاب میں ایسی عبارت کے ساتھ خطاب فرماتے ہیں کہ وہ موضوع تو ایک معنیٰ کے لئے ہوتی ہے لیکن اس سے دوسرے معنیٰ کا ایہام ہوتا ہے جو اس عبارت کا مدلول نہیں ہوتا اور مقصود ان کا مخاطب کی مصلحت کے لئے اس کے ذہن کو اس دوسرے معنیٰ کی طرف منتقل کرنا ہوتا ہے، اور اس حدیث کی دلالت اس مسئلہ پر حنفیہ کے مسلک کی رو سے تو ظاہر ہے کیونکہ حضور اقدس کا یہ ارشاد ہے کہ اس کی مثال کتے کی سی ہے، جو اپنی قے میں عود کرتا ہے، مخاطب میں حرمت کے خیال کو پیدا کرتا ہے، اور حضورؐ کی مراد صرف تنفیر ہے، سو آپ اگر عدم تحریم کی تصریح فرما دیتے تو ترک عود فی الھبہ دشوار ہوتا، نفس میں بار بار یہی تقاضا ہوتا کہ حرام تو ہے نہیں پھر نفع کو کیوں چھوڑیں۔ اور جب عدم تحریم کی تصریح نہیں فرمائی تو اب ترک عود سہل ہو گیا، اس ضمن میں مسلم شریف کی حدیث ولی مقتول اگر قاتل کو قتل کرے گا تو اسی کی مثل ہو جائے گا اور دوسری حدیث قاتل و مقتول دونوں دوزخ میں ہیں، نیز عبداللہ بن ابی کے جنازہ کے بارے میں حدیث کی نہایت ہی عجیب و غریب شرح فرمائی ہے جو ملاحظہ اہلِ علم کے قابل ہے۔

(۴۲) "الارشاد الی مسئلۃ الاستعداد" (عربی)

اس رسالہ میں حدیث ان اللہ تعالےٰ خلق خلقۃ فی ظلمۃ فالقی علیھم من نورہ فمن اصابہ من ذلک النور یومئذ اھتدی و من اخطأہ ضل، اللہ تعالےٰ نے اپنی مخلوق کو ظلمت میں پیدا کیا پھر ان پر اپنا

نور القاء کیا پس جس کو اس روز وہ نور پہنچ گیا اس نے ہدایت پائی اور جس کو نہیں پہنچا وہ گمراہ ہوا، اور دوسری احادیث جو مسئلہ تقدیر سے متعلق ہیں ان کی تحقیق اور ان کا مطلب بیان فرمایا گیا ہے۔

حدیث کا یہ عجیب وغریب مطلب بیان فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مکلف مخلوق کو اس استعداد سے خالی پیدا کیا پھر جس پر منظور ہوا اس استعداد کو بنا بر رحمت کے فائض فرمایا اور جس پر منظور نہ ہوا بنا بر حکمت کے فائض نہیں فرمایا، اس طرح یہ حدیث استعداد کے مخلوق ہونے اور اللہ تعالیٰ کے اپنے اعطا اور عدم اعطا میں مختار ہونے پر دلالت کرنے والی ہوگی، اور جن لوگوں نے استعداد کے غیر مخلوق ہونے اور استعداد کے مقتضاء کے خلاف کرنے سے حق تعالیٰ کے غیر مختار ہونے کا حکم لگا دیا ان کی اس لغزش وغلطی کی اچھی طرح تردید کی ہے جو قابل توجہ ہے۔

(۴۳) الحصحصہ فی حکم الوسوسۃ (عربی)

اس رسالہ میں حدیث ان اللہ تعالیٰ تجاوز لامتی عما حدثت بہ انفسہا مالم تتکلم بہ او تعمل بہ، کی تشریح فرمائی گئی ہے، پہلے علامہ حنفیؒ سے خیال کے پانچ مراتب ہاجس، خاطر، حدیث نفس، ھم، عزم کو نقل فرمایا اور ان سب کی تعریف وحقیقت پر روشنی ڈالی اور ہر ایک کا حکم بیان کیا، جس کا حاصل یہ ہے کہ حدیث نفس پر عدم مواخذہ کو اس اوپر کی حدیث صحیح میں بیان فرمایا گیا ہے تو اس سے پہلے کے مراتب ہاجس اور خاطر" میں عدم مؤاخذہ بدرجہ اولیٰ ہوگا، پھر اس اشکال کو رفع کیا ہے کہ کلیات شرعیہ اور قواعد عقلیہ کا مقتضاء یہ ہے کہ اختیاری پر مؤاخذ

ہو غیر اختیاری پر نہ ہو، اب اشکال ہے کہ اس امت مرحومہ کی یہ خصوصیت کہ وساوس پر مواخذہ نہیں ہوتا، اور دوسری امت پر ہوتا تھا، تو یا تو امم سابقہ کا امور غیر اختیاریہ کے ساتھ مکلف ہونا لازم آتا ہے اور یہ کلیات شرعیہ جیسے لایکلف اللہ نفسا الا وسعہا کے منافی ہے اور عدم مؤاخذہ اگر اختیاری کے اعتبار سے ہے تو خود اختیاری اور دوسری اختیاری میں کیا فرق ہے کہ عزم پر تو مواخذہ ہوتا ہے اور حدیث النفس، پر مواخذہ نہیں ہوتا باوجودیکہ اختیاری ہونے میں دونوں شریک ہیں، اس اشکال کا حل یہ ہے کہ خصوصیت مرتبہ اختیاری کے اعتبار سے ہی ہے اور فرق درمیان خاطر و حدیث النفس اور عزم کے یہ ہے کہ خاطر و حدیث النفس کا رفع اگرچہ اختیاری ہے مگر اس کے لئے قصد کی ضرورت ہے اور اس قصد سے اکثر ذہول ہو جاتا ہے پس ہاجس، اکثر خاطر و حدیث النفس کی طرف منجر ہو جاتا ہے، پس اس خاطر اور حدیث النفس پر مؤاخذہ ہونا کلیات شرعیہ کے خلاف نہیں، کیونکہ یہ بایں معنی اختیاری ہے کہ اس کا دفع اختیاری تھا جب دفع نہ کیا تو بقاء اختیاری ہوا، اور اس بناء پر کسی امت کا اس کا مکلف ہونا، کلیات شرعیہ کے خلاف نہ تھا، لیکن رحمت الٰہیہ نے اس امت کو یہ خصوصیت عطا فرمائی کہ اس درجہ کو معاف کر دیا، باقی رہا عزم تو ہاجس اس کی طرف اس طرح سے مفضی نہیں ہوتا بلکہ وہ قصد مستقل سے پیدا ہوتا ہے تو مدار عفو وہ افضا ہوا جو ذہول کے سبب ہوا اور مدار مؤاخذہ عزم مستقل ہوا،

(۴۴) "فروع الایمان"

یہ رسالہ ایک مقدمہ تین بابوں اور ضمیمہ مفیدہ پر مشتمل ہے، اس میں ان ایمانی

خصائل وعادات کا بیان ہے جو ایک مومن کامل میں ہونی چاہیئے گویا یہ کتاب ایمان کامل کی کسوٹی اور معیار ہے، اور شرح ہے اس حدیث کی جس میں ایمان کے تہتر شعبوں کا ذکر فرمایا گیا ہے، اس میں ایک سو سے زائد احادیث کا ذکر کیا گیا ہے۔ دراصل حکیم الامت نے اس رسالہ میں آیت قرآنیہ ضرب اللہ مثلاً کلمۃ طیبۃ کشجرۃ طیبۃ اصلھا ثابت وفرعھا فی السماء کی شرح اور حدیث شعب الایمان کی تشریح و تفصیل فرمائی ہے جس کے الفاظ الایمان بضع وسبعون شعبۃ ہیں قرآن کریم کی آیت مرقومہ سے اجمالی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کے کچھ اصول ہیں اور کچھ فروع ہیں، اور حدیث مذکور میں شعب ایمان کی تعداد ستر سے اوپر بتلائی گئی اور اس کے تین شعبوں اعلیٰ، اوسط، ادنیٰ کا ذکر بھی فرمایا گیا، مگر سب کی تفصیل اس میں نہیں فرمائی گئی ان تمام شعبوں کی تفصیل دوسری آیتوں اور حدیثوں کی روشنی میں عام فہم اُردو زبان میں اس رسالہ میں کردی گئی۔

پہلے بھی علماء محدثین نے ان تمام شعبوں کو جمع فرمایا ہے، اس صدی کے محدث اعظم نے بھی اپنے مسلمان بھائیوں کی اصلاح کے لئے اس رسالہ میں ان کو جمع کر دیا تاکہ غور کیا جاسکے کہ جس ایمان کا ہم کو دعویٰ ہے اس کے تو اس قدر شعبے اور شاخیں ہیں مگر ہم میں کتنے شعبے پائے جاتے ہیں پھر جتنے شعبے موجود ہیں ان پر خدا تعالیٰ کا شکر کریں اور جتنی کمی ہو اس کو پورا کرنے کی کوشش کریں تاکہ ایمان کی تکمیل ہو کر کمالِ ایمان کی دولت نصیب ہو، یوں تو اصول ایمان کے مان لینے سے ادنیٰ درجہ کا ایمان میسّر آہی جاتا ہے، ان شعبوں میں سے تیس شعبے تو دل سے تعلق رکھتے ہیں اور سات زبان کے ساتھ اور چالیس باقی جوارح سے متعلق ہیں، ہر باب میں ایک ایک قسم کو بیان کیا گیا ہے اور ہر باب میں فصلیں ہیں ان میں ان شعبوں کے فضائل اور بعض متعلقات کا بیان

ہے، اس ضمن میں بکثرت احادیث مذکور ہیں۔

(۴۵) "نشر الطیب فی ذکر النبی الحبیب"

اس کتاب مستطاب میں جناب رسالتمآب سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات طیبات، ابتداء صورت نوریہ روحیہ سے لے کر صورت جسمیہ بلکہ داخلہ جنت تک کے نہایت تحقیق و تدقیق سے اُردو زبان میں با محاورہ اور سلیس عبارت میں تحریر فرمائے ہیں، آپ کے عبادات و اخلاق اور محاسن و کمالات وغیرہ سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلہ میں جو احادیث وارد ہوئی ہیں ان کا خلاصہ اس کتاب میں جمع فرما دیا ہے اور جن کتابوں سے احادیث کو جمع کیا گیا ہے ان کا حوالہ دیا گیا ہے نیز بتلایا گیا ہے کہ یہ حدیث محدثین کے نزدیک کس درجہ کی ہے، ایسا نہیں ہے کہ بغیر حوالہ دیئے یا حدیث کا درجہ بتلائے احادیث کو نقل کر دیا گیا ہو۔

(۴۶) "حیوٰۃ المسلمین"

اُردو زبان میں تشریح احادیث کا یہ مجموعہ اپنی مثال آپ ہے احادیث کے معانی اور مطالب کی تفہیم، توضیح و تشریح اور ازالہ شبہات و اشکالات میں بے نظیر ہے، علم حدیث کے طلباء کے لئے جمع اور تطبیق احادیث کے سلسلہ میں بہت ہی مفید اور کارآمد ہے حضرت حکیم الامت تھانویؒ نے اس کتاب میں احادیث سے ایسے مضامین جمع کر دیئے ہیں جن پر مسلمانوں کی ایمانی حیات کا دار و مدار ہے اور وہ ایمانی زندگی کے لئے بمنزلہ روح کے ہیں ہر شہر بلکہ ہر گھر میں روزانہ اس کو پڑھا اور سنا جانا چاہیئے

اوراس کے مطابق اپنی اسلامی زندگی کو ڈھالنا چاہیئے، افسوس کہ اس نسخۂ حیات ایمانی کی قدر نہیں کی گئی، اب کتاب "اصلاحی نصاب" کا اس کو جزء بنا کر شائع کیا گیا ہے، اور مساجد میں پڑھنے کا اہتمام مجلس صیانۃ المسلمین کی طرف سے ہو رہا ہے، والحمد للہ علیٰ ذٰلک۔

اس کے دیباچہ میں نوے سے زائد آیات قرآنیہ کو مع ترجمہ اردو بیان فرمایا گیا ہے اس میں کل ۲۵ باب ہیں، ہر باب کو روح، کے لفظ سے شروع کیا گیا ہے۔

اسلام وایمان، تعلیم دین روزہ، نماز، زکوٰۃ، حج، قربانی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت، سیرت نبوی مسلمانوں کے حقوق نیک لوگوں کے پاس بیٹھنا وغیرہ غرضیکہ اسلامی زندگی کے تمام شعبوں کے بارہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر مشتمل احادیث کو جمع کر دیا گیا ہے، ہر حدیث کے آخر میں اس کا حوالہ بھی دیا گیا تاکہ اصل کتاب سے مراجعت کی جا سکے اور بعض احادیث کا حوالہ فٹ نوٹ میں دیا گیا ہے، نوے سے زائد آیتوں کے علاوہ غیر مکرر اور مرفوع تین سو چالیس حدیثوں کی تشریح و تبلیغ اس کتاب کے ذریعہ ہو رہی ہے۔

(۴۷) "تصحیح العلم فی تقبیح الفلم"

اس رسالہ میں تصاویر اور فلم سازی کی مذمت میں احادیث سے بھی استدلال فرمایا گیا ہے۔

(۴۸) زیادات علی کتب الروایات"

اس رسالہ کے آخر میں بطور تتمہ کے احادیث بالاولیت بھی درج ہیں۔

(۴۹) "عبور البراری فی سرور الزراری"

اس رسالہ میں ایک اہلِ علم کے اس سوال کا تحقیقی جواب ہے کہ اطفال مشرکین جنت میں جائیں گے یا نہیں؟ اس میں کم سے کم تو احادیث کی تشریح بیان فرمائی گئی ہے۔

(۵۰) "حکیم الامت تھانوی کی بعض حدیثی تحقیقات خاصہ"

اوپر کے رسائل وکتب سے حضرت حکیم الامتؒ کی حدیثی تحقیقاتِ خاصہ اور خدمتِ حدیث کا کافی حد تک تعارف ہوچکا ہے، اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت حکیم الامت تھانویؒ کی مختلف کتابوں سے حدیث کے متعلق مزید بعض چیدہ چیدہ تحقیقاتِ خاصہ کا ذکر بھی کردیا جائے۔

"رفع تعارض در حدیث اعتاق ومذہب حنفی"

حدیث ترمذی من اعتق نصیبا لہ فی عبد لا فکان لہ من المال ما یبلغ ثمنہ فھو عتیق من مالہ والا فقد عتق منہ ما عتق، بظاہر مذہب حنفی کے معارض معلوم ہوتی ہے، مگر حضرت تھانویؒ نے جو تحقیق اصولِ حدیث کی رُو سے فرمائی ہے اس سے تعارض رفع ہو کر تطبیق ہوجاتی ہے، حضرت فرماتے ہیں" کہ حدیث مجمل ہے اور امام صاحب کا مذہب اسی حدیث کی تفصیل، اور ظاہر ہے کہ اجمال وتفصیل میں معارضہ نہیں ہوا کرتا کیونکہ اجمال میں نفی واثبات مسکوت عنہ ہوتے ہیں تفصیل اس کے ساتھ ناطق ہوتی ہے، اور ناطق وساکت معارض نہیں

ہوتے، تقریر اس کی یہ ہے کہ حدیث سے صورت اعسار معتق میں تجزیہ اعتاق کا ثابت ہوتا ہے، اور اس باب میں کل دو ہی مذہب ہیں، تجزیہ مطلقاً یا عدم تجزیہ مطلقاً، اور یسار و اعسار کا تجزیہ و عدم تجزیہ میں متفاوت ہونا باجماع مرکب باطل ہے، پس جب صورت اعسار میں تجزیہ ثابت ہوگیا تو صورت یسار میں بھی ثابت ہوگیا، اور تجزیہ کے لوازم میں سے ہے احتباس مالیت حصہ غیر معتقہ عبد، اور اس احتباس کے لوازم میں سے ہے، تضمین عبد، اور بقاعدہ الشیٔ اذا ثبت ثبت بلوازمہ جب تجزیہ ثابت بالنص ہے تو تضمین عبد بھی بواسطہ ثابت بالنص ہے، اور اطلاق دلیل سے قیاس مقتضی ہے اس اقتصار علی تضمین العبد کے عموم کو، پس حدیث نے فھو عتیق من مالہ سے اس عام کی تخصیص کردی، یعنی صورت یسار معتق میں تضمین معتق بالکسر بھی جائز ہے، جیسا کہ تضمین معتق بالفتح کی بھی جائز ہے، اور صورت اعسار میں وہی حکم ہے تضمین عبد کا جو مقتضا ہے تجزی اعتاق کا اس لئے استسعی العبد کو تعبیر فرمایا گیا عتق منہ ما عتق سے، اور اعتاق کا جواز دونوں صورتوں میں چونکہ اظہر تھا، اس لئے اس سے کہیں تعرض نہیں فرمایا، تحمل ضرر کا برضا خود ظاہر الجواز ہے فقط (امداد الفتاوی ج ۵ ص۴۸ بوادر ج ۱ ص۱۸۷)

"تقریر تطبیق درمیان حدیث لاعدوی"

جس سے تعدیہ مرض کی نفی ہوتی ہے اور حدیث فر من المجذوم کما تفر من الاسد جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جذامی سے ایسا بھاگو جیسا کہ شیر سے بھاگتے ہو، اور بعض حدیثیں بھی اس مضمون کی ہیں، ان سب حدیثوں کے مطلب و معانی اس طرح

بیان فرمائے گئے ہیں جس سے ان میں ظاہری تعارض باقی نہ رہے، اور اس ضمن میں مرض کے متعدی ہونے یا نہ ہونے کی تحقیق بھی تفصیل سے فرمادی گئی، مسلک اول تعدیہ کا نہ ہونا ہے اور بعض کا دوسرا مسلک تعدیہ کا ہونا ہے۔

حکیم الامتؒ ان دونوں مسلکوں میں اگرچہ مسلک ثانی کو قرب الی التحقیق سمجھتے ہیں مگر دوسری طرف بھی تنگی نہیں ہے۔ اور اس اختلاف کو اختلاف امتی رحمۃ میں داخل سمجھتے ہیں اور ان دونوں مسلکوں میں عارفانہ انداز سے نہایت لطیف تطبیق اس طرح دیتے ہیں کہ جن لوگوں پر تفویض کا غلبہ ہے ان کے مناسب مسلک اول عدم تعدیہ ہے، اور جن پر اسباب کا غلبہ ہے ان کے مناسب مسلک ثانی تعدیہ ہے، یعنی منجملہ اسباب مرض کے ایک سبب تعدیہ بھی ہے جس کا اثر اللہ تعالیٰ کے حکم پر موقوف ہے۔ جیسا کہ دوسرے اسباب کا بھی یہی حال ہے۔

اثناء نماز فجر میں، طلوع شمس عند الحنفیہ مفسد صلوٰۃ ہے،

اس بارہ میں ایک تحریر عربی میں ۷ صفحات پر مشتمل حضرت حکیم الامتؒ نے لکھی ہے جو "نوادر النوادر" میں ص ۲۹۴ ج ۱ تا ص ۳۰۱ موجود ہے جس میں اس مسئلہ کی تحقیق احادیث کی روشنی میں کی گئی ہے۔

"قرب فرائض و قرب نوافل"

کی عجیب تحقیق حدیث فاذا احببتہ کنت سمعہ الذی یسمع بی الخ کی روشنی میں فرمائی گئی۔

مسند احمد اور منتخب کنز العمال اور بخاری شریف کی پانچ حدیثوں کے متعلق تحقیق۔ تین حدیثیں مسند احمد کی اور ایک منتخب کنز العمال کی اور ایک بخاری شریف کی حدیث کے بارہ میں سوالات وشبہات کے تحقیقی جوابات تحریر فرمائے ہیں، یہ احادیث طاعون کے بارہ میں ہیں، نہایت ہی محدثانہ اور محققانہ جوابات ہیں۔

سجدہ سہو میں حدیث سے تشہد کا ثبوت نہایت عجیب انداز سے فرمایا گیا ہے جس کو ذیل میں افادہ عام کے لئے نقل کیا جاتا ہے۔

حدیث میں ہے اذا شك احدكم فى صلوته فليتحر الصواب فليتم عليه ثم ليسلم ثم ليسجد سجدتين (متفق علیہ)

۲۔ حتىٰ اذا قضى الصلوة وانتظر الناس تسليمه كبر وهو جالس سجد سجدتين،

۳۔ ان النبى صلى الله عليه وسلم صلى بهم فسهى فسجد سجدتين ثم تشهد ثم سلم (مشکوٰۃ)

فلیتم علیہ، سے تشہد قبل سجدہ سہو ثابت ہے کیونکہ بدون تشہد کے صلوٰۃ ناقص ہے، اسی طرح حدیث ثانی سے کیونکہ بدون قعدہ کے انتظار سلام کا نہیں ہو سکتا، اور حدیث ثانیہ سے تشہد سجدہ سہو ثابت ہے پس مجموعہ ثابت ہو گیا" (بوادر ج ۱ص۱۴۴)

حدیث اول فلیتم سے اتمام صلوٰۃ کا حکم دیا گیا ہے اس سے لازم آتا ہے کہ سجدہ سہو سے تشہد پڑھنی چاہیئے، کیونکہ اس میں اتمام موجودہ کا ہی حکم دیا گیا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام صلوٰۃ کو حدیث اذا قلت هذا او فعلت هذا

فقد تمت صلوتك میں تشہد پڑھنے پر معلق رکھا ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ اتمام صلوٰۃ تشہد پر موقوف ہے بغیر تشہد کے نماز تمام نہیں ہوتی، ناقص ہوتی ہے، یہ عجیب تقریر ہے سجدہ سہو سے پہلے تشہد کے ثبوت میں، اسی طرح دوسری حدیث میں ذکر ہے کہ لوگ آپ کے سلام کا انتظار فرما رہے تھے لیکن آپ نے بدون تشہد کے وقفہ کے لوگوں کو سلام کا انتظار کیوں ہوتا، اس انتظار سلام سے بھی سلام سہو سے پہلے تشہد کا ثبوت ہو رہا ہے۔ اور تیسری حدیث میں دو سجدوں کے بعد تشہد کا ذکر ہے پس مجموعہ احادیث سے سجدۂ سہو کے اندر دو تشہدوں کا ثبوت ہو گیا۔

"حرمت سجدہ تحیہ"

سجدہ تحیہ کی حرمت پر جس حدیث سے استدلال کیا جاتا ہے اس پر خبر واحد ہونے اور پھر خبر واحد سے قرآن کے نسخ نہ ہونے کا اشکال کیا جاتا ہے۔

اس اشکال کے جواب میں حکیم الامت تھانوی نے محدثانہ انداز سے اس حدیث کے تمام طرق کو جمع کر کے بیس صحابیوں تک پہنچا دیا اور اس کا متواتر ہونا اور اقل درجہ میں اس کا خبر مشہور ہونا ثابت کیا پھر تمام شبہات کے جوابات ارقام فرما کر حرمت سجدہ تحیہ کو مدلل، اور مؤید بالبراہین کر دیا۔ یہ مضمون بوادر النوادر کے علاوہ بیان القرآن کے حاشیہ صـ ۲۲ میں بھی ہے۔

مسلم شریف کی حدیث ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا صلی قائما رکع، سجد واذا صلی قاعدا رکع وسجد وھو قاعد سے جو بعض لوگوں نے یہ استدلال کیا تھا کہ نوافل وغیرہ بیٹھ کر پڑھتے وقت سجدہ میں سر یں زمین سے نہ

اٹھائے جائیں، اس حدیث کی شرح حضرت حکیم الامتؒ نے مسلم شریف ہی کی اس کے بعد کی دوسری حدیث کی روشنی میں فرما کر استدلال کی غلطی واضح فرمادی اس دوسری حدیث کے الفاظ یہ ہیں، قلت لعائشة کیف کان یصنع فی الرکعتین و هو جالس قالت کان یقرأ فیهما فاذا اراد ان یرکع قام فرکع،

اس حدیث کی روشنی میں پہلی حدیث کی یہ مراد متعین ہو جاتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اکثر ایسا نہیں کرتے تھے کہ بیٹھ کر نماز پڑھنے کی حالت میں رکوع سجدہ کے قبل کھڑے ہو جاتے ہوں اور پھر قیام سے رکوع میں اور اس کے بعد سجدہ میں جاتے ہوں جیساکہ گاہ گاہ ایسا بھی کرتے تھے جس کا بیان دوسری حدیث میں آیا ہے"۔

ترمذی شریف کی نو۹ حدیثوں کی عجیب وغریب تشریح بزبان عربی بوادر النوادر کے ص۱۱۶ تا ص۱۱۹ قابل دید ہے، ان حدیثوں کی تشریح مختلف حسب ذیل نو عنوانوں کے تحت فرمائی گئی ہے۔

ع۱ در معنی تقیید تکفیر صغائر بعدم غشیان الکبائر ع۲ در توجیه بودن مسجد نبویؐ مصداق لمسجد اسس علی التقوی، ع۳ در اثبات تصرف از نبی صلی اللہ علیہ وسلم ع۴ در اصل اصول ثواب طاعت بدنیه الی الاموات ع۵ در اشکال متعلق بتصدیق دعوی قاتل عدم قتل را، ع۶ در تحقیق کفاره بودن حدود، ع۷ در تفصیل حکم نذر فی المعصیة، وفیما لا یملك، ع۸ در بودن لسانے اشد از سیف در فتنه، ع۹ در عدم استلزام غلبه در محاجه بر حقانیت را"۔

نسائی شریف باب المحافظہ، علی الصلوٰت الخمس

اس حدیث کی عربی میں تشریح کر کے اس اشکال کو حل فرمایا گیا ہے جس کا تعلق وجوب وتر کے مسئلہ سے ہے، کہ اگر ہم پر وتر واجب ہوتا تو صحابہ کے حق میں فرض ہوتا، کیونکہ فرض واجب کے درمیان دلیل کے قطعی اور ظنی ہونے کا ہی فرق ہوتا ہے اور صحابہ کرامؓ کے حق میں ظنیت منفی ہے، اس لئے کہ ان سے براہ راست خطاب ہوتا تھا، جب ان سے فرضیت کی نفی ہوگئی تو ہم پر سے وجوب کی نفی ہونی چاہیئے؟

حضرت حکیم الامتؒ نے اس اشکال کا عجیب وغریب الہامی حل یہ فرمایا کہ صحابہ کرامؓ کے حق میں دلیل کی ظنیت مطلقاً منفی نہیں ہے، کیونکہ ظنیت کی دو قسمیں ہیں ایک باعتبار ثبوت کے یہ تو صحابہ کرامؓ کے حق میں براہ راست خطاب ہونے کی وجہ سے منتفی ہے لیکن دوسری قسم دلالت کے اعتبار سے مخفی ہونا صحابہ کرامؓ کے حق میں بھی ثابت ہے، اس لئے وتر کے صحابہؓ کے حق میں فرض نہ ہونے سے ہمارے حق میں وتر کے وجوب کی نفی لازم نہیں ہے،

فہم حدیث کے کس درجہ علیا پر حضرت حکیم الامتؒ کا ذہن ثاقب پہنچتا ہے اس کی قدر اس شخص کو ہو سکتی ہے جس کو علم حدیث کی استدلال اور فنی مشکلات کے ساتھ سابقہ پڑتا ہو۔

ترمذی شریف کی روایت میں ہے انہا اختلعت علی عہد رسول صلی اللہ علیہ وسلم فامر النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان تعتدی بحیضتہ،

حالانکہ دوسری حدیث جس کو صاحب ہدایہ نے روایت کیا ہے اس میں ہے الخلع

تطلیقہ بائنہ اور بائن کی عدت تین حیض ہیں بحیضۃ کے ساتھ تطبیق کی کیا صورت ہے؟ اس کے جواب میں حضرت حکیم الامتؒ فرماتے ہیں حیضۃ میں تنوین افراد کی نہیں، جس پر ایک حیض کا عدت ہونا لازم آئے، پس معنی حدیث کے یہ ہیں کہ یہ امر فرمایا کہ حیض سے عدت پوری کرے نہ اشھر و وضع حمل سے، کیونکہ وہ حائضہ تھی، اور دوسرا مسلک یہ ہو سکتا ہے کہ ثلاثۃ قروء مطلقہ کی عدت منصوص قطعی ہے، پس تعارض کے وقت خبر واحد پر عمل متروک ہوگا۔ (امداد الفتاوی صـ۹۱ ج ۵)

پہلے دونوں حدیثوں کے مفہوم کی تعیین کرکے ان کے ظاہری تعارض کو رفع فرمایا پھر دوسرے مسلک کو تعارض کے وقت منصوص قطعی کی وجہ سے خبر واحد پر عمل متروک ہونا بیان فرمایا، اب جن لوگوں نے خبر واحد کو نص پر مقدم کرنے کا اصول اپنایا ہے اور ہر صورت میں اس کو استعمال کر رہے ہیں، یہ کتنی بڑی بے اصولی ہے، اول تو خبر واحد اور نص میں اگر مفہوم و معنی کے لحاظ سے تطبیق دی جا سکے تو پھر ترک عمل کی نوبت ہی نہیں آسکتی، اور اگر تطبیق کی کوئی صورت ہی نہیں ہے تو پھر نص کو خبر واحد پر ترجیح دیں گے، مگر شرط یہ ہے کہ وہ نص قطعی ہو ان امور کا لحاظ کئے بغیر یہ اصول عام زد زبان کرا دینا کہ خبر واحد پر قرآن کے مقابلہ میں عمل جائز نہیں، یہ بڑی علمی کوتاہی بلکہ بعض صورتوں میں دربارِ رسالتؐ میں گستاخی کے مترادف اور حدیث کی شرعی حیثیت سے متصادم ہے،

حدیث ذوالیدین کی تحقیق میں حکیم الامتؒ فرماتے ہیں کہ "یہ احتمال ہے کہ نماز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کلام مثل کلام مع اللہ کے ہے مفسد نماز نہ ہو، اسی طرح آپ کا کلام فرمانا بھی دوسری خصوصیات کی طرح آپ کی خصوصیت ہو یعنی نماز میں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کلام کرنا اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی کے ساتھ کلام کرنا مفسد نماز نہ ہو۔

اب اس پر اشکال یہ ہوتا ہے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیث میں ہے فقلنا یارسول اللہ کنا نسلم علیك فی الصلوٰۃ قال ان فی الصلوٰۃ شغلا اس سے کلام مع الرسول کی بھی نماز میں ممانعت ظاہر ہوتی ہے، اس کے حل میں حضرتؒ نے فرمایا کہ یہاں کلام مع الرسول فی الصلوٰۃ نہیں ہے کیونکہ عبداللہ بن مسعودؓ کلام کے وقت نماز میں نہیں تھے، بلکہ کلام رسول مع غیر الرسول تھا، اس لئے اشکال کی یہ تقریر صحیح نہیں، اب شبہ کی تقریر اس طرح ہونی چاہیئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام اگر مفسد صلوٰۃ تھا، تو حدیث ذوالیدین میں کیوں نہ تھا، اور اگر مفسد صلوٰۃ نہ تھا تو حدیث ابن مسعودؓ میں کیوں تھا؟

جواب اس کا یہ ہوسکتا ہے کہ کلام لاصلاح الصلوٰۃ کا غیر مفسد ہونا خصوصیات میں سے ہو اور حدیث ابن مسعودؓ میں یہ اصلاح صلوٰۃ کے لئے نہ ہوگا عجیب توجیہ ہے فللہ در حکیم الامت التھانویؒ

رفع شبہ از حدیث اور شرح حدیث جس میں ہے کہ ملک الموت کی آنکھ پھوڑ دی۔ حدیث میں ہے کہ ملک الموت جب حضرت موسٰی علیہ السلام کی روح قبض کرنے گئے تو انہوں نے ملک الموت کے ایک تھپیڑ مارا جس سے ان کی آنکھ پھوٹ گئی، اگر وہ اجل مسمیٰ پر آئے تھے تو وہ وقت کیسے ٹل گیا اور لایستاخرون الایہ کے خلاف ہوا، اور یہ پیام لانے والے کے اکرام کے خلاف ہے کہ اس کے تھپیڑ مار دیا،

یہ حدیث مسلم شریف باب فضائل موسٰی علیہ السلام میں ہے۔

حضرت موسٰی علیہ السلام نے ملک الموت کو چونکہ پہچانا نہیں تھا ممکن ہے کہ وہ بشر کی شکل میں آئے ہوں جس کو یہ سمجھا ہو کہ کوئی آدمی جو جان لینے کی دھمکی دیتا ہے، آپ نے مدافعت کے طور پر تھپیڑ مارا جس میں آنکھ پھوڑنے کا قصد نہ تھا، اور ملک الموت کو بھی اس کا علم نہ ہوا ہو کہ انہوں نے مجھے پہچانا نہیں، ورنہ کہہ دیتے کہ میں ملک الموت ہوں یا یہ سمجھا ہو کہ یہ اس کہنے سے بھی یقین نہ کریں گے، کیونکہ اس وقت تک حق تعالےٰ نے ان کے ملک الموت ہونے کا علم ضروری پیدا نہ کیا تھا، اس لئے بجائے ان سے گفتگو کرنے کے حق تعالیٰ سے عرض کیا،

آنکھ کے ماؤف ہونے پر بھی اشکال نہیں، ہو سکتا کیونکہ جس شکل میں تمثیل ہوتا ہے اس کے کل یا بعض خواص اس میں پیدا ہو جاتے ہیں اس وقت ان کی آنکھ میں اتنی ہی قوت تھی جس قدر بشر کی آنکھ میں ہوتی ہے، دوبارہ جو تشریف لائے یا تو ملکی شکل میں آئے ہوں یا بشری شکل میں ہوں، مگر حق تعالیٰ نے موسٰی علیہ السلام میں ان کے فرشتہ ہونے کا علم ضروری پیدا کر دیا ہو۔

اور بعض حالات میں انبیاء علیہم السلام کا فرشتوں کا نہ پہچاننا کچھ مستبعد نہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام کا ملائکہ کو نہ پہچاننا اور کھانا پیش کرنا یا اپنی قوم سے اندیشہ کرنا قرآن مجید میں مذکور ہے،

باقی اجل مسمّٰی سے تقدیم و تاخیر کچھ لازم نہیں آئی چنانچہ وقت موت کا وہی مقرر تھا جس میں وفات ہوگئی اگر اول بار ہی میں موسٰی علیہ السلام تیار ہو جاتے تب بھی اتنی دیر لگتی جتنی اب اس مراجعت میں لگی۔ رہا وعدہ تطویل حیات کا یہ تقدیر معلق کے طور پر ہے، جس کی ایک شق حق تعالیٰ کے علم میں مبرم ہوتی ہے، اور وہ تقدیر قضیہ شرطیہ ہوتا

ہے جس کے صدق کے لئے وقوع مقدم اور تالی کا ضروری نہیں، صرف دونوں میں علاقہ ملازمت کا کافی ہے، جیسے حدیث میں ہے لوکان بعدی نبیا لکان عمر، مگر معلوم الٰہی تھا کہ نہ مقدم واقع ہوگا نہ تالی۔

تم مہ میں اس پر تنبیہ فرمائی تھی کہ تطویل عمر کوئی مفید چیز نہیں، البتہ اگر دوام وخلود ہوتا تو سمجھا جاتا کہ مثل ملائکہ کے میرے لئے بھی قرب خاص موت پر موقوف نہیں تو اس کی طلب مفید تھی،

(۲) ملائکہ اگر اپنی صورت اصلیہ میں بھی ہوں تب بھی نصوص سے ان کا مادی ہونا ثابت ہے، گو وہ مادہ لطیف ہو، چنانچہ اسی حالت میں ان کا تحیز ان کی حرکت وسکون سب کچھ قطعیات سے ثابت ہے، پس جو اشکال تجرد کے ساتھ خاص ہے وہ تو مرتفع ہے، باقی جو اشکال لطافت مادہ صورت میں ہے، وہ بھی بظاہر اس وقت واقع ہے، جب ملک الموت اپنی اصلی شکل میں ہوں اور یہ ثابت نہیں کہ بلکہ احتمال ہے کہ بشری شکل میں تھے، اور اوپر مذکور ہوا ہے کہ جس شکل میں تمثل ہوتا ہے اس کے کل یا بعض خواص اس وقت ظاہر ہوتے ہیں اور نظر غائر کے بعد اس تقدیر پر بھی یہ اشکال واقع نہیں، کیونکہ یہ خاصیت کہ تفرق کے بعد فوراً التیام ہو جاتے لوازم ذات سے نہیں، محض جعل جاعل سے ہے، اگر بطور خرق عادت کے کسی حکمت سے کہ اس کی تعیین ہمارے ذمہ نہیں، یہ خاصیت تخلف ہو جاوے تو کوئی وجہ امتناع کی نہیں، جیسے بخاری ومسلم میں حدیث خضر میں مرفوعاً فاضطرب الحوت فی المکتل حتی خرج من المکتل فسقط فی البحر قال امسک اللہ عنہ جریۃ الماء حتی کان مثل الطاق، بلکہ خود قرآن مجید میں ہے فانفلق فکان

کل فرق کالطود العظیم، میں تفرق ماء کے بعد اس کا عدم التیام ایک وقت محدود تک مذکور ہے اور ملائکہ کے آنکھ، کان، وغیرہ کی نفی نہ کسی دلیل نقلی سے ثابت نہ دلیل عقلی سے بلکہ ظاہراً جب ان کے لئے سمع وبصر تکلم ثابت ہے تو ان جوارح کا ثبوت بھی غالب ہے اور اگر غالب بھی نہ ہو تو محتمل تو ضرور ہے، اور مانع کے لئے احتمال کافی ہے، غرض عقلی یا نقلی اشکال کو واقعہ پر کچھ نہ رہا، اب صرف استبعاد کا دعویٰ کیا جاسکتا ہے، سو اہل ملل ونحل اجمالاً اس سے بھی زیادہ مستبعدات کے قائل ہو جاتے ہیں، تو اس کا قائل ہونا بھی لازم ہے۔ (امداد الفتاویٰ جلد ۵ ص ۱۳۲)

حق تعالیٰ جل شانہٗ نے فہم حدیث اور مشکل سے مشکل شبہات کے حل کا عقلی اور نقلی طریقہ پر جو ملکہ حکیم الامت کو عطا فرمایا تھا، وہ حضرت کی حکیمانہ بصیرت اور منطقی استدلال کی جامعیت کا کھلا ثبوت ہے،

اشکال یہ تھا کہ حدیث میں نیند کے بعد اٹھ کر ہاتھ دھونے کا حکم ہے اور اس کا سبب جو بیان کیا گیا ہے وہ بنسبت ہاتھ کے محل استنجا وجہ وثوب میں زیادہ قوت وشدت کے ساتھ محتمل ہے اس لئے غسل غیر ید بہ نسبت ید کے زیادہ مقدم ہونا چاہیئے پھر غسل ید ہی کا حکم خصوصیت کے ساتھ کس مصلحت کی بنا پر ہے، علامہ ابن حجر عسقلانیؒ نے کئی توجیہات نقل کی ہیں لیکن ان سے تشفی نہیں ہوئی، اس کے جواب میں حضرت حکیم الامتؒ نے ارقام فرمایا،

حدیث مفصل یہ ہے اذا استیقظ احدکم من نومہ فلا یغمسن فی الاناء حتی یغسلها ثلاثا فانہ لا یدری این باتت یدہ (جمع الفوائد)

اس میں لا یدری الخ غسل ید کی علت نہیں فرمائی بلکہ لا یغمسن یدہ فی الاناء

کی علت ہے، اور غمس ید میں محتمل تھا نہ کہ محل استنجا وغیرہ میں، پس سوال ساقط ہوگیا،
واقعی بنار سوال ہی منہدم ہوگئی اور سوال بالکل منہدم ہوگیا" سبحان اللہ کتنے
محفوظ طریقہ سے اشکال کا حل فرمادیا گیا، اور اصل جڑ کا قلع قمع کردیا گیا، سائل نے
لا یدری کو غسل کی علت سمجھ کر اس کو غیر ید میں بھی جاری کرنا چاہا اور ید کے حکم غسل میں
غیر ید کے شامل نہ ہونے سے اشکال کیا حضرت حکیم الامتؒ نے سائل کے منشار غلطی
پر تنبیہ فرما کر اشکال کو حل فرمادیا کہ لا یدری علت غسل کی نہیں ہے یہ تو لا یغمسن کی علت
ہے اور اصول حدیث، الحدیث یفسر بعضہ بعضاً کی رو سے دوسری مفصل
حدیث کی روشنی میں اس کی شرح فرمادی، فہم حدیث کے ساتھ اصول حدیث اور
متعلقہ احادیث میں تطبیق کی جو رعایت حضرتؒ کے پیش نظر رہتی ہے، یہی حضرتؒ
کی محدثانہ اور فقیہانہ جامعیت ہے جو کم کسی شخصیت میں پائی جاتی ہے، کہ جس اشکال
کا حل علامہ ابن حجرؒ جیسے جبل علم کی کئی توجیہات سے ذہن نشین نہ ہو سکے اس کا حل
حکیم الامتؒ کے مختصر سے جملہ سے ذہن نشین ہو جائے، ذلك فضل الله يؤتيه
من يشاء۔

"حرم مدینہ کے بارہ میں حدیثوں میں تطبیق"

حدیث انی احرم ما بین لابتیها کما حرم ابراهیم مکة حنفیہ
کے نزدیک کیوں ہوئی ہے، صحیح مسلم میں حدیث تحریم مدینہ میں ہے لا یخبط
فیها شجرة الا لعلف، اور صحاح میں ہے یا ابا عمیر ما فعل النغیر، اور
خبط شجرة مطلقا و تعرض للصید کی حرمت لوازم تحریم بالمعنی المتعارف سے

ہے، پس انتفاء لازم مستلزم ہوگا انتفاء ملزوم کو اس سے معلوم ہوا کہ تحریم لغوی درجہ مذہب میں ہے، جیسا ابوداؤد میں موضع وجہ کے باب میں جو ناحیہ طائف میں ہے آیا ہے۔

صید وج وعضاہہ حرم محرم اللہ اور کو حدیث ابی عمر میں احتمال تقدم علی احادیث التحریم کا ہے مگر اول حدیث میں یہ احتمال بھی نہیں (امداد الفتاویٰ ج ۵)

فتاویٰ میں حدیث لاتشد الرحال الا الی ثلثہ مساجد مسجد الحرام والمسجد الاقصیٰ ومسجدی ھذا اھ کے ماتحت حضرت حکیم الامتؒ نے تحریر فرمایا کہ مقابر کی زیارت کو دور دراز سے جانا اس نہی میں داخل نہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ مسند احمد میں بروایت ابو سعید خدریؓ یہ حدیث ان الفاظ سے نقل کی ہے لاینبغی للمطی ان یشد رحالہ الی مسجد یبتغی فیہ الصلوۃ غیر المسجد الحرام والمسجد الاقصیٰ ومسجدی ھذا اھ یہ روایت تفسیر ہو سکتی ہے حدیث مشہور کی، اور اس کے معنی یہ ہیں بہ نیت تضاعف صلوۃ اور مسجد کی طرف سفر کرنا ممنوع ہے، دوسرے اگر تفسیر بھی نہ ہو تو کم از کم اس معنی کو محتمل تو ہے، اور قیود سے تعلق پر کوئی نص نہیں واذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال اور شراح کی شرح جس میں حجۃ اللہ البالغہ بھی داخل ہے کوئی نص نہیں بلکہ احد الوجوہ المحتملہ ہے، اگر البتہ سفر الی المقابر میں کوئی مفسدہ ہو تو اس کو اس مفسدہ کی بناء پر منع کیا جائے گا گو اس حدیث کا مدلول نہ ہو،

رہی طور پر جانے کی ممانعت اس کا محل یہ ہے کہ بہ نیت تقرب کے سفر کرے سو چونکہ اس میں دعویٰ ہے ایک امر غیر ثابت کا اس لئے غیر مشروع ہے اور وہ اس

حدیث نہی میں اس لئے داخل ہے کہ حدیث یہی ہے کہ جس طرح ان مساجد کی طرف سفر کیا جاتا ہے یعنی، بہ نیت تقرب کے اس پر دوسرے شاہد کو قیاس کرنا جائز نہیں للفارق، اور وہ فارق یہ ہے کہ ان مساجد میں نماز پڑھنے میں تو تضاعف ثواب موجود ہے، سو اس تضاعف کی تحصیل اگر بدون سفر ممکن نہ ہو سفر کی بھی اجازت ہوگی، بخلاف دوسرے مشاہد کے کہ وہاں کوئی دلیل ثواب کی نہیں، اس لئے وہاں اس نیت سے سفر کرنا اس غیر ثابت کا اعتقاد ہے فافترقا (امداد الفتاویٰ جلد ۵)

حدیث ابی داؤد واذا قرأ فانصتوا کی سند میں ایک بحث کا محاکمہ

سنن ابوداؤد کے باب التشہد ج ۱ ص۱۴۱ میں ہے حدثنا عاصم ابن النضر نا المعتمر قال سمعت ابی نا قتادہ عن ابی غلاب یحدثہ عن حطان بن عبد اللہ الرقاشی ھذا الحدیث زاد فاذا قرأ فانصتوا زید و عمرو کی اس میں یہ بحث ہے کہ قتادہ مدلس ہیں اور عنعنۂ مدلس بغیر تصریح سماع مقبول نہیں، زید کہتا ہے کہ یحدثہ کے لفظ سے سماع کی تصریح ہوگئی، گویا قتادہ نے یوں کہا ہے، حدثنی ابو غلاب، عمرو کہتا ہے کہ یہ محض غلط ہے اس لئے کہ قتادہ نے اپنے استاد الم غلاب سے بلفظ عن روایت کی ہے اور یحدث کا فاعل ابو غلاب ہے اور مفعول قتادہ، پس اس کا مطلب گویا یہ ہوا کہ حدثنا قتادہ عن ابی غلاب وھو حدث قتادہ عن حطان، اس سند سے بھی قتادہ کا سماع ابو غلاب سے نہیں ثابت ہوتا، دریافت طلب دو امر ہیں قول عمرو کا صحیح ہے یا نہیں؟

(۲) یحدثہ عن حطان بن عبداللہ الرقاشی قول کسی کا ہے، خاص قتادہ کا یا دوسرے کا؟ محاکمہ، حضرت حکیم الامتؒ نے ارشاد فرمایا کہ ظاہراً تو قول عمرو کا صحیح بلکہ متعین معلوم ہوتا ہے، کیونکہ حدث قتادہ اور ابن المسیب حدثہ میں کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا، جبکہ قائل دوسرا نیچے کا راوی ہو، اور اگر زید کے نزدیک یحدثہ فاعل اور ضمیر تا مفعول میں کچھ اور احتمال ہی ہے تو اس کو بیان کرے، اور بعد بیان لامحالہ اس میں بھی یہ احتمال عمرو کا ہو گا تب سماع محتمل رہا اور احتمال رہتے ہوئے ثبوت کہاں رہا، اور یحدثہ ظاہراً بے تکلف معتمر کے باپ سلمان تیمی کا قول معلوم ہوتا ہے۔

(امداد ج ۵)

ایک حدیث کے رجال سند اور متن کی تحقیق

جلاء الافہام فی الصلوٰۃ والسلام علی خیر الانام میں ہے

حدثنا یحیی بن ایوب العلاف حدثنا سعید بن ابی مریم حدثنا یحیی بن ایوب عن خالد بن زید عن سعید بن ہلال عن ابی الدرداءؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکثروا الصلوٰۃ علی یوم الجمعۃ فانہ یوم مشہود تشہدہ الملائکۃ لیس من عبد یصلی علی الا بلغنی صوتہ حیث کان، سے سماع نبوی درود بلا واسطہ کے اثبات کے جواب میں

حکیم الامتؒ ارقام فرماتے ہیں، اس سند میں ایک راوی یحیی بن ایوب بلا نسب مذکور ہیں جو کئی راویوں کا نام ہے جن میں سے ایک غافقی ہیں جن کے باب میں ربما اخطاء لکھا ہے، یہاں احتمال ہے کہ وہ ہوں، دوسرے ایک راوی خالد

بن زید ہیں یہ بھی غیر منسوب ہیں، اس نام کے رواۃ میں سے ایک کی عادت ارسال کی ہے اور یہاں عنعنہ سے ہے، جس میں راوی کے متروک ہونے کا اور اس متروک کے غیر ثقہ ہونے کا احتمال ہے، تیسرے ایک راوی سعید بن ابی ہلال ہیں جن کو ابن حزم نے ضعیف اور امام احمدؒ نے مختلط کیا ہے وھذا کلہ من التقریب، پھر کئی جگہ اس میں عنعنہ ہے جس کے حکم بالاتصال کے لئے ثبوت تلاقی کی حاجت ہے۔

سند پر کلام فرمانے کے بعد پھر حکیم الامتؒ نے متن حدیث پر کلام فرما کر ثابت فرمایا کہ اس کا متن ان احادیث صحیحہ کے خلاف ہے، جو صریح ہیں عدم سماع عن بعید میں، اور ظاہر ہے کہ جلاء الافہام ان کتب کے برابر قوت میں نہیں ہو سکتی، لہٰذا قوی کو ترجیح ہوگی،

نیز جمع بین الاحادیث کی ضرورت سے بلغنی صوتہ کی یہ توجیہ ہوگی کہ صوت سے مراد جملہ صوتیہ ہے کیونکہ کلام اور کلمہ قسم ہے لفظی اور وہ قسم ہے صوت کی، پس درود شریف بھی ایک صوت ہے، اور بلاغ عام ہے، بلاغ بالواسطہ اور بلاواسطہ کو، اور بقرینہ دوسری احادیث کے بلاغ بالواسطہ متعین ہے، پس معنی بلغنی صوتہ کے ہوں گے بلغنی صوتہ بواسطۃ الملائکہ (امداد الفتاوٰی ج ۵)

سند اور متن حدیث پر محدثانہ انداز میں عجیب تحقیق اور روایات میں تطبیق فرمائی گئی، جو ہر طرح سے اصول حدیث اور قواعد عربیت کے موافق ہے،

القاء ربانی

حضرت حکیم الامتؒ فرماتے ہیں کہ بلا توسط فکر قلب پر وارد ہوا کہ اصل حدیث

صوتہ نہیں بلکہ صلوتہ ہے کاتب کی غلطی سے لام رہ گیا ہے، ۱۹ ذیقعدہ (امداد ج ۵)
چنانچہ نیل الاوطار میں بحوالہ طبرانی یہ الفاظ روایت کئے گئے ہیں لیس من عبد
یصلی علی الا بلغنی صلوته (ج ۵ ص۲۱۱)

"دو حدیثوں کی تخریج" سیر اوزاعی کا جو رد امام ابو یوسفؒ نے لکھا ہے، ایک محقق
عالم نے جب اس کو مصر سے شائع کرانا چاہا اور اس پر کچھ فوائد لکھنے کا بھی خیال ہوا،
تو انہوں نے حضرت حکیم الامت تھانویؒ سے استفادہ کے لئے رجوع کیا اور دو
حدیثوں کی تخریج جس میں وہ مشقت برداشت کر چکے تھے، اور ان کو وہ نہیں مل رہی
تھیں، ان کے بارہ میں استفسار کیا، پہلی حدیث یہ ہے۔

حدثنا ابن ابی حزیمة عن ابی جعفر عن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ
علیه وسلم انه اما الیهود فشابهم فحدثوه حتی کذبوا علی عیسی
علیه الصلوٰۃ والسلام فصعه النبی فخطب الناس فقال ان الحدیث
سیفشو علی فما اتاکم عن موافق القرآن فهو عن اما اتاکم عنی مخالف
القر فلیس عنی"

دوسری معلق ہے حدثنا الثقفة عن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه
وسلم انه قال فورنه الذی مات فیه لا احرم ما حرم القران واللّٰہ لا
یمسکون علی شی فاجعل القرآن والسنة المعروفة لك اماما قائداه۔
حکیم الامت تھانویؒ نے حدیث اور اسماء الرجال کی کتابوں تذکرۃ اللالی
المصنوعه نیز مجمع الزوائد اور لسان المیزان وغیرہ سے ان دونوں حدیثوں کی تخریج
اور فنی طور پر ان کے راویوں کی حیثیت دکھلا کر ان کے بارہ میں محدثانہ اور منصفانہ

یہ فیصلہ فرمایا کہ، ان احادیث پر حکم بالوضع دشوار ہے، غایت مافی الباب حکم ضعف کیا جاسکتا ہے؛

پھر جن حضرات نے اس پر اس وجہ سے حکم بالوضع کیا ہے کہ یہ اس حدیث صحیح سے معارض ہے جس کو احمد و ابوداؤد و ترمذی وغیرہ حضرت ابورافع و مقداد بن معدیکرب و عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہم کے طریق سے روایت کیا ہے لاالفین احدکم متکئا علی اریکته یاتیه الامر من امری مما امرت به او نهیت عنه فیقول لاادری ما وجدنا فی کتاب اللہ اتبعناہ الحدیث۔

اس کا جواب فرمایا کہ درحقیقت دونوں میں تعارض نہیں، کیونکہ اس میں تو ان لوگوں پر وعید ہے "جو صرف قرآن کو واجب العمل سمجھتے ہیں اور حدیث نبوی سے اعراض کرتے ہیں، اور احادیث مذکورہ سابقہ میں حدیث نبوی کو واجب الاتباع جاننے والوں کے لئے صحت حدیث کا معیار موافقت قرآن کو تبلایا گیا ہے۔

لیکن موافقت قرآن کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حدیث کا مضمون بعینہ یا بلفظہ قرآن میں مذکور ہوں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان اصول کلیہ کے موافق ہو جو احکام شرعیہ کے لئے قرآن نے بتلائے ہیں۔ پھر اس کی دلیل حدیث احمد و ابویعلی اور بزار سے بیان فرما کر، عزیزی شرح جامع الصغیر للسیوطی سے اس کے رجال کی تصحیح نقل فرمائی،

عام طور پر لوگ اس حدیث کو پیش کر کے احادیث کا انکار کر دیتے ہیں، حکیم الامت نے اس کے متعلق فرمایا ہے کہ، یہ خطاب ایسے علماء کے لئے ہے جن کا ایمان کامل اور ان کے قلوب علم و تقوی سے منور ہیں، ہر کس و ناکس کا

یہ کام اور مرتبہ نہیں ہے کہ وہ جس حدیث پر چاہے حکم بالوضع لگادے۔

اس کی دلیل وہ حدیث ہے جس کو امام ابویوسفؒ نے معلقاً روایت کیا ہے۔

فاجعل القرآن والسنۃ المعروفۃ لك اماما قائدا، جس کا حاصل یہ ہوا کہ اخبار احاد کو اسی وقت قبول کیا جائے جب کہ وہ قرآن اور سنن معروفہ کے موافق ہوں مخالف نہ ہوں، اس سے صاف معلوم ہوا کہ موافقت قرآن سے مراد موافقت قواعد واصول شرعیہ ہے، موافقت الفاظ قرآن مراد نہیں، ورنہ سنت معروفہ کا ذکر اس کے ساتھ نہ کیا جاتا،

اس کے بعد اپنی تائید میں شرح مشکل الآثار کی بحث کا خلاصہ اس مسئلہ سے متعلق پیش فرمایا ہے (امداد ج ۵)

حقیقت احسان حدیث ان تعبد اللہ کی تشریح

مشہور طریق حضور قلب کا وہ ہے جو حدیث ان تعبد اللہ کانك تراہ الخ لوگوں نے سمجھا ہے یعنی عبادت کرتے وقت یہ خیال کرے کہ میں خدا کو دیکھ رہا ہوں اور اگر یہ نہ ہو تو یہ سمجھے کہ خدا مجھ کو دیکھ رہا ہے پس گویا دو طریق متقابل ہیں لیکن میرے نزدیک یہ صحیح نہیں، اوّل تو لفظوں کے بھی خلاف ہے کیونکہ سوال حقیقت احسان سے ہے نہ طریق تحصیل احسان سے چنانچہ جو جواب دیا گیا ہے اس میں احسان کی حقیقت بتلائی گئی ہے، نہ کہ طریق چنانچہ اس کے قبل بھی اسلام وایمان کی حقیقت ہی سے سوال وجواب کا ہونا اس کا اور بھی مؤید ہے۔

دوسرے تجربہ بھی شاہد ہے کہ تصور رویت حق حضور قلب کے لئے عموماً

اور خصوصاً مبتدی کے لئے بالکل ناکافی ہے، کیونکہ طبیعت پریشان ہوتی ہے کہ خدا کو کیسا سمجھوں اور ایک صورت سمجھ میں آتی ہے پھر اس کا رفع کرتا ہے اسی طرح پریشانی میں مبتلا رہتا ہے اور ظاہر میں جس چیز کو کبھی دیکھا نہیں تو اس کا تصور کیسے جم سکتا ہے؟ البتہ منتہی کو خدا کے دیکھنے کا تصور بے کیف ذوقی طور پر میسّر ہو جاتا ہے، اور طریقہ عام ہونا چاہیئے، علاوہ بریں اگر مضاف محذوف مان کر (یعنی طریقہ ان الخ) سے طریق ہی قرار دیا جائے، تو تقابل ٹھیک نہیں ہوتا، کیونکہ کانک تراہ کے بعد یہ کہا ہے کہ اگر تم اسے دیکھتے نہ ہو تو بیشک وہ تمہیں دیکھتا ہے، سو یہ مضمون جملہ اولیٰ کے ساتھ جمع ہو رہا ہے، یہ نہیں کہا کہ اگر تم ایسی عبادت نہ کر سکو کہ گویا اسے دیکھتے ہو (تو یہ سمجھو) کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے، بہر حال یہ طریق الفاظ حدیث اور تجربہ دونوں کے خلاف ہے، پس اس حدیث میں حقیقت احسان کا بیان ہے طریق مذکور نہیں،

رہا حدیث کے معنی کیا ہیں تو اس کا سمجھنا ایک مقدمہ پر موقوف ہے یہ تو ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص کام کر رہا ہو اور اسے معلوم ہو جائے کہ اس وقت ہمارا مالک اور حاکم دیکھ رہا ہے تو وہ شخص کام بالکل ٹھیک کرنے لگے گا، اور احتیاط رکھے گا کہ کوئی خرابی نہ ہونے پائے، اور اگر کہیں حاکم کو دیکھ لیا تب تو کچھ پوچھنا ہی نہیں ہے، اپنی انتہائی کوشش صرف کر کے کام کو خوب اچھی طرح سے انجام دے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ حاکم کی نظر کے سامنے ہونے کے وقت کام خوب عمدگی سے ہوتا ہے، تو مطلب اس حدیث کا یہ ہوا، کہ خدا کی ایسے حسن و خوبی سے عبادت کرو گویا کہ تم اس کو دیکھ رہے ہو (یعنی اگر فرضاً تم خدا کو دیکھتے تو سوچو کہ اس وقت تمہاری عبادت کس طرح کی ہوتی، اب بھی اسی حالت کے مشابہ تمہاری عبادت ہونا چاہیئے) اس لئے

کہ اگر تم اسے نہ بھی دیکھتے ہو تو کیا ہوا وہ تو تمہیں دیکھ رہا ہے۔

(یہ اس لئے بڑھایا کہ پہلے جملہ سے یہ سوال پیدا ہو سکتا تھا کہ جب واقع میں ہم نہیں دیکھتے تو اس طرح کی تحسین عبادت کس طرح ممکن ہے، اس کا جواب اس سے مفہوم ہو گیا کہ دیکھنے والے کی سی تحسین کے لئے حق تعالیٰ کی رویت کا تعلق بھی کافی ہے) غرض فان لم تکن تراہ میں فائے تعقیب نہ لی جائے فائے علت قرار دی جائے۔ (مواعظ اشرفیہ ص۲۹)

اس حدیث کی مزید توضیح و تشریح حضرت حکیم الامتؒ کے ارشاد ذیل سے ہوتی ہے۔ "اگر یہ مطلب ہوتا کہ عبارت یوں ہوتی فان لم تعبد کانک تراہ فاعبد فانہ یراک کیونکہ مرتبہ اولی ان تعبد اللہ کانک تراہ میں تشبیہ ہے اس کے بعد مرتبہ ثانیہ فان لم تکن تراہ میں

اسی تشبیہ کی نفی ہوگی اور معنی یہ ہوں گے فان لم تعبد کانک تراہ اور یہ نفی صحیح نہیں کیونکہ بزعم مفسرین اس تشبیہ کا مدار تو تصور و خیال پر ہے، کہ ایسی عبادت کرو، گویا تم خدا کو دیکھ رہے ہو، اور تصور میں بڑی وسعت ہے اور ایسا فرض بہت سہل ہے تو اس کے نفی کی کیا ضرورت ہے؟ لہٰذا فان لم تکن تراہ کو نفی پر محمول نہیں کیا جا سکتا، اور اس صورت میں یہ دوسرا مرتبہ پہلے مرتبہ کے مقابل نہیں اس لئے اس کے یہ معنی بیان کرنا کہ اگر تم حالت مشابہ رویت الٰہی پر پر قادر نہ ہو تو بھی تصور کرو کہ حق تعالیٰ تم کو دیکھ رہے ہیں، الفاظ سے نہایت بعید ہے، پس صحیح یہ ہے کہ حدیث میں نہ مراقبہ کی تعلیم ہے نہ مراقبے کی دو درجہ مذکور ہیں، بلکہ جملہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک پہلے جملہ کی علت ہے جس کی تقریر آتی ہے، اور فا تعلیلیہ کلام عرب میں بکثرت مستعمل ہے۔ (اشرف البیان)

حکیم الامتؒ کی تشریح سے واضح ہوگیا کہ اس حدیث میں احسان کی حقیقت بتلائی گئی ہے جیسا کہ ایمان اور اسلام کی حقیقت کی وضاحت فرمائی گئی ہے، اور بظاہر نظر اس میں مراقبہ کی تعلیم کا جو شبہ ہوگیا ہے وہ صحیح نہیں ہے، حکیم الامتؒ کی یہ عارفانہ تقریر قواعد عقلیہ اور عادیہ کے کس قدر موافق ہے ناظرین اس کو خود محسوس کریں گے، اب ایک اور نفیس وسلیس علمی تحریر سے بھی استفادہ فرمائیں۔

"یہ مطلب نہیں کہ تم یہ تصور کرو کہ میں خدا کو دیکھتا ہوں تاکہ یہ اشکالات لازم آئیں، اگر یہ مطلب ہوتا تو عبارت حدیث کی یوں ہوتی ان تعبد اللہ وتقدر انک تراہ مگر عبارت یہ ہے ان تعبد اللہ کانک تراہ اور کان تشبیہ کے لئے ہوتا ہے تو معنی یہ ہوئے ان تعبد اللہ حال کونک مشابھا بانک تراہ، یعنی گو تم خدا تعالی کو دیکھ نہیں سکتے، اگر فرض کیا جاوے کہ تم خدا تعالی کو واقع میں دیکھتے تو اس وقت عبادت کیسی کرتے؟ ظاہر ہے کہ نہایت مکمل عبادت کرتے اور عبادت کے پورے حق ادا کرتے جیسا کہ حاکم کو دیکھنے کا طبعی مقتضا ہے، بس اب نہ دیکھنے کی حالت میں بھی ایسی حالت مذکورہ کے مشابہ عبادت کرو۔

اب ایک اشکال تھا کہ جب خدا کو ہم دیکھتے نہیں تو دیکھنے کے مشابہ عبادت کیسے ہوسکتی ہے؟ وہ تو مخصوص اسی حالت کے ساتھ ہے، آگے اس حکم کی ایک علت بیان فرما کر جواب دے دیا کہ ایسی مکمل عبادت صرف حاکم کو دیکھنے ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ اس حالت کو اور ایک دوسری حالت کو دونوں کو عام ہے اور دوسری حالت یہ ہے کہ حاکم تم کو دیکھتا ہو تو بھی ایسی ہی عبادت ہوگی، چنانچہ مشاہدہ شاہد ہے کہ اگر حاکم کسی کام کا حکم دے اور ایسی جگہ کھڑا ہو کہ کام کرنے والا تو اس کو نہ دیکھے اور وہ اس

کو دیکھے اور اس دیکھنے کی اس کو خبر بھی ہو تب بھی ایسا ہی کام کرے گا اس جواب کی طرف اشارہ کرنے کے لئے فائے علت کے ساتھ فرمایا فان لم تکن تراہ فانہ یراک، یعنی ایسی عبادت کا حکم جو کہ مشابہ اس حالت کے ہے کہ حاکم کو دیکھتے ہو، اس لئے کہا گیا کہ اگر تم اس کو نہیں دیکھتے، تو وہ تم کو دیکھ رہا ہے، اور تکمیل عمل و ادائے حقوق میں اس کا بھی وہی اثر ہے جو اس پہلی حالت کا ہے۔

آگے خلوص و احسان جس کا ذکر حدیث میں ہے دونوں کا ہم معنی ہونا ثابت فرماتے ہیں، اسی طرح سوال میں جو خلوص کی تفسیر کی ہے، وہ بھی صورت اولی ہے، کسی قدر عنوان کے اختلاف سے اور اصل معنوں احسان ہے، جو مرادف ہے اخلاص کا، یعنی نیکو کردن عبادت، کیونکہ اخلاص بھی نیکو کردن اور کامل گزاردن ہے"

(تربیت السالک ص۳۸ و ص۳۹ جلد ۳)

احسان کے معنی "نیکو کردن عبادت" کی تعبیر میں لفظی حسن کی بھی کس قدر رعایت ہے وہ اہل معانی اور ارباب بصیرت کے دیکھنے اور سمجھنے کی چیز ہے، مطلب یہ ہے کہ عبادت کو حسین اور خوبصورت بنانا ہی احسان ہے، اور اخلاص کے معنی بھی خالص کرنے کے ہیں، عبادت کو غیر عبادت سے خالص کرنا ہی اخلاص ہوا اور اسی کا دوسرا نام احسان ہے جس کی اس حدیث میں حقیقت بتلائی گئی ہے،

حکیم الامتؒ کے افادات تقریری اور تحریری سے بحمداللہ تمام اشکالات و شبہات کا ازالہ ہو گیا، اور حدیث کی جو عجیب و غریب وضاحت و تشریح کی ہے وہ اہل علم و نظر کے قدر کرنے کی چیز ہے،

"منتخب احادیث کے مجموعے"

درس و تدریس، تصنیف و تالیف، فتاویٰ اور سالکین کی تربیت وغیرہ کے ضمن میں احادیث کی جو خدمت حکیم الامت تھانویؒ نے انجام دی ہے ان کو اگر جمع کیا جائے تو ان کا مجموعہ سینکڑوں صفحات پر مشتمل تیار ہو سکتا ہے اور مستقل طور پر جو کتابیں اور رسائل اس موضوع پر آپ کے قلم سے نکلی ہیں ان میں سے اکثر و بیشتر کا تعارف اس مقالہ میں آچکا ہے، ان کے علاوہ اس موضوع سے متعلق کئی اور ایسے رسائل اور کتب ہیں، جن کے ذکر سے مقالہ کے طویل ہونے کا اندیشہ ہے، اس لئے اسی قدر پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

حکیم الامتؒ کے مواعظ میں بھی سینکڑوں نہیں ہزاروں احادیث کی تشریح فرما کر ان کی اُمت کو تبلیغ کی گئی ہے، مواعظ کے ہزاروں صفحات حسب موقع احادیث کے بیان و تشریح سے معمور ہیں، ان کو اگر یکجا جمع کیا جائے تو تشریح احادیث کا بہت بڑا ذخیرہ تیار ہو سکتا ہے۔

حضرت حکیم الامتؒ کے سینکڑوں مواعظ کی تعداد ہزاروں صفحات پر مشتمل ہونے کے باوجود ان کو بھی قلم بند کر کے کتابی صورت دے دی گئی ہے، اور وہ حسب موقع طبع ہو کر اُمت کی اصلاح و رہنمائی کا کام دے رہے ہیں۔ امت مسلمہ کی چودہ سو سال سے زائد کی تاریخ میں ایک مثال بھی ایسی معلوم نہیں کہ کسی شخصیت کے اس کثرت سے مواعظ کتابی شکل میں اُمت کے پاس محفوظ و موجود ہوں، حکیم الامتؒ کے مواعظ عام مقررانہ طرز کے نہیں ہوتے تھے بلکہ وہ کسی آیت قرآنی یا حدیث نبویؐ کی

تفسیر وتشریح ہوتی تھی، عام فہم تفسیر سے استنباط اور آیات واحادیث کے عجیب وغریب نکات اور حلِ مشکلات قرآنیہ اور حدیثیہ کا خزانہ ہوتے تھے، جہاں وہ خواص وعوام کے لئے موعظت ونصیحت اور اصلاح ظاہر وباطن کا ذریعہ بنتے تھے، اور ہزارہا بندگانِ خدا نے ان کے ذریعہ اپنی ظاہری اور باطنی اصلاح وتربیت حاصل کی ہے، وہاں ہی وہ قرآن وحدیث کی تفسیر وتشریح اور الہامی تحقیقات عجیبہ کا بہت ہی نادر علمی ذخیرہ بھی ہوتا تھا، جن کو دورانِ وعظ قلم بند کر لیا جاتا تھا، پھر حضرت والا کی نظرِ اصلاحی کے بعد اس کو شائع کیا جاتا تھا، ان کی اشاعت کا سلسلہ اب بھی ماہنامہ رسالہ الابقاء کے ذریعہ قائم اور جاری ہے، اس طرح ان مواعظ کا بھی حضرت حکیم الامتؒ کے مستقل رسائل کی حیثیت سے آپ کی تصانیف تفسیر قرآن اور تشریح احادیث کی خدمات میں شمار ہوتا ہے۔

بعض حضرات نے ان مواعظ سے قرآن وحدیث کے علوم کو علیحدہ علیحدہ منتخب کرنے کی خدمت انجام دی ہے اور مجموعے تیار کئے ہیں، جو اگرچہ مختصر ہی ہیں مگر بطور نمونہ کے ایک اچھا قدم اُٹھایا گیا ہے،

سب سے پہلا مجموعہ، تفسیر المواعظ کے نام سے حضرت مولانا حکیم محمد مصطفےٰ صاحبؒ نے تیار کیا اس مجموعہ میں ان آیات کو جمع کیا گیا ہے جو وعظ کا عمود ہیں اور ان کی تفسیر وتشریح وعظ میں فرمائی گئی ہے۔

دوسرا مجموعہ، "اشرف البیان فی علوم الحدیث والقرآن" کے نام سے جناب منشی علی محمد صاحب مرحوم خلیفہ حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے مرتب کیا تھا، وہ حضرت حکیم الامتؒ کے زمانۂ حیات میں ہی شائع ہو گیا تھا،

اس مجموعے میں قرآنِ کریم کے علوم کے ساتھ احادیث سے متعلق تحقیقات کو بھی حکیم الامتؒ کے مواعظ سے منتخب کرکے جمع کردیا گیا ہے، اس میں ایک سو سے زیادہ احادیث کی عجیب و غریب تشریح اور نہایت ہی لطیف نکات کو جمع کردیا گیا ہے اور بظاہر متعارض احادیث کا حل تو ایسا فرمایا گیا ہے کہ اس کو بیان سے نہیں سمجھایا جاسکتا، وہ تو بس دیکھنے اور پڑھنے سے ہی تعلق رکھتا ہے۔

تیسرا مجموعہ: "اشرف الکلام فی احادیث خیرالانامؐ" کے نام سے صوفی محمد اقبال صاحب قریشی ہارون آباد ضلع بہاولنگر مجاز بیعت حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے تیار کیا ہے، حکیم الامتؒ کے مواعظ و ملفوظات سے تقریباً ۱۲۰ احادیثِ مبارکہ کی شرح جمع کرکے شائع کرایا ہے۔

اب اس عجالہ نافعہ اور مقالہ نادرہ کو حضرت حکیم الامتؒ کی بزبانِ عربی تین حدیثوں کے متعلق تحقیق کو نقل کرکے ختم کیا جاتا ہے، یہ تحقیق اہلِ علم کے لئے فنی طور پر قابلِ دید ہے، معنی احادیث کی تعیین اور متعارض احادیث کے درمیان تطبیق عجیب انداز سے فرمائی گئی ہے، جو اہلِ علم و نظر کے لئے قابلِ قدر ہے۔

غریبۃ در تحقیق احادیث اشتراط حج نفسہ للحج عن غیرہ وحدیث المصراۃ وحدیث خیار المجلس

سوال۔ من العبد المفتاق الی حضرۃ الشیخ الاکمل الاشرف الاجل مد اللہ ظلالہ۔

امّا بعد فھذا العبد منذ زمان قد قصر عن التحریر لیس ھذا الامر من قصور الباع علی انی قد کان عرض لی الحمی

نبافض فحالت بینی و بین ما اشتہی وبحمد اللہ قد براء السقم فشکر اللہ
علی اسباغ النعم۔ وفی تلک الایام لو استطیع علی ضعفی فیا لهف نفسی
ثم الی اکلفجنابکم لحل شبہات قد عرضت لی فی اثناء التدریس للصحیح
للامام محمد بن اسمعیل البخاری ولو اقدر علی جواب شاف من عندی
فالتجأت الی سندی ووسیلة النجاح فی یومی وغدی۔ انا معاشر الحنفیة
نستدل علی جواز الحج عن الغیر وان لم یحج عن نفسه بحدیث الخثعمیة
المرویة فی البخاری المطبوع فی المطبع المصطفائی ص۲۰۵، ۲۲۹، ۲۵۰
ولقول الحدیث مطلق وایضا لم یسئلها صلی اللہ علیہ وسلم احججت
ام لا۔ فیدل علی جواز حج البدل وان لم یحج عن نفسه لکن فی
هذا شئ لان سوال الخثعمیة کان غداة جمع کما وقع فی
الصحیح ص۲۲۶، ۲۵۰ استنباطاً وفی سنن النسائی صریحا بهذا اللفظ
ان امرأة من خثعم سألت النبی صلی اللہ علیہ وسلم غداة جمع
الحدیث باب الحج عن الحی الذی لا یستمسک علی الرحل۔ فلا یمکن
ان یکون المعنی افأحج عنه العام لان الوقت قد مضی بل المعنی
افاحج عنه عاما آخر ولما کان الغالب من حالها انها قد قضت
الحج ثم سألت فلهذا لم یتعرض النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن
سؤالها بانها حجت ام لا وقال نعم ای یجوز لک اداء فریضة الحج عن
ابیک ولما کان الملبی عن شبرمة لم یحج من قبل قطعا اذ کان
ذلک عام حجة الوداع فلما قال لبیک عن شبرمة سأله من شبرمة

فلما قال هو اخی فلا جرم نہی النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن ذلک وامرہ بقضاء الوطر عن نفسہ ثم عن شبرمۃ فحدیث الخثعمیۃ ظنی انہ مقید لا مطلق وعدم الکشف لما مر فلعل مبنی تلک المسئلۃ کون وقت الحج ظرفاً موسعاً ہو العمر لا ہذا الحدیث وامثالہ فالمرجو ان تفید ونی بجواب شاف من عندکم اذ الشراح لم یأتوا بشئ یغنی ولو لیفتح لی مایعنی۔

الجواب نعم ہذا الحدیث محتمل فلا یصح للاستدلال لکن لنا فی اصل المسئلۃ دلیل آخر اقوٰی وہو سوال الجہنیۃ وجوابہ صلی اللہ علیہ وسلم لہا بقولہ ارأیت لو کان علی امک دین الحدیث وہو مذکور فی صحیح البخاری ص۲۵۰ من المجلد الاول فلما الحق صلی اللہ علیہ وسلم الحج عن الغیر بقضاء الدین ولم یشترط فی قضاء الدین تقدیم دین نفسہ علی دین غیرہ فکذا الحج۔ واما الاستدلال بحدیث شبرمۃ فلیس بقوی لاحتمالہ الکراہۃ وقد قال فقہاءنا بہ واللہ اعلم۔ وما ورد فی بعض الروایات قولہ علیہ السلام ہذہ عنک فیحمل علی ما فی بعض روایات اخری حج عن نفسک ثم ہو موقوف عند بعضہم ورجحہ کثیر وہذا کلہ فی التلخیص الحبیر ج۱ ص۲۰۳ مطبع انصاری۔ ۱۰ ربیع الآخر ۱۳۳۲ھ

سوال: انا ندعی ان حدیث المصراۃ مخالف للقیاس الصحیح من کل وجہ ومثل ہذا اذا روی غیر الفقیہ یرد وبنوا علیہ ما

بنوالكن هذا الحديث قد رواه صاحب الصحيح فی ص۲۸۸ عن ابن مسعودؓ موقوفاً ولما كان هذا الحكم غیر مدرك بالرأی كما تدعی فالموقوف له حكم الرفع ایضاً والراوی لهذا فقیه فلا بد ان یترك القیاس لان الراوی فقیه فما المناص عن هذا۔

الجواب ما قالوا فی حدیث المصراة لم یلصق بقلبی قط وانما الذی اری فیه حمل هذا الحدیث علی ما اذا اشترط الخیار فی العقد وقرینة هذا الحمل ما ورد فی روایة من اشتری مصراة فهو منها بالخیار ثلاثة ایام ان شاء امسكها وان شاء ردها ومعها صاعاً من تمر لا سمراء رواه الجماعة الا البخاری كذا فی نیل الاوطار ج ۵ ص۲۷۸ واما تخصیص الصاع من التمر فمحمول علی الصلح و المشورة فلم یخالف القیاس۔ ۱۰ ربیع الآخر ۱۳۳۲ھ

سوال روی البخاری فی ص۲۸۴ ج ا حدثنا قتیبة ثنا لیث عن نافع عن ابن عمر عن رسول الله صلی الله علیه وسلم انه قال اذا تبایع الرجلان فكل واحد منهما بالخیار ما لم یتفرقا وكانا جمیعاً او یخیر احدهما الاخر (فان خیر احدهما الاخر (نسائی) فتبایعا علی ذلك فقد وجب البیع وان تفرقا بعد ان تبایعا ولم یترك واحد منهما البیع فقد وجب البیع ص۸۸ كتاب البیوع وهذه الروایة رواها النسائی بعین هذا السند ومتنه سوی انه زاد لفظ الشرط ثم روی البخاری فی تلك الصفحة عن عبد الله بن عمر قال بعت من امیر المومنین عثمان الی قوله

فلما تبايعنا رجعت على عقبي حتى خرجت من بيته خشية ان يراده في البيع وكانت السنة ان المتبايعين بالخيار حتى يتفرقا الخ ففي هاتين الروايتين المرفوعتين حقيقة وحكماً بيان واضح لثبوت خيار المجلس وقاطع لكل تاويل ولا يعارضه ما رواه النسائي ص۱۸۸ عن عمرو بن شعيب عن ابيه عن جده ان النبي صلى الله عليه وسلم قال المتبايعان بالخيار ما لم يتفرقا الا ان يكون صفقة خيار ولا يحل له ان يفارق صاحبه خشية ان يستقيل اه لان هذا متكلم فيه ولو سلم فهو لا يعارض الصحيح ولو سلم فهي اشارة والاولى كالصريح او صريح والاشارة لا تفوق الصراحة واما قول ابن عمر ما ادركت الصفقة حيا مجموعاً فهو من المبتاع رواه البخاري ص۲۸۷ فهذا وان احتج به الطحاوي فهو غير تام وغير مفيد لنا لانا لا نقول بمفاده الهلاك قبل القبض عندنا يوجب فسخ البيع وكون الهالك من مال البائع لا من المبتاع فما لا نقول به كيف نحتج به فلا يفيدنا الا اثبات المخالفة بين قوله وفعله فهما وان تعارضا بقيت روايته سالمة بل ينبغي ان يؤول هذا الاخير ويراد بالصفقة الصفقة التامة باعتبار جميع شرائط التفرق بالابدان فمعنى هذا القول ما ادركت الصفقة بعد التفرق بالبدن حيا مجموعا فهو من المبتاع فبمجرد قول النخعي رد الحديث الصحيح مرفوعاً وموقوفاً الطبع وليستنكره ولا نويد من جنابكم ذكر ما رواه الشارح والاحناف اذ هو رد الحديث الصريح الصحيح

لاغیر بل معاملة مع عثمان تدل علی ان تلک السنة کانت مستمرة عندھم۔

الجواب۔ ھذہ الشبھة من شبھاتی القدیمة ولاشک فی ان ظاھر الاحادیث ھو ثبوت خیار المجلس لکن لا یصح الحکم بکون المذھب الحنفی مخالفا للاحادیث یقیناً مادامت الاحادیث تحتمل التاویل و لوکان فیہ شیٔ من البعد ولا یسلم احد من اھل المذاھب المتبوعة عن ھذہ التاویلات کما حمل بعض الشافعیة قولہ علیہ السلام فاقرأ ما تیسر معک من القرآن علی الفاتحة فانھا متیسرة واقرب دلائل الحنفیة قولہ علیہ السلام لایحل لہ ان یفارقہ خشیة ان یستقیلہ رواہ الخمسة الا ابن ماجة ورواہ الدارقطنی کذا فی النیل ج ۵ ص ۹۹ ففیہ دلیل ان صاحبہ لایملک الفسخ الا من جھة الاستقالة واما قول المخالفین انہ لوکان المراد حقیقة الاستقالة لم تمنعہ من المفارقة لانھا لاتختص بمجلس العقد فالجواب عنہ ان قرب العھد بالعقد لہ دخل مشاھد فی تأثر کل من المتعاقدین بالتماس الآخر۔ اما قولہ لایحل فمحمول علی الکراھة من حیث انہ لایلیق بالمروة وحسن معاشرة المعلم کما اضطر الیہ القائلون بخیار المجلس فان حل المفارقة اجماعی عندنا وعندھم جمیعًا واما کونہ متکلما فیہ فیعتبر لوکان معارضا للصحیح ولو لیعارض بعد تاویل الصحیح اقرب التاویلات حمل

التفرق بالابدان على الاستحباب تحسيناً للمعاملة مع المسلم كما
ذكر فی تقریر حدیث الاستقالة واما قول المخالفین انه لوکان
المراد تفرق الاقوال لخلا الحدیث عن الفائدة وذلك ان العلم محیط
بان المشتری مالم یوجد منه قبول البیع فهو بالخیار وکذلك
البائع خیاره فی ملکه ثابت قبل ان یعقد البیع اھ فغیر ملتفت
الیه لانه یمکن ان یکون مقصود الشارع نفی بعض بیوع الجاهلیة
من نحو الملامسة والمنابذة فلم یکن خالیا عن الفائدة واما
دعوی کون بعض الفاظ الحدیث غیر محتمل للتاویل کقوله
علیه السلام فان خیر احدهما الأخر فتبایعا علی ذلك فقد
وجب البیع وان تفرقا بعد ان تبایعا ولم یترك واحد منهما
البیع فقد وجب البیع اھ فممنوعة لان معنی قوله فقد وجب
البیع فی الاوّل ای بشرط الخیار حیث خیر احدهما الاخر وفی
الثانی ای البیع البات حیث لم یشترط فیه الخیار ولیس لفظ
اصرح منه ولیس الامام متفردا فی هذا بل قد ذهب الیه النخعی
والمالکیة والثوری واللیث وزید بن علی وغیرهم کما فی النیل
ج ۵ ص۲۰ واللہ اعلم ۱۰ ربیع الآخر ۱۳۳۴ھ

(بوادر النوادر ص ۳۰ تا ص ۳۲ ج ۱)

وههنا تمت المقالة وکملت العجالة وهی مشتملة علی
افادات حکیم الامة المحمدیة ومجدد الملة الحنفیة ۔

شیخنا وشیخ مشائخنا التقی الولی المفسر المحدث الفقیہ العلامة الشھیر باشرف علی التھانوی قدس سرہ لازلنا منغمسا فی بحار لطفہ الجلی والخفی ومتعنا اللہ بفیوضاتہ العامة وبرکاتہ الخاصہ، اللھم اجعلھا خالصة لوجھک الکریم بفضلک العظیم واجعلھا وسیلة لرضاک ورضاء رسولک الرؤف الرحیم، ووفقنا لخدمت حدیثہ وتفقہ علومہ بالقلب السلیم، واحشرنا معہ وادخلنا حزبہ فی النعیم المقیم، کتبھا الاحقر الراجی عفو البر الغفور المدعو بعبد الشکور الترمذی عفی عنہ ذنبہ الجلی والخفی وابن المفتی السید عبد الکریم الگمتھلیؒ المفتی سابقاً فی الخانقاہ الامدادیة الاشرفیہ بتھانہ بھون تحت ظل حکیم الامةؒ الموصی الیہ) الخادم بالمدرسة العربیة الحقانیہ فی قریة ساھی وال من مضافات سرجودھا،

قد وقع الفراغ من تسوید ھذہ العجالة وتحریر ھذہ المقالة ضحوة یوم الثلاثاء لثلاثین من شھر اللہ المحرم الحرام سنة لتسع واربعمائة والف من ھجرة النبی الکریم علی صاحبھا افضل الصلوة وازکی التسلیم وعلی الہ واصحابہ اجمعین وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔

مجلس صیانۃ المسلمین پاکستان

اور

اس کی دینی و ملی خدمات کا

مختصر تعارف

بانی

حکیم الامت، مجدد الملت، حضرت مولانا

شاہ محمد اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

قائم شدہ

۱۹۳۰ء

پاکستان ۱۹۵۲ء میں قائم کنندہ۔ عالم ربانی حضرت مولانا

شاہ حافظ جلیل احمد شروانی رحمۃ اللہ علیہ

خلیفہ مجاز حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا شاہ محمد اشرف علی تھانوی

شعبۂ نشر و اشاعت مجلس صیانۃ المسلمین صدر دفتر جامعہ اشرفیہ مسلم ٹاؤن لاہور

مقالہ نمبر ۲۳

حکیم الامت حضرت تھانوی رح

کی

فقہی خدمات

حضرت مولانا محمد عبید اللہ الاسعدی القاسمی

مدرس جامعہ عربیہ ہتورا - باندہ - انڈیا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ
نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم امابعد

حضرۃ تھانوی کی فقہی خدمات

کسی کی ذات سے متعلق کچھ لکھنے اور کہنے کیلئے اس ذات سے جو قرب و واقفیت کی ضرورت ہوتی ہے، پھر اس کی کسی فنّی خدمات کو بیان کرنے کیلئے خود اس فن سے متعلق جو معلومات و بصیرت و استیعاب درکار ہوتا ہے، مجھے نہ تو حضرتؒ سے وہ واقفیت حاصل ہے نہ وہ معلومات کہ اس کے جو اسباب ہو سکتے ہیں ان کو اپنا یا ہی نہیں، مگر بعض کہنے والوں کے کہنے کی وجہ سے بلاد ہند کی فقہی خدمات سے متعلق کچھ لکھنے سے کام میں لگا تو ایک عنوان یہ بھی رکھا جس کی طرف ایک مقالہ میں اشارہ بھی کیا۔ اتفاق سے اس کی اشاعت کی نوبت آئی تو حضرت کی ذات و خدمات سے حضرت کی شایان شان وحق کے مطابق محبّت و تعلق رکھنے والے بعض حضرات نے اسکی تحریک کی کہ اس عنوان کے تحت مقالہ کی ضرورت ہے تو آپ نے ارادہ ظاہر کیا ہے تو اس کام کو کر ڈال، بہرحال اس نااہلی کے باوجود محض حصول سعادت کے لیے ہاں کر کے کام کو شروع کیا اور جیسا بھی ہوا پیش خدمت ہے۔

حضرت کیا تھے، ان کا مقام و منصب کیا تھا، اور انہوں نے کیا کیا خدمات انجام دیں۔ اور ان کے تجدیدی کارنامے کیا ہیں، اس کی حقیقت تو

حضرت کی سوانح اور تمام تحقیقی و تالیفی ماٰثر کے مطالعہ کے بعد ہی سمجھی جاسکتی ہے،
اس مقالہ میں تو ان کا ایک اجمالی خاکہ و تعارف پیش کرنا مقصود ہے جس میں حضرة
کی فقہی خدمات کے ذکر سے پہلے بطور تمہید کچھ مزید تفصیلات بھی ذکر کی گئی ہیں
جن کا مقصود اجمالاً حضرت کے علمی و فقہی مقام کا بیان و نشاندہی ہے جس سے
حضرت کی ان خدمات کی عظمت مزید واضح ہوسکے۔

ایک ضروری امر یہ کہ مقالہ کے ابتدائی صفحات میں حضرت تھانوی ؒ کے
امتیازی علوم پر کلام کرتے ہوئے تصوّف سے متعلق معلومات پر علاّمہ سید سلیمان
ندوی صاحب ؒ اور جناب عبدالماجد صاحب دریابادی مرحوم کے تاثرات کا تذکرہ
کیا گیا ہے مگر جناب دریابادی کے تاثرات نقل سے اس لیے رہ گئے کہ
کتاب مل نہیں سکی تھی۔ ذیل کی سطور میں ان کے وہ الفاظ ذکر کر رہا ہوں جو نقل
کرنے مقصود ہیں، جناب دریابادی صاحب فرماتے ہیں۔

حکیم الامت ؒ سے اللہ تعالیٰ نے سلوک و طریقت کی وہ خدمت لی ہے
جو آج تک بڑے سے بڑے صوفیاء و مشاہیر اولیاء سے نہیں
بن پڑی۔

انشاء اللہ تعالیٰ اس دعوے کی لاج اللہ رکھ لے گا کہ تاریخ امت میں
کوئی ہستی مرشد مربی و مصلح ان سے برتر نظر نہیں آتی، غزالی کا مرتبہ
بیشک بہت بلند ہے بلکہ یہ کہنے دیجئے کہ امام تھانوی ؒ کے زمانہ سے
قبل انہیں کا مرتبہ بلند ترین ہے لیکن تربیت السالک وغیرہ جیسی گتھیاں سلجھ
کر آگئی ہیں ان کے بعد امام تھانوی ؒ کا پلہ کچھ بھاری ہی نظر آئے گا۔
(معاصرین ص ۱۷،۲۱)

حضرت تھانویؒ کی شخصیت و جامعیت

کسی کے کمالات و صفات کے متعلق مناسب تبصرہ وہی کرسکتا ہے جس نے عالم بھی دیکھا ہے اور جس نے عالم بھی دیکھے ہوں، حضرت تھانویؒ کو دیکھنے والوں اور ان سے قریبی تعلق بلکہ استفادہ و اجازت کا شرف رکھنے والوں میں علامہ سید سلیمان ندوی علیہ الرحمۃ سے زیادہ کوئی شخص موزوں نہیں ہو سکتا کہ انہوں نے عالم بھی دیکھا تھا اور علماء بھی اور علامہ شبلی کے پروردہ بھی تھے جن سے ان کی عقیدت و محبت، علامہ سے متعلق تحریرات سے واضح ہے۔ سید صاحب نے معارف میں ایک موقع پر حضرت کی جامعیت کو واضح کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے۔

حضرت حکیم الامتؒ کے علمی و دینی فیوض و برکات اس قدر مختلف الانواع ہیں کہ ان سب کا احاطہ ایک مختصر سے مضمون میں نہیں ہو سکتا، اور یہی ان کی جامعیت ہے، جو ان کے اوصاف و محامد میں سب سے اوّل نظر آتی ہے، وہ قرآن پاک کے مترجم ہیں مجوّد ہیں، مفسّر ہیں، اس کے علوم و حِکَم کے شارح ہیں، اس کے شکوک و شبہات کے جواب دینے والے ہیں۔ وہ محدّث ہیں۔ احادیث کے اسرار و نکات کے ظاہر کرنے والے ہیں، وہ فقیہ ہیں ہزاروں فقہی مسائل کے جوابات لکھے ہیں، نئے سوالوں کو حل کیا ہے۔ نئی چیزوں کے متعلق نہایت احتیاط کے ساتھ فتوے دیئے ہیں، وہ خطیب تھے انہوں نے خطابات ماثورہ کو یکجا کیا ہے، وہ واعظ تھے ان کے سینکڑوں وعظ چھپ کر عام ہو چکے ہیں، وہ صوفی تھے۔ شیخ وقت تھے تصوف کے اسرار کو فاش کیا ہے، شریعت و طریقت کی ایک مدت کی جنگ

کا خاتمہ کر کے دونوں کو ایک دوسرے سے ہم آغوش کیا ہے، ان کی مجلسوں میں علم و معرفت اور دین و حکمت کے موتی بکھیرے جاتے تھے۔ وہ ایک مرشد کامل تھے، ہزاروں مسترشد و مستفیدان کے سامنے اپنے احوال و واردات پیش کرتے تھے۔ انہوں نے بزرگوں کے احوال و کمالات کو یکجا کیا اور اس سے سب کو آشنا کیا۔ انہوں نے حضرات چشت کے احوال و اقوال میں سے بظاہر اعتراض کے قابل باتوں کی حقیقت ظاہر کی اور اس کے اسرار ظاہر کیے، وہ مصلح امت تھے۔ امت کے سینکڑوں مصائب کی اصلاح کی، رسوم و بدعات کی تردید، اصلاح رسوم، اور انقلاب حال پر متعدد تصانیف کیں، وہ حکیم الامت تھے، مسلمانوں کے علاج اور نشاۃ و احیاء پر رسائل تصنیف فرمائے، غرض ان کی زندگی میں مسلمانوں کی کم کوئی ایسی مذہبی ضرورت ہوگی جس کا مداوا اس حکیم الامت نے اپنی زبان اور قلم سے نہیں فرمایا جن کی وسعت کا اندازہ تحقیق اور مطالعہ کے بعد ہی نظر آسکتا ہے۔[۱]

حضرت کا مقام و مرتبہ

کسی کے مقام و منصب کا حقیقی علم تو علیم حقیقی کو ہی ہے، مگر حالات و کارناموں کی بنا پر اللہ کے بندے اس کی نسبت سے اپنے اپنے حسن ظن و تاثرات کا اظہار کرتے ہیں اور ظاہر بینوں کے لیے وہی تاثرات کسی کی طرف متوجہ کرنے اور اس سے محبت و عقیدت اور استفادہ و استرشاد کا تعلق قائم کرنے کا ذریعہ بنا کرتے ہیں۔ حضرت کی عملی زندگی اور

۱۔ معارف ج ۵۳ نمبر ۱ از البلاغ مفتی اعظم نمبر ص ۵۴۰ تا ۵۴۱

اصلاحی خدمات کا آغاز ان کے بڑوں کی زندگی میں ہی ہو چکا تھا اور ان کی مقبولیت و مرجعیت بھی ان کے سامنے آشکارا ہونے لگی تھی اور معاصرین و چھوٹوں کے سامنے جو کچھ آیا تو آیا ہی، حضرت سے جو کچھ کام لیا گیا، سید صاحب کی تحریر کردہ سطور سے اجمالاً واضح ہے اور در اصل اسی سے حضرت کے مقام و مرتبہ کو سمجھا جا سکتا ہے، سید صاحب نے ہی حضرت کی وفات کے موقع پر تحریر فرمایا تھا "اب اس دور کا بالکلیہ خاتمہ ہو گیا جو حضرت امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ، مولانا یعقوب صاحب نانوتوی، مولانا قاسم صاحب نانوتوی اور حضرت مولانا رشید صاحب گنگوہیؒ اور مولانا شیخ محمدؒ صاحب تھانوی کی یادگار تھا اور جس کی ذات میں حضرات سلسلہ چشتیہ نقشبندیہ سہروردیہ قادریہ، حضرت مجددؒ الف ثانی اور حضرت سید احمد بریلوی کی نسبتیں یکجا تھیں۔۔۔ دنیا نے اس کو حکیم الامت کہہ کر پکارا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ اس اشرفِ زمانہ کے لیے یہ خطاب عین حقیقت تھا[1] (سید صاحب تو آپ کے مسترشد تھے۔")

حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ جو آپ کے اساتذہ کی عمر کے تھے۔ وہ جب کسی تحریر میں آپ کے نام کے ساتھ "حکیم الامت" لکھا ہوا نہ پاتے تو سخت ناراض ہوتے اور فرماتے کہ جب اللہ نے قلوب رجال میں ان کے لیے ایک لقب ڈال دیا ہے تو اس کو چھوڑنا نہ چاہیئے کہ اس میں حضرت حق کے ساتھ سوءِ ادب ہے۔

---

[1] یادِ رفتگان ص ۲۵۳

مولانا محمد یحییٰ صاحب کاندھلویؒ حضرت گنگوہی کے تلمیذ و خادم خاص نے مولانا ظفر احمد صاحب کے اس استفسار پر کہ اس وقت مجدد مائۃ حاضرہ کون ہیں فرمایا میرا خیال تمہارے ماموں کے متعلق ہے کہ وہ اس صدی کے مجدّد ہیں کیونکہ مجدّد کے لیے شرط ہے کہ اس کا فیض صدی کے زیادہ حصّہ کو محیط ہو دوسرے تجدید کے لیے عوام و خاص سب کا بکثرت مستفید ہونا بھی شرط ہے اور مولانا کا فیض عوام و خواص سب کو محیط ہے[1]

مفتی اعظم ہند مولانا کفایت اللہ صاحب دہلوی نے سید سلیمان صاحب ندویؒ کے نام حضرت کی وفات سے متعلق خط میں تحریر فرمایا، ہندوستان ایک "حکیم الامۃ مجدد الملۃ" سے محروم ہو گیا[2]

بہر حال کم از کم یہ طے و مسلم ہے کہ حضرات اکابر علماء دیوبند اور فرزندان دار العلوم میں "مجدّد الملۃ" کا لقب اگر کسی کے لیے تجویز ہوا تو آپ کی ہی ذات تھی کہ آپ کے ہی علمی و تحقیقی اور اصلاحی کارنامے اس لقب کے لیے آپ کی موزونیت کا تقاضا کرتے ہیں۔

علوم متداولہ میں حضرت کا کمال

"علم دین" اور "دین کی فقاہت" جس کو کہتے ہیں جس کا مطلب ہے کتاب و سنّت اور ان کے واسطے سے شریعت محمدیہ کے مسائل و احکام سے گہری واقفیت اور پوری بصیرت، جس کی بابت ارشاد نبویؐ ہے۔ من یرد اللہ

---

[1] اشرف السوانح ج ۳ ص ۲۶۰ [2] یادرفتگان ص ۲۰۶۷۔

بہ خیرا یفقہہ فی الدین (اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتے ہیں اس کو دین کی سمجھ سے نوازتے ہیں) اس کے حصول کی بابت نہ ایسا ہے اور نہ سمجھا گیا ہے کہ اسی کے لیے براہ راست کتاب وسنت کو پڑھا جائے اور اس کے لیے دوسرے علوم کی تحصیل اور ان سے استعمال و استعداد کی کوئی ضرورت نہیں ہے بلکہ قرونِ اولیٰ سے لے کر آج تک یہ بات معروف ورائج رہی ہے کہ جس نے اپنے لیے اس منزل کا انتخاب کیا ہے اور اس کو اپنا مقصود بنایا ہے اس کو کتاب وسنت سے استفادہ کے مرحلہ تک پہنچنے کے لیے دوسرے علوم کی بقدر ضرورت تحصیل کرنی پڑی ہے اور اس کے بعد ہی یہ مرحلہ آسان ہوجاتا ہے۔ یہ علوم وفنون ہر دور وعہد کے حالات کی نسبت سے کم وبیش اور مختلف ہوتے رہے ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں کہ جو ہر عہد میں ضروری سمجھے گئے ہیں اور آج تک سمجھے جاتے ہیں یہ وہ بنیادی علوم ہیں کہ جن کے بغیر کتاب وسنت کی جو زبان ہے اس کو اور پھر ان کی تصریحات کو سمجھا نہیں جاسکتا، یعنی علوم عربیت نیز کتاب وسنت سے احکام کے انسباط واستخراج کے لیے ضروری علوم، آج بھی ہمارے مدارس سے رسمی طور پر جو لوگ عالم بن کر نکلتے ہیں ان کو اس کے لیے شروع سے لے کر آخری مرحلہ تک درجہ بدرجہ متعدد علوم کی تحصیل کرنی پڑتی ہے، اور حضرت تھانویؒ تو اس عہد کے فضلاء میں سے تھے جس عہد میں درس نظامی شباب پر تھا اور اس کا ہی سکہ چل رہا تھا، حضرت نے اس عہد کے مروّج سارے ہی علوم حاصل کیے تھے اور ظاہر ہے کہ محض نصاب میں شامل علوم وفنون کی کتابوں کا پڑھ لینا

ہی کافی اور مدار نہیں بلکہ آئندہ انسان کو جیسا کام کرنا ہوتا ہے اور جیسا کام اس سے لیا جاتا ہے اس کے مطابق ان معاون علوم میں بھی واقفیت، مہارت اور بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے اس کے بغیر گاڑی نہیں چلتی بلکہ انسان جتنا ان میں فائق ہوتا ہے اتنا ہی آگے کا مرحلہ آسان ہوتا ہے اور کتاب وسنت کے سمجھنے کی راہیں کشادہ ہوتی جاتی ہیں۔ ہر عہد میں جن حضرات نے دین کا نمایاں کام کیا ہے بالخصوص تحقیق کا خواہ تحریر وتصنیف کے ذریعہ ہو یا تقریر کے ذریعہ، وہ اپنے اپنے کارہائے تحقیق کے مطابق ان معاون علوم میں بھی بصیرت بلکہ مجتہدانہ شان رکھتے تھے، اور اصل مقصود میں تو وہ امامت وقیادت کے منصب پر فائز ہوتے ہی تھے۔

یہ دوسرے علوم جن سے اصل مقصود کے لیے مدد ملتی ہے۔ یہ "معاون علوم" کہلاتے ہیں اور انہیں کو "علوم الٰہیہ" بھی کہا جاتا ہے۔

حضرت نے بھی اپنے زمانہ کے علوم متداولہ کی تحصیل کی تھی اور ان کی تحصیل میں جد وجہد کی وجہ سے حضرت کو بھی ان تمام علوم سے ہی بقدر ضرورت کمال حاصل تھا، چنانچہ خود فرماتے ہیں "الحمد للہ مجھ کو منطق میں مہارت حاصل ہے" نیز فرماتے "اکثر میرا طریق اصلاح یہ ہے کہ جس شخص کو جس فن میں کمال کا دعویٰ ہو پہلے میں اس کو اس فن میں مغلوب کر کے دکھلا دیتا ہوں بشرطیکہ وہ فن مقصود ہو"[1] بہرحال اس پر آپ کے مآثر اور تصنیفات شاہد ہیں جو کہ مختلف علوم و

---

[1] اشرف السوانح ج ۱ ص ۳۱

فنون سے متعلق اور ان کے مسائل پر مشتمل ہیں اور جو علوم متداولہ سے متعلق حضرت کے کمال و مہارت پر اطمینان و بصیرت چاہتا ہو وہ صرف بیان القرآن اور اس کے حواشی کا مطالعہ کرلے کہ اسی سے اس کو بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ حضرت کی ان علوم سے واقفیت کا مبلغ و معیار کیا ہے۔

علوم دینیہ

جب علوم عالیہ و معادن علوم میں تبحر و کمال کا معیار وہ ہے جو کہ ذکر کیا گیا ہے جبکہ یہ علوم غیر مقصود ہیں تو جو علوم ایک عالم دین کا مقصود زندگی اور محور فکر و تحقیق ہوتے ہیں یعنی علوم دینیہ ان میں کمال و مہارت اور وسعت و بصیرت کا کیا پوچھنا۔ حضرت کی مؤلفات بہت سی ناپید ہونے کے باوجود اکثر عام ہیں۔ بازاروں میں یا کتب خانوں میں موجود ہیں وہ سب کی سب شاہد عدل ہیں کہ علوم دینیہ کا کوئی شعبہ و پہلو ایسا نہیں ہے جو کہ آپ کی دسترس سے باہر ہو اور جس کے متعلق ضمنی نہیں مستقل تاثر موجود نہ ہوں، خواہ علم تفسیر و حدیث ہو یا فقہ و کلام ہو یا یہ کہ تصوف و احسان، ہر ایک سے متعلق ایسے گرانقدر ماثر موجود ہیں کہ رہتی دنیا تک کے لیے آپ کے کمال پر حجت اور آنے والوں کے لیے موجب بصیرت اور بلاشبہ آپ کے لیے ذخیرۂ آخرت ہیں۔ یوں تو چونکہ عموماً انسان کو ہر علم و فن سے طبعی مناسبت نہیں ہوتی بلکہ بعض بعض سے ہوتی ہے، اور پھر اسی میں اس کا ذہن چلتا ہے قلم رواں ہوتا ہے اور زبان علم و تحقیق کے موتی بکھیرتی ہے اور وہ اس میں اپنے کارناموں کے مطابق، محقق و مجتہد گردانا جاتا ہے بلکہ مجدد بھی۔ حضرت کو بھی طبعی مناسبت سارے علوم سے یکساں نہیں تھی، اسی لیے تمام علوم دینیہ میں

سے ہر ایک میں مآثر بھی یکساں حیثیت و معیار کے نہیں ہیں۔

امتیازی علوم

بلکہ جیسا کہ معروضات اور خود حضرت سے بھی تصریحات منقول ہیں کہ علوم دینیہ میں سے تین علوم آپ کے امتیازی و خصوصی علوم رہے ہیں جن کی نسبت سے آپ کی خدمات نہایت گرانقدر و عظیم الشان بلکہ مجتہدانہ و مجددانہ ہیں ——— ، اور وہ تین علوم ہیں تفسیر، فقہ، اور تصوّف، فقہی خدمات سے متعلق تو یہ پورا مقالہ ہی ہے، تفسیر و تصوف کی بابت بھی ہم آگے مختصراً ذکر کر رہے ہیں، اس موقع پر اس کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں کہ ان تین علوم سے خصوصی مہارت اور ان کے متعلق نمایاں کارناموں کی انجام دہی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دیگر علوم دینیہ سے رسمی واقفیت و دلچسپی تھی، بلکہ دیگر علوم یعنی حدیث و کلام میں بھی آپ کو یدطولیٰ حاصل تھا۔

دیگر علوم دینیہ

اس سلسلہ میں بنیادی و اہم بات تو یہ ہے کہ جن تین علوم کی نسبت سے آپ کی خصوصیت ذکر کی گئی ہے ان میں خصوصیت و مہارت تامہ علوم حدیث اور علم کلام سے پوری واقفیت کے بغیر پیدا ہی نہیں ہو سکتی کہ قرآن کریم کا فہم حقیقی احادیث سے واقفیت اور ان سے استیعاب اور ان سے استمداد کے بغیر ممکن نہیں جیسے کہ فقہی مسائل کا استنباط اور فقہ میں مقام تحقیق کا حصول کتاب و سنت سے بقدر ضرورت کما حقہ واقفیت کے بغیر نہیں ہو سکتا، اور ظاہر ہے کہ جو شخص کتاب و سنت کے علوم سے متعلق بصیرت رکھتا ہو وہ علم کلام کے دقائق سے بے بہرہ اور اس میں ناقص کیوں کر ہو سکتا ہے کہ ان سارے علوم کا بنیادی ماخذ کتاب و سنت ہی ہیں۔

حدیث میں آپکے مآثر

دوسری بات یہ کہ جس انداز کے شواہد آپ کے امتیازی علوم سے متعلق آپ کی مہارت و کمال پر موجود ہیں حدیث وغیرہ سے متعلق بھی موجود ہیں۔

آئندہ تفصیلات میں "اعلاء السنن" کا تذکرہ آنے والا ہے اس کی تالیف کی بابت جو تفصیلات منقول ہیں ان میں یہ بھی تصریح ہے کہ یہ کام اولاً خود حضرت نے دو مرتبہ الگ الگ ناموں سے کیا، اور بعد میں جن لوگوں نے اس کو اپنے ہاتھوں میں لے کر پایۂ تکمیل تک پہنچایا ان کی آپ نے نہ صرف یہ کہ بھرپور رہنمائی فرمائی بلکہ پوری پوری نگرانی فرمائی - اور ظاہر ہے کہ وہ کام جس انداز میں آپ نے کیا اور کرایا جن سے متعلق بصیرت کی حد تک واقفیت اور تبحّر کے بغیر ممکن نہ تھا حدیث سے واقفیت سے متعلق حضرت کا کیا مقام تھا حق یہ ہے کہ اعلاء السنن میں اس زمانے کی نسبت سے فن حدیث میں ماہروں کے لیے القاب کی جو تحدید کی گئی ہے اس کے مطابق آپ پر "حافظ" کا لقب صادق آتا تھا چنانچہ مولانا ظفر احمد صاحب نے اعلاء السنن کے مقدمہ میں حضرت کے لیے دیگر القاب کے ساتھ "الحافظ الثقۃ الثبت" کے الفاظ بھی استعمال کیے ہیں اور حاشیہ میں فرمایا ہے کہ اس پر مواعظ وغیرہ میں مذکور احادیث کی کثرت شاہد ہے جو کہ تعداد میں ہزار سے زائد ہیں اور انہیں حضرت نے پوری رعایت کے ساتھ نقل کیا ہے اور ان کے مراجع بھی ذکر فرمائے ہیں۔[1]

---

[1] اعلاء السنن مقدمہ ج ۱ ص ۱۶ و ۲۱

تفسیر و تصوّف

رہے حضرت کے تین امتیازی علوم تو فقہ سے متعلق تو تفصیلات آ ہی رہی ہیں، تفسیر و تصوف کا معاملہ یہ ہے کہ آپ کے پیر و مرشد حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی ؒ نے یہ بشارت دی تھی کہ تم کو تفسیر و تصوّف سے خاص مناسبت ہو گی، اور دونوں سے حضرت کی مناسبت معلوم ہے اور حضرت فرمایا کرتے تھے کہ میں چوک گیا ورنہ دیگر شعب دینیہ خصوص حدیث و فقہ کی مناسبتِ خاصہ کے لیے بھی حضرت حاجی صاحب سے دعا کرا لیتا۔[1]

حضرت کی تفسیر سے مناسبت اور آپ کی تفسیر بیان القرآن کا کیا معیار و شان ہے اس کا اندازہ واقعۂ ذیل سے لگایئے جو کہ حضرت کے ملفوظات میں اور اشرف السوانح نیز حیاتِ انور میں بھی مذکور ہے۔ حسب موقع طول یا اختصار کے ساتھ، علامہ انور شاہ صاحب کے علمی مقام سے ہمارا پورا حلقہ واقف ہے، منقول ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی سے کہا کہ قرآن کریم کی تفسیر سے متعلق بعض بعض مواقع پر کچھ اشکال ہیں کتابوں کی مراجعت سے وہ حل نہیں ہو رہے ہیں۔ مولانا نے کہا آپ نے بیان القرآن دیکھی۔ شاہ صاحب نے کہا کہ میں اردو کتابیں تو دیکھا نہیں کرتا، مولانا نے مشورہ دیا۔ چنانچہ شاہ صاحب نے بیان القرآن سے استفادہ کیا اور اس کے بعد فرمایا کہ میں سمجھتا تھا کہ اردو میں علوم ہیں ہی نہیں۔ بیان القرآن دیکھنے سے معلوم ہوا کہ

---

[1] اشرف السوانح ج ۱ ص ۱۹۔

اردو زبان میں بھی علوم ہیں اور فرمایا کہ بیان القرآن نے بہت سی تفاسیر سے مستغنی کر دیا ہے۔ حضرت تھانویؒ کے علم میں جب یہ بات آئی تو اس پر بڑی مسرت کا اظہار فرمایا۔[1]

رہی تصوّف سے مناسبت اور اس کی نہ صرف امتیازی بلکہ مجدّدانہ خدمات تو وہ تو اظہر من الشمس ہیں۔ بڑے بڑے وسیع النظر علماء نے اس کا اعتراف کیا ہے۔ سید صاحب نے معارف کے   میں تحریر فرمایا تھا۔ ان کی ذات میں حضرات چشت اور حضرت مجدّد الف ثانی اور حضرت سیّد احمد بریلوی کی نسبتیں یکجا تھیں۔ ان کا سینہ چشتی ذوق و عشق اور مجدّدی سکون و محبت کا مجمع البحرین تھا۔ ان کی زبان شریعت و طریقت کی وحدت کی ترجمان تھی، ان کے قلم نے فقہ و تصوّف کو ایک مدّت کی ہنگامہ آرائی کے بعد باہم ہم آغوش کیا تھا، اور ان کے فیض نے تقریباً نصف صدی تک اللہ تعالیٰ کے فضل و توفیق سے اپنی تعلیم و تربیّت اور تزکیہ و ہدایت سے ایک عالم کو مستفید کر رکھا تھا اور انہوں نے اپنی تحریر و تقریر سے حقائق ایمانی، دقائق فقہی، اسرار احسانی، رموز حکمت ربانی کو برملا فاش کیا تھا۔[2] مولانا عبدالماجد صاحب دریاآبادیؒ ایک موقع پر تحریر فرماتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ ان قرون متاخرہ میں علم تصوف جس طرح داغدار اور بدنام

---

[1] حیات انور ص ۲۳۶ ۔ والافاضات الیومیہ ج ۷، ص ۱۱۱۔

[2] یاد رفتگان ص ۲۵۳، ۲۵۴۔

ہو گیا تھا حتیٰ کہ آج تک بعض لوگ اسی سے متاثر ہیں حضرت نے اپنی مجددانہ کوششوں کے ذریعہ اس سے متعلق ساری بدگمانیاں اور غلط فہمیاں دور کر دیں۔ بالخصوص اپنے اس کارنامے کے ذریعہ کہ اس کے مسائل کا براہ راست کتاب و سنّت سے کھلا ہوا تعلق ثابت فرمایا۔ اس کے لیے حضرت نے ایک کتاب مسائل السلوک من کلام ملک الملوک تصنیف فرمائی جس میں تصوف کے مسائل کو قرآن کریم سے ثابت فرمایا، دوسری کتاب التشرف بمعرفۃ احادیث التصوّف تالیف فرمائی جو کہ چار حصوں میں ہے، اس میں صوفیاء کے کلام میں منقول مرویات کی تحقیق ہے نیز احادیث سے ثابت ہونے والے مسائل کی، اور تیسری التکشف عن مہمات التصوف جس میں بعض مہمات تصوّف کا بیان ہے۔

اس سلسلہ میں حرفِ آخر یہ کہ حضرت کے پیرومرشد حاجی امداد اللہ صاحب نے اپنے ایک گرامی نامہ میں حضرت کو خطاب کرتے ہوئے تحریر فرمایا۔

بخدمت فیضدرجت عمدۃ السالکین نخبۃ الواصلین، حضرت العالم الحافظ الحاج القاری شاہ محمد اشرف علی التھانوی ادام اللہ عرفانہ ومحبتہ، [۱]

علمِ فقہ گذر چکا ہے کہ حضرت کے امتیازی علوم اور جن سے حضرت کی خصوصی مناسبت تھی اور جن میں حضرت کی خدمات بھی بہت نمایاں ہیں ان میں سے تیسرا فن "علم فقہ" ہے۔ اس کی عظمت ظاہر ہے کہ یہی وہ علم و فن ہے جس کے ذریعہ جائز و ناجائز اعمال و افعال اور معاملات کا علم حاصل ہوتا ہے،

---

[۱] اشرف السوانح ج ۱ ص ۱۹۷

اس مقالہ کا موضوع اسی علم وفن سے متعلق حضرت کی خدمات کا تعارف کرانا ہے، اور خدمات کے ذکر و تعارف سے پہلے، اس علم وفن میں حضرت کا جو ذوق مقام رہا ہے اس کا ذکر بھی ضروری ہے اور اس سلسلہ کے شواہد بھی، اس کے بعد انشاء اللہ خدمات کا تعارف اپنی ناقص معلومات کے مطابق پیش کیا جائیگا۔

اس سلسلہ میں جو چیزیں ذہن میں ہیں ان کی نسبت سے یہ کہنا شاید بیجا نہ ہو اور ناظرین بھی آخری مرحلہ میں پہنچ کر اس کی تصدیق کریں گے کہ علوم اسلامیہ سے متعلق حضرت کی خدمات میں سب سے وسیع اور مختلف الجہات سلسلہ فقہی خدمات کا ہی ہے

خصوصی علوم کی اہمیت اور علوم دینیہ میں ان کا مقام

حضرت کے خصوصی علوم جو ذکر کیے گئے ہیں ان کے تحت ایک بات کی طرف توجہ دلانا مناسب معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اہل تحقیق سے یہ مخفی نہیں کہ قرآن کریم اور احادیث نبویہ میں "فقاہت فی الدین" کے مصداق جس قسم کی معلومات و مسائل کو قرار دیا گیا ہے وہ آجکل کے اور صدیوں سے مروج "علم فقہ" میں منحصر نہیں بلکہ قرآن و سنّت اور ان کی بنا پر قرون اولیٰ کی یہ تعبیر دین کے جملہ ان پہلوؤں اور معلومات و مسائل کو حاوی ہے جن پر آخرت کا صلاح وفساد موقوف ہے اسی لیے امام ابوحنیفہ نے فقہ کی جو تعریف فرمائی ہے وہ ہے معرفۃ النفس مالہا وما علیہا (نفس کا مفید و مضر چیزوں سے واقف ہونا، یعنی آخرت کی نسبت سے مفید و مضر چیزوں سے)

اس لیے فقاہت کی تعبیر آجکل کے مروّجہ علوم میں سے کلام اور فقہ و تصوف تینوں وسیع الذیل اور کشادہ دامن علوم کے مسائل و معلومات کو شامل ہے، ان

تینوں علوم میں سے دو کا حضرت کے خصوصی و امتیازی علوم میں سے ہونا تو ظاہر ہی ہے یعنی فقہ و تصوّف۔

علمِ کلام رہا علم کلام تو اس کی بابت ہم پیچھے عرض کر چکے ہیں۔ حضرت کے آثار، مؤلفات و تصنیفات کے مطالعہ کے بعد ہر صاحب نظر یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہے کہ "فقاہت فی الدین" کے اس تیسرے شعبہ سے متعلق بھی اس مجدد وقت کی واقفیت و بصیرت بھی ایک امتیازی شان رکھتی ہے، چنانچہ اِدھر اُدھر کے ضمنی مباحث اور بعض مفصل کتابوں کے اجزاء کے علاوہ مستقل بھی اس فن و موضوع سے متعلق ایسی تالیفات ہیں جو اپنے موضوعات و مسائل کے اعتبار سے نہایت دقیع بلکہ عصرِ حاضر کے فتنوں و مسائل کی نسبت سے بلاشبہ مجتہدانہ و مجددانہ ہیں اس سلسلہ کی مؤلفات میں سے ایک اہم کتاب "الانتباہاتُ المفیدہ" ہے جس میں عصرِ حاضر کے پیدا کردہ اشکالات کے جوابات دیئے گئے ہیں اسی اہمیّت کی وجہ سے اس کا انگریزی میں بھی ترجمہ ہوا ہے، ایسے ہی اس سلسلہ کی ایک کتاب اشرف الجواب ہے۔ اس کے علاوہ مختلف موضوعات پر بہت سے رسائل ہیں۔ تفسیر بیان القرآن میں جگہ جگہ اور اس کے حواشی میں بھی کلامی مسائل مذکور ہیں اور ان کی تحقیق کی گئی ہے۔

خلاصہ یہ کہ حضرت کے علوم "فقاہت فی الدین" کا مصداق تھے اور اللہ نے آپ کو یہ جامعیت عطا فرما کر "دین کا حقیقی فقیہ" ہونے کا شرف بخشا تھا اس لیے تو اللہ نے آپ سے وہ کارہائے نمایاں لیے جو تجدیدی کہلائے۔ اور خلقِ خدا نے حضرت کو "حکیم الامۃ" کے لقب سے یاد کیا، کر رہی ہے اور انشاء اللہ کرتی رہے گی اور ظاہر ہے کہ حکیم الامۃ

وہی ہو سکتا ہے جس کی شریعت کے تمام احکام پر پوری نظر اور جملہ ہدایات سے متعلق اسے گہری بصیرت حاصل ہو۔

حضرت کا فقہی ذوق و مسلک

یہ صحیح ہے کہ امت کے سارے طبقات صدیوں سے انحطاط و جمود کا شکار ہیں۔ جن میں علماء بھی شامل ہیں اور جمود خاص طور سے فقہیات میں نمایاں رہا ہے، اگرچہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ علماء ربانیین جن پر علم و معرفت کے دروازے کھلے ہوئے تھے انہوں نے کسی عہد اور کسی ملک میں بھی حق اور حقیقت و حقائق سے آنکھیں بند نہیں کیں بلکہ ان کے علم و تحقیق کے مطابق جو چیز واضح و روشن ہوتی اس کو بے تکلّف اپنا لیا۔ خود ہمارے ملک میں شاہ ولی اللہ صاحبؒ سے پہلے کے عہد میں اس کی متعدد نمایاں مثالیں ملتی ہیں اور اتفاق سے ایسے حضرات وہ ہیں جو کہ اپنے اپنے وقت کے معروف صاحبِ ارشاد تھے یا مسند علم کے مالک تھے مثلاً حضرت مجدد الف ثانی، شیخ نظام الدین دہلوی شاہ عبدالحق محدث دہلوی وغیرہ۔ مگر عام علماء جمود پر ہی تھے اور جیسا کہ معروف ہے کہ امام دہلوی نے اپنی اصلاحی مساعی کے ذریعہ جو انقلاب برپا کیا اور اپنے بعد جو ماثر چھوڑے ان میں سے ایک اہم چیز فقہیات کے باب میں جمود کو بایں معنی ختم کرنا ہے کہ فقہیات میں محض کتب فقہ کی نصوص اور تصریحاتِ فقہاء میں ہی آدمی نہ الجھا رہے بلکہ کتاب و سنّت کے نصوص پر بھی نظر رکھے اور ان کو سامنے رکھ کر مسئلہ میں کسی رائے کا اظہار کرے اور ان کی روشنی میں فقہا کی رائے کی قوت و ضعف کو سمجھے، امام دہلوی کی اس تحریک کا اثر پورے ملک پر پڑا اور محسوس کیا گیا تو جو لوگ ان کے سلسلہ کے ہی

خوشہ چین تھے ان پر اس کا جتنا بھی اثر پڑتا کم تھا، احقر نے علماء دیوبند کی فقہی خدمات سے متعلق تحریر میں تفصیل سے ثابت کیا ہے کہ ان حضرات کا ذوق و مسلک وہی تھا جو ان کے علمی سلسلہ کے بانی مبانی کا تھا، اور یہی حضرت کا بھی ذوق و مسلک تھا یعنی تقلید با تحقیق جس کا مطلب ہے کہ امام ابو حنیفہ اور فقہ حنفی کی تقلید و پابندی مگر پوری تحقیق اور انشراح علمی کے ساتھ حتیٰ کہ اگر پوری تحقیق و جستجو کے بعد کسی قول کا کوئی معتمد ماخذ نہ ملے یا حالات کا تقاضا ہو تو بے تکلف دوسرے ائمہ متبوعین کے قول کو اختیار کیا جائے۔ اس پر صدہا صریح و غیر صریح شواہد موجود ہیں۔ فقہیات و مسائل سے متعلق کوئی تحریر اٹھائیے اور کسی تحقیق کو ملاحظہ کیجئے آپ کو یہ رنگ نمایاں نظر آئے گا۔ صرف کتب فقہ کے حوالوں پر اکتفا نہ ہو گی بلکہ کتاب و سنت کی نصوص بھی حسب موقع ضرور مذکور ہوں گی بلکہ مسئلہ کی اہمیت و نزاکت کے پیش نظر ان کو کچھ زیادہ ہی نمایاں کیا گیا ہو گا۔ اور بیان حکم کے لیے انہیں کو مدار و محور قرار دیا گیا ہو گا اگرچہ ان کا ماخذ کتب فقہ ہی کیوں نہ ہوں۔

حضرت کے ذوق و مسلک سے متعلق مولانا ظفر احمد صاحبؒ کا ایک وضاحتی بیان

ہم اپنی اس بات کی سند کے طور پر علماء دیوبند کے ذوق و مسلک کے بیان کے لیے بالعموم اور بالخصوص حضرت کے ذوق و مسلک کی دلیل کے طور پر حضرت مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی کے ایک بیان کی نقل کو یہاں ضروری سمجھتے ہیں جس میں انہوں نے اعلاء السنن میں مسائل کی تحقیق کے سلسلہ میں

اپنے طریق کار کی وضاحت کی ہے اور جیسا کہ آگے تفصیل سے آئے گا۔ اعلاء السنن حضرت کی خدمات کا ہی ایک جزو شاہکار ہے۔ سارا کام گویا کہ حضرت نے ہی کیا ہے، اس لیے اس میں جو کچھ ہے وہ حضرت ہی کی تحقیقات کا خلاصہ و نچوڑ ہے اور ان کے ذوق و مسلک کے عین مطابق ہے اور حضرت چونکہ نہ صرف یہ کہ دار العلوم دیوبند کے ایک مایۂ ناز فرزند اور دار العلوم کے فضلاء کے سرخیلوں کی جماعت میں سے تھے بلکہ ان اساطین علماء دیوبند میں سے تھے، جن کی تحقیقات و تشریحات پر دیوبندی مکتب فکر کی بنیادیں قائم ہیں اور انھیں سے دیوبندی ذوق اور مسلک و مشرب کو سمجھا جاتا ہے اس لیے حضرت مولانا ظفر احمد صاحب کا یہ بیان در اصل پورے طبقۂ علماء دیوبند اور دیوبندی مکتب فکر کے فقہی ذوق و مسلک کا بیان و ترجمان ہے فرماتے ہیں۔

"مذہب حنفی کے متعلق شاہ صاحب دہلوی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بطور کشف کے نقل فرمایا ہے، بحمد للہ کتاب اعلاء السنن میں اسی کے مطابق عمل کیا گیا ہے کہ اپنے ائمہ ثلاثہ میں سے جس کا قول حدیث کے زیادہ موافق پایا اختیار کیا گیا ہے بلکہ بعض مسائل میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کو حنفیہ کے قول پر ترجیح دی گئی ہے اور لکھ دیا گیا ہے کہ کتب احادیث موجودہ میں حنفیہ کی تائید میں کوئی حدیث نہیں ملی ممکن ہے ہمارے ائمہ کے پاس کوئی حدیث ہو جو کتابوں میں ہم کو نہیں ملی اس لیے بحالت موجودہ قول امام شافعی قوی تر ہے اور ہم نے اسی کو اختیار کیا ہے"[1]

---

[1] تذکرۃ الظفر ص ۲۷۱ بحوالہ امام راشد ص ۱۳۸

حضرت تھانویؒ کا ایک ارشاد
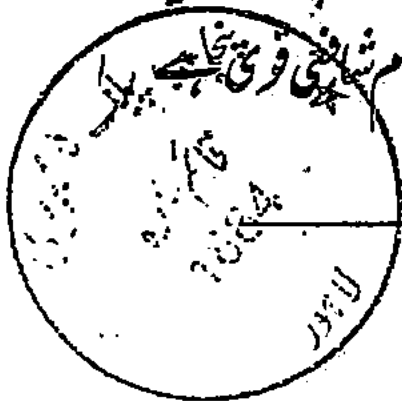
مولانا مفتی محمد شفیع صاحب جو کہ حضرت کے ذوق و مسلک اور کاروکاز کے واقعی نمائندہ و ترجمان تھے انہوں نے خود حضرت کا ایک ارشاد ایک موقع پر نقل کیا ہے اور وہ بھی دراصل ان کا ارشاد نہیں ہے بلکہ حضرت گنگوہی کی ایک وصیّت ہے جو انہوں نے حضرت تھانوی کو فرمائی تھی، حضرت نے فرمایا۔

"آجکل معاملات پیچیدہ ہو گئے ہیں اور اس کی وجہ سے دیندار مسلمان تنگی کا شکار ہیں اس لیے خاص طور سے بیع و شرار اور شرکت وغیرہ کے معاملات میں جہاں بلویٰ عام ہو وہاں ائمہ اربعہ میں سے جس امام کے مذہب میں عام لوگوں کے لیے گنجائش کا پہلو ہو اس کو فتویٰ کے لیے اختیار کر لیا جائے۔

دوسرے مذاہب کے اقوال پر فتوی و عمل کے بعض شواہد

ان حضرات کی یہ تصریحات محض فکر و نظر کی حد تک نہیں تھیں بلکہ انہوں نے اور حضرت نے حسب موقع دلائل یا ضرورت کے پیش نظر دوسرے مذاہب کے اقوال کو اختیار فرمایا یا اپنی رائے کا اظہار فرمایا۔

اس سلسلہ کے شواہد میں سب سے اہم چیز جو کہ بالخصوص حضرت کا اور بالواسطہ تمام علماء دیوبند کا کارنامہ ہے۔ حضرت کی مرتب کردہ کتاب الحیلۃ الناجزہ ہے جس کا تفصیلی تذکرہ آگے آئے گا، اس کتاب میں بعض مصیبت زدہ خواتین کے لیے مالکی مذہب کے مطابق حل بیان فرمایا گیا ہے اور پوری تحقیق اور مذہب مالکی کے علماء عصر سے مراجعت کے بعد اس سلسلہ میں حضرت کا ایک فتویٰ بھی ملاحظہ ہو جو کہ بٹائی پر دیئے جانے والے جانوروں سے متعلق ہے۔

کتب الی بعض الاصحاب من فتاوی ابن تیمیة کتاب الاختیارات مانصه ولو دفع دابة او نخلة الی من یقوم له وله جزء من نمائه صح وهو روایة عن احمد ج ۴ ص ۸۵ س ۱۴، پس حنفیہ کے قواعد پر تو یہ عقد ناجائز ہے۔ لیکن بربنار نقل بعض اصحاب امام احمد کے نزدیک اس میں جواز کی گنجائش ہے، پس تحرز احوط ہے اور جہاں ابتلار شدید ہو وہاں توسع کیا جا سکتا ہے[1]

نصوص کی تقدیم اور ان سے استدلال کے بعض شواہد

(۱) الجواب، بعد دفن اوّل سورۃ بقرہ اور آخر اس کا قبر پر پڑھنا ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وکان ابن عمر یستحب ان یقراء علی القبر بعد الدفن اول سورة البقرة وخاتمتها۔ ۔ ۔ ۔ نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قبر کے سرہانے اوّل سورۃ بقرہ اور پائینتی پر آخر اس کا پڑھنا ثابت ہے۔

(۲) الجواب، فی شرح الصدور بتخریج الطبرانی عن و ابی عمرو قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا تصدق احدکم صدقة تطوعا فلیجعلها عن ابویه فیکون لهما اجرها ولا ینقص من اجره شیئاً۔ یہ حدیث نص ہے

---

[1] امداد الفتاوی ج ۳ ص ۳۴۳

اس میں کہ ثواب بخش دینے سے بھی عامل کے پاس پورا ثواب رہتا ہے اور صحیح مسلم کی حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، من سن سنۃ حسنۃ فلہ اجرھا واجر من عمل بہا من غیر ان ینقص من اجرہ شیئاً او کما قال وجہ تائید ظاہر ہے کہ دوسرے شخص کی طرف تعدیۂ ثواب سے بھی عامل کا ثواب کم نہیں ہوتا، ہاں اتنا فرق ہے کہ حدیث طبرانی میں تعدیہ بالقصد ہے اور حدیث مسلم میں بلاقصد سو یہ فرق حکم مقصود میں کچھ مؤثر نہیں الخ[1]

(۳) الجواب: قال اللہ تعالیٰ۔ فامسکوھن بمعروف ولا تمسکوھن ضراراً لتعتدوا۔ یہ آیت اپنے عموم الفاظ سے دال ہے تحریم اضرار پر اور ایجاب تسریح پر، جبکہ امساک بالمعروف نہ ہو سکے پس جب صورت مسئولہ میں زوج پر تطلیق واجب ہے اور واجب پر قادر شخص پر جبر جائز ہے اس لیے حالت کذائیہ میں حاکم سے استغاثہ و استعانت جبر فی التطلیق میں بلاشبہ جائز ہے[2]

(۴) الجواب۔ یہ نوکری بوجہ اس کے کہ نماز فرض ہوتی ہے اور وقت مقابلہ کفار و مسلمین کے تائید کفار کی کرنی پڑتی ہے اور وقت پر انکار ہو نہیں سکتا ناجائز ہے اس کو چھوڑ دینا چاہیے، اگرچہ والدین ناراض ہوں، خدا تعالیٰ کے سامنے کسی کی طاعت نہیں، قال اللہ تعالیٰ ان الحکم الا للہ، وقال جل شانہ وان جاھداک علی ان تشرک بی ما لیس لک بہ

---

[1] امداد الفتاویٰ ج ا ص ۷۲۵ [2] ایضاً ص ۷۴۶

علم فلا تطعهما۔ الآیۃ۔ وقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا طاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق الحدیث[1]

(۵) جاء فی الحدیث قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الواھب احق لھبتہ مالم یثب منھا کذا فی القسطلانی۔

پس امام صاحب کے نزدیک قرابت محرمیہ میں رجوع کسی دلیل سے جائز نہیں۔

الجواب۔ وہ دلیل یہ ہے۔ قال علیہ السلام اذا کان الھبۃ لذی رحم محرم لم یرجع منھا رواہ البیھقی والدار قطنی فی سننھا والحاکم فی المستدرک[2]۔

عدم تقلید کا الزام

جمود پرستوں سے کوئی عہد خالی نہیں تھا انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی تبلیغی جد و جہد کے باوجود بھی جب ان کے جمال جہاں آراسے نگاہوں کو منّور کرنے والے بھی ایمان وہدایت کی دعوت سے محروم رہے ہیں تو علماء اسلام کی اصلاحی مساعی کے باوجود کور چشمی اور حقائق سے صرف نظر کے مرض کا باقی رہنا موجب تعجب نہیں، امام دہلوی کا لایا ہوا انقلاب بھی ایسے مریضوں اور امراض کا یکسر خاتمہ نہ کرسکا نتیجتہً اُن کو اور اُن کے اخلاف کو ہر عہد میں ایسے لوگوں کی طرف سے نہ جانے کن کن اتہامات اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ حضرات دیوبند نے فقہیات میں جو ذوق ومسلک اپنایا تھا جس کے بعض شواہد گذر چکے ہیں ظاہر ہے کہ 'جمود پرست اور کتب پرست'

---

[1] امداد الفتاویٰ ج ۳ ص ۲۳۴ [2] ایضاً ص ۳۸۳ [3] ص ۴۷۴

اس ذوق و مسلک کو کب پسند کر سکتے تھے اور وہ بھی اس حد تک کہ دوسرے مذاہب کی آرا کے لیے بھی سینہ کھولا جائے، چنانچہ ان حضرات کی تحریرات و تحقیقات کے سامنے آنے پر ایسے لوگوں نے ان حضرات کو اس بات کا الزام دیا کہ یہ تو تقلید کے مخالف ہیں اور حقیقت سے بیگانے ہیں جیسے کہ اس سے پہلے حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کے قافلے کے علماء و رفقاء پر یہ الزام لگایا گیا۔ اس الزام کی بات یونہی بے بنیاد نہیں ہے۔ یہ اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ حضرت تھانوی کے علم میں بھی آچکی تھی چنانچہ خود انہیں کی تصریحات سے احقر نے اس کو جانا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک واقعہ یہ نقل کیا گیا ہے کہ حضرت کی خانقاہ کے مدرسے کے ایک طالب علم نے ایک مرتبہ نماز میں حضرت کے پیچھے قرأت شروع کر دی۔ آپ کو نماز میں احساس ہوا تو نماز کے بعد اس کو ٹوکا اور فرمایا،

> ایک تو ہم ہیں ہی بدنام کہ یہ لوگ غیر مقلد ہیں، اگر کوئی تم کو الحمد پڑھتے سن لے تب تو رجسٹری ہو جائے یہی سمجھا جائیگا کہ اس کی تعلیم ہوگی [۱]

اور ایک موقع پر حضرت نے خود فرمایا کہ

> جو دھپور میں گیا تو میرے دوستوں نے رائے دی کہ یہاں لوگ ہم کو غیر مقلد کہتے ہیں، وعظ میں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے فضائل بیان کیے جائیں تاکہ اس الزام کا غلط ہونا ثابت ہو [۲]

---

[۱] حسن العزیز ص ۲۱۴ [۲] ص ۵۷۴،

حضرت کا فقہی مقام و مرجعیّت

یہ بات بار بار آچکی ہے بلکہ یہ ساری تفصیل اس ضمن میں چل رہی ہے کہ حضرت والا کو جن علوم سے کمال مناسبت تھی اور جن میں آپ کی خدمات نہایت مہتم بالشان وگرانقدر ہیں ان میں سے تیسرا فن فقہ ہے، اور یہ بھی کہ فقہ سے متعلق آپ کی خدمات ہی زیادہ وسیع اور مختلف الجہات ہیں، اور واقعہ یہ ہے کہ ہر جہت مستقل ایک کارنامہ اور طالب تفصیل ہے بلکہ ہر جہت کے تحت آنے والی بعض بعض چیزیں مثلاً بعض مؤلفات جیسے الحیلۃ الناجزۃ، ایسے ہی اعلاء السنن و احکام القرآن کی تالیف وغیرہ مستقل جداگانہ کارنامے ہیں ظاہر ہے کہ کسی فن وشعبے سے متعلق جس کے فیوض کا یہ عالم ہو اس کا اس فن وشعبہ میں مقام واضح ہے۔

اس وجہ سے یہ بات جاننے والوں پر مخفی نہیں کہ جن لوگوں کو وعظ یا ارشاد سے مستفید ہونے کا موقع ملا ان کے علاوہ عام لوگ جنہیں یہ سعادت حاصل نہ ہو سکی ان کے افادہ واستفادہ کا جو آپ سے تعلق رہا اس کا عمومی ذریعہ یہی تھا اور اس میں ملک کے عوام وخواص علماء وعامی، رؤسا وکارکنندگان، شخصیات واداریے، سب برابر کے شریک رہے ہیں، حضرت کے فتاویٰ کے مجموعے پر نظر ڈالیے تو آپ کو جہاں ہر نوع کے سوالات نظر آئیں گے وہیں ہر حیثیت کے مستفتی بھی نظر آئیں گے۔ حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جو کہ دارالعلوم دیوبند مظاہر علوم سہارنپور میں صدارت افتاء کے منصب پر فائز تھے، آگے آئے گا کہ حضرت سے اللہ نے علم وافتاء کی خدمت ۶۰ سال سے زائد عرصہ تک لی، اس طویل وقفہ میں ایک طویل حصہ آخیر کا ایسا بھی ہے کہ پورے حلقۂ دیوبند میں اس سلسلہ میں آپ ہی تن تنہا مرجع

رہ گئے تھے حضرت گنگوہی رح نے ۱۳۲۳ھ میں وفات فرمائی اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب نے ۱۳۴۵ھ میں، حضرت گنگوہی تو سب کے بڑے تھے، ان کے بعد حضرت مولانا خلیل احمد صاحب بھی اس شرف میں آپ کے سہیم و شریک تھے مگر ان کے بعد ۱۳۴۵ھ سے ۱۳۶۲ھ تک تو اس صف و مرتبہ کا کوئی دوسرا فرد نہیں رہ گیا تھا جس کا در آخری در قرار پایا۔

حضرت نے تحریر فتاویٰ اور فقہی تالیفات میں جس شان سے مسائل کی تحقیق و تنقیح فرمائی ہے جس کے بعض مختصر نمونے پیش کیے گئے ہیں ان سے یہ بخوبی واضح ہے کہ اس حلقہ کے دیگر بعض اکابر و ممتاز حضرات کی طرح حضرت کا مبلغ علم بھی اس معیار و کمال کو پہنچا ہوا تھا جس معیار و کمال کا تعلق تقلید محض کے حدود سے آگے بڑھ کر دائرہ اجتہاد سے ہے، کہ اجتہاد کا دائرہ محدود نہیں بہت وسیع ہے اور اہل تحقیق نے اس کے بھی مختلف مراحل تجویز کیے ہیں، حضرت بھی اپنی شان تحقیق اور تفوق علمی کی بنا پر بعض مراحل کے اہل جو حضرات قرار دیئے گئے ہیں بلاشبہ ان کی صف اوّل میں داخل اور سر فہرست ہیں۔

علماء دیوبند کی فقہی خدمات سے متعلق مقالہ میں شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی رح نے اپنے گرانقدر رسالہ "عقد الجید" میں اجتہاد کی بابت جو تفصیلات و تصریحات ذکر کی ہیں، ان کی روشنی میں یہ عرض کیا گیا ہے کہ اس حلقہ کے صفِ اوّل کے لوگ بلاشبہ اس مقام پر فائز ہیں کہ اہل اجتہاد میں ان کو شمار کیا جائے اور ان کو ان اہل اجتہاد میں مانا جائے جو کسی امام کی اتباع و تقلید اس طور پر کرتے ہیں کہ ہر حکم کی دلیل سے واقف ہوتے ہیں اور علی وجہ البصیرۃ اس پر وہ اطمینان

قلبی رکھتے ہیں، اور اس مقام پر ہونے کی وجہ سے وہ اکثر مسائل میں اتباع کرتے ہیں بعض میں حسب موقع اختلاف بھی کرتے ہیں، ایسے اکابر علماء کا اجتہاد "اجتہاد انتہائی اور خود مجتہد منتسب کہے جاسکتے ہیں [1]

نیز یہ کہ عام طور سے فقہاء نے اجتہاد و تقلید کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے اجتہاد مفید کے چند مراحل تجویز کرکے ایک مرحلہ "اجتہاد فی المسائل" کا قرار دیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ وہ مسائل جن کی بابت امام مذہب و علماء مذاہب کے اقوال نہ مل سکیں خواہ اس وجہ سے کہ وہ ان کے عہد میں پیش ہی نہ آئے ہوں یا اس وجہ سے کہ ان کے حق میں ان سے کوئی چیز محفوظ نہ کی گئی ہو، اپنے مقتدا امام اور اپنے معمول بہ مذہب کے اصول و قواعد اور جزئیات کے مطابق۔ ایسے مسائل کے احکام کا بیان کرنا اور ان کی تحقیق [2]، کم از کم عصر حاضر میں درپیش عصری و غیر عصری مسائل کے جوابات کی تحقیق و تصریح کی حد تک اجتہاد مفید کے اس مرحلہ پر تو ان حضرات کو جن میں حضرت تھانوی بھی شامل ہیں، فائز مانا جاسکتا ہے۔ وذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم۔

تربیت افتاء و فقہ

اہل علم خوب جانتے ہیں کہ فقہی مسائل کا بیان و افتاء کوئی معمولی چیز نہیں بلکہ نہایت ذمہ داری اور بڑی

---

[1] ملاحظہ ہو عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید، ابتدائی صفحات

[2] ملاحظہ ہو رسم المفتی اور مقدمہ عمدۃ الرعایۃ وغیرہ

اہمیت کا کام ہے اس لیے کہ اسی پر انسان کے دین و آخرت کا مدار ہے اور اسی وجہ سے اس میں محض کتابوں کا پڑھ لینا و پڑھا دینا اور فنی حذاقت و ذہانت کافی نہیں بلکہ اس کے لیے کسی ماہر و محقق صاحب فن اور کامل فن کی صحبت میں رہنے کی ضرورت ہوتی ہے جس کا اپنی تمام تر علمی قابلیتوں کے ساتھ محتاط و متقی ہونا بھی ضروری ہے، اس کی ضرورت اس لیے پیش آتی ہے کہ انسان فن کے اصول و ضوابط سے کام لینا سیکھے اور اس طرح اس کام کے لیے مناسب ذوق حاصل کرے، بالخصوص اس مصاحبت کی ضرورت اور اہمیت اس وجہ سے ہے کہ زمان و مکاں کے اختلاف کی وجہ سے فقہیات و افتاء کا کام کرنے والے کو بہت سے ایسے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جن کا قدیم ذخیرہ میں کوئی تذکرہ نہیں ہوتا اور کتابوں میں مذکور جزئیات و کلیات سے ان کا تعلق واضح بھی نہیں ہوتا، تو ایسے مسائل میں شریعت کا حکم جاننے اور ضرورتمند کی رہنمائی کے لیے دوسرے مسائل کی نسبت سے خاص انداز میں غور و فکر سے کام لینا پڑتا ہے جو بلاشبہ ایک قسم کا اجتہاد ہے اور کسی فن سے متعلق اجتہاد کے لیے فن کا ملکہ ہونا ضروری ہے، یہ مصاحبت و تربیت خاص طور سے اس ملکہ کے پیدا کرنے میں معین ہوتی ہے۔

حضرت تھانویؒ کی علمی صلاحیت و قابلیت کا تذکرہ گذر چکا ہے۔ اس ضرورت کی تکمیل کے لیے بھی اللہ تعالیٰ نے حضرت کے لیے اپنے فیضان کے دروازے پورے طور پر کھولے، اور آپ کو وقت کے دو اکابر اور فن کے ماہرین و کاملین کی مصاحبت و تربیت کا شرف حاصل رہا، ایک حضرت مولانا

محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ دوسرے حضرت گنگوہیؒ ان دونوں حضرات کا مقام اکابر کے حلقہ میں اور فقہ و افتاء کے باب میں معروف ہے، بالخصوص حضرت گنگوہیؒ کہ جن کو "فقیہ النفس" اور "ابو حنیفہ عصر" تک کہا گیا ہے اور مولانا انور شاہ صاحب نے علامہ رشید رضا مصری کی آمد پر استقبالیہ کی تقریر میں اور مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ نے اپنے گرانقدر رسالہ "علماء دیوبند کا مسلک" میں اس کا ذکر کیا ہے کہ ہم علماء دیوبند جزئیات میں حضرت گنگوہیؒ کو اپنا امام مانتے ہیں، دیوبند کے تعلیمی پانچ سالوں میں حضرت نے مولانا یعقوب صاحب کی نگرانی میں کام کیا اور حضرت گنگوہی کی وفات تک جو کہ ۱۳۲۳ھ میں ہوئی برابر ان سے مشورے لیتے رہے اور اصلاحات کرتے رہے۔

فقہی مسائل اور فتاویٰ کی تحقیق میں طریق کار

مفتی محمد شفیع صاحبؒ جن کے اپنے خصوصی مزاج کی وجہ سے حضرت تھانوی کی ان خدمات اور ان کے امتیازات و خصوصیات پر ان سے زیادہ کسی کی نظر نہیں ہو سکتی تھی۔ مفتی صاحب موصوف نے امداد الفتاویٰ کے مقدمہ میں حضرت کے طریق کار اور فتاویٰ و فقہی تحقیقات کی خصوصیات کو بیان فرمایا ہے وہ فرماتے ہیں۔

۱۔ جب کوئی مسئلہ سامنے آتا تھا کہ کتنا ہی سہل اور صاف ہو، کچھ لکھنے سے پہلے اسے بار بار بغور ملاحظہ فرماتے۔

۲۔ پھر جہاں تک ممکن ہوتا فقہا کے فتاویٰ و تحقیقات میں صریح جزئیہ تلاش فرما کر جواب تحریر فرماتے۔

۳۔ جس مسئلہ میں کوئی صریح جزئیہ دستیاب نہ ہوتا وہاں اصول و قواعد سے مسئلہ کا جواب تحریر فرماتے تھے۔

۴۔ نئے مسائل جو آلات جدیدہ کی ایجاد یا معاملات جدیدہ کے رواج کی وجہ سے پیدا ہوتے تھے ان میں مسئلہ کے ہر پہلو پر گہری نظر مسئلہ سے متعلق پوری تحقیق، اس کے ساتھ ساتھ ابتلائے عام اور عوام کی سہولت کو سامنے رکھنا حضرت کا مخصوص طرز تھا۔

۵۔ معمول یہ تھا کہ معاملات میں جہاں تک اصول فقہیہ کے دائرہ میں رہتے ہوئے عوام کو کوئی گنجائش یا سہولت دی جاسکتی تھی وہ ضرور دیتے، خصوصاً ایسے معاملات میں جن میں ابتلاء اور اضطرار عام ہو۔

۶۔ حتیٰ کہ اگر مذہب کی ضعیف سے ضعیف روایات سے گنجائش ملتی تو انہیں کو اختیار کر لیتے۔

۷۔ جیسے کہ اگر اپنے مذہب سے گنجائش نہ ملتی مگر مذاہب اربعہ میں ہوتی تو حسب موقع دوسرے مذہب کے قول کو اختیار فرماتے مگر بنیادی طور پر دو چیزیں سختی کے ساتھ پیش نظر رہتی تھیں۔

ایک تو یہ کہ اضطرار و ابتلاء عام ہو اور دوسرے اس دوسرے مذہب کی مکمل تحقیق اسی مذہب کے علماء سے کی جاتی محض اپنے مطالعہ سے کسی رائے کا اظہار نہ کیا جائے جیسا کہ "الحیلۃ الناجزہ" میں کیا گیا اور آگے آئے گا

احتیاط

مخلص آدمی کو یوں بھی اپنے کام و رائے پر اصرار نہیں ہوتا، پھر جبکہ معاملہ دین کا اور ذمہ داری کا ہو اس لیے

افتاء وفقہیات کے باب میں احتیاط کی تاکید ہے اور اہل اخلاص اصحاب علم کا یہ شیوہ رہا ہے عہد صحابہ سے لے کر آج تک، حضرت کا جو ذوق و مزاج تھا اس کی نسبت سے حضرت کے یہاں یہ وصف بھی کچھ زیادہ نمایاں اور اس کا کچھ زیادہ ہی اہتمام تھا۔ مفتی شفیع صاحب نے امداد الفتاوی کے خصائص کے تحت اس سلسلہ کی چند چیزیں یہ ذکر کی ہیں۔

۱۔ جب تک حضرت کے اساتذہ و مشائخ موجود تھے ان سے برابر طالب علمانہ استفادہ فرماتے رہے، اور جب اساتذہ کا عہد ختم ہو گیا تو علماء وقت سے مشوروں اور مذاکروں کے بغیر اہم مسائل میں کوئی فیصلہ نہیں فرماتے تھے، باوجود اس کے کہ علماء وقت زیادہ تر شاگرد یا شاگردان شاگرد تھے، اور فرماتے تھے کہ علماء کے مشورہ کی پابندی ضروری ہے ضابطہ کے بڑے نہ رہیں تو چھوٹے سہی۔

۲۔ اصول و قواعد کی رو سے جو تحقیق ہوتی اس کے آخر میں یہ تنبیہ ضرور ہوتی کہ یہ جواب اس بنیاد پر ہے صریح جزئیہ نہیں ملا اس لیے دوسرے علماء سے بھی مراجعت کر لی جائے اور اختلاف ہو تو مطلع کیا جائے۔

۳۔ تحقیق و کاوش کا معیار گذر چکا ہے پھر بھی سب حاضرین مجلس اور عام علماء کو تاکید تھی کہ میرے کسی فتویٰ و تحقیق سے کسی کو اختلاف ہو تو مجھے اس پر ضرور متنبہ کیا جائے اور اگر کسی بچہ نے بھی کسی تحریر و تحقیق پر کوئی اعتراض کیا تو اس کو اس طرح سنتے تھے جیسے کسی پیاسے کو پانی مل جائے۔

۴۔ کسی مسئلہ سے متعلق اظہار رائے کے بعد رائے بدلنے پر فوراً اس کا اعلان ہوتا تھا اور اس کی اشاعت کا اہتمام ہوتا تھا۔ خانقاہ سے نکلنے والے رسائل اور امداد الفتاوی کے اجراء کے ساتھ۔

۵۔ اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ حضرت نے ایک موقع پر صاف صاف فرمایا ہے کہ بندہ نے آئندہ کے لیے ایک کافی جماعت اہل علم و دیانت کی اس کام کے لیے مخصوص کر دی ہے کہ میری تمام تحریرات کو نظر تنقید سے دیکھ لیا جائے جو ان کی رائے میں قابل اشاعت نہ ہوں ان کو یا حذف کر دیں یا نشان بنا دیں تاکہ ان کو کوئی شائع نہ کرے۔

اسی انداز کی بہت سی ہدایات حضرت سے منقول ہیں جو اشرف السوانح[1] اور حضرت کی تالیفات سے متعلق رسالہ "تالیفات اشرفیہ" وغیرہ میں مذکور ہیں۔

۶۔ اور یہ تو کمال احتیاط تھا ہی کہ عمر بھر کوئی مسئلہ اپنی ذات و عمل سے متعلق پیش آیا تو کبھی اپنے فتوی پر عمل نہیں کیا بلکہ دوسرے ارباب افتا سے فتوی لے کر عمل کرتے اگرچہ وہ حضرت سے چھوٹے کیوں نہ ہوں۔

حضرت کی فقہی خدمات

ہماری اس تحریر و مقالہ کا موضوع حضرت تھانوی کی فقہی خدمات پر روشنی ڈالنا ہے، ہم معذرت خواہ ہیں کہ اصل مقصود تک پہنچنے میں تمہید میں

---

[1] اشرف السوانح ج ۳ ص ۱۰۸

کافی طول ہو گیا، مگر تمہید میں جو چیزیں ذکر کی گئی ہیں، حضرت کی ان خدمات کی اہمیت اور امتیاز و عظمت کے اظہار و بیان کے لیے ان کا ذکر ناگزیر تھا۔

گذشتہ سطور میں یہ بات آچکی ہے کہ اس فن سے متعلق حضرت کی خدمات سب سے زیادہ نمایاں ہیں اس لیے کہ ان کو وسعت بھی زیادہ حاصل ہے اور یہ مختلف الجہات بھی ہیں، حضرت کے ذریعہ اس جلیل القدر فن کی جو عظیم خدمات انجام پائیں، اصولی طور پر چار حصّوں میں تقسیم کی جا سکتی ہیں اور چار عناوین کے تحت ان کو سمیٹا جا سکتا ہے۔

۱۔ افتاء نویسی ۲۔ فقہی تصنیفات و تالیفات ۳۔ فقہی تالیفات کے لیے منصوبہ سازی ۴۔ فقہی شخصیت سازی۔

اب ہم ترتیب وار ان چاروں جہتوں پر اپنی ناقص معلومات و فکر کے مطابق روشنی ڈال رہے ہیں۔

افتاء نویسی

حضرت کی فقہی خدمات اور فقہی مآثر کے سلسلہ کی اوّلین چیز جو کہ آپ کی ساری علمی زندگی، بلکہ سلسلۂ تعلیم و تعلم میں آنے کے بعد آپ کی پوری زندگی کو محیط ہے، وہ افتاء نویسی کی خدمت اور آپ کے فتاویٰ ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا حضرت کے ساتھ ایک خصوصی معاملہ یہ بھی رہا کہ حضرت کو تقریباً ۸۰ سال کی عمر عطا کی گئی، سنہ ۱۳۰۰ھ پر آپ کی طالب علمانہ زندگی کا اختتام ہوا، اور سنہ ۱۳۰۱ھ سے معلمانہ و عالمانہ زندگی کا آغاز ہوا، جس سے عمر کے آخری

سال و ایام تک برابر تعلق قائم رہا، اور ۱۳۶۲ھ میں وفات فرمانے پر یہ زمانہ کل تقریباً باسٹھ سال کا ہوا، جس میں آپ نے یہ گرانقدر خدمت انجام دی۔ اور ایسا نہیں ہے کہ طالب علمی کا دَور محض طالب علمانہ ہی دَور رہا ہو۔ بلکہ اس دَور کے آخری پانچ سال بھی خدمت افتاء کی مدّت میں شامل ہیں بایں معنیٰ کہ اسی زمانے میں آپ نے اپنے استاد خاص مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ کی نگرانی میں افتاء نویسی کی مشق کی اور اس شان کے ساتھ کہ اس عہد کے بطور مشق تحریر کردہ فتاویٰ بھی آج اُمّت کی رہنمائی کے لیے مطبوعہ موجود دستیاب ہیں، ان پانچ سالوں کو شمار کرنے پر افتاء کی خدمت کا کل عرصہ تقریباً سڑسٹھ سال کا ہوتا ہے، ظاہر ہے کہ اتنے سال تک ایسی عظیم خدمت کا انجام دینا جبکہ اتنی عمر بکثرت لوگوں کو نہیں ملتی، سعادت بالائے سعادت کے علاوہ اور کیا ہے

حضرت کے فقہی ذوق و مزاج، تربیت اور طریق تحقیق و احتیاط کا تذکرہ گذر چکا ہے، اس موقع پر حضرت کے فتاویٰ کی بعض ان خصوصیات کو نمایاں کرنا ہے جن کی وجہ سے ان کو اہمیت حاصل ہے اور برابر رہے گا، اور جن کی وجہ سے حضرت کے فتاویٰ کا مجموعہ آج فقہ حنفی کے گرانقدر مآخذ میں شمار ہوتا ہے اور عصر حاضر میں اس خدمت کو انجام دینے والے کا بہترین رہنما ہے

الف) تحریر کردہ فتاویٰ کی نقل و ضبط

فتاویٰ میں جو کچھ بیان کیا جاتا ہے اگرچہ اس کی تحریر و بیان کی نوبت شخصی یا وقتی احوال و عوارض کی بنا پر آتی ہے، مگر وہ احکام شخصی یا وقتی نہیں ہوتے اس لیے کہ شریعت کے احکام نہ شخصی

ہیں اور نہ وقتی، اس لیے وہ احکام اس قسم کے عوارض و احوال سے دوچار ہر فرد کے لیے ہوتے ہیں خواہ جس جگہ ہو اور جس زمانے میں ہو پھر یہ کہ بہت سی چیزیں کافی کاوش اور تحقیق بسیار کے بعد سامنے آتی ہیں اور وہ عام ضرورت کی ہوتی ہیں۔

اس لیے اس اہتمام کو ہمیشہ پسند کیا گیا ہے کہ تحریر کردہ فتاویٰ کو جمع کیا جائے، اسی کی بدولت آج قدماء و متاخرین کے فتاویٰ کے گرانقدر مجموعے ہمارے پاس موجود ہیں، بہرحال مذکورہ ضرورت کی بنا پر حضرت کے یہاں اس کا اہتمام ناگزیر تھا، پھر جبکہ حضرت کے مزاج میں ہی عام نظم و ضبط تھا جو زندگی کے ہر پہلو سے متعلق تھا، ہر باب و فن میں علم و معرفت کے گرانقدر موتی چن چن کر جمع کرنا اور دوسروں کے افادہ کے لیے عام کرنا حضرت کا مزاج تھا۔ جب حضرت کو اپنے مواعظ و تحریرات میں حتمی طور پر آنے والے مختلف علوم و فنون سے متعلق نکات کو چھانٹنے اور ان کی باقاعدہ فہرست مرتب کرنے کا اہتمام تھا، تو یہ چیز تو مقصود ہی ہے۔ اس لیے حضرت کے یہاں اس کا نہ صرف اہتمام بلکہ کمال اہتمام تھا اور ابتداء عہد سے ہی، جس میں پانچ سالہ دورِ تربیتِ افتاء بھی شامل ہے کہ حضرت نے اس عہد کے فتاوی کو بھی محفوظ رکھنے کا اہتمام فرمایا اور وقت آنے پر ان کو بھی شائع کرایا، فتاوی کی نقل و ضبط کے اہتمام کی وجہ سے حضرت کے فتاویٰ کا بہت بڑا مجموعہ جمع ہو گیا جو آج امّت کی رہنمائی کے لیے موجود ہے اور جس سے نہ صرف عامۃ الناس عام علماء فائدہ اٹھا رہے ہیں بلکہ اہل افتاء کے لیے بھی وہ ایک سند کی حیثیت

رکھتا ہے۔

ب) فتاویٰ کی اشاعت

یوں تو فتاویٰ ہر عہد میں جمع کیے جاتے رہے اور ان کے مجموعوں کی اشاعت بھی ہوتی رہی، آج دیار ہند کے ماضی قریب میں گذرنے والے بہت سے اکابر اہل افتاء کے فتاویٰ کے مجموعے مطلوبہ صورت میں موجود ہیں مگر حضرت کے فتاویٰ کو اس باب میں بھی ایک گونہ خصوصیت حاصل ہے، اور وہ حضرت کے خصوصی مزاج اور حضرت کے ذوق کے مطابق معاونین کی فراہمی اور حضرت کے زیر سایہ علمی خدمات کی انجام دہی کی بناء پر ہے۔

حضرت نے جس طرح اپنے فتاویٰ کے ضبط و جمع کا خصوصی اہتمام فرمایا جب اللہ تعالیٰ نے صورتیں پیدا فرمائیں تو حضرت نے اپنے سامنے ہی اور اپنی حیات میں ہی خود ان کی اشاعت کا بھی کمال اہتمام فرمایا، اور وہ یوں کہ جب حضرت نے تھانہ بھون میں قیام اختیار فرمایا، اور وہاں خانقاہ بدرسہ دونوں کا کام سنبھالا اور شریعت و طریقت دونوں کی خدمت کا بیڑہ اٹھایا تو کام کے پھیلنے کے ساتھ ساتھ حضرت کے کمال نظم و ضبط نیز وقت و ضرورت کی مزاج شناسی کی بناء پر اس کا بھی اہتمام بڑھتا گیا اور صورتیں پیدا ہوتی گئیں کہ حضرت کے ذریعہ جو خدمات انجام پا رہی تھیں ان کا سلسلہ زائد سے زائد وسیع اور ان کا افادہ عام ہو، چنانچہ جیسے مواعظ کی نشر و اشاعت کی طرف توجہ ہوئی اس کے لیے خانقاہ سے رسائل کا اجراء ہوا اور دوسرے مقامات سے بھی، اسی طرح فتاویٰ کی اشاعت کی طرف بھی توجہ ہوئی، اور دھیرے دھیرے

ترتیب وار حضرت کے فتاوی برابر شائع ہوتے رہے، حتیٰ کہ حضرت کے تحریر کردہ تقریباً سارے ہی فتاویٰ حضرت کی حیات میں ہی شائع ہو کر عام ہو گئے۔

امداد الفتاویٰ اشاعت کا سلسلہ ۱۳۲۷ھ سے شروع ہوا اور ۱۳۶۲ھ تک برابر چلتا رہا، ابتداءً ۱۳۲۶ھ ۱۳۲۷ھ میں اس وقت تک کے تمام فتاویٰ چار جلدوں میں شائع ہوئے جن کو خود حضرت نے اصولی طور پر تین حصوں میں یوں تقسیم فرمایا تھا کہ پہلا حصہ ان فتاویٰ کا تھا جو حضرت نے زمانۂ طالب علمی میں مولانا یعقوب صاحب کی زیر سرپرستی تحریر فرمائے تھے یہ ۱۲۹۷ھ سے لے کر ۱۳۰۱ھ تک کے فتاوی ہیں، دوسرا حصہ کانپور کے زمانۂ قیام کے فتاوی کا مجموعہ ہے جو کہ ۱۳۰۱ھ سے لے کر ۱۳۱۵ھ تک کے اوائل فتاویٰ پر مشتمل تھا جن میں کثرت کے ساتھ حضرت گنگوہیؒ سے مراجعت کا موقع ملا تھا۔

اس کے بعد جو فتاویٰ تحریر فرماتے جاتے رہے وہ بتدریج وقفے وقفے سے "تتمہ امداد الفتاویٰ" کے نام سے شائع ہوتے رہے، مگر تتمات کے عنوان و جامہ میں صرف ۱۳۴۷ھ تک کے فتاویٰ کی اشاعت ہو سکی۔ اس کے بعد کے فتاویٰ خانقاہ سے نکلنے والے ماہوار رسالہ "النور" میں ہوتی رہی اور حضرت کی اخیر عمر تک، اور اس اشاعت سے بہت تھوڑے سے فتاوی رہ گئے تھے، تتمات کل پانچ ہیں پہلا ۱۳۲۷ھ تا ۱۳۳۰ھ تک دوسرا ۱۳۳۱ھ و ۱۳۳۲ھ کے، تیسرا ۱۳۳۳ھ چوتھا ۱۳۳۴ھ اور پانچواں ۱۳۳۵ھ تا ۱۳۴۷ھ

تک کے فتاویٰ کا مجموعہ ہے۔

وقفہ وقفہ سے مختلف سالوں کے فتاویٰ کی اشاعت کی وجہ سے سارا مجموعہ مرتب نہیں تھا کہ ایک ایک باب کے سارے فتاویٰ ایک ساتھ ہوں نیز ترجیح کا سلسلہ بھی منتشر تھا جیسا کہ آگے تفصیل آئے گی اس کی وجہ سے فتاویٰ کے مجموعہ سے کسی چیز کی تلاش میں زحمت ہوتی تھی۔ آخر مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے اس کی طرف توجہ فرمائی اور مولانا ظہور احمد صاحب دیوبندی کے تعاون سے اس کی ترتیب و تبویت کا کام کیا، مگر اشاعت کا مرحلہ آنے پر تقسیم ملک کا ہنگامہ کھڑا ہوا مفتی صاحب نے ہجرت فرمائی اور حسن اتفاق کہ مجموعہ پوری حفاظت سے ان کے ساتھ پاکستان پہنچا اور بالآخر ۱۳۷۱ھ سے امداد الفتاویٰ مرتب و مبوب کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا اور پورا مجموعہ چھ ضخیم جلدوں میں منظر عام پر آیا، جو حضرت کے قلم فیض رقم سے تحریر کردہ ہزاروں فتاویٰ پر مشتمل ہیں۔

امداد الفتاویٰ مبوب کی خصوصیات

امداد الفتاویٰ کا موجودہ مبوب و مرتب مجموعہ میں مفتی صاحب نے محنت شاقہ برداشت کر کے جو کام کیا ہے اس کو خود مفتی صاحب کے الفاظ میں ملاحظہ فرمایئے۔

(الف) ایک مسئلہ کے متعلق حضرت کے جتنے فتاویٰ مختلف ادوار عمر میں مختلف جلدوں میں شائع ہوئے ان سب کو یکجا کر دیا گیا۔

(ب) جس مسئلہ کے متعلق تصحیح امداد الفتاویٰ ضمیمہ ابتدائی چار جلدوں میں یا

اصلاح تسامح ضمیمہ تتمہ اولیٰ وثانیہ میں یا ترجیح الراجح ضمیمہ بقیہ تتمات میں کوئی بحث تھی وہ سب بحثیں ایک جگہ جمع کر دی گئی ہیں۔ اور جس مسئلہ میں حضرت نے رجوع یا اصلاح فرمائی ہے اس کی بدلی ہوئی صورت کو اصل کتاب میں لکھ دیا گیا اور جو پہلی صورت تھی اس کو بھی حاشیہ میں باقی رکھا گیا۔

(ج) ہر مسئلہ کے ساتھ اس کی طبع قدیم کی جلد اور صفحہ کا بھی حوالہ لکھ دیا گیا تاکہ اشتباہ کے موقع پر اصل کی طرف مراجعت سہل ہو۔

(د) جن مسائل میں متعدد فتاوی بظاہر متعارض نظر آئے اور ترجیح الراجح وغیرہ میں بھی اس پر کوئی کلام نہیں ملا، ان کی تطبیق و توضیح کے لیے حاشیہ میں توضیح کر دی گئی ہے۔

(ھ) جن مسائل میں کوئی اغلاق وابہام تھا ان پر حواشی لکھ کر وضاحت کر دی گئی

(و) ترتیب میں قدیم طرز کے ابواب فقہیہ کے ساتھ اہم مسائل کے لیے جدید عنوانات اور فصول بھی قائم کی گئیں۔

(ز) فتاوی کے ترتیبی نمبر ہر جلد کے علیحدہ علیحدہ لکھ دیئے گئے۔

یہ مبوّت و مرتب مجموعہ پاکستان سے شائع ہوا تھا جیسا کہ ذکر کیا گیا۔ ہندوستان میں دستیاب نہیں تھا، ادھر چند سالوں میں دیوبند کے ایک ادارے "آوارہ تالیفات اولیاء" نے بتدریج اس کی ساری جلدیں شائع کی ہیں، اس اشاعت کی جلد اوّل میں مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری سے تصحیح و تحشیہ کا بھی کام کرایا ہے اس کی وجہ سے اس جلد کی افادیت مزید بڑھ گئی ہے، افسوس کہ بقیہ جلدوں میں یہ کام نہیں ہو سکا ہے۔

(ج) حوادث الفتاوی

ضروریاتِ زندگی لاتعداد اور درپیش مسائل و مشکلات غیر محصور ہیں، یہی وجہ ہے کہ موقع پڑنے پر ہر آدمی کے حال کے مطابق جزئیات اگر کتب فقہ میں تلاش کیے جائیں تو فقہ و فتاوی کے وسیع سے وسیع ذخائر بھی عاجز و ناقص نظر آتے ہیں، تاہم پھر بھی بہت سی ضروریات اور حالات میں زمان و مکان کے اختلاف کے باوجود قدرِ اشتراک پایا جاتا ہے، اور ان کے مطابق فتاوی ہر عہد میں کام آتے ہیں اور ان سے سہولت ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ قدیم سے قدیم ذخائر سے برابر کام لیا جارہا ہے۔

لیکن بعض زمان و مکان میں کچھ ایسے انقلابی حالات پیش آتے ہیں کہ جن کے نتیجے میں شرعیات و فقہیات کے باب میں بھی نئے نئے مسائل اور صورتیں سامنے آتی ہیں جو کہ سابق ذخائر پر اضافے کی مقتضی ہوتی ہیں اور ان کی بابت کسی رائے کے اظہار کے لیے بڑی تحقیق و جستجو و دقتِ نظر اور فنی ملکہ کی ضرورت ہوتی ہے۔

خاص طور سے اخیر کی دو صدیاں اور ان کا جو حصّہ برابر گذر رہا ہے اور آرہا ہے، وہ اس سلسلہ میں بہت اہم ہے کہ یہ عہد سائنس و ایجادات کا عہد کہلاتا ہے، اس میں نہ جانے کتنی صدیوں کے عقلی و فکری مسلّمات یکسر بدل گئے، ضروریاتِ زندگی کا معیار اور اسبابِ زندگی کی صورتیں پہلے سے بالکل بدل گئیں اور شرعیات کے باب میں بھی اس عہد نے اُمّت کو ایسے نازک موڑ پر لے جاکر کھڑا کر دیا کہ بہت سے دین سے لگاؤ رکھنے والے، پڑھے لکھے

مگر تجدد زدہ بھی یہ کہنے لگے کہ نعوذ باللہ شریعت کے احکام اس عہد کا ساتھ نہیں دے سکتے، اس عہد نے زندگی کے ہر میدان و مرحلے میں بے شمار طرح طرح کے مسائل پیدا کیے ہیں، فقہ کا کوئی باب ایسے مسائل سے خالی نہیں خواہ عبادات ہوں یا معاملات، تجارت و ملازمت ہو یا زراعت حتیٰ کہ نکاح و طلاق بھی۔

ظاہر ہے کہ ایسے عہد میں کارِ افتاء اور مسائل فقہیہ کا بیان نہایت دشوار کن کام اور بڑی ہی اہم ذمہ داری کا حامل ہے، اور اصول و فروع سے گہری واقفیت، کتاب و سنت سے پوری واقفیت اور اعلیٰ درجہ کی اجتہادی صلاحیتوں کے بغیر یہ کام نہیں ہو سکتا۔ اس صدی میں جن حضرات نے افتاء کی ذمہ داری سنبھالی سب کو ایسے مسائل کا سامنا کرنا پڑا لیکن اوّلین مرحلوں میں جبکہ گویا ان مسائل کا ایک سیلاب اُمنڈا چلا آرہا تھا جن حضرات نے مورچہ لیا ہے اور نہایت اہتمام سے اس ذمہ داری کو ادا کر کے بعد میں آنے والوں کے لیے راہیں کھولی ہیں ان میں حضرت تھانوی کا ایک نمایاں مقام ہے، بلکہ امتیاز حاصل ہے بالخصوص اس لیے کہ حضرت کو امت کی صلاح و اصلاح کا جو فکر دامنگیر تھا اس کی وجہ سے خود حضرت کو ایسے مسائل کی بابت کھوج و تحقیق کا اہتمام تھا تاکہ ضرورت مندوں کی مکمل رہنمائی کی جا سکے، جیساکہ حوادث الفتاویٰ اول کے خطبہ میں حضرت نے وضاحت بھی فرمائی ہے۔

حضرت نے جو فتاویٰ تحریر فرمائے ان میں ایسے فتاویٰ کا بہت بڑا ذخیرہ ہے اور تقریباً ہر باب کے تحت ایسے مسائل ہیں اور حضرت نے

اپنے خصوصی مزاج کی وجہ سے ان کی اہمیت کے پیشِ نظر ان کی اشاعت کا اہتمام بھی ان کو نمایاں و ممتاز کر کے کیا ہے۔ چنانچہ اس عنوان سے مستقل مجموعے شائع کرائے۔ فتاویٰ کے اولین مجموعے جو چار جلدوں میں شائع ہوتے تھے ان کی اشاعت میں تو ان کو ممتاز نہیں کیا گیا مگر تتمات کی اشاعت کا جب سلسلہ شروع ہوا تو تتمہ ثانیہ سے اس کا سلسلہ شروع کیا گیا اور ہر تتمہ کے ساتھ "حوادث الفتاویٰ" کے عنوان سے عصری مسائل سے متعلق فتاوی کا مجموعہ شائع ہوتا رہا۔ اور یکے بعد دیگرے اس کے چار حصے شائع ہوئے جو کہ تقریباً تین سو صفحات پر مشتمل ہیں اور ان میں بھی پہلے دو حصوں میں ہر باب کے مسائل کو الگ الگ ذکر کیا گیا ہے لیکن بعد میں یہ اہتمام باقی نہیں رہا اس لیے کہ اوّلین دونوں حصے ضخیم تھے، مفتی صاحب نے فتاویٰ کی تبویب و ترتیب کا کام جب فرمایا تو سہولت کے پیشِ نظر اس مجموعے کو بھی ترتیب و تبویب میں شامل فرمالیا، اس کے نتیجے میں اب یہ مسائل پورے مجموعہ میں حسب موقع پھیلے ہوتے ہیں، تاہم ان کا بڑا حصہ بیوع و اجارہ اور حظر و اباحت کے ابواب میں شامل ہے، بلکہ کتاب البیوع کے تحت ترتیب جدید میں بھی حوادث الفتاویٰ" کا عنوان قائم کر کے بیوع کے باب کے ایسے مسائل کو نمایاں کیا گیا ہے، یہ حصہ موجودہ ایڈیشن کے حصہ سوم کے صفحہ ۱۲۰ سے لے کر تقریباً تین سو تک پھیلا ہوا ہے۔

(د) ترجیح الراجح

اہل حق و اہل اخلاص علماء کا ہر عہد میں یہ امتیاز رہا ہے کہ مجتہدات میں انہیں اپنی رائے پر

اصرار نہیں رہا ہے۔ بایں معنی کہ وہ اپنے علم وتحقیق کی بنیاد پر جس رائے تک پہنچیں حق اسی کو سمجھیں اور دوسری رائے کے قائل کے لیے حق سے تعلق کی کوئی گنجائش نہ سمجھیں، نیز یہ کہ کسی رائے کو اپنانے کے بعد خواہ کیسے ہی دلائل سامنے آئیں جو کہ سابق رائے سے رجوع کے مقتضی ہوں مگر وہ اپنی رائے پر اڑے رہیں، ان کی یہ شان نہیں رہی بلکہ ان کا شعار یہ رہا کہ ایسا موقع آنے پر بے تکلف انہوں نے دوسری رائے کو اختیار کر لیا اور سابق سے رجوع کر لیا اور چونکہ کسی شرعی مسئلہ سے متعلق جس رائے کا اظہار کوئی عالم کیا کرتا ہے۔ اس پر عمل محض اسی کی ذات تک محدود نہیں ہوتا بلکہ جس ضرورتمند کے سامنے وہ اس کا اظہار کرتا ہے اور جس کے علم میں آتی ہے سب اس پر عمل کرتے ہیں اور کسی رائے کی بابت غلطی کے سامنے آجانے پر کسی کے لیے اس پر عمل کی گنجائش نہیں رہ جاتی اس لیے ایسا موقع آنے پر سابق رائے سے رجوع کا اعلان بھی ضروری ہوتا ہے خواہ اس کے لیے جو طریقہ مناسب سمجھا جائے، چنانچہ جن حضرات کے یہاں کسی رائے سے رجوع کی نوبت آتی ہے وہ حسب موقع رجوع کا اعلان بھی کرتے رہے ہیں اور کرتے ہیں۔

حضرت تھانویؒ کے یہاں بھی اس چیز کا اہتمام تھا اور حضرت کے ذوق ومزاج کے شایان شان گذشتہ اوراق میں حضرت کے طرق تحقیق اور احتیاط کا تذکرہ گذرا ہے، ظاہر ہے کہ اسی سب کا حاصل اور اس کے اہتمام کا باعث اس کے علاوہ کیا تھا کہ اگر چوک ہو گئی ہو تو اپنی رائے سے رجوع کر کے راہ صواب کو اپنایا جائے، حضرت نے سابق آرا سے رجوع کے اعلان اور

دوسروں کو اس سے مطلع کرنے کے لیے بھی اپنے شایان شان اہتمام فرمایا تھا اور چونکہ حضرت ایک طویل عرصہ تک افتار کی خدمت انجام دیتے رہے اس لیے اس کے مواقع بار بار آتے رہے، اس سلسلہ میں حضرت نے یہ اہتمام فرمایا کہ جب فتاوی کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا تو اس کے ساتھ اس کا بھی سلسلہ شروع فرمایا اور اتنا اہتمام فرمایا کہ "ترجیح الراجح" کے نام سے ایسے مسائل پر مشتمل مستقل اجزار مرتب فرما کر شائع کرائے اگرچہ ان اجزار کی اشاعت کا سلسلہ تتمۂ ثالثہ کی اشاعت کے ساتھ شروع ہوا اور تتمۂ خامسہ تک جاری رہا، اور اس کے بعد سب کچھ الجبلہ میں چھپتا رہا۔ اور مستقل اجزار کی اشاعت سے پہلے اس سلسلہ میں یہ کیا گیا کہ امداد الفتاوی کی ہر جلد کے ساتھ شروع میں "تصحیح امداد الفتاویٰ" کے عنوان سے ایسے مواقع و مسائل کو ذکر کر دیا گیا، اور تتمۂ اولیٰ و تتمۂ ثانیہ کے آخر میں "ملحقات" کا عنوان قائم کر کے اس کے تحت "اصلاح تسامح" کے عنوان سے ایسے مواقع و مسائل کا تفصیل کے ساتھ تذکرہ کیا گیا ہے۔

اور چونکہ یہ مرحلہ امداد الفتاویٰ و تتمات کی اشاعت کے موقع پر آتا تھا۔ اس لیے جب "النور" کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا تو یہ تو ہوتا ہی تھا کہ کسی مسئلہ میں رائے بدلتے ہی فوراً النور کی اولین اشاعت میں اس کا اعلان کرا دیا جاتا تھا، اب یہ ہی سارا سلسلہ ترتیب و تبویب کے تحت یکجا ہو گیا ہے۔

(۵) تنوع موضوعات

حضرت کے فتاویٰ کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ کتب فقہ میں معروف ابواب و فصول سے متعلق مسائل کے علاوہ ایسے ابواب سے متعلق مسائل بھی ان میں

ہیں جو فقہ وفقہا کا دائرہ کار سے تعلق نہیں رکھتے اور ایسا نہیں کہ اس قسم کے فتاویٰ دوچار بہت تھوڑی تعداد میں ہوں، نہیں بلکہ فتاویٰ کا ایک تہائی حصّہ اور اس سے زائد ہی ایسے امور سے متعلق ہے، فتاوی کی چھ جلدوں میں سے جو کہ متداول ہیں۔ اخیر کی دو جلدیں تو پوری کی پوری ایسے ہی موضوعات سے متعلق ہیں۔

ان موضوعات سے مراد کلامیات اور تفسیر و حدیث اور سلوک ہیں، کلامیات کا معاملہ تو یہ ہے کہ اس سلسلہ کی بہت سی چیزوں کو فقہاء، کتاب السیر کے تحت ذکر کر دیا کرتے ہیں۔ جیسے کہ بعض حضرات نے سلوک سے متعلق بعض چیزیں بھی لے لی ہیں مگر تفسیر و حدیث کی تشریح و توضیح کا دائرہ افتاء سے کوئی تعلق نہیں ہے جیسے کہ کلامیات وغیرہ سے متعلق جو توسع و بسط اس مجموعے میں ہے وہ فقہ و فتاوی کی کسی کتاب میں نہیں ہے، جیسے کہ "کتاب الحظر والاباحۃ" کی تہذیب و تفصیل بھی اس کا امتیاز ہے، جو کہ جلد رابع کے تقریباً ساڑھے تین سو صفحات پر مشتمل ہے، جبکہ اس کے بہت سے جزئیات اس جلد کے نصف میں "مسائل شتیٰ" کے عنوان کے تحت بھی مذکور ہیں اور دوسرے مواقع پر بھی آئے ہیں، ہم نے ذکر کیا ہے کہ دیگر موضوعات میں تفسیر و حدیث اور سلوک و کلام سے متعلق فتاوی ہیں۔ حضرت کے فتاوی میں ان چیزوں کا توسع کے ساتھ شمول کچھ تو حضرت کی علمی جامعیت کی وجہ سے ہے جس کا تذکرہ تفصیل سے گذر چکا ہے اور کچھ دراصل اس عہد کے حالات کی وجہ سے،

تفسیر حدیث وسلوک سے متعلق استفسارات میں بعض آیات و احادیث تحقیق و تشریح، اور بعض مواقع سے

متعلق اشکالات، کے رفع کا سوال ہے، حضرت نے حسب موقع جواب عنایت فرمایا ہے، اور سلوک سے متعلق استفسارات کا حال بھی یہی ہے کہ کہیں کسی چیز کی تشریح و توضیح ہے اور کہیں کسی اشکال کا حل و دفعیہ اور کہیں مصطلحات تصوف و سلوک کو واضح کیا گیا ہے۔

کلام دوسرے موضوعات میں بڑا حصّہ کلامیات سے متعلق ہے، جس کے تحت ان امور کی بابت بھی تحقیق ہے جن پر ایمان و کفر کا مدار ہے اور ان چیزوں سے متعلق بھی جو کہ سنّت یا بدعت کے تحت آتی ہیں۔ دونوں قبیل کے بے شمار موضوعات و جزئیات سے متعلق استفسارات پر حضرت کے فتاوی مشتمل ہیں، بلکہ بدعات کے قبیل کی کچھ چیزوں کو نمایاں کر کے بھی ذکر کیا گیا ہے۔

ان مسائل سے متعلق اتنے وسیع پیمانے پر سوالات اور بسط کے ساتھ تحقیق کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ چودھویں صدی کا نصف اوّل جو حضرت کے کارِ افتاء کا اصل عہد رہا ہے، وہ ان امور کی نسبت سے بڑا پُرآشوب و ہنگامہ خیز رہا ہے، اور اس عہد میں ملت ہندیہ مسلمہ کی مختلف گروہوں میں بٹی رہی ہے اور اہل حق کو مختلف فرقوں کا سامنا کرنا پڑا ہے جو کہ زیغ و ضلال کا بازار گرم کیے ہوئے تھے، کوئی بدعات کی راہ سے اور کوئی کفر و ارتداد کی راہ سے، اور کسی نے شکوک و شبہات کو ذریعہ بنا رکھا تھا۔

ایک طرف مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنا فتنہ کھڑا کر رکھا تھا، دوسری طرف انگریزوں نے ملک و متاع لوٹنے کے بعد دولت ایمان کے لوٹنے کیلئے

تحریک چلا رکھی تھی، اسی طرح ایک طرف انگریزی تعلیم و نظام سے متاثر اور سائنسی ترقیات سے مرعوب مسلمان نئے نئے نظریات و خیالات کو اسلامی فکر کے عنوان سے اور اسلامی لبادہ و جامہ میں پیش کر رہے تھے اور قرآن و حدیث کو انہی کے مطابق ڈھال رہے تھے، دوسری طرف بدعات و رسومات عروج پر تھیں، بالخصوص اس وجہ سے کہ اس وقت کے بعض نام نہاد علماء نے ان کی تائید و تقویت کے لیے پوری تحریک چلا رکھی تھی حتیٰ کہ اس کے پیچھے انہوں نے سارے علماء حق بلکہ ہر اس سنجیدہ مسلمان کی تکفیر تک کا بیڑہ اٹھایا تھا جو ان چیزوں کو کبھی پسند نہیں کرتا اور نہ ان کو بنظر استحسان دیکھتا ہے بلکہ ان کے کھلے ہوئے مقاصد کے پیش نظر ان سے دور رہتا ہے اور ان کو منع کرتا ہے۔

بہر حال یہ وہ حالات تھے جن کی وجہ سے اس قبیل کے استفسارات بکثرت حضرت کی خدمت میں آتے اور جن کی وجہ سے حضرت نے بعض مستقل کتب و رسائل کی بھی تالیف فرمائی جو اپنی اپنی جگہ پر نہایت وقیع ہیں، اور فتاویٰ میں حضرت نے جو کچھ رقم فرمایا ہے وہ تو ہے ہی، امداد الفتاویٰ کے موجودہ متداول مرتب نسخ کی چھٹی جلد پوری کی پوری اسی قسم کے مسائل سے متعلق ہے جبکہ جلد پنجم کا بھی اچھا خاصا حصہ یعنی تقریباً نصف زیادہ تر اسی موضوع سے متعلق مسائل و استفسارات پر مشتمل ہے۔

(ز) خانقاہ امدادیہ سے صادر ہونے والے دیگر فتاویٰ

حضرت سے تعلق رکھنے والے خوب جانتے ہیں کہ حضرت کی خانقاہ کی حیثیت ایک مکمل ادارے کی تھی۔

ایسا ادارہ جو کہ بہم وجوہ دین و مسلمانوں کی خدمات میں مصروف تھا، اس کے تحت تزکیہ کے کام کے ساتھ تعلیم و کتاب و حکمت کا بھی کام ہوتا تھا جس کے روح رواں حضرتؒ ہی تھے مگر دوسرے بہت سے لائق متعلقین کو بھی حضرت نے لگا رکھا تھا، حضرت کے فقہی مقام اور عام مرجعیت کی بنا پر خانقاہ میں استفتاءات کا ایک ہجوم رہتا تھا اور ان سب کا جواب خود حضرت ہی دیتے، حضرت کی مشغولیات کی وجہ سے حضرت کو اتنی فرصت نہیں تھی اس لیے حضرت خانقاہ کے بعض مدرسینؒ اہل فن سے بھی یہ کام لیا کرتے تھے۔ خانقاہ میں رہ کر جن لوگوں نے بڑے پیمانہ پر یہ خدمت انجام دی وہ دو حضرات تھے، مولانا عبدالکریم صاحب گمتھلوی اور مولانا ظفر احمد صاحب چنانچہ دونوں کے فتاویٰ کے مجموعے الگ الگ شائع ہوئے، اور حضرت نے ان کے مستقل نام تجویز فرمائے، چونکہ یہ کام خانقاہ میں انجام پایا، اور حضرت کے تربیت کردہ افراد کے ذریعہ اور بالیقین حضرت کی تصویب و تصحیح کے بغیر یہ فتاویٰ روانہ نہ کیے جاتے ہوں گے، اس لیے حضرت کی "خدمت افتاء نویسی" کے تحت ان کو بھی شمار کیا جا سکتا ہے، پھر جبکہ حضرت نے ان حضرات کے فتاوی کی نسبت سے یہاں تک فرمایا ہے کہ ان کا تحریر کردہ فتویٰ میں اپنا ہی تحریر کردہ سمجھتا ہوں۔

تصنیفات و تالیفات

حضرت کی فقہی خدمات کا دوسرا اہم جزء وہ تصنیفات و تالیفات ہیں

جن کو حضرت نے کسی فقہی مسئلہ و جزئیہ یا فقہی مسائل سے متعلق مرتب کیا ہے۔
ویسے یہ سلسلہ زیادہ تر رسائل کی صورت میں رہا ہے۔ اور رسائل کی اس باب میں اس وجہ سے اہمیت زیادہ ہے کہ رسائل کی تالیف عموماً کسی ایک مسئلہ یا پہلو کو موضوع بحث بنا کر ہوا کرتی ہے اس لیے اس سے متعلق اس میں بھرپور تحقیق کی جاتی ہے اور معلومات جمع ہو جاتی ہیں جب کسی تالیف کا موضوع پھیلا ہوا ہوتا ہے تو ایک ایک مسئلہ کو بسط و تفصیل کے ساتھ ضبط کرنا ایک مسئلہ ہوتا ہے مگر جب محض کسی ایک پہلو یا مسئلہ سے متعلق کسی تحریر یا تالیف کو مرتب کرنا ہو تو موضوع کے اختصار کے پیش نظر کلام کو طول دینے میں کوئی دقت معلوم ہوتی ہے
یہی وجہ ہے کہ اس قسم کے رسائل کی ہر زمانے میں اہمیت رہی ہے، بالخصوص اس صورت میں جبکہ کسی ایک ہی عالم کے قلم سے اس سلسلہ کے کوئی مجموعہ تیار ہو جائے۔ چنانچہ ماضی بعید کے علماء احناف میں علامہ ابن نجیم مصری کے رسائل معروف ہیں، پھر علامہ شامی کے رسائل کا مجموعہ بڑی وقعت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا رہا ہے، بلاد ہند کے علماء میں سے مولانا عبدالحی صاحب نے مختلف موضوعات پر رسائل ترتیب دے کر اس سلسلہ میں گرانقدر اضافہ فرمایا، اور علماء دیوبند میں سے حضرت تھانوی اور مفتی شفیع صاحب اس گرانقدر خدمت کی انجام دہی میں نمایاں ہیں۔

حضرت کی علمی خدمات کا سلسلہ تو وسیع ہے ہی، اس لیے تالیفی خدمات کا سلسلہ بھی بہت پھیلا ہوا ہے، حتیٰ کہ حضرت کی طرف منسوب مؤلفات سینکڑوں کی تعداد میں ہیں، حضرت کی تالیفات سے متعلق جو رسالہ مرتب کیا گیا تھا اس میں

مستقل مؤلفات کی تعداد ۵۰۰ پانچ سو سے زائد ذکر کی گئی ہے متعلقات الگ ہیں مثلاً ملفوظات کے مجموعے جو کہ ۶۰ ذکر کیے گئے ہیں، اور مواعظ، نیز مواعظ و مسائل کی تسہیل، بعض چیزوں کے تراجم، بعض کا انتخاب وغیرہ۔

حضرت کے تالیف کردہ رسائل مختلف موضوعات پر ہیں، اور عموماً کسی عصری مسئلہ پر خواہ وہ نیا پیش آمدہ ہو یا حضرت کے وقت میں اختلافی و نزاعی ہونے کی وجہ سے اہمیت اختیار کر گیا ہو۔ ان رسائل کی تعداد کثیر ہے جن میں سے سب ہی مستقلاً شائع ہوتے ہیں اور بہت سے بعض کتابوں میں شامل ہیں مثلاً بعض رسائل امداد الفتاویٰ میں شامل ہیں، جلد اول میں سات رسالے شامل ہیں، جلد دوم میں ۲ اور سوم میں پانچ اور بقیہ جلدوں میں سے ہر ایک میں دس دس کے قریب ہیں گویا لگ بھگ چالیس تو امداد الفتاویٰ میں ہی شامل ہیں۔ بعض رسائل بوادر النوادر حصہ دوم میں مزید ہیں۔

ان میں سے خالص عصری مسائل پر بعض حسب ذیل رسائل ہیں۔ [1] التحقیق الفرید فی حکم آلۃ تقریب الصوت البعید [2] ضم شارد الابل فی ذم شارد ابل، [3] تصحیح العلم فی تقبیح القلم اور جیسے کہ بعض اہم رسائل یہ ہیں [4] تفصیل الکلام فی تقبیل الاقدام، [5] القاء السکینۃ فی ابداء الزینۃ۔ [6] القول الاحکم فی تحقیق بالالتزام، [7] التوحد فی طلاق ذات التعدد، [8] رافع الضنک عن منافع المنسک، [9] تحذیر الاخوان عن الربا فی ہندوستان، وغیرہ

اہم رسائل میں سے اغلاط العوام، اور غلط مسئلے، نیز اصلاح الرسوم بھی ہے جن کے ذریعہ حضرت نے رات و دن کی زندگی میں درپیش معروف و مروّج

چیزوں کی غلطیوں کو واضح کر کے اُمت کو ان سے بچانے کا انتظام فرمایا ہے، بالخصوص رسالہ اصلاح الرسوم نہایت اہم ہے کہ اس میں پیدائش سے لیکر وفات تک کی مروّج رسوم کی نشاندہی فرمائی گئی ہے اور ان کی دینی و دنیوی خرابیوں کو واضح کیا گیا ہے، کتاب کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ عالم کو تو یوں بھی عام معاملات و معمولات سے بے خبر سمجھا جاتا ہے علی الخصوص پھر ایک خانقاہ نشین عالم نے کس طرح ان چیزوں کا علم حاصل کیا، یہ در اصل حضرت کے مزاج میں تحقیق و جستجو کا مادہ تھا اس کا طفیل ہے اور ان رسوم کی خرابیوں کی نشاندہی یہ محض حق تعالیٰ کی طرف سے القاء و الہام کی بات ہے ورنہ آدمی کہاں ایک ایک چیز کی خرابی کو جاننا، کہاں کسی انسان کے بس میں ہے خواہ کیسا ہی علم رکھتا ہو، یہی وجہ ہے کہ کتنی ہی رسوم ایسی ہیں کہ جن سے بڑے بڑے صاحب علم بھی صرف نظر کر جاتے ہیں اور وہ ان کو کچھ زیادہ بُری نگاہوں سے نہیں دیکھتے اس لیے کہ ان کی خرابیاں اور مفاسدات انکے سامنے نہیں آتے۔

حضرت کی فقہی خدمات کے اس جزء سے متعلق ان گرانقدر تالیفات میں حضرت کی مختلف وجوہ سے شرکت ہے جو محض حضرت کی منصوبہ سازی و منصوبہ بندی کے تحت اور حضرت کی زیر نگرانی اور حضرت کے افادات کی روشنی میں، مرتب کی گئیں، جن کا تفصیلی تذکرہ آگے آرہا ہے، ان میں سے ہر ایک کا معاملہ یہ ہے کہ ہر ایک مستقل ایک خدمت و گرانقدر کارنامہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

منصوبہ سازی

حضرت تھانوی کے فقہی مآثر اور کارناموں کا ایک اہم جزء جو بلا شبہ پورے حلقۂ دیوبند میں بلکہ کم از کم بلاد ہند و پاک کے اہل علم میں صرف اور صرف آپ کو ہی اس کی سعادت حاصل ہے، کہ حضرت نے صرف وعظ و تقریر اور تدریس و تالیف کے ذریعہ ہی خدمت نہیں فرمائی بلکہ حالات و ضرورت کے تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے نیز اپنے بے انتہا مشاغل کی وجہ سے خود پورے طور پر وقت نہ دے سکنے کی وجہ سے منصوبہ بندی کے ساتھ اپنے تربیت کردہ متعلقین اہل علم سے بعض ایسے کام کرائے اور ان کی رہنمائی کرنے اور ان کے ساتھ لگ کر خود بھی اس میں شرکت کی کہ جن میں سے ایک صرف حضرت کے اعزاز و افتخار کو کافی ہے جیسا کہ حضرت نے خود بعض کے متعلق فرمایا ہے بلکہ پورے ہندوستان کے علمی حلقے اور بالخصوص علماء دیوبند کے لیے سرمایۂ افتخار ہے، اپنے موضوع کے اعتبار سے بھی اور ترتیب و تالیف کے اعتبار سے بھی، نیز تحقیق و جستجو کے اعتبار سے بھی اور بسط و تفصیل کے اعتبار سے بھی۔

احقر کے علم کے مطابق حضرت کی منصوبہ بندی کے تحت تالیف پانے والی چار کتابیں ہیں۔ ۱۔بہشتی زیور ۲۔الحیلۃ الناجزہ ۳۔اعلاء السنن ۴۔احکام القرآن، جن حضرات کو ان کتابوں سے واقفیت ہے اور جنہیں ان سے استفادہ کا موقع ملا ان کی واقفیت و علم کی نسبت سے ان کتابوں کی بابت حق یہ ہے کہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے، بالخصوص بہشتی زیور سے تو ہر دین دار گھر

بہت پڑھا لکھا مسلمان بھی واقف ہے اور بقیہ کتابیں اہل علم پر مخفی نہیں ہیں اگرچہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہمارے حلقہ کا انحطاط اب اس درجہ کو پہنچ چکا ہے کہ ہم اپنے اکابر واداروں کی علمی و تحقیقی خدمات سے بھی واقف و آشنا نہیں ہیں۔ اس لیے ان کتابوں کی بابت بالخصوص آخری دونوں کتابوں سے متعلق اتنی تفصیل ضروری ہے کہ جس سے کتاب کا پورا تعارف ہو سکے اور اس کی حیثیت و اہمیت واضح ہو سکے۔

بہشتی زیور جیسا کہ نے ذکر کیا ہے اور حق ہے کہ بہشتی زیور سے شاید ہی کوئی پڑھا لکھا مسلمان ناواقف ہو کہ تقریباً صدی پوری ہونے والی ہے اس کی اشاعت اور اس سے استفادہ کے سلسلہ کو نہ جانے کتنی مرتبہ اور کتنی تعداد میں اور آج بھی ایک وقت میں کئی کئی مکتبوں سے شائع ہو رہی ہے اور عام ہو رہی ہے، کم از کم دین سے تعلق رکھنے والوں کے ایسے گھر کم ہوں گے جن میں یہ کتاب نہ ہو۔

کہنے کو تو یہ کتاب دراصل عورتوں کے لیے لکھی گئی اس زمانہ میں جبکہ ان کو نورنامہ و وفات نامہ وغیرہ الٹی سیدھی چند کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔ جن سے زندگی کے مراحل و مسائل میں کوئی رہنمائی نہیں ملتی تھی۔ چنانچہ حضرت نے اس ضرورت کا احساس کر کے یہ کتاب عورتوں کے لیے تحریر فرمائی چنانچہ اسی انداز پر مرتب ہے، مگر اس میں جو کچھ معلومات آ گئی ہیں۔ نہ صرف یہ کہ عام مردوں کے کام کی ہیں بلکہ اہل علم واہل افتا بھی ان سے مستغنی نہیں بلکہ ان سے سند پکڑتے ہیں۔ یوں تو اس میں شروع سے اخیر تک اس انداز

کے مضامین و معلومات ہیں کہ الف بار سے لے کر عورتوں سے متعلق ہر ضرورت کی تعلیم اس کے ذریعہ ہو جاتی ہے۔ مگر بڑا حصہ مسائل سے متعلق ہے کہ ایک مومن کی اصل ضرورت ہر مرحلہ و معاملہ میں شریعت کے احکام کا علم ہے۔

پورا مجموعہ گیارہ حصّوں پر مشتمل ہے، جن میں سے آخری حصّہ جو کہ بہشتی گوہر کے نام سے معروف ہے، وہ در اصل مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی کی علم الفقہ کا ملخص ہے باقی دس حصّے حضرت کے تالیف کردہ اور تالیف کرائے ہوئے ہیں آغاز کتاب سے لے کر تجوید کے مسائل تک کا حصّہ مولوی احمد علی صاحب ساکن فتح پور ضلع بارہ بنکی کا تالیف کردہ ہے۔ فقہ سے خصوصی مناسبت کی بنا پر جس کی حضرت گنگوہی نے بھی شہادت دی تھی حضرت نے ان سے یہ کام کرایا اور خود بھی شرکت فرمائی۔ حصّہ پنجم تک کی تالیف انہوں نے کی ہے باقی پانچ حصّے خود حضرت کے تالیف کردہ ہیں۔

کتاب میں مذکور مسائل کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگا لیجئے کہ متعدد علماء نے اس سے مسائل کو الگ کر کے مختلف کتابیں ترتیب دی ہیں اور اس کے عموم افادہ و استفادہ کا اندازہ اس سے لگا لیجئے کہ پورے ملک میں عام ہوئی اور صرف اردو زبان میں نہیں۔ حضرت کی حیات میں ہی اس کا ترجمہ، ہندی، سندھی، بنگالی، گجراتی وغیرہ اور بعض غیر ملکی زبانوں مثلاً برہمی و پشتو میں ہو چکا تھا اور فرنچ و عربی میں ترجمہ کا تذکرہ حضرت کے سامنے آچکا تھا کہ لوگ کرنا چاہتے تھے اور حضرت سے اجازت کے طالب تھے، اس لیے کہ کتاب اپنی ترتیب و مضامین کے اعتبار سے ہر مسلمان مرد و عورت کی ضرورت کی ہے۔

جس نے کتاب پڑھی اور اس سے واقف ہوا وہ ہی قائل ہو گیا، آج بھی متعدد زبانوں میں دستیاب ہے، اب انگریزی میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔

الحیلۃ الناجزۃ اس کتاب کی بابت کیا لکھا جائے اور کیا کہا جائے کہ یہ مختلف وجوہ سے ایک گرانقدر کارنامہ ہے۔

شادی شدہ عورتیں بعض مرتبہ جو ایسے حالات کا شکار ہو جاتی ہیں کہ نہ ہی شوہروں کی طرف سے ان کے حقوق کی ادائیگی ہوتی ہے اور نہ ہی وہ کسی دوسرے مرد سے نکاح کر کے اپنی مشکلات کو حل کر سکتی ہیں، ایسے حالات مختلف قسم کے ہیں۔ جن میں سے ایک اہم صورت یہ ہے کہ شوہر لاپتہ ہو جائے کہ یہ صورت سب سے اہم ہے اس لیے کہ اس صورت کے لیے فقہ حنفی کا حکم کچھ سخت ہے جو آجکل کے حالات میں اور زیادہ خطرات و دشواریوں کو متضمن ہے، اس کے علاوہ صورتوں میں سے شوہر کا عنین یا مجنون، یا متعنت ہونا ہے، ایسے ہی بعض اور صورتیں جن میں اس انداز کی دشواری پیدا ہو جاتی ہے کہ عورتیں اسلام کے ترک اور دوسرے مذاہب کی پناہ لینے کو سوچنے پر مجبور ہو جاتی ہیں بلکہ ہوتی ہیں، حضرت کی حیات میں پنجاب کے علاقے میں اس قسم کے واقعات پیش آئے جنہوں نے حضرت کو اس درجہ بے چین کیا کہ حضرت اس کام کا پردہ اٹھانے پر مجبور ہوئے اور اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچا کر ایسی مظلوم عورتوں کے لیے نہایت مناسب و سہل حل رہتی دنیا تک چھوڑ گئے، ایک تو اس کارنامہ کا یہ پہلو ہے۔

دوسرا روشن پہلو یہ ہے کہ اس حل کے پیش کرنے میں بالخصوص مفقود

والی صورت میں فقہ مالکی کو بنیاد بنایا گیا ہے اور فقہ حنفی کے مناسب و معین جزئیات کے ساتھ بنیادی طور پر فقہ مالکی کے مسائل و جزئیات کو سامنے رکھا گیا ہے اور اس طرح کسی ایک مذہب کی تقلید کرتے ہوئے محض اس پر عدم جمود کا ثبوت پیش کیا گیا ہے اور اس کا کہ ضرورت پر دوسرے مذاہب کو اختیار کرنا ہرگز برا نہیں جبکہ وہ مذاہب حق ہوں۔

ایک اور اہم پہلو اس کا یہ ہے کہ اس کی تالیف و ترتیب کے لیے محض کتابوں کی مراجعت پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے ——— بلکہ جیسے ترتیب و تالیف میں حضرت کے ساتھ حضرت کے دو معتمد اصحاب فن متعلقین لگے رہے، ایسے ہی اسی انداز کے لوگوں سے برابر ربط و مشورہ رہا، اور اس کے لیے خط و کتابت بھی کی گئی اور مسودہ بھی ملاحظہ و مطالعہ کے لیے بھیجا گیا، اور یہی نہیں کہ ملک کے علماء سے مراجعت کی گئی بلکہ بیرون ملک یعنی حرمین کے علماء مالکیہ اور فقہ مالکی کے ماہرین سے بھی مراجعت کی گئی ہے، اور بار بار استفسار و خط و کتابت کے بعد آخری رائے اور فیصلہ تیار کیا گیا ہے۔

ایک روشن پہلو اس کا یہ بھی ہے کہ یہ کتاب ایک اجتماعی شان کی کتاب ہے، بایں معنی کہ یوں تو کتاب خانقاہ تھانہ بھون میں حضرت تھانوی اور مفتی شفیع صاحب و مولانا عبدالکریم صاحب گمتھلوی کی کاوشوں سے تیار ہوئی ہے اور خاص طور سے اکابر علماء دیوبند و مظاہر علوم سے استفسار و استصواب کے ساتھ ساتھ اور حق یہ ہے کہ کتاب کی اہمیت اور اعتماد و استفسار کے لیے اتنا بہت کافی تھا مگر مسئلہ کی اہمیت کے پیش نظر حضرت نے ملک بھر کے مختلف

حصوں کے معتمد علماء و اداروں کے پاس تصدیق و تائید اور استفسار و مشورہ کے لیے کتاب کا مسودہ بھیجا اور اس کے بعد ہی اس کی اشاعت اور منظرِ عام پر آنے کی نوبت پہنچی اور ہر جگہ سے اس کاوش کی تائید و استحسان ہی ہوا، اور کچھ مشورے و تنبیہات بھی شامل رہیں تصدیق کرنے والے علماء بہار ڈھاکہ، گوجرانوالہ، کراچی، کشمیر، جالندھر، امرتسر، مراد آباد، میرٹھ و دہلی وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں، ظاہر ہے کہ اس کے بعد اس کاوش و کتاب کے اجماعی ہونے میں کیا شبہ رہ جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ اتنے لمبے اور پھیلاؤ والا کام چند دنوں یا چند ماہ میں نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی لیے جیسا کہ مفتی شفیع صاحب نے تصریح فرمائی ہے کہ اس کام میں تقریباً پانچ سال کا عرصہ لگا، اور اب یہ کاوش مرجع خواص و عوام اور حق یہ ہے کہ مقبول انام ہے۔

کتاب میں موضوع سے متعلق ہر پہلو و جہت پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے اور ہر ایسی صورت کا حل پیش کیا گیا ہے، ساتھ ہی موقع بموقع ضروری ہدایات و تنبیہات بھی ہیں کہ جن کا لحاظ نہ کرنے پر یہ برکت و رحمت کا کام الجھنیں اور زحمتیں بھی پیدا کر سکتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ یہ کتاب حضرت کا اصلاً اور دیگر علماء دیوبند کا تبعاً ایک روشن و گرانقدر کارنامہ، اور امت مسلمہ پر عموماً اور عورتوں پر خصوصاً احسان عظیم ہے۔

احکام القرآن و اعلاء السنن

حضرت کی منصوبہ سازی کے تحت تالیف پانے والی گرانقدر کتابوں میں سے موضوع و

مباحث کے اعتبار سے ہمہ گیر اور وسعت وضخامت کے اعتبار سے گویا جہاں گیر اور عربی میں ہونے کی وجہ سے افادیت کی رُو سے عالمگیر، مذکورہ دونوں کتابیں ہیں جن کی تالیف کا باعث وسبب اس وقت کے مخصوص حالات بنے۔
جن کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ یہ تو ظاہر ہے کہ فقہ حنفی مذاہب اربعہ میں سے اولین اور وسیع ترین مذہب ہے اور اس کی مقبولیت ہی اس کے صحیح ومعتمد دلائل پر مبنی ہونے کی دلیل ہے اور یہ چیز اس کے قدیم وجدید ہر عہد کے مآخذ سے روزِ روشن کی طرح عیاں ہے، مگر فقہ حنفی وحنفیت سے متعلق ایک عجیب خیال کے لوگ ہر عہد میں رہے ہیں جو حقائق سے قطع نظر کر کے پورے زور شور کے ساتھ یہ باور کراتے ہیں کہ فقہ حنفی کے مسائل قرآن وسنّت کی نصوص سے زیادہ محض قیاسات پر مبنی ہیں اور صریح نصوص سے انحراف پر بھی، پچھلی صدی کے اواخر اور اس صدی کے اوائل میں بلاد ھند میں اس کا کچھ زیادہ ہی شور و چرچا رہا نتیجۃً یہاں نہ جانے کیا کیا ہوا، اور اب تک کسی نہ کسی قدر جاری ہے، حالانکہ اس دعویٰ کے بطلان پر صدہا کتابیں اور شواہد و دلائل موجود ہیں، نہ صرف احناف کے قلم سے بلکہ دوسرے مذاہب کے انصاف پسند علما کے قلم فیض رقم سے بھی مگر ایک بات تو یہ کہ عام فقہی کتابوں میں، بنیادی توجہ مسائل کے بیان پر ہوتی ہے پھر نقلی و عقلی دلائل لائے جاتے ہیں اور بعض مواقع پر عقلی پر ہی اکتفا ہوتی ہے نقلی ہوتے ہیں مگر ذکر نہیں کیے جاتے۔ بہر حال نقلی دلائل ان کتابوں کے اندر دوسری تفصیلات میں مدغم ہوتے ہیں اس لیے ان سے یہ مدعا پورے طور پر ثابت ہو نہیں پاتا۔

دوسری بات یہ کہ بالخصوص احناف کے مسائل و جزئیات سے متعلق سنّت کے ماخذ کا بڑا حصّہ ایسا ہے جسے اگرچہ معتمد محدثین نے روایت کیا ہے مگر جیسے شوافع وغیرہ کے ماخذ صحاح ستہ میں پائے جاتے ہیں۔ فقہ حنفی کے ماخذ صحاح ستہ میں کم ہیں بلکہ مستدرک حاکم، مصنف عبدالرزاق، مصنف ابن ابی شیبہ، سنن بیہقی وغیرہ میں ہیں۔ نیز امام ابوحنیفہ اور ان کے تلامذہ کی مرویات کے مجموعوں اور کتابوں میں ہیں۔ یہ کتابیں اور ان کی مرویات صحاح ستہ کی طرح معروف و متداول تو ہیں مگر خدا معلوم کیا مصلحت تھی کہ درس نظامی میں ایسی کتابیں کیوں شامل نہیں۔

نیز ایک بات یہ بھی ہے کہ بلوغ المرام وغیرہ کے انداز پر فقہ حنفی کی مستدل روایات کا کوئی مجموعہ معروف و متداول نہیں رہا ہے اور بظاہر کسی نے خاص اس انداز پر کام کیا بھی نہیں۔

ان وجوہ کی بنا پر خود بہت سے علماء احناف اپنی فقہ کے ماخذ سے ناواقف ہوتے ہیں اور موقع پر مناسب جواب دینے سے عاجز رہتے ہیں اور اس سے دوسروں کو مزید موقع ملتا ہے۔

بہر حال حالات کا شدید تقاضا تھا کہ فقہ حنفی کے جزئیات کے کتاب و سنت کی نصوص سے تعلق کو خوب واضح کر کے پیش کیا جائے تاکہ مخالفین پر اتمام حجت ہو سکے۔

ضرورت اس کی بھی تھی کہ فقہ حنفی کے جو جزئیات ثبوت کے اعتبار سے کسی آیت سے متعلق ہوں خواہ جس قسم کا تعلق ہو اس کو واضح کیا جائے اور ایسے تمام مسائل کو آیات قرآنیہ کے ضمن میں ذکر کر کے قرآن کریم سے ان کے

ثبوت کو واضح کیا جائے، اگرچہ اس موضوع سے متعلق جصاص رازی کی کتاب احکام القرآن موجود ہے جو کہ معروف و متداول بھی ہے مگر اس سے مقصود کی پورے طور پر تکمیل نہیں ہوتی بالخصوص اس وجہ سے کہ اس کے ابتدائی حصہ میں تو کافی طول ہے اور اخیر میں بے انتہا اختصار ہے اور تمام جزئیات کے تعلق کا اثبات و اظہار اس کا مقصود و موضوع بھی نہیں ہے۔

اور اس کی ضرورت تو تھی جس کی نسبت زیادہ اعتراض ہوا کرتا ہے کہ سنت کے وسیع ذخائر میں فقہ حنفی کے جزئیات کے جو مآخذ ہیں ان کو یکجا ایک مجموعہ میں جمع کیا جائے اور مبوّب و مرتب کہ عام ناظر بھی اول وہلہ میں مقصود سے واقف ہو سکے اور اس پر یہ بات پورے طور پر آشکارا ہو جائے کہ فلاں مسئلہ و جزئیہ فلاں حدیث سے ثابت ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ دونوں ہی کام بڑی کدوکاوش عرق ریزی و محنت، تلاش بسیار اور جستجوئے کثیر کے طالب تھے اور ان کے لیے وفور علم، وسعت نظر، اور دقت فکر اور سب سے بڑھ کر وہ ملکہ جو کہ اس گرانقدر خدمت کی کماحقہ انجام دہی میں معین بنے، اس کی تو ضرورت تھی ہی، مزید یہ کہ احکام القرآن کا کام آیات سے جزئیات کے تعلق کے اثبات و بیان کے اعتبار سے اہم تھا اور احادیث والا اس بنا پر کہ مستدل روایات کتابوں میں منتشر ہیں اور وہ کتابیں عام و متداول بھی نہ تھیں کہ اس عہد میں بہت سے ذخائر طبع نہیں ہو سکے تھے اور قلمی طور پر بھی عام نہ تھے۔

اس لیے حق یہ ہے کہ یہ کسی ایک فرد کے بس کا کام نہ تھا، اس انداز

کی مکمل منصوبہ سازی ہی اپنی جگہ اہم تھی چہ جائیکہ عملی طور پر اس کی انجام دہی اور اس کی تکمیل، یہ کام تو ایسے تھے کہ کسی ایک ادارہ کا اس کے لیے بیڑہ اٹھانا اہمیت رکھتا تھا اور اس کے لیے دنیا و آخرت میں سرمایۂ افتخار تھا بہرحال اللہ نے حضرت کے حصے میں جو سعادتیں رکھی تھیں ان میں اس انداز کے کاموں کی منصوبہ سازی اور عملی طور پر ان کی انجام دہی اور تکمیل تک ان کو پہنچانا بھی شامل تھا حضرت نے ان دونوں کاموں کا مکمل منصوبہ بنایا۔ اور اپنے خصوصی متعلقین میں سے جن کی آپ نے اپنے خاص ذوق و مزاج کے مطابق تربیت فرمائی تھی ان کے سپرد یہ دونوں کام کیے اور خود بھی برابر افادات کا املاء کراتے رہے، کام کی نگرانی کرتے رہے، ہونے والے کام کو ملاحظ فرما کر حسب موقع اس میں قطع و برید اور اصلاح بھی کرتے و کراتے رہے، حتیٰ کہ اللہ نے حضرت کی خواہش و منصوبہ کے مطابق دونوں کاموں کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا۔ یہ ضرور ہے کہ احادیث والا کام جو "اعلاء السنن" کے نام سے معروف ہے وہ حضرت کی حیات میں ہی مکمل ہو چکا تھا اور اس کا بڑا حصہ شائع بھی ہو گیا تھا، اور آیات سے استدلال و اثبات والا کام حضرت کے بعد مکمل ہو سکا، اور حالات کے اعتبار سے پہلا کام زیادہ اہم و ضروری تھا، ان خدمات کی کیا اہمیت ہے اور ان کو کن نگاہوں سے دیکھا گیا ہے اس کو "اعلاء السنن" کے تفصیلی تعارف کے تحت ذکر کیا جائے گا۔

احکام القرآن

ذکر کیا جا چکا ہے کہ فقہ حنفی پر مخالفین کے اعتراضات کے دفعیہ اور کمال اتمام حجت کے لیے اس کی ضرورت تھی کہ فقہ حنفی کے جزئیات و مسائل کے نصوص قرآنیہ سے تعلق و ثبوت

کو باحسن وجوہ واضح کیا جائے اور بتایا جائے کہ احناف نے کس آیت سے کن کن مسائل کا استنباط کیا جائے، حضرت نے اس ضرورت کا احساس کرتے ہوئے اس کام کو بھی پیش نظر رکھا مگر یہ کام حضرت کی خواہش کے مطابق نہ تو ایک آدمی کے ذریعہ ہوسکا اور نہ حضرت کی حیات میں مکمل ہوسکا اگرچہ کافی حصہ حضرت کے سامنے ہی تیار ہوگیا تھا۔

اس کی انجام دہی اور تکمیل کی مختصر روئداد یہ ہے کہ اعلاء السنن کا کام مکمل ہوجانے پر حس کا تقاضا شدید اور جلد تکمیل کا تھا، حضرت نے مولانا ظفر احمد صاحب کو ہی اس کام کے لیے بھی متعین فرمایا۔ انہوں نے کچھ کام کیا مگر پھر وہ ڈھاکہ چلے گئے تو کام رہ گیا، حضرت کے ذہن پر اس کا بھی غلبہ تھا اور جلد از جلد اس کی تکمیل کا بھی شدید تقاضا تھا، آخر جب مولانا ظفر احمد صاحب دوبارہ اس کے لیے یکسو نہ ہوسکے تو حضرت نے ۱۳۶۱ھ میں اس کی طرف پھر توجہ کی، اور کام کو جلد از جلد مکمل کرانے کی غرض سے نیز کسی ایک آدمی کے پورے طور پر اس کام کے لیے یکسو نہ ہونے کی وجہ سے حضرت نے اس کام کو چار افراد پر تقسیم کر دیا، اور تقسیم کی صورت یہ رکھی کہ قرآن کریم کی ایک ایک منزل کے لیے ایک ایک، دو دو جلدیں تجویز فرما کر تین حضرات کے سپرد دو، دو منزلیں اور ایک کے حصہ میں ایک منزل رکھی، پہلی دو منزلیں حضرت مولانا ظفر احمد صاحبؒ کے سپرد کی گئیں۔ تیسری و چوتھی حضرت مولانا مفتی جمیل احمد[1] تھانوی مدظلہ کے پانچویں و چھٹی حضرت مولانا مفتی شفیع صاحبؒ کے حصے میں آئیں ساتویں حضرت

---

[1] مفتی جامعہ اشرفیہ لاہور

مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی[1] کے حصے میں، ہر جلد کئی کئی سو صفحات پر مشتمل ہے اور پہلی منزل کا کام چونکہ دو جلدوں میں ہو سکا ہے یعنی مولانا ظفر احمد صاحب نے دو منزلوں سے متعلق اپنا کام تین جلدوں میں کیا ہے اس طرح یہ پورا کام آٹھ جلدوں میں ہوا ہے۔

اور جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے کہ یہ کام حضرت کی رہنمائی میں تو ہوا ہی ہے حضرت کے افادات پر بھی مشتمل ہے جو کہ بیان القرآن وغیرہ میں ہیں۔ مزید برآں یہ کہ خاص انداز پر کام شروع ہونے پر حضرت نے اس کی مکمل نگرانی فرمائی۔ اور رہنمائی بھی فرمائی۔ نقل کیا گیا ہے کہ جس حصہ کی تفسیر لکھنی ہوتی حضرت خود بار بار اس کی تلاوت فرماتے اور جو بات ذہن میں آتی اس کو املاء کراتے چنانچہ مفتی صاحب نے سنہ ۶۱ھ میں خانقاہ میں ہی مستقل قیام اختیار کرنے پر جب یہ کام شروع کیا تو ان سے ہی منقول ہے کہ حضرت روز کی مجلس میں جو بات ذہن میں آتی اس کو بیان فرماتے اور مفتی صاحب قلمبند کر لیتے، اور ساتھ ہی حضرت کتابوں سے مراجعت کی بھی ہدایت فرماتے تھے۔ چنانچہ مفتی صاحب نے سورۃ شعراء سے لے کر قصص تک کا کام اسی طرح کیا ہے، پھر حضرت اپنے ضعف کی بنا پر اس لائق نہیں رہے، آخر اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس دنیا سے اٹھا لیا۔

ذکر کیا جا چکا ہے کہ پورا کام آٹھ جلدوں میں چار حضرات کے ذریعہ ہوا ہے، بعض جلدیں حضرت کے سامنے ہی تیار ہو گئی تھیں اور بعض کافی بعد میں

---

[1] سابق شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور

تکمیل کو پہنچیں، بہر حال دھیرے دھیرے یہ کام مکمل ہو ہی گیا اور اشاعت کے مرحلہ تک پہنچ کر مفید عام و خاص بن گیا

ابتداً اس کا نام دلائل القرآن علی مسائل النعمان تجویز کیا گیا تھا مگر بعد میں اس موضوع سے متعلق دیگر کتب کی رعایت میں اس کا نام "احکام القرآن" کر دیا گیا اور اسی نام سے اس کی اشاعت ہوئی ہے، جیسے کہ اصلاً اس کا موضوع فقہی مسائل ہیں مگر بعض دوسرے مسائل مثلاً تصوف وعقائد وغیرہ کے بھی اس کے تحت آگئے ہیں۔

بہر حال یہ کام بھی اپنی جگہ بے نظیر ہے اس لیے کہ احکام القرآن کے موضوع پر جن حضرات نے کام کیا ہے شاید اتنے توسع کے ساتھ کسی نے کام نہیں کیا ہے نہ تو اتنی جلدوں میں کام ہوا ہے اور نہ جزئیات ومباحث کی وہ وسعت ہے جو اس مجموعے میں ہے، کہ اس میں حسب موقع بعض بعض مسائل وموضوعات پر اتنا طویل کلام کیا گیا ہے کہ وہ ضخیم رسالوں کی صورت اختیار کر گیا ہے۔

اور آج یہ کارنامہ حنفیت کی حقانیت کا اور قرآن کریم کی نصوص سے فقہ حنفی کے مسائل وجزئیات کے تعلق کا ببانگ دہل اعلان کر کے معترضین کے سر کو نیچا کر رہا ہے۔

اعلاء السنن

فقہ حنفی کے مآخذ سنّت اور مستدلّات حدیثیہ کے جمع اور مبوب وترتیب کا جو کام حضرت تھانوی کے منصوبہ کے مطابق خود ان کی نگرانی میں، ان کی خانقاہ ومدرسے میں ہی انجام پایا وہ

مختلف مراحل سے گزر کر اب "اعلاء السنن" کے نام سے شائع ہو کر چار دانگ عالم میں شہرت حاصل کر رہا ہے، اور ہند و پاک کے علماء و محققین کی عظمت رفتہ کا سکہ دلوں پہ بٹھا رہا ہے۔

اس کام کے کرانے کی غرض و مقصود کیا تھا گذر چکا ہے کہ علامہ ابن حجرؒ کی بلوغ المرام اور علامہ ابن تیمیہؒ کی المنتقی کی طرح احکام سے متعلق مرویات جو کہ احناف کا مستدل ہیں ان کو اس انداز میں مرتب کیا جائے کہ عام نظر میں ان کے مراجع و مآخذ سے واقفیت حاصل ہو کر موجب بصیرت و اطمینان ہو، ظاہر ہے کہ یہ کام تحقیق طلب بھی تھا اور دیر طلب بھی۔

اس لیے کہ اس کے لیے مرویات کو ان کے مآخذ مراجع سے تلاش کرنے کی ضرورت تھی اور اس وقت تک بہت سے مراجع طبع ہو کر عام نہ ہوتے تھے اور قلمی بھی متداول نہ تھے، اس لیے اس کام کے پیچھے کافی جد و جہد کی ضرورت تھی۔

پھر یہ کہ اس کے تحت صرف یہ نہیں کرنا تھا کہ مرویات کو تلاش کر کے فوراً ضبط کر لیا جائے اور بطور مجموعہ تیار ہو جائے اس لیے کہ نہ ساری کتب حدیث کی حیثیت یکساں ہے اور نہ ہر کتاب کی تمام احادیث کی، اس کی وجہ سے اس کام کے لیے اس محنت و تحقیق کی بھی ضرورت تھی کہ جو حدیث احناف کا مآخذ و مستدل ہے، اس کا موضوع سے متعلق دوسری مرویات کے درمیان کیا مقام ہے؟ اہل تحقیق محدثین نے اس کے رواۃ اور خود اس کے متعلق کن تاثرات کا اظہار کیا ہے، اصول کا کیا تقاضا ہے، زیر بحث مسئلہ سے متعلق دوسرے ائمہ کے اقوال اور ان کے مستدلات نیز ان کا مقام و مرتبہ کیا ہے، اس لیے کہ اس تفصیل

کے بغیر مقصود پورا نہیں ہو سکتا اور ظاہر ہے کہ جو حالات تھے ان میں محض مرویات کا کتابوں سے جمع کرنا ہی مسئلہ تھا چہ جائیکہ ایسی تحقیقی بحثیں۔

بہر حال حضرت نے اس کی شدید ضرورت کا احساس کرتے ہوئے منصوبہ بنایا اور اللہ نے حضرت کی حیات میں ہی یہ کام حضرت کے مقصود و منشا کے مطابق تکمیل کے مرحلہ تک پہنچایا اور اس شان کے ساتھ کہ خود حضرت نے اس کی بابت ان تاثرات کا اظہار کیا۔

"اگر خانقاہ امدادیہ میں صرف یہی کام انجام پایا ہوتا تو اس کے فخر وفضل کے لیے کافی تھا، کہ یہ کام اپنی نوعیت کے اعتبار سے بے نظیر ہے"[1]۔ ایک موقع پر حضرت نے فرمایا "میں نے ایک کتاب تیار کرائی ہے اس میں ہر مسئلہ پر حدیثوں کو جمع کیا گیا ہے، اس سے پہلے مذہب احناف کی نصرت میں کوئی ایسی کتاب نہیں لکھی گئی ہے"[2]۔ نیز فرمایا کہ

"اس کتاب کی تالیف کے بعد یہ بات عوام و خواص سب کے لیے پورے طور پر واضح ہو گئی ہے کہ امام ابو حنیفہ کا کوئی مسئلہ کتاب وسنت کے خلاف نہیں ہے"۔

علامہ زاہد الکوثری، جو کہ ترکی کے مشہور عالم گذرے ہیں اور جو عصر حاضر کے مشہور شامی محقق و محدث شیخ عبد الفتاح ابو غدہ کے شیخ و استاذ تھے۔

---

[1] مقدمہ حدیثیہ کا مقدمہ و تقریظات [2] تذکرۃ الظفر ص ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۴

انہوں نے اپنے تاثرات کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا ہے۔

"اس جمع واستقصاء کو دیکھ کر میں تو حیران رہ گیا، کہ ہر ہر حدیث پر سند و متن کے اعتبار سے بھرپور کلام کیا گیا ہے، اور اپنے مذہب کی تائید میں جو کچھ کہا گیا ہے اس میں کہیں تکلّف کا شائبہ نہیں پایا جاتا، جیسے کہ دوسرے مذاہب پر کلام میں پورے انصاف سے کام لیا گیا ہے"[1]

شیخ عبد الفتاح ابو غدہ کے کتاب کے تاثر کو اسی سے سمجھا جا سکتا ہے کہ اس کے مقدمہ حدیثیہ کو انہوں نے بڑے اہتمام کے ساتھ اپنی تعلیمات کے بعد شام سے شائع کرایا، مولانا محمد یوسف صاحب بنوری سے ہمارا حلقہ خوب واقف ہے مولانا فرماتے ہیں۔ اگر مولانا ظفر احمد صاحب کی تصانیف میں اعلاء السنن کے علاوہ کوئی اور تصنیف نہ ہوتی تنہا یہ کتاب ہی علمی کمالات، حدیث وفقہ ورجال کی قابلیت ومہارت اور بحث وتحقیق کے ذوق، محنت وعرق ریزی کے سلیقہ کے لیے برہان قاطع ہے، مولانا نے اعلاء السنن کے ذریعہ حدیث وفقہ اور خصوصاً مذہب حنفی کی وہ قابل قدر خدمت کی ہے کہ جس کی نظیر مشکل سے ملے گی۔۔۔۔ موصوف نے اس کتاب کے ذریعہ جہاں علم پر احسان کیا ہے وہاں حنفی مذہب پر بھی احسان عظیم کیا ہے، علماء حنفیہ قیامت تک ان کے مرہونِ منت رہیں گے۔۔۔۔ مجھ سے علامہ کوثری نے فرمایا تھا احادیث احکام میں حنفیہ کے نقطۂ نظر سے اس کتاب کی نظیر نہیں، مجھے حیرت ہے کہ قدماء کی

---

[1] مقدمہ حدیثیہ کا مقدمہ وتقریظات۔

کتابوں میں بھی اس استیعاب کے ساتھ ادلہ حنفیہ کو جمع کر کے اس کی تحقیق و تنقیح کی مثال مشکل سے ملے گی[1]

مرحلۂ آغاز سے لے کر تکمیل کے مرحلہ تک اس کام کے سفر کی مختصر روئداد یہ ہے کہ حضرت پر اس کام کے جلد از جلد انجام پانے کا شدید غلبہ تھا اور واقعہ یہ ہے کہ ضرورت بھی بہت تھی، چنانچہ خانقاہ میں قیام فرمانے پر حضرت نے جہاں دیگر مہتم بالشان تصنیفی و تالیفی کام انجام دیئے، اس کی طرف بھی توجہ فرمائی اور اولاً یہ ارادہ فرمایا کہ خود ہی اس کو انجام دیں کہ اس صورت میں مقصود کی تکمیل پر زیادہ اطمینان تھا، خود حضرت کے مختلف اوقات میں اس کام کو مختلف ناموں سے کیا، اولاً احیاء السنن کے نام سے کیا جس کا انداز اعلاء السنن کے جیسا تھا جس کو ہم آگے ذکر کریں گے مگر سوء اتفاق کہ اشاعت سے پہلے مسودہ ضائع ہو گیا، ایک عرصہ کے بعد حضرت دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہوئے اور دوسرے انداز پر کام شروع کیا وہ یوں کہ احناف کی مستدل مرویات کو "جامع الآثار" کے نام سے جمع کیا، اور اس کے ساتھ بطور تعلیق کی معارض روایات کو "تابع الآثار" کے نام سے، اور اس کی اشاعت کی بھی نوبت آئی مگر کام ابواب الصلوٰۃ سے آگے نہ بڑھ سکا، یہ کام حضرت نے تھانہ بھون کے قیام کے قریبی زمانوں میں کیا، پھر حضرت کو مشاغل نے اس میں لگنے کی اجازت نہیں دی، دوسری بات یہ کہ جامع الآثار والا کام نہایت مختصر تھا اور حضرت کام مکمل و مفصل چاہتے

---

[1] تذکرۃ الظفر ص ۱۶۸ / ۱۶۹ / ۱۷۴

تھے، آخر مجبور ہو کر خود سے قریبی تعلق رکھنے والوں اور علمی و فقہی طور پر حضرت کے ذوق و مسلک کو سمجھنے والوں میں سے بعض حضرات سے اس کام کو کرانے کا عزم کیا چنانچہ ۱۳۳۱ھ میں خانقاہ میں مقیم اس ذوق کے حامل دو حضرات کے سپرد یہ کام کیا، انہوں نے بڑی حد تک کام کو کیا، حضرت نے نگرانی کی تصحیح کی، اور پھر تحسین کے بعد اشاعت کی تدبیر کی، مگر اس عرصہ میں خود کام کرنے والے ایک صاحب نے اس میں اپنی رائے سے ایسا ردّ و بدل کیا کہ اشاعت کے بعد حضرت کے علم میں آنے پر حضرت نے اس کو پسند نہیں کیا۔ اسی عرصہ میں مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی کا ۱۳۳۸ھ سے خانقاہ میں قیام ہو گیا۔ تو پھر حضرت نے ان کو اس کام پر مامور فرمادیا کہ جو ہو چکا جائزہ لے کر اصلاح و استدراک کا کام کریں، اور جو رہ گیا ہے اس کو پورا کریں، چنانچہ مولانا اس کام میں لگے اور بیس سال کے طویل عرصہ میں اس کو باحسن وجوہ تکمیل تک پہنچایا۔ اور خود حضرت نے اس کی بابت مکمل اطمینان و استحسان کا اظہار فرمایا۔

اعلاء السنن کے کل اکیس اجزاء ہیں جن میں سے اصل موضوع و مقصود سے متعلق یعنی مرویات پر مشتمل حصے اٹھارہ ہیں، ابتدائی تین حصے بطور مقدمہ ہیں۔ ایک حصہ میں اصول حدیث کو جمع کیا گیا ہے عام معروف اصول کی کتابوں کے علاوہ دیگر علوم و فنون کی کتابوں سے بھی، ایک میں اصول فقہ کو جمع کیا گیا ہے اسی انداز میں اور خاص طور سے قیاس کی حیثیت وغیرہ کو واضح کیا گیا ہے۔ اور ایک جزء میں امام صاحب اور ان کے تلامذہ نیز دیگر بہت سے علماء احناف کے احوال جمع کیے گئے ہیں اور بالخصوص فن حدیث میں ان کی حیثیت، مقام

وکام اور محدثین کے ان کی بابت اظہارِ خیال کو پیش کیا گیا ہے، ان تینوں مقدمات کے خود حضرتؒ نے الگ الگ نام تجویز فرمائے تھے اب بھی امتیاز کے لیے باقی ہیں اگرچہ بطور مقدمہ تینوں یکجا شائع ہوئے ہیں، اور ان کی ترتیب کے لیے جو محنت کی گئی ہے اور جو معلومات ان میں جمع کر دی گئی ہیں۔ اس کی بنا پر مقدمہ کا ہر جز مستقل ایک کارنامہ ہے، اصولِ حدیث سے متعلق مقدمہ مستقلاً علیحدہ سے "قواعد فی علوم الحدیث" کے نام سے مشہور شامی حنفی محقق و محدث شیخ عبدالفتاح ابوغدہ کی گراں قدر تعلیقات کے ساتھ شائع ہوا ہے، اور اس کی بابت انکی بے انتہا تحسینات منقول ہیں، مولانا بنوری نے اس مقدمہ کی بابت فرمایا ہے کہ اس میں ایسے نفائس جمع ہیں کہ ان پر عقل حیران ہے۔

اصل کام ۱۸ اجزاء میں ہوا ہے، جس کے متعلق ذکر کیا گیا ہے کہ حضرت نے پہلے مولانا احمد حسن صاحب سنبھلی سے کرایا اور کچھ مولانا حبیب احمد صاحب کیرانوی سے، مولانا احمد حسن صاحب نے ابتدائی کام کیا۔ حضرت نے مکمل اصلاح کی اور حصہ اوّل شائع ہوا مگر اشاعت سے پہلے انہوں نے اس میں ردّو بدل کر دیا جس کا علم حضرت کو اشاعت کے بعد ہوا، تو حضرت نے مولانا ظفر احمد صاحب کو کام کے لیے تجویز کیا اور مولانا احمد حسن صاحب کے کام پر استدراک لکھوایا اور غیر شائع شدہ ان کا کام اور مولانا حبیب احمد صاحب کا کیا ہوا جو تھا اس پر نظرِ ثانی کا حکم فرما کر تتمات لکھوائے، اور باقیماندہ کام مکمل انہیں سے کرایا، اور حضرت کی ہدایت کے مطابق مولانا نے سارا کام کیا، خود جو حصے مستقلاً لکھے ان کے لیے تو جو جدوجہد و محنت کی وہ کی، استدراک و تتمات وغیرہ کے پیچھے بھی کافی جانفشانی

سے کام لینا پڑا، ابواب الصلوٰۃ کے بعد کا سارا کام مولانا ظفر احمد صاحب نے ہی کیا ہے اور جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے اس سے پہلے کے کیے ہوئے کام کے پیچھے کافی محنت کی ہے اتنی کہ یہ کہنا اور یہ لکھنا بیجا نہیں ہے کہ سارا مولانا کا ہی کیا ہوا ہے۔

حضرت نے اس کام کو خود جب انجام دیا تھا تو اس کے لیئے "احیاء السنن" کا نام تجویز فرمایا تھا، بعد میں بھی یہ نام باقی رہا اور اسی نام سے مولانا احمد حسن صاحب کا تیار کردہ ایک جزء شائع بھی ہوا، اور تعلیقات کے لیے "التوضیح الاحسن" کا نام تجویز کیا تھا، مولانا ظفر احمد صاحب نے جو استدراک لکھا تھا وہ "الاستدراک الحسن" کے نام سے شائع ہوا تھا، جیسے کہ اُردو ترجمہ "اطفاء الفتن" کا نام دیا گیا تھا۔ اور مولانا ظفر احمد صاحب کے اصل متن کے لیے "اعلاء السنن" اور تعلیقات کے لیے "اسداء المتن" تجویز کیا گیا تھا۔ مگر بعد میں ساری کاوش کے لیے ایک ہی نام و عنوان تجویز ہوا، اور اب تمام جلدیں اسی ایک نام سے شائع ہوئی ہیں جیسے کہ استدراک وغیرہ کا امتیاز خود مولانا ظفر احمد صاحب نے ہی اخیر عمر میں ختم فرما کر سب کو ایک کر دیا، اور اُردو ترجمہ بھی ختم کر دیا گیا جو کہ ساتھ ساتھ شائع ہوتا رہا تھا۔ اصل کتاب کے مباحث کو ہدایہ کی جو اہمیت و حیثیت ہے اس کی بنا پر اسی کی کتب و ابواب نیز مسائل کی ترتیب کے مطابق مرتب کیا گیا ہے۔ اور جس مسئلہ سے متعلق حدیث ذکر کرنی ہوتی ہے۔ اولاً اس کے مناسب عنوان قائم کیا گیا ہے، اولاً بطور متن مسئلہ سے متعلق مرویات مع تصریح ماخذ و تصریح حیثیت، ذکر کی جاتی ہے۔ پھر ایک خط سے فصل کر کے بطور شرح باقی ضروری تفصیلات

مذکور ہیں، جن میں بقدرِ ضرورت نہایت نفیس ودقیق فقیہانہ ومحدثانہ کلام ہوتا ہے، جیسے کہ متن کے ساتھ بھی مختصراً روایات کی تصحیح وتحسین سے متعلق کلام کیا گیا ہے۔ کہیں کہیں پر بعض حواشی بھی ہیں جیسے کہ موجودہ ایڈیشن کے ابتدائی کچھ حصہ میں مولانا تقی صاحب عثمانی کی تعلیقات ہیں جن سے کتاب کی افادیت و اہمیت مزید بڑھ گئی ہے، کتاب پر اعتماد واستناد بڑھانے کی غرض سے یہ کیا گیا تھا اور موجودہ ایڈیشن میں بھی اہتمام ہے کہ مرویات ومعلومات جہاں سے لی گئی تھیں۔ کتابوں کے نام کے ساتھ جلد وصفحات کے ذکر کا بھی اہتمام کیا گیا، جو کتابیں اس وقت مطبوعہ نہیں تھیں ان کی مرویات جہاں سے لی گییں ذکر کر دیا گیا، مولانا تقی صاحب نے حوالوں کے ضبط وتوضیح کا بھی اہتمام کیا ہے۔ مثلاً بہت سی کتابوں میں صفحات کے بجائے ابواب کے حوالے ذکر کر دیئے ہیں جن کے مختلف نسخے معروف ہیں۔

کتاب کی تیاری کے ساتھ ہی اشاعت کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا، کام تو حضرت کی حیات میں مکمل ہو گیا تھا مگر حضرت کے سامنے سارے اجزاء نہیں شائع ہو سکے تھے۔ اب الحمد للہ ٹائپ پر سارے اجزاء پاکستان سے بڑی آب و تاب کے ساتھ شائع ہوتے ہیں۔

شخصیت سازی

یہ صحیح ہے کہ موقع کے مناسب علمی وعملی کاموں کی انجام دہی، ایک کامل کا کمال ہے، لیکن اصل کمال یہ ہے کہ کوئی کامل اپنی تربیت سے ایسے افراد تیار

کر جائے کہ جو اسی کے نہج و ذوق کے مطابق اس کے سامنے اور بعد میں موقع و ضرورت کے مناسب کام کرتے رہیں، حضرت تھانوی کے لیے قدرت نے جو کمالات خاصہ مقدر فرمائے ان میں ایک نمایاں کمال یہ بھی رہا ہے کہ آپ نے اپنی زندگی میں جس انداز کے علمی کام کیے اور خدمات کی انجام دہی کی ایسے افراد بھی تیار کیے جو کہ نہ صرف یہ کہ حضرت کے بعد ان کاموں کو کرتے رہے حضرت کی حیات میں بھی کرتے رہنے، اگرچہ یہ صحیح ہے، کہ ان میں سے ہر ایک آپ کی طرح جامع کمالات اور متنوع الصفات نہیں تھا مگر پھر بھی ان میں بعض بعض نے حضرت کے انداز پر ہی نمایاں علمی و تربیتی کام کیے ہیں اور کر رہے ہیں فقہ و افتاء کی لائن کے کام کی ضرورت و اہمیّت ظاہر ہے، حضرت نے اس باب میں خود جو خدمات انجام دیں ان کا تذکرہ گذر چکا ہے، اپنے کمال تربیت کے طفیل ایسے افراد تیار کیے کہ جن سے اپنی زندگی میں اپنے ذوق و مزاج کے مطابق تحقیقی کام لیے اور ان پر پورے اطمینان و اعتماد کا اظہار کیا، حالانکہ اس کے لیے محض کتابوں کی معلومات کافی نہیں ہوتی بلکہ جیسا کہ گذر چکا ہے کہ مزاج کے بنانے اور ملکہ پیدا ہونے اور پیدا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ حضرت نے اس انداز کے افراد تیار کیے کہ جن کے علمی کارناموں پر متعلقین، اداروں اور حلقوں بلکہ پوری مِلّت کو فخر بجا ہے۔

صاحب اشرف السوانح نے ذکر کیا ہے کہ حضرت والا عرصہ سے اس اہتمام میں ہیں کہ اپنی مختلف دینی خدمات کو رفتہ رفتہ دوسروں کی طرف منتقل فرما دیں، چنانچہ فتویٰ نویسی تو بہت ہی کم کر دی (خانقاہ میں متعین اس کام کو کرنے

والے افراد کی وجہ سے) اس سلسلہ میں ایک بار فرمایا اس کا زاویہ ہے کہ دین کی بہت سی خدمات کا ایک ہی شخص سے متعلق ہو جانا ہرگز مناسب نہیں' ایک بار فرمایا کہ میں اسی لیے بھی دینی کاموں کو مختلف جگہوں میں تقسیم کرتا رہتا ہوں کہ میں چاہتا ہوں کہ میرے مرنے کے بعد کسی کو صدمہ نہ ہو، یہ بھی فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ میرے سپرد دین کے جتنے کام ہیں وہ سب میرے بعد بھی بدستور چلتے رہیں اور کسی کو میرے نہ ہونے کا اس بنا پر افسوس نہ ہو کہ فلاں دین کا کام اب کون کرے گا[1]

حضرت کو اس کا کس درجہ اہتمام تھا اور حضرت اپنی اس کوشش میں کس درجہ کامیاب تھے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ حضرت کے مسترشدین میں سے جو اہل علم حضرات حضرت سے اجازت یافتہ ہوتے وہ مسند ارشاد کے کام کے ساتھ افتاء کا بھی کام کرتے رہے اور اب تک کر رہے ہیں اور خصوصیت سے جن حضرات پر اس کام کے لیے توجہ فرمائی اور ان کی مکمل تربیت و رہنمائی کر کے ان سے کام لے کر جس طرح ان کو تیار کیا اور کمال تک پہنچایا ان کا پوچھنا ہی کیا' کہ اس فہرست کے ایک ایک فرد کا معاملہ یہ ہے کہ ان میں سے کسی ایک کی حضرت کے ساتھ یہ نسبت حضرت سے فخر و اعتزاز کو کافی تھی چہ جائیکہ حضرت نے پوری ایک جماعت تیار کی اور ان سے نہایت مہتم بالشان کام کر لئے اور انہوں نے خود انجام دیئے۔ جن حضرات کا نمایاں مقام رہا ہے اور اشرف السوانح میں

---

[1] اشرف السوانح - ج ۲ ص ۲۲۷ ر ۳۵۱

ان کی بابت فقہ سے مناسبت کا تذکرہ ہے یا ان کے گرانقدر کارنامے ہیں ان میں سے چند حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ مولانا اسحٰق صاحب بردوانی جن کو جامع العلوم میں حضرت نے اپنا جانشین بنایا۔ ۲۔ مولانا رشید احمد صاحب کانپوری جن کا امداد الفتاویٰ میں متعدد مواقع پر تذکرہ ہے۔ ۳۔ مولانا احمد علی صاحب بارہ بنکوی، مؤلف بہشتی زیور۔ ۴۔ مولانا احمد حسن صاحب سنبھلی، مؤلف احیاء السنن۔ ۵۔ مولانا حبیب احمد صاحب کیرانوی، مؤلف مقدمہ اعلاء السنن بابت اصول فقہ۔ ۶۔ مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی۔ ۷۔ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب۔ ۸۔ مولانا عبدالکریم صاحب گمتھلوی۔ شریک در تالیف الحیلۃ الناجزہ۔ ۹۔ مولانا جمیل احمد صاحب تھانوی۔

ان حضرات کو حضرت نے تربیت کر کے کس معیار تک پہنچایا تھا، ان حضرات کے کارناموں سے ظاہر ہے، بعض حضرات کا نام ان خدمات کی انجام دہی میں اتنا روشن ہے کہ ان کی بابت کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔

مولانا ظفر احمد صاحبؒ کی بابت حضرت نے خود مولانا کے فتاوی کے مجموعہ کے آغاز میں تحریر فرمایا۔ "برخوردار سلمہ کے فتاویٰ پر مجھے تقریباً ایسا ہی اطمینان ہے جیسا کہ خود اپنے لکھے ہوتے فتاویٰ اس لیے اس کا نام "امداد الاحکام ضمیمہ امداد الفتاوی" تجویز کرتا ہوں[1]۔"

مفتی شفیع صاحبؒ کی بابت ایک موقع پر تحریر فرمایا، "دو مسئلے میں حاصل

---

[1] تذکرۃ الظفر ص ۱۷۶

ہوتیں دونوں بالغہ و سابقہ" ایک شبہ کا ازالہ دوسری اپنی آنکھ سے دین کی صحیح خدمت کرنے والے کا مشاہدہ جس سے امید بندھ گئی کہ انشاء اللہ تعالیٰ امت کے دستگیر ابھی باقی رہیں گے[1]

باقی دیگر حضرات کے تذکرے حضرت کے فتاویٰ و نیز علمی کاموں کے ضمن میں آئے ہیں اور ہر ایک کے مآثر موجود ہیں۔ جن سے ان کا مقام و مرتبہ واضح ہے۔

مولانا احمد علی صاحب نے بہشتی زیور کے ابتدائی پانچ اجزاء ترتیب دیئے مولانا احمد حسن صاحب و مولانا حبیب احمد صاحب اعلاء السنن کے کام میں شریک رہے، مولانا عبدالکریم صاحب کو حضرت نے الحیلۃ الناجزہ کے کام میں لگایا اور چونکہ مفتی شفیع صاحب اس زمانہ میں دارالعلوم دیوبند سے متعلق تھے۔ اس لیے زیادہ کام انہوں نے ہی کیا، مفتی جمیل احمد صاحب سے احکام القرآن کی دو جلدوں کی تالیف کا کام لیا گیا، ان میں سے سبھی کی مختلف تحریرات، رسائل و فتاویٰ وغیرہ موجود ہیں۔ جو ان کے کمال و تفقہ پر شہادت کے لیے کافی ہیں۔ ان میں سے بعض حضرات کی زندگی نے کچھ زیادہ وفا نہیں کی اور وہ حضرت کی حیات میں ہی اشرف السوانح کی تکمیل سے پہلے وفات پا چکے تھے مگر بعض حضرات کی عمروں میں حق تعالیٰ نے اتنی برکت عطا فرمائی کہ ان کے طول حیات کا سلسلہ اس صدی کے اواخر پر منتہی ہوا اور بعض ابھی الحمدللہ بقید حیات ہیں حق تعالیٰ ان کی

---

[1] البلاغ مفتی اعظم نمبر ص ۷۸۴

عمروں میں برکت عطا فرماتے اور ان کے فیوض کو بیش از بیش فرماتے۔ چونکہ ان حضرات نے حضرتؒ کے نقش قدم اور ذوق و مزاج کے مطابق ہی خدمات انجام دیں۔ اور یوں گویا حضرت کی براہ راست خدمات کا ہی سلسلہ ان کی زندگیوں کے ساتھ جاری رہا اس لیے یہ کہنا شاید کچھ بیجا نہ ہو کہ حق تعالیٰ نے حضرت تھانویؒ سے پوری ایک صدی علمی و فقہی خدمات لیں۔

احکام القرآن و اعلاء السنن کی بابت آخری بات

ان دونوں کتابوں اور ان سے متعلق تفصیلات کا تذکرہ حضرت کی فقہی خدمات بعنوان "منصوبہ سازی برائے تالیف کتب" کے تحت آیا ہے اور ان کتابوں کی تالیف ان حضرات کی طرف ہی منسوب ہے جن کے قلم مسودات کے اوراق پر چلے ہیں، مگر ہماری ذکر کردہ تفصیلات سے واضح ہے کہ جو کچھ ہوا ہے وہ محض انہیں کا نہیں ہے جن کی طرف منسوب ہے بلکہ ان دونوں کتابوں میں باقاعدہ اور پوری پوری حضرت کی عملی طور پر شرکت رہی ہے، اور احکام القرآن میں تو ایسی زیادہ نہیں۔ مگر اعلاء السنن تو گویا حضرت کے قلم فیض رقم کا ہی فیض اتم ہے، اس لیے کہ یہ کام حضرت کی نگرانی میں، حضرت کی خانقاہ میں، اور حضرت کی حیات میں ہی تکمیل تک پہنچا ہے، اور حضرت نے اس کا جو حصّہ تیار ہوتا رہا، اس کو ملاحظہ فرما کر حسب موقع اس میں اصلاحات فرمائی ہیں اور خود تصریح فرمائی ہے کہ میں نے مولانا احمد حسن صاحب کے تیار کردہ حصّہ کو اور مولانا ظفر احمد صاحب کے کیے ہوئے کام کو حرفاً حرفاً دیکھا ہے اس لیے تو حضرت نے پورے وثوق و اطمینان کے

ساتھ اس کی تعریف فرمائی ہے اور اس کی اہمیّت کا تذکرہ فرمایا ہے، بہرحال عرض یہ کرنا ہے کہ یہ بھی دراصل حضرت کی براہِ راست خدمت ہے۔ اور حضرت ہی کے کمالِ علمی، تفقہ و تبحر، دقتِ نظر، وسعتِ فکر، علوم قرآن و حدیث سے واقفیت اور ان پر بصیرت اور اجتہادی ملکہ کی دلیل ہے اگرچہ بقول مولانا بنوری اس کے ظہور کا ذریعہ مولانا ظفر احمد صاحب وغیرہ بنے ہیں۔ اور جس طرح اور جس شان کے ساتھ وہ ان کا کمال ہے اور دار العلوم دیوبند سے کسب فیض اور اس حلقہ سے تعلق کی بناء پر یہ صرف حضرت کا اور خانقاہ امدادیہ کا کارنامہ اور علماء و اُمّت اور بالخصوص احناف پر حضرت اور ان کے متعلقین کا ہی احسان نہیں ہے۔ بلکہ بالواسطہ سہی علماء دیوبند کا کارنامہ، اور اکابر علماء دیوبند کا فیض و احسان ہے کہ جو کچھ ہوا ہے انہیں کی مومنانہ فراست کی بنیاد پر قائم ہونے والے اداروں کے دریائے علم و معرفت سے سیراب ہونے اور ان حضرات کے کمال تربیت سے بہرہ ور ہونے کے طفیل ہی ہوا ہے۔

حرفِ آخر

بات بہت لمبی ہو گئی ہے، پتہ نہیں کیا موضوع سے متعلق لکھا گیا ہے اور کیا اس سے بے تعلق اور زائد ہے مگر جو کچھ لکھا گیا ہے اس فکر و جذبہ کے تحت کہ حضرت تھانوی کی فقہی خدمات کا تفصیلی تعارف اپنی معلومات و صلاحیت کے مطابق پیش کر دیا جائے، اس ضمن میں یہ بات آئی ہے کہ حضرت نے اعلاء السنن کے کارنامہ کی بابت یہ فرمایا ہے کہ "اگر خانقاہ سے صرف یہی ایک کام ہوتا تو شرف و عزت کو کافی تھا" مگر شاید ہمارا یہ کہنا بڑی بات نہ مانا جائے کہ ہم نے حضرت کی جو خدمات

ذکر کی ہیں اگر ان میں سے کوئی ایک ہی حضرت کے حصّہ میں ہوتی تو شرف و سعادت کے لیے کافی تھی اور حضرت کے کمال علمی اور تفقہ کی واضح شہادت تھی۔ چہ جائیکہ ان بے مثال ولازوال خدمات کے گنجہائے گراں یہ کہ جن کی انجام دہی کے لیے ایک ایک جماعت و انجمن درکار تھی اور جن میں سے کسی ایک کا کسی ادارے سے انتساب اس کے افتخار کے لیے کافی تھا۔

حضرت نے حیات المسلمین کی بابت فرمایا ہے کہ اس کے متعلق میرا غالب خیال قلب پر ہے کہ اس سے میری نجات ہو جائے گی، اس کو میں اپنی ساری عمر کی کمائی اور ساری عمر کا سرمایہ سمجھتا ہوں[۱]۔ تو کیا صرف یہی ایک کتاب اس کا مصداق قرار پائے گی یہ تو حضرت کا کمال تواضع ہے۔ جن کا فیض آج ایک صدی سے جاری ہے اور انشاء اللہ قیامت تک جاری رہے گا، کیا وہ یونہی خالی چلی جائیں گی، اور بہشتی زیور، الحیلۃ الناجزہ، اعلاء السنن وغیرہ، نیز مولانا ظفر احمد و مفتی شفیع صاحب وغیرہ کی خدمات یونہی بے اجر رہ جائیں گی۔ نہیں، ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین۔ فقط

نوٹ:۔ احکام القرآن و اعلاء السنن سے متعلق تفصیلات اعلاء السنن، تذکرۃ الظفر، البلاغ مفتی اعظم نمبر وغیرہ سے ماخوذ ہیں۔

حررہ العبد محمد عبید اللہ الاسعدی عفرلہ

ہتورہ باندہ، یو۔پی۔ انڈیا ۱۴۰۶/۶/۲۸ھ
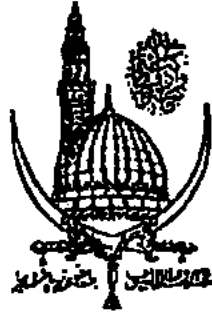
---

[۱] اشرف السوانح۔ تالیفات اشرفیہ ص ۴

نظام

صیانۃ المسلمین

رسالہ

آئین

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرۃ مولانا شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ

کی نظر میں

مجلس صیانۃ المسلمین پاکستان

صدر دفتر: جامعہ اشرفیہ، فیروزپور روڈ لاہور

مقالہ نمبر ۲۴
حضرت تھانوی رح
رحمۃ اللہ علیہ
کی
علمِ تجوید و قرات کے متعلق خدمات
جلیلہ
حضرت مولانا مفتی عبدالشکور صاحب ترمذی

حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہٗ
کی
علم تجوید و قرآت سے متعلق خدمات جلیلہ

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ خصوصاً علیٰ سید الرسل وخاتم الانبیاء محمد وعلیٰ آلہ الاصفیاء واصحابہ المجتبیٰ امابعد۔

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ قرآن فہمی اور قرآنی علوم میں نہایت بلند مقام پر فائز تھے، اپنے ہمعصروں میں آپ کو ایک ممتاز حیثیت حاصل تھی۔ جس پر آپ کی بے نظیر تفسیر "بیان القرآن" کے علاوہ مواعظ و ملفوظات میں بھی جابجا آیات قرآنی کی تفسیرات و تشریحات بھی واضح دلیل ہیں۔

علم تجوید و قرات میں مہارت تامہ

اس کے ساتھ ہی حضرت حکیم الامت رح فن تجوید و قرآت میں بھی کامل عبور رکھتے تھے آپ نے مکہ مکرمہ کے دورانِ قیام مدرسہ صولتیہ میں حضرت شیخ القراء قاری عبداللہ مہاجر مکی رح سے قرآت کی مشق کی اور قرآت و تجوید کے فن میں کمال حاصل کیا تھا۔

اشرف السوانح میں تحریر ہے کہ جب مدرسہ صولتیہ کے بالائی حصہ پر حضرت قاری

صاحب موصوف حضرت تھانوی رح کو مشق کراتے تھے تو پیچھے سے سننے والوں کو بسا اوقات استاد شاگرد کی آواز میں اشتباہ ہو جاتا تھا (ص)

اس فن میں آپ کی محققانہ عام فہم اور بے حد نافع و مفید کتابیں آپ کی جامعیت اور مہارت فن پر شاہد عدل ہیں آپ کا آسان اسلوب بیان اور سہل طرز نگارش اس بات کی دلیل ہے کہ آپ کو اس فن پر کامل عبور اور پوری دسترس حاصل ہے اور آپ اس فن کے ممتاز ماہرین اور قراء کی صف میں شامل ہیں۔

اس کے علاوہ قرآنی علوم کے مختلف موضوعات پر حضرت حکیم الامت رح نے مختلف رسائل اور متعدد تصانیف لکھی ہیں، فضائل قرآن، آیات و سور کے خواص، غرضیکہ قرآن کریم کے الفاظ اور معانی دونوں سے متعلق مختلف پہلوؤں سے آپ نے بلند پایہ علمی اور قابل قدر خدمات انجام دی ہیں

خدمت تجوید و قرأت

تجوید و قرات کے موضوع پر بھی حضرت تھانوی رح نے متعدد رسائل لکھے ہیں اور مواعظ و تصانیف میں بھی بہت عمدہ طریقہ سے اس فن قرأت و تجوید سے متعلق جا بجا تحقیقات بیان فرمائی ہیں اور اس کی ضرورت کی طرف بڑے بلیغ اور دلنشین انداز میں توجہ دلائی ہے اس مختصر مقالہ میں حکیم الامت حضرت تھانوی رح کی فن تجوید و قرأت سے متعلق خدمات عالیہ کا جائزہ لینا مقصود ہے

تجوید و قرأت سے متعلقہ تالیفات

حکیم الامت حضرت تھانوی رح نے اس فن میں کم و بیش دس کتابیں تصنیف فرمائی ہیں ان سب کا مختصر تعارف زیر نظر مجموعہ مقالات اشرفیہ، کے مقالے، حکیم الامت کے

آثار علمیہ، میں کرادیا گیا ہے اس مقالہ میں موضوع کی مناسبت سے مزید چند ضروری باتوں کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے۔

تحقیق وجوب علم تجوید وقرآت

حضرت حکیم الامت تھانویؒ ارقام فرماتے ہیں کہ اس علم کے تین شعبے ہیں
(۱) تصحیح حروف بقدر امکان ورعایت وقوف بایں معنیٰ کہ جہاں وقف کرنے سے معنیٰ میں فساد واختلال ہو وہاں وقف نہ کرے اور اضطرار میں عفو ہے لیکن ایک دو کلمہ کا اعادہ کرلینا احوط ہے یہ دونوں امر تو واجب ہیں علی العین، اور جس کو سعی کرنے پر بھی حصول سے یاس ہو جاوے وہ معذور ہے۔
(۲) اور ایک شعبہ اختلاف قراءت ہے یہ مجموع امت پر واجب علی الکفایہ ہے کہ اگر بعضے جاننے والے موجود ہوں یا بعض ایک قرآت کے حافظ ہوں اور بعض دوسری کے تو یہ واجب سب کے ذمہ سے ادا ہو جاتا ہے۔
(۳) اور ایک شعبہ ادغام وتفخیم واظہار واخفاء وغیرہا کی رعایت ہے یہ مستحب ہے
یظہر هذا کله من المراجعة الیٰ کتب الفقه والقراءة (امداد الفتاویٰ ص ۲۰۱ ج ۱)

خلاصہ یہ ہے کہ تجوید کا ایک شعبہ قادر پر واجب علی العین ہے وہ حروف کا صحیح کرنا اور مواضع وقف کی رعایت کرنا ہے، دوسرا شعبہ اظہار واخفاء وغیرہا کی رعایت کا ہے یہ مستحب ہے، تیسرا شعبہ اختلاف قراۃ کا ہے اور یہ امت پر واجب علی الکفایہ ہے

تجوید کی ضرورت اور اس میں کوتاہیوں کی تفصیل

حضرت رحمہ کے ذیل کے ارشاد سے بھی تجوید کی ضرورت کے ساتھ اس سلسلہ میں کوتاہیوں کی تفصیل کا علم ہوتا ہے۔

ا:۔ ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض دوا گا بھی پڑھتے ہیں مگر اس کی تصحیح کی طرف اصلاً توجہ نہیں فرماتے نہ مخرج کی خبر نہ صفات کا اہتمام نہ نقص وزیادت سے تحاشی کوئی صاحب "ض" کو صاف مخرج "ظ" سے ادا کرتے ہیں اور کوئی صاحب مخرج "د" سے، ث، س، ص، میں ان کے نزدیک کوئی فرق ہی نہیں، الف کے موقع پر نرا فتح پڑھنا اور فتح کی جگہ الف ملا دینا بعض کی عادت ہو گئی ہے نہ بے موقع وقف کرنے سے اجتناب کیا جاتا ہے حالانکہ اس سے بعض موقع پر معنی میں فساد ہو جاتا ہے (اصلاح انقلاب ص۱۴۲ ج ۱)

آگے فرماتے ہیں!

ہر چند کہ وجوب کے متعلق کلام طویل اور مقتضی تفصیل ہے مگر اتنی قدر میں کسی کو کلام نہیں کہ جتنی قسم کی غلطیوں کا ذکر اوپر ہوا ہے ان کی تصحیح واجب علی العین ہے جب تک کہ عدم قدرت وعدم مساعدت لسان متیقن نہ ہو جاتے، جس کی موٹی دلیل یہ ہے کہ بدون اس قدر تصحیح کے قرآن کی عربیت باقی نہیں رہتی، اور عربیت بدلالت خصوص لوازم قرآن سے ہے پس اس کے نہ رہنے سے قرآن نہ رہیگا۔ پس اس کی ضرورت میں کیسے اشتباہ ہو سکتا ہے (اصلاح انقلاب ج ۱ ص۱۴۳)

ایک اور جگہ ارشاد ہے۔

میں تو کہتا ہوں کہ تجوید کا سیکھنا فرض ہے کیونکہ قرآن عربی زبان میں ہے جس کا عربی میں پڑھنا فرض ہے اور عربیت کے موافق صحیح تلفظ بدون تجوید کے نہیں آسکتا۔

تو تجوید کا سیکھنا فرض ہوا (اشرف الجواب ص ۲۲۵ ج ۲)

تجوید و قرآت کا مختصر تعارف

تجوید:۔ تجوید کے لغوی معنی ہیں سنوارنا، خوبصورت بنانا، جودت کے معنی عمدہ ہونا ہیں، تجوید باب تفعیل سے اس کا مصدر ہے۔

اور اس کی اصطلاحی تعریف یہ ہے کہ قرآن مجید کے حروف وکلمات کو صحیح مخارج سے برعایت صفات لازمہ، مقومہ، محسنہ، بلا تکلف و تعسف کے لطافت وخوبی کے ساتھ ادا کرنا جس میں افراط و تفریط نہ ہو بلکہ اعتدال ہو (تذکرہ قاریان ہند ص ۱۱)

علامہ محقق جزری رح نے اپنی بے نظیر محققانہ کتاب "النشر" میں تجوید کی تعریف ان الفاظ میں فرمائی ہے، فرماتے ہیں۔

فالتجوید ھو حلیۃ التلاوۃ وزینۃ القراءۃ وھو اعطاء الحروف حقوقھا و ترتیبھا و مراتبھا و رد الحروف الی مخرجہ واصلہ والحاقہ بنظیرہ وتصحیح لفظہ وتلطیف النطق بہ علی حال ضیعۃ وکمال ھیئۃ من غیر اسراف ولا تعسف ولا افراط ولا تکلف۔

"تجوید تلاوت کا زیور اور قرآت کی زینت ہے، حروف کے حقوق ادا کرنا اور ان کے مراتب و ترتیب کا لحاظ رکھنا حروف کو ان کے مخارج اور اصل مقام سے ادا کرنا۔ مکرر ادائی میں یکسانیت ملحوظ رکھنا، لفظ کی ساخت و ہیئت کے اعتبار سے اس کے تلفظ کا اہتمام کرنا، ادا میں لطافت پیدا کرنا کہ نہ تو حد سے تجاوز ہو جائے اور نہ بے راہ روی کی صورت پیدا ہو، اور نہ افراط و تفریط و تکلف ہو نہ اسراف و تعسف"

آگے فرماتے ہیں :۔

"وللہ الحافظ ابی عمرو الدانی رح حیث یقول ولیس بین التجوید وترکہ الا ریاضۃ لمن تدبرہ بفکہ فلقد صدق وبصر واوجز فی القول وما قصر"

حضرت حافظ ابو عمرو الدانی رح نے کیا خوب فرمایا ہے کہ تجوید کا حصول وعدم حصول مشق دہن پر منحصر ہے علامہ جزری فرماتے ہیں کہ علامہ دانی نے اس قول میں دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے

علامہ جزری رح نے خود بھی اپنے مقدمۃ الجزریہ کے ایک شعر میں یہی مضمون ادا کیا ہے فرماتے ہیں :۔

ولیس بینہ وبین ترکہ الا ریاضۃ امرئ بفکہ

یعنی تجوید کا حصول اور غیر حصول آدمی کے مشق دہن ہی پر منحصر ہے۔

اور تجوید کی تعریف میں بھی علامہ جزری نے اسی طرح ارشاد فرمایا ہے ، فرماتے ہیں۔

وھو اعطاء الحروف حقھا من صفۃ لھا ومستحقھا

تجوید یہ ہے کہ حرفوں کو ان کا حق دیا جائے اور جس حرف کی جو صفات ہیں ان کے ساتھ ادا کیا جائے۔

ورد کل واحد لاصلہ واللفظ فی نظیرہ کمثلہ

اور ہر حرف کو اس کے مخرج سے ادا کیا جائے ۔۔ اور جس طرح ایک دفعہ ادا کیا جائے اسی طرح دوبارہ ادا کیا جائے

مکملا من غیر ما تکلف باللطف فی النطق بلا تعسف

اداء کمال کے ساتھ ہو کہ تکلف نہ معلوم ہو، تلفظ میں لطافت ہو، سختی اور گرانی نہ ہو"

چونکہ تجوید میں علم اور ادار دونوں چیزیں ہیں اس لئے صرف تجوید و قرارت کی کتابیں پڑھ لینا کافی نہیں بلکہ استاذ سے سبقاً سبقاً مشافہتہً پڑھ کر اس کی سند حاصل کرنا ضروری ہے جیسا کہ ارشاد الاہ یا صة امو ء یفکد سے معلوم ہو رہا ہے۔

اسی مضمون کو حضرت تھانویؒ نے اپنے رسالہ تجوید القرآن میں اس طرح ذکر فرمایا ہے

؎ کیا ہے وہ تجوید اور علم ادار	حق ادا کرنا ہے ہر اک حرف کا
یعنی مخرج اور صفات کا ہو خیال	تیسرے زینت ہے اے نیکو خصال

(تجوید القرآن ص۲)

آگے فرماتے ہیں!

؎ معتبر جب ہے کہ ساری کیفیت	قاریوں کے منہ سے سن لے اور صفت
اور رسالوں اور کتابوں سے کہیں	ہوتا ہے حاصل یہ فن اے مرد دین
ضبط کے واسطے ہیں یہ سب متون	سیکھ لے اس فن کو از اہل فنون

(تجوید القرآن ص۵)

کتابوں رسالوں سے فن کے ضبط اور یاد کرنے میں مدد ملتی ہے اس لئے ان کا پڑھنا پڑھانا بھی ضروری ہے کتابوں سے علم تو آجاتا ہے مگر ادار مشافہتہ استاذ سے پڑھنے کے بغیر معتبر نہیں ہے

حضرت ملا علی قاری رح اشعار مذکورہ کی تشریح کرتے ہوئے حق الحروف و مستحقہا کا فرق اس طرح بتلاتے ہیں۔

ان حق الحرف صفة لازمة له من همس وجهر وشدة ورخاوة وغير ذلك من الصفات الماضية ومستحقها ما ينشاء عن هذه الصفات كترقيق المستفل وتفخيم المستعلي ونحو ذلك من ترقيق الراءات وتفخيم بعضها وكذا احكم اللامات

ویدخل فی الثانی ما ینشأ من اجتماع بعض الحروف الی بعض ماحکموا علیہ بالاظہار والادغام والاخفاء والقلب والغنۃ والمد والقصر وامثال ذٰلک فالحق صفۃ اللزوم والمستحق صفۃ العروض ولا یخفیٰ ان اخراج الحروف من مخرجہ فی التجوید کما صرح بہ الناظم فی کتاب التمہید (المنح الفکریہ ص۱۲)

خلاصہ یہ ہے کہ ہر حرف کو مع اس کی صفات لازمہ کے اس کے مخرج سے ادا کرنا تجوید کی حقیقت میں داخل ہے باقی صفات غیر لازمہ زینت اور تحسین کے لئے ہیں، اسی حقیقت کو حضرت تھانوی رح نے تجوید القرآن کے مذکورہ اشعار میں سادہ لفظوں میں بیان فرمایا ہے۔ حضرت نے جمال القرآن میں اس کی مزید وضاحت اس طرح فرمائی ہے:۔

وہ (صفات) دو طرح کی ہیں۔ ایک وہ کہ اگر وہ صفت ادا نہ ہو تو وہ حرف ہی نہ رہے، ایسی صفت کو ذاتیہ اور لازمہ اور ممیزہ اور مقومہ کہتے ہیں۔

اور ایک وہ کہ اگر وہ صفت ادا نہ ہو تو حرف تو وہی رہے گا مگر اس کا حسن وزینت نہ رہے اور ایسی صفت کو محسنہ، مزینہ، محلیہ، عارضیہ، کہتے ہیں (ص۸)

تجوید کی اہمیت وضرورت

تجوید کی اہمیت کے بارہ میں علامہ جزری کے اشعارِ ذیل قابل لحاظ اور خصوصی توجہ کے مستحق ہیں فرماتے ہیں:۔

والاخذ بالتجوید حتم لازم   من لم یجود القرآن آثم

تجوید کا حاصل کرنا واجب و لازم ہے، جو شخص قرآن پاک کو تجوید سے نہ پڑھے گنہگار ہے

لانه به الاله انزلا　　　　وهكذا منه الينا وصلا

اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو تجوید کے ساتھ اتارا ہے ، اور وہ ہم تک اسی طرح سے پہنچا ہے ۔

وهو ايضًا حلية التلاوة　　　　وزينة الاداء والقراءة

تجوید تلاوت کا زیور بھی ہے اور قرأت و ادار کی زینت بھی ہے

حکیم الامت حضرت تھانویؒ اپنے رسالہ تجوید القرآن منظومہ میں تجوید کی ضرورت کے بارہ میں ارشاد فرماتے ہیں :۔

کیونکہ واجب تر ہوا علم ادا　　　　نام ہے تجوید جس کا اسے فتا

ورتل القرآن ترتیلا سنو　　　　اس وجوبی امر سے غافل نہ ہو

جو کرے تجوید پڑھتا ہے غبی　　　　رُبَّ تالٍ اس کو کہتے ہیں نبیؐ

حضرت تھانوی رح ان اشعار میں علم ادار کو واجب قرار دیتے ہوئے اس کا نام تجوید بتلاتے ہیں اور اس کے واجب ہونے کی دو دلیلیں بیان فرمائی ہیں ۔ پہلی دلیل کا ذکر قرآنی آیت ورتل القرآن ترتیلا میں امر کو وجوب پر محمول کر کے کیا ہے ۔

اور دوسری دلیل میں حدیث رب تال للقرآن والقرآن یلعنہ (بعض لوگ قرآن پڑھتے ہیں اور قرآن ان پر لعنت کرتا ہے) کا ذکر کیا ہے اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو بلا عذر غلط پڑھتے ہیں اور صحیح پڑھنے کی کوشش بھی نہیں کرتے ، البتہ اگر کوشش کے بعد بھی صحیح نہ ہو تو عذر قبول ہے ۔

حضرت تھانویؒ بھی اسی تجوید القرآن میں فرماتے ہیں :۔

بعد کوشش کے نہ ہو گر حصول　　　　عذر اس کا شرع میں ہے قبول

نیز اپنے مشہور فتاویٰ " امداد الفتاویٰ " میں بھی اسی آیت کو وجوب ادار کی دلیل کے طور پر بیان فرمایا ہے ، فرماتے ہیں !

اس کے سیکھنے میں کوشش کرنا ہمیشہ واجب ہے لقولہ تعالیٰ۔ ورتل القرآن ترتیلا، درتفسیر حسینی تحت ایں آیت آوردہ وازمرتضیٰ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نقل کردہ اند کہ مراد بترتیل حفظ وقوف است واداء حروف، انتہٰی۔ اور رتّل وجوب کے لئے ہے اس کی تعمیل میں سعی کرنا واجب ہے اور اگر جہد وطلب میں کوتاہی کرے گا گنہگار ہوگا۔

لما مرفی الامر المذکور (امداد الفتاویٰ ص ۱۹۰ ج ۱)

علامہ جزری کے مقدمہ کے تینوں اشعار نقل کرکے حضرت والا رحمہ فرماتے ہیں۔ شعر اول سے تجوید کا وجوب اور ثانی سے رعایت صفت کا اور ثالث سے رعایت مخارج کا ماہیت تجوید ہونا ثابت ہے۔ (امداد الفتاویٰ جلد ۱ ص ۱۶۲)

خلاصہ یہ کہ ہر حرف کو اس کے مخرج سے مع رعایت اس کی صفات کے ادا کرنا تجوید کی حقیقت ہے اور بقدر استطاعت اس کی کوشش کرنا لازم اور اس کا ترک لحن اور گناہ ہے

اقسام لحن

لحن کے اقسام اور اس کے احکام جمال القرآن میں حضرت تھانویؒ نے تفصیل سے بیان فرماتے ہیں۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ لحن دو قسم پر ہے

ایک یہ کہ ایک حرف کی جگہ دوسرا حرف پڑھ دیا یا کسی حرف کو بڑھا دیا یا کسی حرف کو گھٹا دیا یا زبر، زیر، پیش، جزم میں ایک کو دوسرے کی جگہ پڑھ دیا ان کو لحن جلی کہتے ہیں اور یہ حرام ہے۔ (حقیقۃ التجوید)

اور بعض جگہ اس سے معنی بگڑ کر نماز بھی جاتی رہتی ہے۔ اور دوسری قسم یہ کہ ایسی غلطی تو نہیں کی لیکن حرفوں کے حسین ہونے کے جو قاعدے مقرر ہیں ان کے خلاف پڑھا جیسے رُ کی جگہ باریک پڑھ دیا۔ اس کو لحن خفی کہتے ہیں۔ اور یہ مکروہ ہے (ایضاً)

علامہ جزری رح کے اشعار بالا سے تجوید کی ضرورت واہمیت کے ساتھ ساتھ یہ بھی ثابت ہورہا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن مجید کو تجوید کے ساتھ نازل فرمایا ہے حضرت جبریل علیہ السلام اس کو جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر پڑھتے تھے آپ بھی اسی طرح پڑھتے تھے اور " فاذا قرأناہ فاتبع قرآنہ " سے اسی قرأت جبریل کی اتباع کا حکم دیا گیا ہے پھر صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی تجوید کے ساتھ پڑھا۔ اسی بنا پر حضرت عمر بن عبد العزیز اور حضرت ابن عامر کا قول ہے کہ :۔

تجوید سنت متبعہ ہے پچھلا اگلے سے اخذ کرتا چلا آتا ہے پس تم کو جس طرح سے پڑھایا جائے اسی کو اختیار کرو "

غرض کہ ناقلین کی سعی اور محنت سے قرآن مجید ہم تک تجوید کے ساتھ پہنچا ہے اور تجوید کے ساتھ ہی وہ نازل ہوا ہے اور جس طرح نازل ہوا ہے اسی طرح ہمیں پڑھنے کا حکم ہے چنانچہ حضرت عمر رض اور حضرت علی رض اور حضرت زید بن ثابت ارشاد فرماتے ہیں کہ :۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے کہ تقرؤا القرآن کما علمتم " قرآن مجید کو اسی طرح پڑھو جس طرح تم کو سکھلایا گیا ،، (تذکرہ قاریان ہند)

حضرت رح کے دو رسالے اور سبب تالیف واجمالی کیفیت

حضرت حکیم الامت تھانوی رح کے دو منظوم (اردو) رسالے ہیں ایک کا نام تجوید القرآن ہے دوسرے کا نام یادگار حق القرآن ہے۔ سب سے پہلا رسالہ اردو نظم میں تجوید القرآن ہے اس کے دو سو اشعار ہیں یہ رسالہ نہایت آسان اور عام فہم زبان میں بہت ہی مفید اور کارآمد ہے

تجوید القرآن

حضرت تھانوی رح نے یہ رسالہ اپنے قیام مکہ معظمہ کے دوران غالباً ۱۳۱۰ھ میں مدرسہ

صولتیہ کے ہندی طلبار کے لئے نظم فرمایا تھا یہ رسالہ مدرسہ کے نصاب میں داخل رہا ہے۔ حضرت تھانوی رح نے خود بھی اس مدرسہ میں حضرت شیخ القرار قاری محمد عبد اللہ مہاجر مکی رح سے اسی زمانہ میں تجوید و قرأت کی تعلیم حاصل کی تھی اپنے استفادہ کے ساتھ طلبار مدرسہ کو اس رسالہ کی شکل میں یہ افادہ بھی فرمایا تھا۔

اس مدرسہ صولتیہ کے بانی ایک جلیل القدر ہندی عالم حضرت مولانا رحمۃ اللہ صاحب کیرانوی رح ضلع مظفر نگر (یو۔پی) تھے جو ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان سے مکہ معظمہ ہجرت کر گئے تھے۔

رسالہ کی افادیت

حضرت موصوف رح کے صاحبزادہ حضرت مولانا محمد سعید صاحب رح جو اس وقت مدرسہ کے مہتمم تھے، حضرت تھانوی رح کے اس منظوم رسالہ کی افادیت کے بارہ میں فرماتے ہیں

یہ رسالہ جو اس وقت آپ کے ہاتھ میں ہے میرے واجب الاحترام دوست مولانا مولوی محمد اشرف علی صاحب تھانوی نے اپنے قیام مکہ معظمہ زادہا اللہ شرفاً کے ایام میں مدرسہ صولتیہ کے طالب علموں کے واسطے نظم فرمایا تھا جو اس وقت مدرسہ مذکورہ کے نصاب میں داخل ہے۔ عام فہم اور اردو ہونے کی وجہ سے رسالہ ہندی طلبار اور کم عمر بچوں کے لئے نہایت کارآمد اور مفید ہے اور مجھے پوری امید ہے کہ شائقین علم اس رسالہ کی قدر کریں گے اور ہندوستان کے حفاظ سے اس الزام کو دور کریں گے کہ ہندی قرآن غلط پڑھتے ہیں۔

محمد سعید کیرانوی مہتمم مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ (تجوید القرآن ص۳)

خود حضرت حکیم الامت رح نے اپنی مشہور عام دوسری کتاب "جمال القرآن" کے شروع میں "مشورہ مفید" کے عنوان سے فرمایا ہے کہ:-

اول اس رسالہ کو (جمال القرآن) کو خوب سمجھا کر پڑھا دیں اور ہر شئے کی تعریف اور مخارج وصفات وغیرہ خوب یاد کرا دیں۔ اس کے بعد رسالہ تجوید القرآن نظم حفظ کرا دیا جائے اور اگر فرصت کم ہو تو رسالہ حق القرآن یاد کرا دیا جائے (جمال القرآن ص۲)

تفصیلی کیفیت

یہ رسالہ ابتدائی اشعار کے علاوہ جس میں تجوید کی ضرورت اور تعریف وغیرہ کا بیان ہے سات ابواب پر مشتمل ہے،

پہلا باب مخارج حروف میں، دوسرا باب صفات حروف کے بیان میں تیسرا باب بیان میں احکام نون ساکن و تنوین کے اور اس میں پانچ فصلیں ہیں۔ باب چہارم احکام میم ساکن وغیرہ میں اور اس میں دو فصلیں ہیں باب پنجم اقسام مدیں اور اس میں چار فصلیں ہیں باب ششم بیان میں ترقیق و تفخیم حرفوں کے باب ہفتم بیان میں کیفیت استعمال حروف وقرات کے، اور یہ چھ فصلوں پر مشتمل ہے۔

یادگار حق القرآن

تجوید میں حضرت تھانوی کی دوسری تصنیف لطیف یہ مختصر اردو منظوم رسالہ ہے یہ ترسیٹھ اشعار پر مشتمل ہے اور اس کی تالیف ۱۱ر صفر ۱۳۱۱ھ میں ہوئی تھی۔

سبب تالیف اور اجمالی کیفیت

یہ رسالہ حضرت تھانوی نے اپنے مدرسہ امداد العلوم تھانہ بھون کے طلباء کے لئے نظم فرمایا ہے حضرت والا رسالہ کے شروع میں فرماتے ہیں:۔

بعد اس کے سن کہ امداد العلوم   مدرسہ دینی ہے یاں لئے ذی فہوم

اس کا اک شعبہ ہے تعلیم قرآن	حق قرآن نام ہے اس کا عیاں ہے
جی میں آیا اس کے بچوں کے لئے	نظم ہو جائیں ضروری قاعدے
تاکہ وہ اور اور بھی ہوں مستفید	سب کے حق میں ہوں الٰہی یہ مفید

(یادگار حق القرآن صـ۱۶ـ)

اس مختصر رسالہ میں چودہ درج ذیل عنوانات کے تحت تجوید کے احکام نظم فرمائے ہیں، بیان مخارج حروف، بیان اظہار، ادغام نون، اقلاب نون، اخفاء نون، انون قطنی، ابدال تنوین بالالف، احکام میم، حروف غنہ، حروف قلقلہ، تفخیم و ترقیق، مد روم و اشمام، متفرق ضروریات

اوپر حضرت تھانوی کا مشورہ کم فرصت والوں کے لئے گذر چکا ہے کہ ان کو رسالہ یادگار حق القرآن یاد کرا دیا جائے یہ رسالہ درحقیقت رسالہ تجوید القرآن کی تلخیص ہے البتہ اس میں صفات حروف کا بیان نہیں کیا گیا جبکہ تجوید القرآن میں صفات کا بیان بہت بسط و تفصیل سے کیا گیا ہے ان دونوں رسالوں سے حضرت والا کی اردو میں بھی نظم پہ صلاحیت بلکہ مہارت و قدرت کا اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت کو نظم پر پوری دسترس اور کامل قدرت حاصل ہے آپ بڑی سلاست اور روانگی کے ساتھ دقیق علمی مضمون اور اصطلاحی الفاظ کو سلک نظم میں پرونے کی کامل قابلیت و اہلیت سے سرفراز ہیں

جمال القرآن

حضرت حکیم الامت کی تجوید میں تیسری مشہور و مقبول عام کتاب جمال القرآن ہے برصغیر کے تقریباً ہر اہم مدارس میں بلا امتیاز مذہب فکر یہ کتاب داخل درس ہے اس کے بغیر تجوید کا نصاب نامکمل سمجھا جاتا ہے

مختلف حضرات قراء کرام نے اس پر مختصر اور مطول حواشی اور شروح تحریر فرمائے ہیں

احقر کے ناقص فہم کے مطابق اس کے حواشی میں استاذنا حضرت مولانا قاری حفظ الرحمٰن صاحب سابق صدر شعبہ قرآت دارالعلوم دیوبند کا حاشیہ تسہیل الفرقان نہایت مفید اور جامع حاشیہ ہے۔

سبب تالیف اور مختصر تعارف

حضرت تھانوی رح نے یہ کتاب مولانا حکیم محمد یوسف رح صاحب مہتمم مدرسہ قدوسیہ گنگوہ ضلع سہارنپور (یوپی) کی فرمائش پر تصنیف فرمائی اس کے ماخذ میں مولانا قاری عبد الوحید صاحب سابق صدر شعبہ قرآت دارالعلوم دیوبند کی کتاب (ہدیۃ الوحید) سرفہرست ہے حضرت فرماتے ہیں

یہ چند اوراق ہیں ضروریات تجوید میں مسمی جمال القرآن اور اس کے مضامین کو ملقب بہ لمعات کیا جائے گا، محبی مکرمی مولوی حکیم محمد یوسف صاحب مہتمم مدرسہ قدوسیہ گنگوہ کی فرمائش پر کتب معتبرہ خصوص رسالہ ہدیۃ الوحید مؤلفہ قاری مولوی عبد الوحید صاحب مدرس اول درجہ قرأت مدرسہ عالیہ دیوبند سے ملتقط کر کے بہت آسان عبارت میں جس کو مبتدی بھی سمجھ لیں لکھا گیا ہے اور کہیں کہیں قرأت کے دوسرے رسالوں سے بھی لکھا گیا ہے وہاں ان رسالوں کا نام بھی لکھ دیا ہے اور کہیں اپنی یادداشت سے کچھ لکھا ہے وہاں کچھ نشان بتانے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی

رسالہ ہدیۃ الوحید کے علاوہ جمال القرآن میں جن ماخذ کی تصریح کی ہے ان میں حقیقۃ التجوید، درۃ الفرید، جہد المقل اور تعلیم الوقف شامل ہیں

تفصیلی تعارف اور افادیت

علم تجوید میں حضرت تھانوی کی کتاب جمال القرآن بہت ہی اہم اور مفید ہے یہ مختصر

تمہید خاتمہ کے علاوہ چودہ۱۴ لمعات پر مشتمل ہے اس کے کل ۳۲ صفحات ہیں اس کتاب کے پڑھنے سے اس علم میں کمال اور کتاب اللہ کو سنوار کر پڑھنے کا جمال میسر آتا ہے جس طرح چودھویں کا چاند اپنی آن بان اور آب وتاب سے کمال وجمال دکھلاتا ہے گویا جمال القرآن کا پڑھنا بھی اسی طرح زیب وزینت اور تحسین وتجوید میں کمال وجمال کا وسیلہ ہے

جمال القرآن کے خاتمہ میں حضرت مؤلف فرماتے ہیں کہ:۔ چاند کا لمعہ بھی چودہویں رات کو ہوتا ہے اور یہاں بھی چودہویں لمعہ کے ختم پر سب مضامین پورے ہوگئے اس لئے یہاں پہنچ کر رسالہ ختم کرتا ہوں اللہ تعالیٰ اس کو نافع اور مقبول فرمائے طالب علموں سے خصوص بچوں سے خصوص قدسیوں سے رضائے مولیٰ کی دعا کا طالب ہوں ۔ ۵ صفر ۱۳۳۳ھ ۔ اس کے آخر میں لکھی ہوئی تاریخ سے معلوم ہورہا ہے کہ یہ کتاب ۵ صفر ۱۳۳۳ھ کو اختتام کو پہنچی ۔ جمال القرآن کا اسلوب بیان نہایت عام فہم اور بڑا ہی سادہ ہے جو حضرت مصنف کی کمال مہارت فن اور جامعیت کا کامل ثبوت ہے

پہلے لمعہ میں تجوید کی تعریف ، اور دوسرے میں تجوید کے خلاف پڑھنے اور لحن جلی اور لحن خفی کا بیان تیسرے لمعہ میں اعوذ باللہ ، بسم اللہ پڑھنے کا بیان ہے چوتھا لمعہ مخارج حروف اور پانچواں صفات لازمہ کے بیان میں ہے صفات کے بیان کے آخر میں پانچ فوائد بھی ہیں جن میں تجوید سے متعلق بڑے قیمتی افادات سے نوازا گیا ہے

چھٹے لمعہ میں ان آٹھ حروف کا بیان ہے جن میں صفات عارضہ محسنہ پائی جاتی ہیں

ساتواں لمعہ لام کے قاعدوں اور آٹھواں راء کے قاعدوں میں ہے اس کے ضمن میں چھ تنبیہات کا بھی ذکر ہے نواں لمعہ میم ساکن اور مشدد کے قاعدوں میں اور دسواں نون ساکن اور مشدد کے قاعدوں میں گیارھواں لمعہ الف اور واؤ اور یاء کے قاعدوں یعنی مدوں کے بیان میں ہے اس لمعہ میں دو تنبیہات حروف مقطعات کی مد کے بارے میں ہیں اور دو تنبیہات مدلین سے متعلق ہیں اور ایک مد اصلی اور فرعی کے فرق کے

بیان میں ہے بارھویں لمعہ میں ہمزہ کے قاعدے بیان کئے گئے ہیں اتیرھویں میں وقف کے مقامات اور ان پر وقف کرنے کے قواعد کا ذکر ہے اس میں ایک تنبیہ میں ان کلمات کا ذکر کیا گیا ہے جو اس قاعدہ سے مستثنیٰ ہیں کہ کلمہ جس طرح لکھا ہوا ہے اس کے موافق وقف ہوتا ہے۔ چودہواں لمعہ فوائد متفرقہ ضروریہ کے۔ ان میں ہے اس جگہ پندرہ فوائد لکھے گئے ہیں اور آخر میں ایک تنبیہ بھی ہے کہ یہ قاعدے امام حفص رحمۃ اللہ علیہ کے ہیں جن کی روایت کے موافق ہم لوگ قرآن مجید پڑھتے ہیں

سند روایت امام حفص رح

حضرت امام حفص رحمۃ اللہ علیہ نے قرآن مجید حاصل کیا ہے امام عاصم تابعی سے اور انہوں نے زر بن حبیش اسدی اور عبداللہ بن حبیب سلمی سے اور انہوں نے حضرت عثمان رض اور حضرت علی رض اور حضرت زید بن ثابت اور حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے اور ان سب نے حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے۔ (ص ۳۱)

اس سے روایت حفص رح کی سند قرات بھی معلوم ہو گئی کہ ان کے استاذ امام عاصم تابعی ایک واسطہ سے جلیل القدر صحابہ کرام رض کے شاگرد ہیں جن میں حضرت عثمان حضرت علی کے علاوہ حضرت زید بن ثابت اور حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہم شامل ہیں۔

حضرت استاذی مولانا قاری محی الاسلام صاحب پانی پتی رح فرماتے ہیں:۔

یہ مقبولیت خداداد ہے کہ صدیوں سے مکاتب و مدارس میں صرف روایت حفص پڑھائی جاتی ہے اور روئے زمین پر ایک ہزار حفاظ میں سے تقریباً نو سو ننانوے آدمی

کو صرف یہی روایت یاد ہے اور ایسا شاید کوئی نہ ہو جس نے یہ روایت نہ پڑھی ہو
ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء،
علی رغم نحاۃ کہ یہ قرات مروج ہی نہ ہونی چاہیئے تھی کیونکہ نحاۃ ہمزتین کی تحقیق
کی وجہ سے قرآت عاصم پر اعتراض کرتے تھے
(مقدمہ شرح سبعہ قرات مصنفہ قاری محی الاسلام صاحب ص۳۶)

جمال القرآن

یہ بڑی جامع کتاب ہے اور نہایت آسان اردو زبان میں لکھی گئی ہے یہ کتاب تجوید کے ضروری مسائل پر حاوی اور عمدہ تحقیقات پر مشتمل ہے اس کو سمجھا کر پڑھا دیا جائے تو اس علم کی بڑی بڑی کتابوں کا پڑھنا آسان ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ نے جس طرح حضرت مؤلف علیہ الرحمۃ کی کتاب بہشتی زیور کو اردو کتابوں میں فقہی مسائل کا مرجع بنا دیا ہے عام مسلمانوں کے ساتھ خواص کے لئے بھی اس کو مفید بنایا اور ایسی عام قبولیت اور شہرت سے نوازا ہے کہ مسلمانوں کا کوئی گھر اس سے خالی نہ ہوگا۔ نہایت عام فہم زبان میں منقح مفتیٰ بہ مسئلہ اس سے مع حوالہ کتاب دستیاب ہو جاتا ہے اسی طرح حق تعالیٰ جل و علا شانہٗ نے جمال القرآن کو علم تجوید میں ایک خاص مقام عطا فرمایا ہے اور اس کو وہ خداداد قبولیت عامہ حاصل ہوئی کہ شاید ہی کوئی مکتب اور مدرسہ اس کی تعلیم سے خالی ہو گویا اس زمانہ میں علم تجوید کی تکمیل اس کتاب کے بغیر نہیں ہوتی۔

صرف برصغیر ہی کے علماء تجوید اس کی تعریف نہیں کرتے اور اس کے مفید ہونے کے قائل نہیں بلکہ قراء عرب بھی اس کی تعریف سنی ہے

عرب کے مشہور قاری جناب قاری عبدالوہاب صاحب مکی جن کا عرصہ سے لاہور میں قیام ہے اور علم قرات کی خدمت کر رہے ہیں وہ بھی اس کو پڑھاتے ہیں۔ احقر کے سوال پر

انہوں نے بھی اس کی افادیت کی تعریف کرتے ہوئے احقر سے فرمایا تھا کہ جمال القرآن میں صفات حروف کا بیان جس طرح عام فہم اور سلیس عبارت میں واضح طور پر لکھا ہے ایسا کسی اردو کتاب میں نہیں ہے حقیقت یہ ہے کہ اہل فن ہی اس کی افادیت کو جان اور اس کی قدر کو پہچان سکتے ہیں۔

تحقیق مخرج ضاد

مخارج میں سب سے زیادہ مشکل مخرج "ض" کا ہے حضرت مصنف فرماتے ہیں

مخرج نمبر ۸ ضاد کا ہے اور وہ حافہ لسان یعنی زبان کی کروٹ داہنی یا بائیں سے نکلتا ہے جب کہ اضراس علیا یعنی اوپر کی ڈاڑھوں کی جڑ سے لگادیں، اور بائیں طرف سے آسان ہے اور دونوں طرف سے ایک دفعہ نکالنا بھی صحیح ہے مگر بہت مشکل ہے اور اس حرف کو حافیہ کہتے ہیں (ص۶)

امداد الفتاویٰ میں بھی حضرت مصنف نے ارشاد فرمایا ہے

ضاد کے مخرج میں حافہ لسان کو اوپر کی پانچوں ڈاڑھوں (ضاحک اور تین طواحن اور نواجذ داہنی یا بائیں طرف) کی جڑوں سے ملانا چاہیئے صرف ایک دو کے ساتھ ملانا کافی نہیں اور نیچے کے اضراس سے ملانا غلط ہے (ص۲۱۶ ج ۱)

اس عبارت میں مزید تشریح فرمادی گئی ہے کہ صرف ایک دو ڈاڑھوں سے ملانا کافی نہیں ہے، (کیونکہ اس طرح ضاد مستجنہ (ضاد ضعیفہ) نکلتا ہے جس کا قرآن میں پڑھنا جائز نہیں ہے) اوپر کی پانچوں ڈاڑھوں سے ملانا ضروری ہے،

دوسری یہ بات معلوم ہوئی کہ نیچے کے اضراس سے ملانا غلط ہے جب کہ اس کا مخرج اوپر کی ڈاڑھیں تو ظاہر ہے کہ نیچے کی ڈاڑھوں سے ملانا غیر مخرج سے نکالنا اور غلط

ہوگا۔

دال یا خالص ظا پڑھنا دونوں غلط ہیں

حضرت مصنف رح جمال القرآن میں لکھتے ہیں کہ اس حرف میں اکثر لوگ بہت غلطی کرتے ہیں اس لئے کسی مشاق قاری سے اس کی مشق کرنا ضروری ہے اس حرف کو دال پُر یا باریک یا دال کے مشابہ جیسا کہ آج کل اکثر لوگوں کو پڑھنے کی عادت ہے ایسا ہرگز نہیں پڑھنا چاہئے کہ بالکل غلط ہے اسی طرح خالص ظا پڑھنا بھی غلط ہے البتہ اگر ضاد کو اس کے صحیح مخرج سے صحیح طور پر نرمی کے ساتھ آواز کو جاری رکھ کر اور تمام صفات کا لحاظ کر کے ادا کیا جائے تو اس کی آواز سننے میں ظا کی آواز کے ساتھ بہت زیادہ مشابہ ہوتی ہے دال کے مشابہ بالکل نہیں ہوتی علم تجوید اور قرات کی کتابوں میں اسی طرح لکھا ہے (جمال القرآن ص۶)

امداد الفتاوی میں مزید فرماتے ہیں کہ :-

اس میں جو دو عادتیں ہو گئی ہیں ایک مخرج دال سے نکالنا دوسرے مخرج ضاد سے نکالنا دونوں غلط ہیں مخرج صحیح سے نکالنا چاہئے اس سے صوت مشابہ ظاء کے پیدا ہوگی نہ عین ظاء کی، مشاق کے ادا کرنے میں "ذ" اور "ض" اور "ظ" میں فرق متمیز ہوتا ہے (ص۱۹۱ ج ۱)

اور اس کی تشریح حضرت مصنف کے الفاظ میں اس طرح ہے فرماتے ہیں

یہ تو ظاہر ہے کہ تغایر مخرج تغایر حروف خارجیہ پر دلالت کرتا ہے اور تغایر ضاد و دال و ذال و ظاء مجمع علیہ اور مصرح بہ ہے کما لا یخفیٰ بس یہ دلیل ہے اس پر کہ ذات ضاد اور ہے اور ذات ظاء و دال اور جب تغایر ذاتی ثابت ہو گیا تو اب ضاد کو ظاء یا دال پڑھنا ایسا ہے جیسا کہ بار کو تار، ثاء کو جیم حار کو خار و ہذا باطل بالاجماع

فکذا ذٰلك اور اتحاد صفات سے اتحاد موصوف لازم نہیں۔ جیسا جیم اور دال کو صفات جہر، شدت، وانفتاح، وانخفاض واصمات وقلقلہ میں متحد ہیں، باوجود اتحاد اوصاف مذکورہ کے پھران دونوں میں زمین وآسمان کا تفاوت ہے وعلیٰ ہٰذا القیاس۔

اسی طرح ضاد و دال میں تفاوت بلیغ ہے کہ محض تغایر فی المخرج واطباق فاصل ہے (حصر اضافی ہے پس اس سے نفی استطالت نہ سمجھی جاوے ۱۲) کما صرح بہٖ فی المفتاح الرحمانی فی علم القراءۃ۔

"لولا الاطباق فیھا لکان الضاد سینا والطاء تاءً والظاء ذالاً والضاد دالاً"، اس سے ثابت ہوا کہ ظاء کو ذال کے ساتھ اور ضاد کو دال کے ساتھ قرب تام ہے کہ فقط اطباق (اور استطالت) ممیز ہے بلکہ باعتبار مخرج کے ضاد کو دال کے ساتھ زیادہ قرب ہے بہ نسبت ظاء کے ..... پس متحقق ہوا کہ جیسا ضاد کو ظاء کے ساتھ تشابہ ہے ویسا ہی یا زیادہ دال کے ساتھ ہے، اور جیسا دال کے ساتھ تغایر ذاتی ہے ویسا ہی ظاء کے ساتھ، پس ضاد کو ظاء و دال دونوں کے ساتھ اعلیٰ درجہ برابر نسبت ہوئی اور دونوں جواز و عدم جواز میں متساوی الاقدام ہیں (یعنی باعتبار اقربیت مخرج کے نہ کہ صفات وصوت کے) اگر ضاد کو ظاء پڑھنا جائز تو دال بھی پڑھنا جائز اور اگر دال پڑھنا جائز نہیں تو ظاء پڑھنا بھی جائز نہیں اور اول یعنی ضاد کو بصوت دال وظاء پڑھنا بالاجماع باطل ہے پس ثانی متعین ہو گیا کہ کسی کی صوت میں پڑھنا جائز نہیں الخ (ص ۱۸۹-۱۹۰) ج ۱

جمال القرآن کے حاشیہ "تسہیل الفرقان"، مصنفہ حضرت استاذی مولانا قاری حفظ الرحمان صاحب رحمہ اللہ سابق صدر شعبہ تجوید وقرائت دار العلوم دیوبند میں بعض جدید و مفید تحقیقات کی تفصیل کے ساتھ ضاد کے ادا کرنے کے طریقہ کی عمدہ تقریر

بھی درج ہے اس کو غور سے ملاحظہ کرنے کی ضرورت ہے ۔

حرف تاء اور کاف میں صفت ہمس اور شدت کے جمع ہونے پر شبہ کا جواب !

صفات لازمہ کے بیان میں حضرت مصنف ؒ نے تاء اور کاف میں صفت ہمس اور شدت کے جمع ہونے پر شبہ کے جواب میں ارشاد فرمایا ہے ،
حرف تا اور کاف کو مہموسہ میں بھی شمار کیا گیا ہے حالانکہ ان میں آواز بند ہو جاتی ہے اور اسی واسطے ان کو شدیدہ میں شمار کیا گیا ہے ۔
اس کا جواب یہ ہے کہ ان دونوں حرفوں میں ہمس ضعیف ہے اور شدت قوی ہے سو شدت کے قوی ہونے سے تو آواز بند ہو جاتی ہے لیکن کسی قدر ہمس ہونے کے کچھ تھوڑا سا سانس بھی جاری ہوتا ہے مگر اس سانس کے جاری ہونے میں یہ احتیاط رکھنی چاہئے کہ آواز جاری نہ ہو کیونکہ اگر آواز جاری ہو جاویگی تو کاف وتاء شدیدہ نہ رہیں گے بلکہ رخوہ ہو جاویں گے اور دوسرے اس میں ہاء کی آواز پیدا ہو کر غلط ہو جاوے گا ۔ (جمال القرآن ص۹)

رسالہ ضیاء الشمس فی اداء الہمس

بعض لوگ کاف اور تاء میں سانس کے جاری کرنے میں اس قدر مبالغہ کرتے ہیں کہ صفت "شدت" زائل ہو کہ ھاء ھوز کی آواز پیدا ہو جاتی ہے اور کاف اور تاء مخلوط بالہا ہو جاتے ہیں اور یہ سراسر غلط اور تمام کتب تجوید وقرات اور ادار محققین کے خلاف ہے بلکہ کتاب النشر علامہ جزری ؒ اور "منح الفکریہ" ملا علی

قاری" اور تحفہ نذریہ" حضرت قاری عبدالرحمن پانی پتی رح سے اس کی تردید ہوتی ہے، اس کی مفصل تحقیق مع جواب شبہات و توجیہ و مطلب عبارت "جہد المقل" رسالہ ضیاء الشمس فی اداء الہمس مؤلفہ قاری محمد یامین صاحب سابق مدرس تجوید و قراءت امداد العلوم خانقاہ تھانہ بھون ضلع مظفرنگر میں مع تصدیقات اکابر فن مذکور ہے۔

تصدیق حضرت حکیم الامت تھانوی رح

حضرت حکیم الامت تھانوی رح رسالہ ضیاء الشمس فی اداء الہمس پر تصدیق فرماتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں:۔

میں مدت سے ایسی تحقیق کا شائق تھا اس رسالہ کو دیکھ کر جوشِ مسرت میں یہ شعر بیساختہ قلب میں آیا ؎

للہ الحمد ہر آن چیز کہ خاطر می خواست ۔ آخر آمد زپس پردۂ تقدیر پدید

جزی اللہ تعالیٰ مؤلفہا خیر الجزاء ۔ اشرف علی ، ۷ ربیع الاول ۱۳۳۸ھ

(امداد الفتاویٰ ص۲۱۵ ج ۱)

ایک ضروری اور اہم افادہ

حروف کی صفات لازمہ متضادہ اور غیر متضادہ کا تفصیلی بیان کرنے کے بعد حضرت مصنف رح نے ایک بہت ضروری اور اہم افادہ تحریر فرمایا ہے، تجوید کی مشق کرنے والے طلباء کو خصوصاً اور ہم سب کو عموماً اس کا ہر وقت پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ حضرت فرماتے ہیں!

فائدہ:۔ حروف کے مخارج اور صفات لازمہ میں کوتاہی ہونے سے جو غلطیاں ہوتی ہیں فن تجوید کا اصلی مقصد ان ہی غلطیوں سے بچنا ہے اسی واسطے مخارج اور

صفات کا بیان سب قاعدوں سے مقدم کیا گیا ہے اب آگے جو صفات محسنہ کے متعلق قاعدے آویں گے وہ اس مقصود سے دوسرے درجہ پر ہیں لیکن عام طور سے ان دوسرے درجہ کے قاعدوں کی رعایت اس اصلی مقصود سے زیادہ کی جاتی ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ ان قاعدوں سے نغمہ خوشنما ہوجاتا ہے اور لوگ نغمہ ہی کا زیادہ خیال کرتے ہیں اور مخارج و صفات لازمہ کو نغمہ میں کوئی دخل نہیں اس لئے اس کی طرف توجہ کم کرتے ہیں۔

(جمال القرآن ص۱۳)

واقعی یہ کوتاہی عام ہو رہی ہے کہ صفات محسنہ جو کہ صفاتِ لازمہ کے مقابلہ میں دوسرے درجہ پر ہیں ان کا تو بہت زیادہ لحاظ کیا جاتا ہے اور ان میں کوتاہی کو کوتاہی سمجھا جاتا ہے اور صفات لازمہ جو مخارج کے ساتھ مل کر اس علم تجوید سے اصل مقصود ہیں ان کا لحاظ اس قدر نہیں رکھا جاتا اس لئے مشق میں بھی کمی رہ جاتی ہے اور حروف کی ادائیگی کما حقہ نہیں ہوتی۔

حضرت حکیم الامت ؒ نے اس کوتاہی کی جو وجہ دریافت فرمائی ہے اور اس بیماری کی جو علت تشخیص فرمائی ہے وہ حضرت تھانوی کی حکمت ایمانی کا ایک باب ہے اسی حکمت ایمانی سے کام لیتے ہوئے ایک اور افادہ تحریر فرماتے ہیں جس کی طرف ہم سب کو عموماً اور علماء کو خصوصاً توجہ رکھنے کی ضرورت ہے۔

افادہ ثانی

حضرت حکیم الامت فرماتے ہیں :۔

جس طرح یہ بے پروائی کی بات ہے کہ تجوید میں کوشش نہ کرے اسی طرح یہ بھی زیادتی ہے کہ تھوڑے سے قاعدے یاد کر کے اپنے کو کامل سمجھنے لگے اور دوسروں کو حقیر اور ان کی نماز کو فاسد جاننے لگے یا کسی کے پیچھے نماز ہی نہ پڑھے محقق عالموں نے

عام مسلمانوں کے گنہگار ہونے کا اور ان کی نمازوں کے درست ہونے کا حکم نہیں کیا۔ اس میں اعتدال کا درجہ قائم کرنا ان علماء کا کام ہے جو قرائت کو ضروری قرار دینے کے ساتھ فقہ اور حدیث پر نظر رکھتے ہیں۔ (جمال القرآن ص۱۳)

ہر کام میں افراط و تفریط سے بچ کر شریعت کی مقرر کردہ راہِ اعتدال پر گامزن ہونا ہی شریعت میں مطلوب اور صراط مستقیم پر چلنا ہے جس کی دعا اھدنا الصراط المستقیم میں سکھلائی گئی ہے اور وکذلک جعلنٰکم امۃ وسطا لتکونوا شھداء علی الناس میں اس امت مرحومہ کو اس کی بشارت دی گئی ہے

تجوید و قرارت میں بھی اس راہ اعتدال پر عمل پیرا ہونا مقصود و مطلوب اور یقیناً شریعت کے اعتدالی مزاج کے موافق ہوگا جس کی طرف حضرت حکیم الامتؒ نے اس افادہ میں توجہ دلائی ہے اور اس پر تنبیہ کی ہے۔ عام طور پر دیکھنے میں آرہا ہے کہ تجوید کی طرف سے بے توجہی کی جاتی ہے خاص طور پر تصحیح مخارج و صفات لازمہ کی طرف سے بہت بے پروائی برتی جاتی ہے اگر کسی کو توجہ ہوتی بھی ہے تو صرف صفات محسنہ، مزینہ اور نغمہ اور لہجہ کے سیکھنے کی طرف ہوتی ہے۔ تصحیح مخارج اور صفات لازمہ کی طرف توجہ کم ہوتی ہے جس میں نفس کا وہی کید خفی کام کر رہا ہوتا ہے کہ نغمہ اور لہجہ سے لوگوں میں شہرت اور مقبولیت حاصل ہوتی ہے جس کی اصلاح واجب ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس طرح کی ریاکاری سے محفوظ اور اخلاص کے ساتھ اپنی کتاب کی خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائیں آمین

تحقیق صفت تکریر

حروف کی صفات لازمہ میں (۱۵) صفت تکریر کے بیان میں حضرت مصنف فرماتے ہیں کہ:۔

مطلب اس کا یہ ہے کہ چونکہ اس کے ادا کرنے کے وقت زبان میں ایک رعشہ،

یعنی لرزہ طاری ہوتا ہے اس لئے اس وقت آواز میں تکرار کی مشابہت ہو جاتی ہے اور یہ مطلب نہیں کہ اس میں تکرار ظاہر کیا جاوے بلکہ اس سے بچنا چاہئے اگرچہ اس پر تشدید بھی ہو کیونکہ وہ پھر بھی ایک ہی حرف ہے کئی حرف تو نہیں ہیں۔ (درۃ الفرید ملخصًا)

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

امداد الفتاویٰ میں جمال القرآن کی اس عبارت پر کہ "اس سے بچنا چاہئے" زینت القاری کی عبارت ذیل

"راء کو ایسا ادا کرے کہ اس کی صفت تکرار کی نہ جاتی رہے، پُر بھی ہو اور صفت تکرار کی بھی باقی رہے خاص کر جب مشدد ہو" سے تعارض ظاہر کر کے اس کا جواب طلب کیا گیا۔ تو حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے حسب عادت اس کا جواب جناب قاری محمد یامین صاحب مدرس شعبہ تجوید مدرسہ امداد العلوم تھانہ بھون کے سپرد فرمایا۔ جناب قاری صاحب مرحوم نے اس کا جواب حسب ذیل لکھا جو امداد الفتاویٰ کا جزو ہے

"جمال القرآن کا قول محقق ہے کما قال المحقق ملا علی قاری رحمہ اللہ فی منح الفکریۃ علی المقدمۃ الجزریۃ فی شرح قول المتن وبتکریر جعل والمعنی ان الراء یوصف بالتکرار ایضًا کما وصف بالانحراف والتکرار اعادۃ الشیٔ واقلہ مرۃ علی الصحیح ومعنی قولہم ان الراء مکرر ھو ان الراء لہ قبول التکرار لارتعاد اللسان بہ عند تلفظہ کقولہم لغیر الضاحک انسان ضاحک یعنی انہ قابل للضحک وفی الجعل اشارۃ الی ذلک ولہذا قال ابن الحاجب لما تحسہ من شبہ ترديد اللسان فی مخرجہ واما قولہ ولذلک جری مجری حرفین فی احکام متعددۃ فلیس کذلک بل تکریرہ لحن فیجب معرفۃ

التحفظ عنه للتحفظ به وهذا کمعرفة السحر لیجتنب عن
تضرره ولیعرف وجه دفعه قال الجعبری وطریقة السلامة
ان یلصق اللافظ ظهر لسانه باعلی حنکه لصقا محکما
مرة واحدة ومتی ارتعد حدث فی کل مرة راء قال مکی
لا بد فی القراءة من اخفاء التکریر وقال واجب علی القاری
ان یخفی تکریره ومتی اظهر فقد جعل من الحروف
المشدد حروفاً ومن المخفف حرفین (امداد الفتاوی ج۱ ص۲۲۶)

ملا علی قاری کی یہ عبارت صفات کے بیان میں ہے، علامہ جزری کے قول
وتکریر جعل کی شرح میں شرح الجزریہ المنح الفکریہ ص۱۸ پر ہے

آگے علامہ جزری مزید فرماتے ہیں واخف تکریرا اذا تشدد، اس کی
شرح میں علامہ قاری لکھتے ہیں۔

المعنی اذا کان الراء مشدداً فاخف تکریرها قال مکی
لا بد فی القراءة من اخفاء التکریر وواجب علی القاری
ان یخفی تکریر الراء فمتی اظهره فقد جعل من الحروف
المشدد حروفاً ومن المخفف حرفین۔

فقوله اذا تشدد لیس بقید بل اما علی سبیل الاهتمام
والاعتناء او من باب الحذف للاکتفاء (المنح الفکریہ ص۳۱)

مقدمہ جزریہ اور اس کی شرح المنح الفکریہ کی عبارتوں سے واضح ہو گیا کہ جمال القرآن
کا قول محقق اور اہل اداء کی تحقیق کے موافق ہے اور ظاہر ہے کہ متعارض اقوال میں اسی
قول کو ترجیح ہوگی، جس کے مطابق اور علماء متقدمین اور اکابر و سلف معتبرین کے قول ہوں
زینت القاری کا منقولہ قول اہل تحقیق کے موافق نہیں ہے۔

تحقیق اخفاء

حضرت تھانوی رح اخفار کی تحقیق کرتے ہوتے فرماتے ہیں کہ۔

اور اس اخفار کا مطلب یہ ہے کہ نون ساکن اور تنوین کو اس کے مخرج اصلی یعنی کنارہ زبان اور تالو سے علیحدہ رکھ کر اس کی آواز کو خیشوم میں چھپاکر اس طرح پڑھیں کہ ادغام ہو نہ اظہار، بلکہ دونوں کی درمیانی حالت ہو یعنی نہ اظہار کی طرح اس کے ادا میں سر زبان تالو سے لگے اور نہ ادغام کی طرح بعد والے حرف کے مخرج سے نکلے بلکہ بدون دخل زبان کے اور بدون تشدید کے صرف خیشوم سے غنہ کی صفت کو بقدر ایک الف کے باقی رکھ کر ادا کیا جاتے (ص ـــــ)

حضرت استاذ الاساتذہ مولانا قاری عبدالرحمٰن صاحب الہ آبادی کی تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ اخفار میں سر زبان کو تالو سے معمولی سا لگاؤ ضرور ہوتا ہے اور نون مخفاۃ نون مظہر کے مخرج کے ساتھ فرع ضعیف سے ادا کیا جاتے اور ما بعد کے حرف کا اس میں شائبہ بھی نہ ہو نہ اس کے مخرج پر اعتماد ہو۔ اس کی پوری تفصیل رسالہ التدقیق الجلی فی تحقیق النون الخفی میں جو امداد الفتاوی جلد اول کا جزء ہو کر شائع ہو رہا ہے ملاحظہ کی جاتے اس تحقیق کی روشنی میں جمال القرآن کی عبارت کا مفہوم یہ ہوگا کہ اخفار میں زبان کی نوک کو مکمل طور پر دخل نہ ہو معمولی دخل ہونے کی نفی مراد نہیں ہے، اس طرح رسالہ التدقیق الجلی اور جمال القرآن کا ظاہری تعارض رفع ہو جاتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ جمال القرآن کا بیان کردہ مطلب صحیح اور جمہور ائمہ اہل ادار کے موافق ہے اور التدقیق الجلی کی تحقیق تفرد پر محمول ہے۔

تحقیق مقدار مد

حضرت مصنف لکھتے ہیں اور مقدار اس (مد واجب) کی تین الف یا چار الف ہے مگر یہ مقدار اس مقدار کے علاوہ ہے جو حروف مدہ کی اصلی مقدار ہے مثلاً جاتہ میں اگر مد

نہ ہوتا تو آخر الف کی بھی تو کچھ مقدار ہے سو اس مقدار کے علاوہ مد کرنے کی مقدار ہوگی (ص۲۱)

اس پر محشی ابن ضیاء لکھتے ہیں کہ:۔

مثلاً چار الف والی مقدار میں ایک الف اصلی اور تین فرعی ہے"

محشی مذکور کی عبارت مذکورہ سے جو مطلب معلوم ہورہا ہے اس پر تو کوئی اشکال نہیں ہوتا۔ کیونکہ موصوف نے مد کی مقدار میں اصل مقدار کو بھی شامل کر لیا ہے، جب کہ حضرت مصنف نے مقدار مد کو اصلی مقدار کے علاوہ بتلایا ہے اور اسی سے اشکال پیدا ہوتا ہے جیسا کہ مولانا اظہار احمد تھانوی مرحوم نے لکھا ہے کہ گویا مد منفصل کی مقدار کشش مد اصلی سمیت کل چار یا پانچ الف ہے مگر یہ صحیح نہیں حضرت مؤلف سے یہاں تسامح ہوا ہے صحیح یہ ہے کہ امام عاصم کے یہاں مد منفصل کی زیادہ سے زیادہ مقدار چار الف مع مد اصلی ہے (حاشیہ ص۳۳)

جب مد متصل کی مقدار تین یا چار الف علاوہ مد اصلی کے ہوئی تو پھر مد اصلی سمیت چار یا پانچ الف ہوگی حالانکہ حضرت امام عاصم کے نزدیک مد متصل کی زیادہ سے زیادہ مقدار مد اصلی سمیت چار الف ہے۔ اور جن حضرات نے اس کی مقدار کو تین الف فرمایا ہے انہوں نے مد اصلی کی مقدار کے علاوہ فرمایا ہے اس طرح دونوں قولوں میں تطبیق کی صورت نکل آتی ہے کہ تین الف کہنے والوں نے مد اصلی کو شمار نہیں کیا اور چار الف بتانیوالوں نے مد اصلی کو شمار کر لیا ہے۔ علامہ قاری رح فرماتے ہیں کہ:۔

وفی الطول خلاف هل هو مقدار خمس الفات او اربع وكذا فی هل هو مقدار اربع او ثلاث و منشاء الخلاف ادخال المد الاصلی فيه و تركه فالنزاع لفظی لا تحقيقی (ص۵۳)

علامہ علی قاری مقدمہ جزریہ کے متن وبالطول تمد پر فرماتے ہیں

ای بذا حروف المد والمراد بالطول قدر ثلاث الفات علی خلاف فی اعتبار المد الاصلی معهما او بدونه (ص۵۱)

اس سے معلوم ہوا کہ قراء کرام کا اس میں خلاف ہے کہ مد کے طول کی مقدار میں مد اصلی کا اعتبار کیا جائے یا نہیں۔ اور جب یہ دیکھا جائے کہ مد در اصل مد اصلی پر زیادتی کا نام ہے جیسا کہ علامہ قاری فرماتے ہیں:۔

ثم المد نوعان اصلی وھو اللازم لحروف المد الذی لا ینفک عنہا بل لیس لہا وجود بدونہ لا بتنا تُحہ بنیتہا علیہ ویسمی مدًا ذاتیًا و طبعیًا و امتدادہ قدر الف .... وفرعی وھو ما یکون منہ سبب للزیادۃ علی مقدار المد الاصلی (ص۱۵۰)

مقصد یہ ہے کہ مد فرعی میں کسی سبب سے مد اصلی کی مقدار پر زیادتی ہوتی ہے اس لئے حضرت تھانوی کا یہ ارشاد تو صحیح ہے کہ یہ مقدار اس مقدار کے علاوہ ہے جو حروف مدہ کی اصلی مقدار ہے مگر مد متصل کی مقدار میں تین الف کے بعد یا چار الف کا ذکر مشہور قول کے خلاف اور زائد معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس مد کی مقدار علاوہ مد اصلی کے تین الف ہے اور اس کا بیان اور مقدار اس کی تین الف ہے پر ختم ہو جاتا ہے۔ اب آگے یا چار الف زائد معلوم ہوتا ہے، واللہ اعلم بمراد عبادہ۔

حضرت اقدس تھانوی رح نے اپنے رسالہ تجوید القرآن میں مقدار مد متصل کے بیان میں مد طبعی کا استثناء نہیں فرمایا چنانچہ ارشاد ہے:

متصل اور منفصل ہے لے اتی ۔ قدر حرکت چار کی یا پانچ کی۔ (تجوید القرآن)

اور جمال القرآن میں یہ استثناء فرمایا ہے کیونکہ اس کا ذکر ہدیۃ الوحید میں کیا گیا ہے اور زیادہ تو یہی جمال القرآن کا ماخذ ہے۔

تحقیق بسملہ در ابتداء سورۃ براۃ

حضرت تھانوی رح جمال القرآن میں لکھتے ہیں :۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم میں یہ تفصیل ہے کہ اگر سورت سے شروع کرے تو بسم اللہ ضروری ہے اسی طرح اگر پڑھتے پڑھتے کوئی سورت بیچ میں شروع ہو گئی تب بھی بسم اللہ ضروری ہے مگر اس دوسری سورت میں سورت براۃ کے شروع میں نہ پڑھے اور بعضے عالموں نے کہا ہے کہ پہلی صورت میں بھی سورۃ براءت پر بسم اللہ نہ پڑھے " (ص ـــ)

اس میں قابل تحقیق بات یہ ہے کہ سورۃ براۃ کی ابتدا میں بسم اللہ کا کیا حکم ہے ، حضرت تھانوی رح کی تحقیق یہ ہے کہ درمیان میں سورۃ براءت پر بسم اللہ نہ پڑھی جائے البتہ ابتدائے سورت میں بسم اللہ پڑھے اور بعضے عالموں کا قول اس صورت میں بھی نہ پڑھنے کا ہے ۔

ایک شبہ کا ازالہ

اس پر شبہ یہ ہوتا ہے کہ ابتداء براءت میں بسم اللہ پڑھنے کا قول بعض عالموں کا ہے اور جمہور کا قول عدم بسملہ کا ہے تو اسی کو اختیار کرنا مناسب تھا۔ مولانا قاری اظہار احمد تھانوی مرحوم نے بھی اپنے حاشیہ جمال القرآن میں اس کا ذکر کیا ہے

امداد الفتاویٰ میں بھی حضرت تھانوی رح سے مکررہ کی عبارت کے حوالہ سے سوال کیا گیا ہے کہ جناب کے قول اور مکررہ میں جو صورت تطبیق کی ہو تحریر فرمائیں ۔ مکررہ کی عبارت یہ ہے کہ اجمع القراء علی ترک بسملۃ فی اول براۃ سواء ابتدابھا او وصلھا بالانفال ایسا ہی شاطبیہ میں ہے ؎

ومھما تصلھا او بدأت براۃ   لتنزیلھا بالسیف لست مبسملا

حضرت تھانوی رح نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ ۔

واقع میں ان دونوں قولوں میں تطبیق نہیں ہوسکتی مگر یہ مسئلہ فن قرأت کا نہیں اس لئے میرے نزدیک اس میں قاری کا قول حجت نہیں قواعد فقہیہ کا مقتضا میرے نزدیک وہی ہے جو میں نے لکھا ہے واللہ اعلم۔

بعد تحریر سطور ہذا ایک وجہ تطبیق کی جو کہ مجھ کو بہت لطیف معلوم ہوتی ہے خیال میں آگئی۔ وہ یہ کہ ابتدار سورت میں بسملہ پڑھنے کی دو حیثیتیں ہیں ایک حیثیت ابتدار مطلق القرأت کی دوسری حیثیت ابتدار بالسورۃ کی۔ پس اغلاط العوام میں اول کا اثبات ہے اور مکررہ و شاطبیہ میں ثانی کی نفی ہے، فلا تعارض۔ واللہ اعلم (ص ۲۲۸)

مطلب یہ ہے کہ جس طرح قرأۃ کے ابتدار میں جس جگہ سے بھی ہو بسم اللہ پڑھی جاتی ہے اس حیثیت سے سورۃ برارۃ کے ابتدار میں بھی بسم اللہ پڑھی جانی چاہئے یعنی سورۃ کے درمیان میں سے اگر قرأت کی ابتدار کی جائے تو اس پر بھی بسم اللہ پڑھی جانی چاہئے اس حیثیت سے نہیں کہ یہ سورت شروع کی جارہی ہے بلکہ اس حیثیت سے کہ یہاں سے قرأت کی ابتدا کی جارہی ہے فافھم فانہ دقیق وبالقبول حقیق۔

بعد میں اس پر حضرت مرشدی مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کا حسب ذیل حاشیہ بوادر النوادر میں نظر سے گذرا۔ جس کا کچھ حصہ مفید سمجھ کر نقل کیا جاتا ہے فرماتے ہیں کہ:

مراد یہ ہے کہ یہاں دو چیزیں ہیں ایک فعل قرأت کی ابتدار اس پر بسم اللہ پڑھنا۔ دوسرے عام افعال کھانے پینے وغیرہ کی طرح مستحب ہوگا۔ اور دوسری سورت کی ابتدار اور چونکہ سورت کی ابتدار اس جگہ مشتبہ ہے الخ

جمال القرآن کی عبارت میں دو صورتوں کا حکم تو اوپر کی عبارت سے معلوم ہوگیا۔ نمبر ۱، سورت شروع کرنے، نمبر ۲، درمیان میں سورت شروع ہونے کا دونوں صورتوں میں بسم اللہ پڑھنی چاہئے۔ البتہ سورۃ برأت کا حکم عام سورتوں سے مختلف ہے اس کی تفصیل بھی گذر گئی نمبر ۳۔ ایک تیسری صورت یہ بھی ہے کہ سورت کے اجزاء سے قرأت شروع کرے

تو اس کا حکم جمال القرآن میں یہ ہے کہ پڑھ لینا بہتر ہے ضروری نہیں یعنی پڑھنے والے کو اختیار ہے بسم اللہ پڑھے چاہے نہ پڑھے اور دونوں وجوہ ثابت اور صحیح ہیں .... اور سورت براءت کی درمیانی آیتوں کا بھی یہی حکم ہے کہ جب ان سے شروع کرے تو بسم اللہ پڑھے خواہ نہ پڑھے کیونکہ ناظم (علامہ شاطبی) نے یہ فرمایا ہے کہ اجزاء میں پڑھنے والے کو اختیار ہے، فرماتے ہیں کہ

وفی الاجزاء خیر من تلا

پس اجزاء کو عام رکھا ہے کہ جو براۃ اور باقی سورتوں کے سب اجزاء کو شامل ہے لیکن متقدمین سے اس بارہ میں کوئی نص نہیں ہے اور بعض علماء نے اسی سبب (جہاد کے لئے نازل ہونے کے باقی رہنے کا اعتبار کر کے براۃ کی ابتداء کی طرح اس کے درمیانی حصوں میں بھی بسم اللہ کو جائز نہیں رکھا۔ اور دونوں مذہب صحیح ہیں (ص ۱۰۶ شرح شاطبیہ)

دفع تعارض درمیان قول امام اعظم رح و امام عاصم رح

حضرت تھانوی رح سے امداد الفتاویٰ میں سوال کیا گیا کہ باب البسملہ میں امام عاصم رح کے نزدیک بین السورتین بسم اللہ ضروری ہے اور امام ابوحنیفہ رح کے مذہب میں تراویح کے اندر ہر سورت پر بسم اللہ نہیں پڑھی جاتی۔

تو اب اس صورت میں بروایۃ حفص عن العاصم الکوفی رح ختم کلام مجید پورے طور پر کیونکر ہوگا اس لئے کہ بسم اللہ ایک غیر معین سورت کے اول میں پڑھی جاتی ہے اور باقی ایک سو تیرہ سورتوں کے اول میں نہیں پڑھی جاتی۔

حضرت تھانوی رح نے اس کے جواب میں فرمایا کہ،

بسم اللہ کے باب میں ایک مسئلہ قراۃ کے متعلق ہے اور ایک مسئلہ فقہ کے متعلق عاصم کا قول اول مسئلہ کی تحقیق ہے اور امام ابوحنیفہ کا قول دوسرے مسئلہ کی تحقیق حاصل مسئلہ اول کا یہ ہے کہ گو بسم اللہ ہر سورت کا جزء نہ ہو مگر باوجود عدم جزئیت روایۃً

اس کا پڑھنا ہر سورۃ پر منقول ہے پس اگر کوئی شخص ہر سورت پر نہ پڑھے تو اس کی قرأت اس روایت کے موافق نہ ہوئی گو کوئی جز متروک نہ ہوا ہو جبکہ کم از کم ایک سورت پر پڑھ لے اور دوسرے مسئلہ کا حاصل یہ ہے کہ گو روایۃً ہر سورت پر بسم اللہ منقول ہو لیکن ہر سورت کا جزو نہیں ہے بلکہ جزء مطلق قرآن کا ہے اگر ایک جگہ بھی پڑھے تو قرآن کا ختم پورا ہو جائیگا گو اس روایت کے موافق اس کی قرأت نہ ہو، پس امام عاصم اور امام ابو حنیفہ کے قول میں کوئی تخالف نہیں کیونکہ دونوں کی نفی اور اثبات کی حیثیتیں جدا جدا ہیں اور حیثیات کے بدلنے سے تعارض جاتا رہتا ہے یہ عیب ہے کہ ہر سورت پر بسم اللہ نہ پڑھے اور اگر پڑھ لے تو شبہ کی گنجائش ہی نہیں اور امام صاحب کے بھی خلاف نہیں کیونکہ امام صاحب تسمیہ کو ہر سورت پر ضروری نہیں کہتے یہ نہیں کہ جائز نہیں کہتے،

در مختار یا ردمختار میں ہر سورت پر تسمیہ کو حسن کہا ہے۔ رہا ہر جگہ پکار کر پڑھنا یہ بلا شبہ احناف کے خلاف ہے اور امام عاصم بھی جہر کو ضروری نہیں کہتے صرف تسمیہ کو ضروری کہتے ہیں۔

(۸ ربیع الثانی ۱۳۲۴ھ امداد الفتاوی ص۲۳۱ ج ۱)

مسئلہ جہر بالتسمیہ فی الصلوٰۃ

ہمارے شیخ مولانا قاری فتح محمد صاحب پانی پتی رح شرح شاطبی اردو میں فرماتے ہیں رہا یہ کہ نماز میں بسم اللہ کو آہستہ پڑھیں یا آواز سے، سو فرض اور واجب نمازوں میں تو ہمارے تمام علماء کا آہستہ پڑھنے پر ہی اتفاق ہے لیکن تراویح میں اختلاف ہے حضرت مولانا قاری عبدالرحمٰن صاحب محدث پانی پتی کی رائے یہ ہے کہ آواز سے پڑھی جائے ورنہ سننے والوں کا قرآن روایت کے موافق کامل نہ ہوگا اور دوسرے تمام علماء آہستہ پڑھنے کے قائل ہیں اس بنا پر کہ نماز میں امام ابو حنیفہ کا مذہب یہی ہے۔

خلاصہ یہ کہ تراویح میں آہستہ اور آواز سے دونوں طرح پڑھ سکتے ہیں لیکن قوی یہ ہے کہ آہستہ پڑھیں (شرح شاطبیہ ص۱۰ ج ۱) مزید تفصیل کے لئے رسالہ احکام رمضان کا مطالعہ کیجئے [1]

حضرت حکیم الامت رح غیث النفع کی عبارت نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں

اس عبارت سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ میرا قول بھی گنجائش رکھتا ہے اور قاری صاحب کا بھی ۔

دوسرا امر قابل غور یہ ہے کہ اگر قاری صاحب کے سب مقدمات تسلیم کر لئے جاویں تو تراویح کی کیا تخصیص ہے یہ مقدمات تو قرات فی الفرض میں بھی جاری ہیں تو کیا احناف وجوب جہر بالبسملہ فی الفرض کا التزام کریں گے ؟ (بوادر النوادر ص۳۲۷ ج ۱)

اوقاف کا بیان

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :-

اصل فن تجوید تو مخارج اور صفات کی بحث ہے جو بفضلہ تعالیٰ بقدر ضرورت اوپر لکھی گئی ہے باقی اور تین علم اس فن کی تکمیل ہیں علم اوقاف، علم قرآت، علم رسم خط

چنانچہ علم اوقاف کی ایک بحث وقف کرنے کے قواعد ہیں

قاعدہ نمبر(۱) جو شخص معنی نہ سمجھتا ہو اس کو چاہیئے کہ انہیں مواقع پر وقف کرے جہاں قرآن میں نشان بنا ہوا ہے بلا ضرورت بیچ میں نہ ٹھہرے ۔

البتہ اگر بیچ میں سانس ٹوٹ جائے تو مجبوری ہے (جمال القرآن ص ـــ)

---

[1] یہ رسالہ مفیدہ کتاب بارہ مہینوں کے مسائل و فضائل کے ساتھ طبع ہو رہا ہے اور ادارہ اسلامیات ۱۹۰ انارکلی لاہور سے دستیاب ہے ۔ (سید عبدالقدوس ترمذی)

علم تجوید کے ذریعہ جس طرح یہ معلوم ہوتا ہے کہ فلاں حرف اس طرح ادا کرنا چاہئے اور فلاں کو کس طرح اسی طرح علم وقف سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ معنی کے اعتبار سے وقف کہاں کیا جائے اور کس کلمہ پر کس طرح وقف کرنا چاہیئے۔

حضرت مصنف علیہ الرحمۃ نے جمال القرآن میں دونوں طرح کے قواعد بیان کر دیئے ہیں وہ بھی جن میں وقف کرنے کا موقعہ بیان کیا گیا ہے اور وہ بھی جن میں وقف کرنے کا طریقہ بتایا گیا ہے۔

جمال القرآن کے قاعدہ نمبر ۱ میں وقف کرنے کے مواقع کا بیان کیا گیا ہے کہ معنی کے اعتبار سے وقف کہاں کیا جائے

اور قاعدہ نمبر ۲، ۳، ۴ وغیرہ میں بیان کیا گیا ہے کہ وقف کس طریقہ سے کیا جاتا ہے اس کا بہت تفصیلی بیان جمال القرآن میں لکھا گیا ہے اور وقف کی تینوں قسموں وقف بالاسکان اور وقف بالروم، وقف بالاشمام "کے ساتھ وقف کرنے کا طریقہ تبلایا گیا ہے اور یہ بھی تبلایا گیا ہے کہ روم اور اشمام کس جگہ کیا جاتا ہے اور کس جگہ منع ہے۔

رموز اوقاف

علماء کرام نے قرآن کریم کے معنوں میں غور کر کے عام لوگوں کی سہولت کی خاطر وقف کرنے کی جگہ پر رموز اور نشان لگا دیتے ہیں

حضرت مصنف علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں جو شخص معنی نہ جانتا ہو اس کو چاہئے انہیں مواقع پر وقف کرے جہاں قرآن میں وقف کا نشان لگا ہوا ہے تاکہ بے موقع وقف کرنے کی غلطی سے حفاظت رہے۔

ثبوت اوقاف کلام مجید

قرآن کریم میں اوقاف کے جو رموز لکھے ہوتے ہیں اور قراء کے معمول ہیں، حضرت تھانویؒ نے اپنے فتاویٰ میں ان کو ادلہ اربعہ یعنی قرآن وسنت اور اجماع وقیاس سے ثابت کیا ہے حضرت فرماتے ہیں:۔

آیات واوقاف کلام مجید کے کتاب وسنت واجماع وقیاس سے ثابت ہیں۔ اما الکتاب فقد قال اللہ تعالیٰ ورتل القرآن ترتیلا۔ فرمایا حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے کہ معنی ترتیل کے یہ ہیں کہ تجوید حروف کی اور پہچاننا وقفوں کا،،

(از مختصر التجوید قاری قادر بخش مرحوم)

فی الصراح، ترتیل ہموار خواندن وآرمیدہ وپیدا خواندن۔ وقال اللہ تعالیٰ ولقد اٰتینٰک سبعا من المثانی (سبع آیات وھی الفاتحۃ) بیضاوی۔ (آیت بھی وقف بالمعنی الاعم میں داخل ہے)

اما السنۃ فعن ام سلمۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہا قالت کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقطع قرأتہ یقرأ الحمد للہ رب العلمین ثم یقف الرحمٰن الرحیم ثم یقف (ترمذی ص ۱۳ ج ۲)

وعن ابی ھریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان سورۃ من القرآن ثلاثون آیۃ شفعت لرجل حتی غفر لہ وھی تبارک الذی بیدہ الملک (ترمذی ص ۱۲۶ ج ۲) از نہایات البیان مصنفہ قاری سید محمدی دہلویؒ

اور اجماع اس لئے کہ آج تک سلف وخلف میں سے کسی نے اس میں خلاف نہیں کیا بلکہ ہمیشہ اس فن میں تصنیفات فرماتے رہے۔ کما یعلم من مطالعۃ رسائل القرأۃ

اور قیاس یہ کہ کلام میں مواضع و مواقع وصل و فصل ہوا کرتے ہیں تو منجملہ رعایات حسن کلام کے اس کی بھی رعایت ہے مگر اتنا فرق ہے کہ اہل زبان کو اس میں کچھ تکلف اور مشقت نہیں ہوتی اور غیر زبان والے کو دشواری پڑتی ہے اس لئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس کے تعلیم و تعلم کی حاجت نہ تھی،

جب قرآن شریف تمام ملکوں میں پھیلا اور ان کی زبان عربی نہ تھی اس لئے غلط کرنے لگے اور بے موقع اور غلط پڑھنے لگے ان کے لئے علماء سلف نے اعراب قرآن و رموز و اوقاف تجویز فرمائے اور ضبط کئے تاکہ ان کو سہولت ہو پس ثبوت اس کا ادلہ اربعہ شرعیہ سے ہے اور حتی الوسع اس کی رعایت ضروری ہے کہ بعض جگہ خلاف کرنے سے معنی بگڑ جاتے ہیں چنانچہ سورۃ براۃ میں آیت واللہ لایھدی القوم الظالمین پر ٹھہرنا لازم ہے اور اگر یہاں نہ ٹھہریں اور الذین اٰمنوا وھاجروا کے ساتھ ملا دیں تو معنی بالکل فاسد ہو جاویں گے

کما لا یخفیٰ و کفی قدوۃ بما قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ما رآہ المسلمون حسنا فھو عند اللہ حسن اور جو قصداً اس کے خلاف کرے تو وہ مخالف جماعت ہے، واللہ اعلم محرم ۱۳۰۱ھ (امداد الفتاویٰ ص ۲۰ ج ۱)

اس جگہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے امداد الفتاویٰ کے حاشیہ میں اپنی ایک مبسوط تحریر کا بھی حوالہ دیا ہے جو اس مبحث میں لکھی گئی ہے اور رسالہ اثبات وقف لازم کے اخیر میں شائع ہوئی ہے۔

رسالہ اثبات وقف لازم حضرت قاری محمد علی صاحب جلال آبادی کی تصنیف لطیف ہے اس کے ساتھ حضرت تھانوی رحمہ کی مبسوط تحریر بنام رفع الخلاف فی حکم الاوقاف شائع ہوئی ہے اس کا ذکر اشرف السوانح حصہ سوم ص ۲۴۷ پر بھی کیا گیا ہے اور اس کا حوالہ امداد الفتاویٰ میں بھی دیا گیا ہے۔

تطبیق وقف لازم در دو مقامات

اور وقف لازم کے بارہ میں حضرت علیہ الرحمۃ کا ایک اور مفصل اور تحقیقی جواب امداد الفتاویٰ کے صـ۱۹۶ ج ۱ سے صـ۲۰۰ ج ۱ تک قابل ملاحظہ ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ رفع الخلاف کے علاوہ اس بارہ میں دوسرا مضمون حضرت تھانویؒ کا ہے۔ دراصل یہ اس شبہ کا جواب ہے کہ علامہ سجاوندی نے واسئلهم عن القرية التى كانت حاضرة البحر میں البحر پر وقف لازم لکھا ہے حالانکہ اذ يعدون فى السبت میں اذ ظرف ہے القریۃ کا۔ اسی طرح سورۃ مؤمنون میں اعناب پر وقف لازم لکھتے ہیں حالانکہ یہ وقف بھی قبیح ہے کیونکہ جنٰت مفعول ہے انشأنا کا یقیناً اور شجرة تخرج معطوف ہے جنّٰت پر معطوف اور معطوف علیہ میں فصل کرنا خصوصاً جب مفردات ہوں جملے نہ ہوں ناجائز ہے تو انشأنا سے للاٰکلین تک وقف کرنا ناجائز ہوا۔ تو اعناب پر بھی وقف ناجائز ہوا۔ ناجائز کو لازم کہنا معاذ اللہ سخت گناہ ہے الخ

حضرت حکیم الامت تھانوی رحؒ نے اس کے جواب میں اول چند مقدمات ارقام فرماتے ہیں ـــــ

پہلا مقدمہ یہ ہے کہ رؤس آیات کے علاوہ کہ وہ مثل قرآت سبعہ کے توقیفی ہیں اور ان میں جو جو اختلاف ہے وہ بناءً علی اختلاف الروایات ہے اور باقی جتنے اوقاف ہیں سب امور اجتہادیہ اور ذوقیہ ہیں اور ذوق لسانی سے ہر لغت میں یہ فصل و وصل مواقع مختلفہ میں استعمال کیا جاتا ہے

اور ان میں اختلاف بناء علی اختلاف التفسیر والتاویل والاعراب ہے مثل اختلاف مسائل قیاسیہ، حنفیہ اور شافعیہ کے الخ

مقدمہ دوم، وقف لازم میں لزوم بمعنی وجوب یا فرضیت نہیں ہے بلکہ عین

استحسان موکد ہے اور مدار اس لزوم کا ایہام پر ہے اگر وصل موہم ارادہ غیر مراد ہو، وہاں وقف لازم سمجھا جاتا ہے۔

مقدمہ سوم اسی طرح وقف قبیح میں قبح بمعنی لزوم کفر یا معصیت نہیں بلکہ بمعنی عدم استحسان ہے اور مدار اس قبح کا بھی ایہام پر ہے جہاں فصل موہم ارادہ غیر مراد ہوتا ہے وہاں وقف قبیح سمجھا جاتا ہے

پھر ان ہر دو مقدموں کی دلیل منار الہدیٰ سے نقل فرمائی ہے اور بھی کئی مقدمات کا ذکر فرمانے کے بعد ارشاد فرماتے ہیں کہ:۔

بعد تمہید ان مقدمات کے جواب سمجھنا چاہئے کہ سوال کے دونوں موقعوں میں وقف لازم ہے اور وہ سجاوندی کے قول پر ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ وصل میں ایہام اذ کے واشکل کے متعلقات میں سے ہونے کا اور وہ علامہ سجاوندی کے ذہن میں خلاف مراد قرآنی ہے کیونکہ ان کے نزدیک یہ جملہ مستانفہ ہے ..... اس لئے انہوں نے بجو پر وقف کیا اور ایہام اعناب کے موصوف اور جملہ لکم فیہا فواکہ کثیرۃ کی صفت ہونے کا یہ ایہام وقف سے مرتفع نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وقف کسی طرح اس پر دلالت نہیں کرتا کہ یہ اعناب کی صفت نہیں بلکہ نخیل و اعناب مجموعہ کی یا جنات کی صفت ہے لہذا استدلال یوں کرنا چاہئے کہ سجاوندی کے نزدیک یہ کلام مستانف ہے .... اور وصل میں شبہ تھا جنات "یا نخیل و اعناب" کی صفت ہونے کا جو کہ ان کے نزدیک خلاف مراد قرآنی تھا اس لئے انہوں نے وقف کیا۔

علاوہ اس کے جو بنا رشبہات کی ہے کہ اذ بعد دن میں اذ ظرف ہے" اس مضاف کا الخ یا شجرۃ مفعول ہے انشأنا کا الخ اس میں خود کلام ہو سکتا ہے اس لئے کہ یہ توجیہ بھی ممکن ہے کہ عامل اذ کا محذوف ہو مثلاً کانت حاضرۃ البحر یا وقعت القصۃ یا مثل اس کے جیسا کہ قرآن میں اس کے نظائر بکثرت موجود ہیں بہرحال

لزوم قبح کا کوئی مبنیٰ نہیں پایا جاتا (صفحہ ۲ ج ۱)

محل وقوف میں کلام کرنے کے لئے حضرت رح نے بڑا قیمتی اور ضروری مقدمہ ہشتم بیان فرمایا ہے فرماتے ہیں

چونکہ علم وقوف نہایت دقیق علم ہے جس میں بہت سے علوم کی ضرورت ہے اس لئے بدون جمع ان آلات وعلوم کے محض تھوڑی سی مناسبت درسی علوم کے سبب اس میں کلام جائز نہیں جیسا کہ جمیع اجتہادیات کا حال ہے (صفحہ ۱۹۹ ج ۱)

یعنی جب تک تمام متعلقہ علوم میں مہارت اور خوب مناسبت حاصل نہ ہو اس وقت تک اس میں کلام جائز نہیں کیونکہ علم وقوف اجتہادی ہے اور تمام اجتہادیات کا یہی حال ہے کہ ان میں کلام کرنے کے لئے متعلقہ علوم میں مہارت تامہ اور کامل مناسبت کی ضرورت ہے ہر شخص کا اس میں کلام اور اختلاف کرنا معتبر نہیں اس لئے علامہ سجاوندی کے ساتھ اختلاف کرنا ہم جیسوں کو کہ نہ اس قدر علم ہے اور نہ وہ ذکاء اور نہ وہ سلامت نظر جائز نہیں۔

وقف پر شبہ کا جواب

سورۃ انعام کی دو آیتوں کے وقف پر شبہ کا جواب،

سوال یہ تھا کہ سجاوندی کے اوقاف میں اکثر خلجان ہوتا ہے پہلے ہی عرض کیا ہے کہ اس وقت دو جگہ خلجان ہے اگر خیال مبارک میں کوئی توجیہ آوے یا کسی کتاب میں نظر پڑے تو اعلام فرما دیں۔

(۱) واقسموا باللّٰہ جھد ایمانھم لئن جاءتھم آیۃ لیؤمنن بھا قل انما الآیات عند اللّٰہ وما یشعرکم انھا اذا جاءت لا یؤمنون۔

جملہ وما یشعرکم تا لا یؤمنون بر قرآۃ ان مفتوحہ ماقبل سے منقطع ہے

داخل مقولہ قول نہیں معلوم ہوتا۔ اور عدم وقف کی صورت میں شبہ ہو سکتا ہے نہ داخل مقولہ ہو، لہذا بظاہر عند اللہ پر وقف لازم مگر کسی قرآن یا کتاب میں وقف نہیں لکھا۔

(۲) الا انهم من افكهم ليقولون ولد الله وانهم لكاذبون
چونکہ بظاہر جملہ وانهم لكاذبون ماقبل سے بالکل منقطع ہے اور داخل قول نہیں لہذا وقف لازم ہے حالانکہ سجاوندی میں لا لکھا ہے، تعجب ہے ہاں اگر قول کے نیچے داخل کریں اور خلاف سیاق ضمیر و انهم" مرسلین کی طرف پھیریں تو مضائقہ نہیں مگر نہایت بعید معلوم ہوتا ہے اور منار الہدیٰ میں اس جگہ جائز لکھا ہے۔

حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃً نے جواب میں ارشاد فرمایا۔
اول مکررہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن عامر اور حمزہ نے قرار سبعہ میں سے انها بفتح اک اور لا تؤمنون بصیغہ خطاب پڑھا ہے تو اس صورت میں جملہ و مایشعرکم داخل مقولہ ہو سکتا ہے۔ ویکون المعنیٰ ای لا تعلمون بل یعلم الله انها اذا جاءت لا تؤمنون پس ممکن ہے کہ سجاوندی کی یہی قرأت ہو۔

اور بقیہ قرأت پر بھی ایک توجیہہ یہ ہو سکتی ہے کہ قل کا مقول لہٗ کفار نہ ہوں۔ بلکہ کفار کی قسم سن کر جن مسلمانوں کو ان کے ایمان کی طمع اور اس طمع سے تمنا ظہور آیات کی پیدا ہو گئی تھی ان کو دونوں جملوں سے یعنی انما الآیات سے بھی و مایشعرکم سے بھی فہمائش کی گئی ہو اور کفار کو بوجہ ان کے معاند ہونے کے قابل خطاب قرار نہ دیا گیا ہو

دوسرا: اس وقت اور بھی چند مواقع یاد آئے کہ جہاں کفار کا قول نقل کر کے اس کو رد کیا ہے اور دونوں کے درمیان وقف لازم نہیں ہے سو اس میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر اصل سے عدول کسی نکتہ خاصہ کی وجہ سے ہو تو مضائقہ نہیں اور یہاں اصل وقف ہی تھا مگر نکتہ کی وجہ سے عدول کیا گیا اور وہ نکتہ وہی ہو جو شاید جناب نے ایک بار فرمایا تھا

تعجیل تنزیہ حق و تعجیل ابطال باطل مقصود ہے، واللہ اعلم)

علاوہ اس کے یہ اوقاف اجتہادی ہیں والاجتہاد یحتمل الخطاء والصواب اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ وقف لازم وہاں ہوگا جہاں وقف نہ کرنا موہم خلاف مقصود ہو، اور یہاں قرینہ عقلیہ اس ایہام کا قاطع ہے کیونکہ عقل اس پر دلالت کرتی ہے کہ ایک ہی شخص ایک امر کا دعویٰ کرے اور خود ہی ساتھ ساتھ تصریحاً و التزاماً اس کا ابطال کرے یہ عادۃً ممتنع ہے پس یہاں وانہم لکاذبون میں ضمیر تو یقیناً ان ہی قائلین کی طرف ہے پس بناء مذکور پر یہ ممتنع ہے کہ وہ لوگ ولد اللہ بھی کہیں اور اپنے کو اس میں کاذب بھی کہیں۔

علیٰ ھذا وقالوا اتخذ اللہ ولداً سبحانہ میں بناء مذکور پر یہ ممتنع ہے کہ وہ لوگ اتخذ اللہ ولداً بھی کہیں اور تنزیہ بھی کریں۔ پس چونکہ ایہام خلاف مقصود کا نہ تھا لہٰذا ان مواقع پر وقف لازم نہ ہوا۔

نیز غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وقف لازم میں ایہام کفر سے بچنے کا اعتبار کیا گیا ہے سو اگر کفار کوئی بات ایمان کی کہیں تو یہ کفر نہیں اس لئے ایسے مقام پر وقف لازم کا انتظام نہیں کیا گیا (امداد الفتاویٰ ص۲۰۴ ج۲)

یہ توجیہ الہامی اور بہت ہی عجیب و غریب ہے فللہ در حکیم الامۃ التھانوی

سورۂ نور میں رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ کے رجال پر وقف کی تحقیق

رجال کے بعد سجاوندی نے وقف ط لکھا ہے اور اگر قرآن شریف مطبوعہ میں (لا) بنا ہے یہ غلط ہے ابوبکر وغیرہ جو لوگ یسبح بصیغۂ مجہول پڑھتے ہیں ان کے نزدیک الاصال پر ط ہونا چاہئے اور رجال پر لا۔

اور جو معروف پڑھتے ہیں ان کے نزدیک رجال پر ط ہونا چاہئے اور الاصال پر لآ حفص کی قراءت میں رجال پر لآ لکھنا غلط ہے اور سہو کاتب ہے۔

حضرت رحمہ اللہ نے اس سوال کے جواب میں ارقام فرمایا ہے
میرے نزدیک دونوں توجیہ صحیح ہو سکتی ہیں مشہور مصاحف کی تقدیر پر تو ظاہر ہے
اور سجاوندی کی تقدیر پر اس طرح کہ رجال کو موصوف نہ کہا جائے بلکہ بمعنی بعض کے لے کر
کلام کو ختم کر دیا جائے آگے جملہ استینافیہ بطور سوال کے کہا جائے کہ وہ رجال کیسے ہیں
ایسے ایسے ہیں۔ فارتفع الاشکال (امداد الفتاوی صہ ۲۰۶ ج ۱)

وقف رسم خط کے موافق ہوتا ہے

اس قاعدہ نمبر ۱۱ کے آخر میں لکھا ہے کہ کلمہ جس طرح لکھا ہے اس کے موافق وقف
کرو اگرچہ وہ دوسری طرح پڑھا جاتا ہو پڑھنے کے موافق وقف نہ کریں گے۔ مثلاً انا میں جو
الف نون کے بعد ہے وہ ویسے تو پڑھنے میں نہیں آتا لیکن اگر اس کلمہ پر وقف کیا جائیگا
تو پھر الف کو بھی پڑھیں گے (جمال القرآن صہ ۲۷)

یہاں سے واضح ہو رہا ہے کہ وقف رسم الخط کے موافق ہونا اس لئے کہا جاتا ہے
کہ وقف رسم الخط کے تابع ہوتا ہے یعنی کلمہ جس طرح لکھا ہوا ہے اس کے مطابق وقف
ہوگا۔ اوپر کی مثال میں انا نون کے بعد الف کے ساتھ لکھا جاتا ہے تو وقف میں اس کو پڑھا
جائے گا

اس طرح گول ۃ بصورۃ ۃ لکھی ہوئی کو حالت وقف میں ہ پڑھا جائیگا یہ اصول
کہ وقف تابع رسم خط ہوتا ہے اگرچہ انتہائی وسیع اصول ہے اور اس کی تفصیل قرآت کی
بڑی کتابوں میں ہے مگر اس قاعدہ سے کئی الفاظ مستثنیٰ بھی ہیں حضرت نے ان کی نشاندہی
فرمادی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں

قاعدہ مذکورہ کے اخیر میں جو لکھا گیا ہے کہ وہ کلمہ جس طرح لکھا ہے اس کے موافق
وقف کرو اس قاعدہ سے یہ الفاظ مستثنیٰ ہیں او یعفوا۔ ان تبوآ وغیرہ تو وہ

الفاظ کا شمار فرمایا ہے ان میں بعض الفاظ ایسے ہیں جن میں دونوں حالتوں میں الف نہیں پڑھا جاتا نہ وصلاً نہ وقفاً اور بعض ایسے ہیں جن میں بحالت وصل الف نہیں پڑھا جاتا اور حالت وقف میں پڑھا جاتا ہے مگر خاص لفظ سلا سلا کو حالت وقف میں بدون الف پڑھنا بھی مروی ہے یعنی سلاسل (ص۲۷، محصلاً)

یعنی اس میں وقفاً دو وجہیں ہوئیں بالالف و بلا الف (حاشیہ شریفہ)

یہ رسم خط کے خلاف وقف کرنے اور قاعدہ مذکورہ سے استثنائی حالتوں کا ذکر تھا

تحقیق اثبات و اسقاط الف تثنیہ در ذاقا و قالا الحمد وغیرہ

حضرت حکیم الامت سے سوال کیا گیا تھا کہ الف تثنیہ کا جیسے الف ذاقا الشجرۃ اور وقالا الحمد للہ الذی اور واؤ جمع کا جیسے وقالوا الحمد للہ اور افعلوا الخیر کے درج میں ساقط ہوتا ہے یا نہیں اور اس کو پڑھنا چاہئے یا نہیں؟

حضرت تھانوی رح نے اس کے جواب میں ارقام فرمایا ہے۔

اس باب میں کوئی معتبر سند میری نظر سے نہیں گذری البتہ حضرت مولانا قاری عبدالرحمن صاحب پانی پتی کے بعض اپنے رسائل میں الف تثنیہ موقع الباس میں الف تثنیہ کے کسی قدر اظہار کو لکھا ہے مگر واؤ جمع میں نہیں لکھا۔ مگر چونکہ اس پر کوئی دلیل قائم نہیں کی لہذا میرا معمول نہیں اور التباس تو بعض جگہ واؤ جمع میں بھی ہے جیسے قل ادعوا اللہ او ادعوا الرحمٰن۔ حالانکہ وہاں کوئی قائل نہیں اور رفع التباس کے لئے قرینہ مقامیہ کافی ہے واللہ اعلم

اور اگر سماع عن القراء سے استدلال کیا جاوے تو اس کے خلاف بھی مسموع عن القراء ہے (ماخوذ از امداد الفتاویٰ ص۱۹۶ ج ۱)

اصل تو قراۃ کا مدار سماع پر ہی ہے اور یہ قواعد اسی کی حفاظت کے لئے مدون کئے

گئے ہیں اسی لئے حضرت علیہ الرحمۃ نے فرمایا ہے کہ اس کے خلاف بھی مسموع عن القراء ہے
احقر کے فہم ناقص میں غور طلب بات یہ ہے کہ ان دونوں مقامات میں اگر ائمہ قرأت
سے الف تثنیہ کا اثبات مسموع ہے تو پھر تو اس کا اثبات لازم ہے اس میں کوئی نکتہ
ہو یا نہ ہو سماع کے موافق ہی پڑھنا ضروری ہے اور اگر ائمہ سے اس کا سماع نہ ہو بلکہ
بعد میں کسی نے اجتہادی طور پر اختیار کیا ہو تو پھر اس پر یہ اشکالات وارد ہوتے ہیں
جن کا ذکر حضرت تھانوی ؒ نے اپنے مذکورہ بالا جواب میں فرمایا ہے احقر کی دریافت
میں یہ ائمہ قرأت سے مسموع نہیں ہے بعد میں اجتہادی طور پر بعض اعلام نے اس کو اختیار
فرمایا ہے ۔ واللہ اعلم

علم رسم خط

رسم خط سے مراد وہ طریقہ تحریر اور الفاظ کی شکل ہے جس میں حضرت عثمان رضی اللہ
تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجماع سے قرآن کریم لکھوا کر جا بجا بھیجا
گیا۔ اس طریقہ تحریر اور اس کے قواعد و ضوابط کو علم رسم خط کہتے ہیں
اس کا علم اس لئے بھی ضروری ہے کہ اوقاف رسم خط کے تابع ہوتے ہیں جیسا کہ
گذرا۔ دوسرے اجماع صحابہ کی وجہ سے اس رسم خط کا اتباع کتابت قرآن میں ضروری
ہے علم رسم خط کا بیان جس قدر بہت ضروری تھا اس کا بیان حضرت مصنف علیہ الرحمۃ نے
اجمالی طور پر چودھویں لمعہ میں کر دیا ہے کیونکہ یہ جمال القرآن مبتدیوں کے لئے تصنیف
فرمایا گیا ہے

ایک سوال کے جواب میں حضرت تھانوی علیہ الرحمۃ نے ارشاد فرمایا ۔ اور وہ سوال
یہ تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اسم مبارک قرآن مجید میں ایک سو ستتر جگہ پر ہے ایک سو
ستتر جگہ یا کے ساتھ لکھا ہے اور سات جگہ زیر کے ساتھ "

"رسم خط سلف سے یوں ہی چلی آتی ہے جہاں یا نہیں ہے بعض (امام ہشام) کی قرآت ابراھام ہے عجیب نہیں کہ اس کی رعایت سے ابراہم (کھڑی زیر سے) لکھا ہو تاکہ دونوں طرح پڑھ سکیں ابراہیم اور ابراھم" (امداد الفتاوی ج۱ ص۲۰۵)

قرآن کریم کی کتابت میں تو رسم خط عثمانی اور اسی طرز تحریر کا لحاظ رکھنا بہت ضروری ہے اس کے خلاف لکھنا جائز ہی نہیں ہے البتہ یہ بات قابل غور ہے کہ قرآن کریم کی کوئی آیت اگر کسی تحریر میں لکھی جائے تو کیا اس میں بھی رسم عثمانی کی رعایت واجب ہے؟

تفسیر مظہری کی تصحیح

تفسیر مظہری کی تصحیح کے سلسلہ میں ہمارے شیخ حضرت مولانا قاری محی الاسلام صاحب پانی پتی رح اور حضرت حکیم الامۃ تھانوی قدس سرہٗ کی تفصیلی خط و کتابت ہوئی تھی جو امداد الفتاوی کا جزو ہو کر شائع ہو رہی ہے وہ بہت سے فوائد نافعہ پر مشتمل ہے اس میں رسم الخط کے بارہ میں بھی ایک سوال و جواب ہے۔ حضرت مولانا قاری محی الاسلام صاحب رح کا سوال یہ تھا کہ:-

حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی رح رسم عثمانی کی پابندی نہیں کرتے اور قرآنی الفاظ کو مصریوں کی مانند رسم کے خلاف تحریر فرماتے ہیں آیات زیر تفسیر میں بھی یہی عمل ہے اور ان آیات و فقرات میں بھی جن کو استشہاداً یا اقتباساً نقل فرماتے ہیں

حضرت حکیم الامت تھانوی رح نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا ہے کہ:-

میرے خیال میں حضرت قاضی صاحب کا اجتہاد یہ ہے کہ قرآن مجید جب تلاوت کے لئے تحریر کیا جائے اس میں تو مصحف عثمانی کا اتباع واجب ہے ورنہ واجب نہیں جیسے کوئی شخص اپنے خط میں کوئی آیت استشہاداً لکھے اس میں اس اتباع کے وجوب کا دعویٰ غالباً دشوار اور بے دلیل ہے اس لئے حضرت قاضی صاحب پر کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔

(امداد الفتاویٰ صـ۲۶ ج ۵)

اس جواب کا حاصل یہی ہے کہ تفسیر اور دوسری تحریروں میں اگر رسم عثمانی کی رعایت نہ رکھی جائے تو اس کی بھی گنجائش ہے اور اگر اس کی رعایت کرلی جائے تو اس کے استحسان میں کیا کلام ہے۔

یہ پہلے معلوم ہوچکا کہ علم رسم الخط کا جاننا اس لئے ضروری ہے کہ بعض کلمیں کی رسم اور طرح سے ہے اور پڑھے اور طرح سے جاتے ہیں اس علم کا جس قدر بیان ضروری تھا وہ اجمالی طور پر جمال القرآن کے چودھویں لمعہ میں کردیا گیا ہے

جمال القرآن کی جامعیت

جمال القرآن میں علم تجوید اور وقوف اور رسم خط تینوں کا بیان ہے جیساکہ اوپر گذرا اس طرح یہ نہایت جامع اور مفید رسالہ ہے۔

علم قرأت

تعریف علم قرأت

علم قرأت میں یہ بیان کیا جاتا ہے کہ قرآنی کلمات کو وحی الٰہی نے کس کس طرح پڑھنے کی اجازت دی ہے۔

موضوع

علم تجوید اور علم قرأت دونوں کا موضوع الفاظ قرآن ہیں، مگر تجوید میں حروف کے مخارج وصفات اور ان کے حالات متفقہ سے بحث ہوتی ہے اور قرأت میں احوال مختلفہ فیہا سے، مثلاً حذف واثبات، تحریک وتسکین، مدوقصر، فتح وامالہ، تحقیق وتخفیف

(شرح سبعہ قرأت)

اقسام قرأت

پھر قرأت کی دو قسمیں ہیں۔ متواترہ۔ اور شاذ

متواترہ

متواترہ وہ قرأت ہے جس کے نقل کرنے والے ہر زمانہ میں اس قدر کثیر ہوں کہ ان سب کے جھوٹ پر اتفاق کر لینے کو عقل سلیم محال سمجھے

شاذ

شاذہ وہ قرأت ہے کہ جس کے نقل کرنے والے ہر زمانہ میں اتنے کثیر نہ ہوں، قرأت متواترہ قرآن ہے اس کا پڑھنا مطلقاً جائز ہے نماز کے اندر بھی نماز کے باہر بھی، اس کا انکار کرنا گناہ اور کفر ہے اور قرأت شاذہ قرآن نہیں کیونکہ تمام ائمہ اصول متفق ہیں کہ قرآن کے لئے تواتر شرط ہے اور ان میں تواتر نہیں پایا جاتا اس کا حکم یہ ہے کہ ان کو قرآن سمجھ کر پڑھنا یا ایسے طرز سے پڑھنا جس طرز سے قرآن پڑھا جاتا ہے ناجائز ہے لیکن ان کو سیکھنا سکھانا، کتابوں میں لکھنا ان کی لغوی، معنوی توجیہات بیان کرنا اور کسی لغوی وجہ پر ان سے استدلال کرنا جائز ہے (تجوید القرآن)

حکم

قرأت کا حکم بحوالہ امداد الفتاوی پہلے لکھا جا چکا ہے کہ اس کا سیکھنا سکھانا واجب علی الکفایہ ہے اگر کوئی بھی نہ سیکھے گا تو سب گنہگار ہوں گے

ایک شبہ درباره ضرورت سبعہ اور اس کا ازالہ!

اوپر حضرت والا کی تحقیق سے یہ ثابت ہو چکا کہ سبعہ قرارت واجب علی الکفایہ ہے تو اس کا حکم بھی وہی ہوگا جو دوسرے فروض کفایہ کا ہے۔

ایک سوال کے جواب میں حضرت والا فرماتے ہیں۔ اگر کوئی لکھا پڑھا آدمی حرف بھی اس کا اچھا ہو (یعنی تجوید سیکھ چکا ہو) تو اس کو سبعہ پڑھائی جاتے، سفہاء اور تنگ خیال لوگوں کو فقط تجوید پڑھائی جاتے الخ۔

یہی حال اکثر فروض کفایہ کا ہے مثلاً تبحر فی العلوم الشرعیہ کہ فرض علی الکفایہ ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ حدیث بھی ہے واضع العلم فی غیر اھلہ کمقلد الخنازیر اللؤلؤ والجواھر او کما قال اور مشاہدہ بھی ہے کہ بعض لوگ جو بدطینت ہیں اور وہ تحصیل علوم کر کے مقتداء بن گئے ان سے کیا کیا مفاسد پیدا ہو گئے اور ان مفاسد کا انسداد بجز اس کے کیا ہے کہ نااہلوں کو اس رتبہ پر نہ پہنچایا جائے

جو لوگ کہ آج کل اس فن (یعنی سبعہ قرآت) کے مخالف ہیں وہ تو نفس فن ہی کو فضول بتلاتے ہیں ہر ایک کے لئے حتیٰ کہ اہل فہم کے لئے بھی اور ہر شیعہ کو حتیٰ کہ تجوید کو بھی فشتان بینھما۔ غرض مدعی منکر دو کلیہ کے ہیں اور اس جواب میں التزام کیا گیا ہے دو جزئیہ کا اور ظاہر ہے کہ جزئیہ مستلزم کلیہ کو نہیں ہوتا اور سبعہ کی فرضیت عامہ (یعنی واجب علی العین) کا دعویٰ کیسے کیا جا سکتا ہے جبکہ خود ایک قرآت سے بھی اتمام قرآن کا فرض عین نہیں اور یہ ظاہر ہے، شوال ۱۳۳۶ھ

(امداد الفتاویٰ ج ۱ ص ۲۰۵)

تحقیق شبہ نقص حسنات بر بعض قرأت اور قرأت کا متواتر ہونا

شبہ کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کریم پڑھنے والے کو ہر حرف کے بدلے دس دس نیکیاں ملتی ہیں تو اب اگر مالك يوم الدين کی قرأت کی بجائے مَلِكِ يوم الدّين کی قرأت پڑھی جائے تو کیا دس نیکیاں کم ہوجائیں گی اسی طرح ہمزہ وصل کو گرا کر پڑھنے میں کیا دس نیکیاں کم ہوجائیں گی۔

حضرت حکیم الامت رح اس کے جواب میں ارشاد فرماتے ہیں۔

قرائتیں ساتوں متواتر اور منقول عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں منقول کے اتباع میں کسی قسم کا نقصان نہیں ہوتا۔ حدیث میں حرف قرآنیہ کے باب میں آیا ہے کلھا شاف کاف رہا شبہ نقص ثواب بنقص حرف، بناء علی الحدیث، سو نقص فی الکم سے نقص فی الکیف لازم نہیں آتا (مطلب یہ کہ کمیت حروف کی کمی کی وجہ سے یہ لازم نہیں کہ کیفیت میں بھی کمی آجائے اس لئے اگر حذف کی قرأت میں کمیت میں کمی ہو گئی تو کیفیت میں پھر بھی کمی نہیں آئی) کیا معلوم نہیں کہ ایک دو نّی باوجود اکنی سے ناقص فی العدد ہونے کے کیف وکمیت میں برابر ہیں یعنی دو نّی ایک ہے اور اکنیّ دو ہیں تعداد میں دو نّی دو اکنیوں سے کم ہے مگر پھر بھی دونوں برابر ہیں جتنے پیسے دو اکنیوں کے ہیں اتنے ہی ایک دو نّی کے ہیں

رہا ہمزہ وصل کا کم ہوجانا سو اول تو اس کا وہی جواب ہے جو لکھا گیا ہے ابھی۔ دوسرے ممکن ہے کہ وہ حکماً ملفوظ ہونے کے سبب مکتوب الاجر ہو۔

(۴ر شوال ۲۵ھ امداد الفتاوی صـــ ج ۱)

اس جواب میں شبہ مذکورہ کے جواب کے ساتھ اس کی بھی تصریح ہے کہ قرأۃ سبعہ متواتر اور منقول عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

حضرت تھانویؒ کے بعض رسائل قرآت کا تعارف

حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے علم تجوید کی جس طرح خدمت کی ہے اور آپ کا فیض برصغیر سے گذر کر مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ تک پہنچا ہے اسی طرح حضرتؒ نے علم قرآت کی بھی بڑی مفید اور نافع خدمت کی ہے اور اس فن قرآت میں دو کتابیں تالیف فرمائی ہیں۔ ایک تنشیط الطبع فی اجراء السبع دوسری وجوہ المثانی فی توجیہات الکلامات والمعانی

تنشیط الطبع فی اجراء السبع

اس رسالہ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے سبعہ قرآت کے بارے میں سادہ اور آسان عام فہم انداز میں نہایت قیمتی معلومات مہیا کی ہیں یہ رسالہ ایک خطبہ و تمہید کے بعد سات فصلوں اور ایک تتمیم پر مشتمل ہے اس کے ۸۰ صفحات ہیں تقطیع چھوٹی ہے

پہلی فصل میں پہلے قرآت سبعہ متواترہ کے ائمہ اور ان کے دو دو راویوں کا تعارف کرایا گیا ہے اس طرح اکیس راویان کرام یعنی سات ائمہ اور ان کے چودہ راویوں کا تذکرہ آگیا ہے۔ پھر اس کے بعد کے تین ائمہ قرآت اور ان کے دو دو راویوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ یوں دس قرار اور ان کے دو دو راویوں کا ذکر ہو کر تیس مشہور قرار کا تذکرہ آگیا

سبعہ کے علاوہ ان تین قراتوں کے تواتر میں اگرچہ کسی قدر اختلاف ہے مگر محقق قول یہی ہے کہ یہ بھی متواتر ہیں اس کی تفصیل شرح سبعہ قرات میں ملاحظہ ہو۔

پھر قرآت شاذہ کے چار ائمہ اور ان کے دو دو راویوں کا ذکر بعد میں کیا گیا ہے یہ وہ قرار ہیں جن کی قرات شاذ ہیں اور ان کی قرات درجہ احاد سے نہیں بڑھ سکیں۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ علاوہ ان قرآت عشرہ کے چار قرآت اور ہیں جو درجہ

احاد سے نہیں بڑھیں اور ان کو پڑھنا جائز نہیں (صت)

فائدہ

قرات متواترہ اور شاذہ کا حکم

حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے علم قرأت یعنی اختلاف قرأت کو مجموع امت پر فرض کفایہ فرمایا ہے، اور قرأت سبعہ کے متواتر اور منقول عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم ہونے کی تصریح فرمائی ہے جیساکہ اوپر بحوالہ امداد الفتاوی گذرا ہے۔

تنشیط الطبع فی اجراء السبع اس اختلاف قرأت کے اجراء کا نمونہ پیش کیا ہے اور وجوہ المثانی فی توجیہ الکلمات والمعانی میں اختلاف قرأت کی وجہ سے جو کلمات اور معانی میں اختلاف ہوتا ہے اس کی نشاندہی بھی فرمادی ہے۔

پہلے گذر چکا کہ علم قرأت کی دو قسمیں ہیں متواتر اور شاذ۔ قرات متواترہ قرآن ہے اس کا حکم یہ ہے کہ اس کا نماز کے اندر بھی پڑھنا جائز ہے اور قرأت شاذہ کا نماز کے اندر پڑھنا جائز نہیں ہے۔

قرأت عشرہ چونکہ متواترہ ہیں اس لئے ان کا نماز میں پڑھنا جائز ہے سبعہ کے تواتر میں تو کسی کو کلام ہی نہیں بلکہ ان کے تواتر پر اجماع ہے۔ ان کے علاوہ تین قرأتوں کے تواتر میں گو بعض نے کلام کیا ہے مگر محقق قول یہی ہے کہ وہ بھی متواتر ہیں اور ان کا نماز میں پڑھنا جائز ہے۔

کتاب النشر الکبیر میں ہے کہ سئل العلامۃ القاضی القضاۃ ابو النصر عبد الوھاب رحمہ اللہ عن قولہ فی کتاب جمع الجوامع فی الاصول، والسبع متواترۃ مع قولہ والصحیح ان ما وراء

العشرة فهو شاذ: اذا كانت العشرة فهو شاذ: اذا كانت العشرة متواترة فلم لا ذكرتم والعشرة متواترة بدل قولكم والسبع -

فاجاب اما كوننا لم نذكر العشر بدل السبع مع ادعائنا تواترها فلان السبع لم يختلف فی تواترها وقد ذكرنا اولا موضع الاجماع ثم عطفنا عليه موضع الخلاف على ان القول بان القرات الثلاث غير متواترة فی غاية السقوط ولا يصح القول به عمن يعتبر قوله فی الدين وهی اعنی القرات الثلاث: قراة يعقوب وخلف وابی جعفر من القعقاع لا تخالف رسم المصحف- ثم قال سمعت الشيخ الامام يعنی والده المذكور يشدد النكير على بعض القضاة وقد بلغه عنه انه منع من القراة بها واستاذنه بعض اصحابنا مرة فی اقراء السبع فقال اذنت لك ان تقری العشر انتهی

نقلته عن كتابه منع الموانع على سوالات جمع الجوامع (۴/۵-۱)

سیدی علی النوری الصفاقسی اپنی کتاب غیث النفع میں فرماتے ہیں

فالشاذ ما ليس بمتواتر وكل ما زاد الان على القرات العشرة فهو غير متواتر (على هامش ابن القاصح ۱۸)

اور علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ ارقام فرماتے ہیں

القران الذی تجوز به الصلوة بالاتفاق هو المضبوط فی مصاحف الائمة التی بعث بها عثمان رضی الله تعالى عنه الى الامصار وهو الذی اجمع عليه الائمة العشرة

هذا هو المتواتر مجملة و تفصيلاً فما فوق السبعة الى العشرة غير شاذ وانما الشاذ ماوراء العشرة وهو الصحيح وتمام تحقيق ذلك فى فتاوى العلامة قاسم. (۴۵۳-۱)

ان عبارات کا خلاصہ یہ ہے کہ قرأت عشرہ متواترہ ہیں اور ان کا نماز میں پڑھنا جائز ہے اور ان کے علاوہ شاذ ہیں ان کا نماز میں پڑھنا جائز نہیں مگر تفسیر وغیرہ میں ان سے کام لیا جا سکتا ہے دوسری فصل میں متداول قرأت کی تعلیم وتدریس کے انداز اور طریقہ کار سے بحث ہے اور یہ بتایا ہے کہ چند قرأت کو دو سے چودہ تک جمع کرنا چاہیں تو اس کا کیا طریقہ ہے (ص ۳) پھر تیسری فصل میں جمع الجمع کے طریقہ پر پڑھنے کا بیان ہے یعنی جس ترتیب سے قرأت سبعہ کو جمع کرکے پڑھا جاتا ہے اس کا طریقہ بتلایا گیا ہے۔ پھر رسالہ کے آخر میں ایک نقشہ ایک پاؤ سپارہ میں اس کو عملی طور پر جاری کرکے دکھلایا ہے۔ اور یہی اس رسالہ کی روح اور اس کا اصل مقصود ہے۔

چوتھی فصل میں قراء کے درمیان اختلاف کی نوعیت کا بیان ہے اور قراء کے اختلاف کی کلی اور جزئی دو قسموں کو بتلایا ہے اور یہ بھی بتلایا ہے کہ اختلاف جزئی کو اختلاف فرشی بھی کہتے ہیں اور اس کا انضباط کسی قاعدہ میں نہیں ہو سکتا البتہ اختلاف کلی کا انضباط قواعد کلیہ سے ممکن ہے پھر ہر قاری کے اصول کلیہ مختصراً بیان کرکے تنبیہ کی گئی ہے کہ یہ قواعد اکثریہ ہیں بعض مواقع سب کے نزدیک مستثنیٰ ہیں کیونکہ مدار اس فن کا سماع پر ہے اور قواعد کی تدوین محض تقریب ضبط کے لئے ہے۔

پانچویں فصل میں ان امور کا بیان ہے جن سے دوران قرأت پرہیز لازم ہے۔
چھٹی فصل کا موضوع ہے تعوذ، بسملہ، اور تکبیر، اعوذ میں صیغہ مختار یہ ہے اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم اور بسم اللہ ہر سورت کے اول میں متفق علیہ ہے بجز سورۃ براءۃ کے جب کہ اس سے ابتدا کی جائے البتہ بین السورتین اختلاف ہے۔ قالون، کسائی، عاصم مکی کے نزدیک بسم اللہ ثابت ہے اور حمزہ کے نزدیک صرف وصل

اور ابن عامر، ورش اور ابو عامر کے نزدیک وصل و سکتہ دونوں جائز ہیں، پس مبسملین کے نزدیک تین وجہ جائز ہیں۔ اول وقف آخر سورت پر بھی۔ اور بسم اللہ پر بھی، ثانی وقف آخر سورت پر اور بسم اللہ کو دوسری سورت سے ملانا۔ تیسرے دونوں پہ وقف نہ کرنا اور مجوزین بسملہ و ترک کے نزدیک پانچ وجہیں جائز ہیں، تین تو بسم اللہ کی جو اوپر مذکور ہوئیں اور چوتھی سکتہ پانچویں وصل۔

والضحیٰ سے آخر قرآن تک ہر سورت کے ختم پر تکبیر کہنا مسنون ہے اور ائمہ سبعہ میں صرف مکی سے منقول ہے مگر ان کے ایک راوی قنبل کے نزدیک تکبیر و ترک دونوں جائز ہیں (ص۱۸)

ساتویں فصل میں ان آداب کو بتلایا گیا ہے جو کتاب اللہ کی تعلیم و تعلم تلاوت و قرأت اور دعائے اختتام سے تعلق رکھتے ہیں۔

رسالہ کی تتمیم بے حد مفید اور اہم ہے جس میں اختلاف قرأت کو بصورت نقشہ پیش کیا گیا ہے یہ نقشہ سورۃ فاتحہ اور پارہ اول کے ربع اول پر مشتمل ہے اس میں ائمہ قرأت میں سے سات قاریوں اور ان کے دو دو راویوں کی قرأت کو جمع کیا گیا ہے آخر میں تقریباً چوبیس فارسی اشعار پر مشتمل ایک فارسی منظومہ بھی شامل کر دیا ہے جو قرار کے رموز قرأۃ پر مشتمل ہے اور سب سے آخر میں مشہور و غیر مشہور قرأۃ چودہ قاریوں اور ان کے اٹھائیس راویوں کے اسمار گرامی کا مکمل نقشہ بھی دیا گیا ہے جس سے تمام قرار ایک نظر میں سامنے آجاتے ہیں

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس رسالہ کے دیباچہ میں فرمایا ہے

امابعد یہ احقر عرض رسا ہے کہ میں ترجمہ رسالہ منظومہ مصنفہ مولوی سعد اللہ صاحب سے فارغ ہوا تو مناسب معلوم ہوا کہ چند اوراق متعلق قرأت سبعہ کے لکھے جاویں تاکہ بتدی کو تجوید، اختلاف روایات دونوں سے مناسبت ہو جاوے (ص۱)

معلوم ہوا ہے کہ اس رسالہ منظومہ کا ترجمہ بھی حضرت تھانوی کی علمی خدمت تجوید کا

ایک حصہ ہے مگر یہ رسالہ احقر کی نظر سے نہیں گذرا اور معلوم نہیں ہو سکا کہ کس زبان میں ہے۔
بظاہر اس کا ترجمہ اردو زبان میں کیا ہوگا۔

عدد	ترتیب القراء	القراءت مع الضبط فوق و المخالفین تحت	من اتفق مع
۱	قالون	اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ (بلا ادغام) سوسی ۱۲ — مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ (بلا الف) عاصم کسائی ۱۲	ورش و مکی و دوری و شامی و حمزہ
۲	عاصم	مَالِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ	کسائی
۳	سوسی	اَلرَّحِیْم مّٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ (بالادغام)	
	قالون	اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ ۝ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ (بالصاد؛ قنبل خلف) الْمُسْتَقِیْمَ ۝ صِرَاطَ (بالصاد؛ قنبل خلف) الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ (بالکسر بالسکون؛ حمزہ و حمزہ قالون و مکی) غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ (خلاد) عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ (بالکسر بالسکون؛ حمزہ و حمزہ قالون و مکی)	ورش و بصری و شامی و عاصم و کسائی

۲	وجہ قالون	اَنْعَمْتَ عَلَیْہِمْ بالصلۃ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْہِمْ بالصلۃ وَلَا الضَّآلِّیْنَ ج	بزی
۳	قنبل	اِھْدِنَا السِّرَاطَ بالسین الْمُسْتَقِیْمَ ہ سِرَاطَ بالسین الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْہِمْ بالصلۃ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْہِمْ بالصلۃ وَلَا الضَّآلِّیْنَ ہ	
۴	خلف	اِھْدِنَا الصِّرَاطَ بالاشمام الْمُسْتَقِیْمَ ہ صِرَاطَ بالاشمام الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْہُمْ بضم الہاء	
۵	خلاد	صِرَاطَ بالصاد الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْہُمْ بضم الہاء غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْہُمْ بضم الہاء وَلَا الضَّآلِّیْنَ ہ	

اول قالون کے لئے الرحمٰن الرحیم ملک " بلا الف پڑھیں گے ورش، مکی، دوری، شامی، اور حمزہ مندرج ہو گئے اس کے بعد عاصم کے لئے مالک، بالف پڑھیں، کسائی مندرج ہو گئے اس کے بعد الرحیم ملک " سے بادغام اور بلا الف سوسی کے لئے لوٹائیں گے،

دوم اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیہم قالون صاد خالص اور ہاء کنایہ کے کسرہ اور میم کے سکون سے پڑھیں گے، ورش، بزی، بصری، شامی عاصم، کسائی مندرج ہو گئے اس کے بعد قنبل کے لئے سین سے پڑھیں گے اس کے بعد حمزہ کے لئے دونوں جگہ صاد کا زاد سے اشمام کرکے اور ہاء کنایہ کے ضمہ سے لوٹائیں گے پھر

خلاد کے لئے صراط سے بصار خالص اعادہ کریں گے۔

لیکن نقشہ بالا میں خلاد کے لئے اھدنا الصراط المستقیم بالاشمام سے اعادہ ہونا چاہئے ورنہ ان کی یہ وجہ باقی رہ جاتی ہے کیونکہ اس نقشہ میں اوپر صرف خلف کے لئے اشمام لکھا ہے ان کے ساتھ خلاد کا ذکر نہیں ہوا حالانکہ پہلے الصراط میں ان کے لئے بھی خلف کی طرح اشمام ثابت ہے

حضرت حکیم الامت جمع قرأت کا طریقہ تحریر فرماتے ہوئے لکھتے ہیں

پس طریقہ اس کا یہ ہے کہ اول مثلاً قالون کی روایت پڑھی اور غور کیا کہ کون بالکل من اولہ الی آخرہ موافق ہے اور کون کون کس کس جگہ مختلف ہے ان کو یاد رکھا، یا ابتدأ تعلیم میں بہتر یہ ہے کہ لکھ لیا جو بالکل موافق ہے وہ تو مندرج ہو گیا گویا اس کی قرأت بھی ساتھ ساتھ فراغت ہوئی (موافقین کے لئے مکرر پڑھنے کی ضرورت نہیں رہی گویا سب کی طرف سے یہ قرأت ہو گئی)۔

اب مختلفین میں دیکھا کہ آخر اختلاف یعنی ختم آیت کے قریب کس کا اختلاف ہے اس کو وہاں سے پڑھ کر پورا کر لیا (اختلاف کی جگہ تک تو گویا اس کی قرأت پڑھی گئی تھی اختلاف کی جگہ سے آیت تک جو اختلاف ہے اس کو پڑھ لیا تو اس کی طرف سے بھی پوری آیت پڑھی گئی) اور اس میں بھی دیکھ لیا کہ کوئی راوی مندرج ہوا یا نہیں، اگر کوئی مندرج ہوا ہو تو اس کی قرأت سے بھی اپنے کو فارغ سمجھا۔

پھر دیکھا کہ اختلاف باقیہ میں آخر اختلاف کس کا ہے اس کو لیا اور اس کا لحاظ رکھا کہ کوئی مندرج ہوا یا نہیں اسی طرح تمام اختلافات کو اس ترتیب سے پڑھا۔ اگر ایک کلمہ میں دو شخص مختلف ہوں تو باعتبار ترتیب اسمی مذکورہ بالا کے جو مقدم ہے اس کو پہلے لیا مؤخر کو پیچھے اگر ایک شخص کی دو وجہ ایک کلمہ میں ہوں تو حکماً وہ شخص حکم میں دو شخص کے سمجھا جائے گا اور ان دو وجہوں کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے گا جیسا

دو شخصوں کے مختلف روایتوں کے ساتھ اور ان روجہوں کی ترتیب بھی قراء کے نزدیک واجب استحسانی ہے چنانچہ فصل مستقل میں اس کا بیان آتا ہے (ص۔)

تیسری فصل جمع کے مختلف طریقے

حضرت تھانوی فرماتے ہیں کہ اصل تو یہ ہے کہ ہر قاری کے لئے پوری آیت پڑھی جائے مگر اس وقت رواج بنظر اختصار و تسہیل یوں ہے کہ ایک راوی کی روایت کو پوری پڑھ کر جن جن کلمات میں اختلاف ہے وہاں سے شروع کر کے آیت ختم کر دیتے ہیں۔ اور جس وقت طرق کا اختلاف اچھی طرح ذہن نشین ہو جاتے تو جمع کلی کرتے ہیں یعنی ہر کلمہ میں جتنی وجہیں ہوں ان کو پورا کر کے اسی طرح دوسرے کلمہ میں کرتے ہیں
(تنشیط ص۲)

جمع کرنے کا طریقہ

چند قراءات کو جمع کر کے پڑھنے کے کئی طریقے ہیں حضرت حکیم الامت نے جس طریقے کو اس نقشہ میں اختیار فرمایا ہے اس زمانہ میں جمع کا یہی طریقہ مروج اور اسی کا معمول ہے چنانچہ حضرت شیخ القراء مولانا قاری محی الاسلام صاحب اپنی محققانہ کتاب شرح سبعہ قراءات میں ارقام فرماتے ہیں

جمع کے متعلق شیوخ سے تین مذاہب منقول ہیں۔

(۱) اول جمع بالحرف یعنی قراءت کرتے ہوئے جب قاری اس کلمہ پر پہنچے جس میں اصولی یا فرشی اختلاف ہو تو اس کلمہ کا اعادہ کر کے یکے بعد دیگرے اختلافات کو ادا کر کے پھر آگے چلے ... یہ اہل مصر کا مذہب ہے

(۲) دوم جمع بالوقف یعنی قاری اس وقف صحیح تک وقف کرے جس کے بعد سے

ابتدار درست ہو۔ جو ائمہ اور رواۃ مندرج ہو گئے ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں صاحبان اختلاف کو ابتدار سے لوٹائے اور اسی جگہ وقف کرے جہاں پہلے وقف کیا تھا اسی طرح تمام اختلافات پورے کر کے آگے چلے، یہ اہل شام کا مذہب ہے

(۳) سوم جمع مروجہ جو ہر دو مقدم الذکر مذاہب سے مرکب اور محقق کے اختیار کردہ مذاہب کی مکمل ترین صورت ہے جس کو علماء مصر و شام نے اختیار د مروج کیا ہے پہلے قالون کو وقف صحیح تک پڑھتے ہیں جو قرار ان کے ساتھ مندرج ہو گئے ان کا اعادہ نہیں کرتے اور خلاف کرنے والوں کو دیکھتے ہیں کہ محل وقف سے کون اقرب ہے چنانچہ اس جگہ سے وقف تک اس کے لئے اعادہ کرتے ہیں اور پھر ان کو لوٹاتے ہیں جو ان سے اوپر ہوں حتی کہ سب اختلافات پورے ہو جائیں اور اگر چند ائمہ ایک جگہ جمع ہوں تو مراتب مندرجہ شاطبیہ کے مطابق اعادہ کرتے ہیں اور اگر ایک جگہ امالہ اور فتح والے جمع ہوں تو فتح والوں کو پڑھتے ہیں اس وقت روئے زمین پر یہی طریقہ مروج ہے

سید (صاحب غیث النفع) کہتے ہیں ا

میں نے اپنے تمام شیوخ سے اس طرح پڑھا ہے اور اسی طرح پڑھاتا ہوں ہمارے شیوخ بھی اسی طرح پڑھاتے تھے اور میرا بھی یہی معمول ہے (شرح سبعہ قراءات صـ۳۲۲)

حضرت حکیم الامت رح نے قالون کے لئے بے صلہ کو مقدم کیا ہے اور صلہ کو مؤخر یہ طریقہ مصری قرار کا ہے کہ وہ صلہ کو مؤخر کرتے ہیں۔

حضرت تھانوی رح کے شیخ حضرت قاری عبداللہ مکی حضرت قاری سعد مصری کے شاگرد تھے شاید اسی مناسبت سے حضرت نے صلہ کو مؤخر کیا ہے

حضرت شیخ القراء لکھتے ہیں ا

تنبیہ ہمارے یہاں قالون کا صلہ پہلے پڑھتے ہیں اور مصری بے صلہ کو مقدم کہتے ہیں (جیساکہ حضرت تھانوی ؒ نے کیا ہے۔ ق) نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے طریقہ پر قالون کی وجوہات میں عام طور سے فصل نہیں ہوتا۔ اور مصریوں کے طریقہ پر ابن کثیر کے سوا اور سب قراء کو اگر اوپر نہ چھوٹے ہوں صلہ سے پہلے پڑھنا پڑتا ہے لہذا قالون کی وجوہات میں فصل ہو جاتا ہے، ہمارا طریقہ طلباء کے لئے زیادہ موزوں اور سہل ہے (شرح سبعہ ص۳۲۲)

اختلاف قراآت کی نوعیّت

واضح ہو کہ اس اختلاف قراآت کی نوعیت درحقیقت تضاد وتناقض کی نہیں بلکہ اس کا تعلق طرز ادا کے اختلاف سے ہے، مثلاً مد وقصر، پھر مد کی لمبائیوں میں فرق وغیرہ جنہیں اصولی اختلاف کہا جاتا ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ لفظ میں تو تبدیلی ہو مگر معنی نہ بدلیں جیسے سورۃ فاتحہ میں "صراط" صاد سے اور "سراط" سین سے یہ اس لفظ کے لغات ہیں مگر معنی ایک ہیں

تیسری قسم تبدیلی وہ ہے جو لفظ و معنی دونوں میں ہو مگر دونوں کا مصداق ومراد ایک ہی ہو یعنی دونوں ایک ہی ذات پر صادق آتے ہوں، جیسے اسی سورۃ فاتحہ میں مالک بالالف اور ملک بلاالف دونوں اللہ تعالیٰ ہی کی صفات ہیں کہ وہ قیامت کے دن کے مالک بھی ہیں اور اس روز کے بادشاہ بھی ہیں

کیف ننشزھا۔ اور ننشرھا۔ (سورۃ بقرہ رکوع ۳۵)

پہلی قراءت میں معنی ہیں کہ ہڈیوں کو دیکھو ہم ان کو کس طرح ایک کو دوسرے پر چڑھاتے

ہیں اور راء والی قرات پر معنیٰ یہ ہوں گے کہ دیکھو ہم ہڈیوں میں جان ڈال کر ان کو کس طرح زندہ کرتے ہیں، دونوں معنیٰ دونوں قراتوں سے معلوم ہوگئے

قولہ تعالیٰ: وارجلکم، فیہ قرأتان الاولیٰ بنصب اللام لنافع وابن عامر وحفص والکسائی والثانیۃ بالخفض للباقین۔

قولہ تعالیٰ لایعذب ولا یوثق (سورۃ الفجر)

فیہما قرأتان الاولیٰ بفتح الذال وھثلہ لکسائی والثانیۃ بکسرھا و اضافۃ العذاب والوثاق علی الاول الی المفعول وعلی الثانی الی الفاعل

(وجوہ الثانی)

قولہ تعالیٰ حمالۃ الحطب فیہ قرأتان الاولیٰ بنصب التاء لعاصم والثانیۃ بالرفع للباقین والنصب علی الحال او الذم والرفع علی انہ خبرھی (ر)

ان چند مثالوں سے واضح ہے کہ اختلاف قرات کی نوعیت اختلاف تنوع ہے اور تغایر کی اس میں ضدیت اور منافات نہیں ہے یہ نا ممکن ہے کہ ایک قرات میں امر اور دوسری میں نہی ہو یا اور کسی طرح کا تعارض ہو فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے کلام کے ایک سے زیادہ پہلو ایسے ہوتے ہیں کہ ہر ایک میں ایک خاص خوبی ہوتی ہے

مثلاً مالک، الف کے ساتھ اس کے معنی مالک ہونے کے ہیں اور ملک بغیر الف کے اس کے معنیٰ بادشاہ کے ہیں دونوں کے معنی میں الگ الگ خاص خوبی ہے۔ مالک سے ملکیت کا ثبوت ہوتا ہے اور ملک سے بادشاہت کا اور مالک کے لئے بادشاہت اور بادشاہت کے لئے مالک ہونا لازم نہیں اور دونوں کے ملانے سے اللہ تعالیٰ کی ملکیت اور بادشاہت کا ثبوت ہو رہا ہے۔

اسی طرح کیف ننشزھا راء کے ساتھ اور ننشزھا زاء کے ساتھ

ان میں بھی تغایر ہے تضاد نہیں ہے۔ ہڈیوں کے چڑھانے اور زندہ کرنے میں کسی قسم کا تضاد نہیں ہے
ارجلکم میں دو قرآتیں ہیں ایک لام کے نصب ہے اور دوسری جر سے۔ نصب کی قرات سے وضو میں پاؤں کا دھونا اور جر کی قرآت سے پاؤں کا مسح ثابت ہو رہا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان سے واضح ہو گیا کہ یہ دو قرآتیں دو حالتوں پر محمول ہیں پاؤں کا دھونا تو اس پر فرض ہے جو موزے پہنے ہوئے نہ ہو اور مسح کی فرضیت اس کے لئے ہے جس نے موزے پہن رکھے ہوں (علم قرات اور قرا سبعہ ص)

لیکن حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

اور ایک قرآت میں ارجلکم مجرور ہے جس سے بعض کو یہ شبہ ہو گیا ہے کہ پاؤں کا بھی مثل سر کے مسح ہے۔ لیکن چونکہ دو قرآتوں کا مثل دو آیتوں کے متوافق ہونا بلکہ اس سے بھی زیادہ متحد المعنیٰ ہونا ضروری ہے اور ان میں تعارض ہونا محال ہے اس لئے لامحالہ غسل ارجل اور مسح ارجل سے ایک ہی معنیٰ مراد ہوں گے۔

اور ابو زید، بیضاوی وغیرہ اہل لغت نے تصریح کی ہے کہ مسح بمعنی غسل بھی آتا ہے چنانچہ متوضی کو متمسح کہتے ہیں اور مسح الارض المطر بولتے ہیں جب کہ بارش سے زمین دھل جائے۔

پھر احادیث صحیحہ غسل ارجل پر متفق ہیں اور حدیث شیخین میں ایڑیاں خشک رہ جانے پر ویل للاعقاب سے نار کی وعید فرمانا مصرح ہے جس سے عدم جواز مسح کالشمس فی النہار واضح ہے۔ پھر اہل حق کا اس پر اجماع بھی ہے اس لئے مسح ارجل کو غسل پر محمول کیا جائے گا۔ اور ایک امسحوا مقدر کر لیا جاوے گا تاکہ امسحوا ملفوظ میں جمع بین الحقیقۃ والمجاز لازم نہ آئے اور اس صورت میں نکتہ لفظ مسح لانے میں یہ اشارہ ہو گا کہ پاؤں دھونے میں جیسا کہ عادت ہے اسراف پانی کا نہ کریں۔

یا جر جوار کہا جاوے اور یہ کہنا کہ عطف میں جر جوار نہیں ہوتا غیر مسلم ہے چنانچہ

نابغہ کے شعر میں موثق اس پر معطوف ہے اور پھر بھی مجرور ہے ؎

لم یبق الاسیر غیر منفلت　　　　وموثق فی حبال القد مجنوب

(بیان القرآن صفحہ ج ۳)

حضرت حکیم الامت کی اس تحقیق سے واضح ہے کہ مسح کی قرأت کو غسل کی قرأت پر محمول کیا جا سکتا ہے اور اس طرح مسح ارجل کا شبہ دور ہو کر دونوں قرأتیں متحد المعنی ہو جاتی ہیں غسل ارجل اور مسح ارجل دونوں کے ایک ہی معنی ہو جاتے ہیں۔

اس پر جو جمع بین الحقیقۃ والمجاز کا اشکال لازم آتا تھا اس کا جواب امسحوا الخ ما ل کر دیدیا۔ اور عطف میں جر جوار کا ثبوت شعر سے پیش کر دیا گیا

ومن اراد البسط فلیطلب فی احکام القرآن تحت ھذہ الآیۃ تجد فیھا مالا تجد فی غیرھا۔

اس صورت میں یہ دو قرأتوں کو ایک محمل پر جمع کرنے کی ایک مثال ہوگی اور پہلی صورت میں دو قرأتوں کو دو حالتوں پر محمول کرنے کی مثال ہوگی جس طرح سورۃ بقرہ رکوع ۲۸ میں حتی یَطْهُرْنَ یَطَّهَّرْنَ تخفیف اور تشدید کے ساتھ دو قرأتیں دو حالتوں پر محمول ہیں۔ ولکل وجھۃ ھو مولیھا

حضرت تھانوی ان دونوں قرأتوں کی توجیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں

قالت الحنفیۃ ان القراءتین بمنزلۃ الآیتین فحملوا احدھما علی مادون العشرۃ والاخری علی تمام العشرۃ والتقاء لمجرد الارتباط من غیر وجود معنی التأخر فیہ وایضا لانسلم ان المتطھر لیس الا بالاغتسال فانہ یمکن حملہ علی تیقن الانقطاع وعدم بقاء الریبۃ فیہ کما اشرت الیہ فی الترجمۃ۔ ولکن الطھارۃ لا یدل علی

الاغتسال کما زعم البعض ففی روح المعانی عن تاج البیہقی طہرت خلاف طمثت۔
وعن شمس العلوم امرأۃ طاہرۃ بغیر ہاء انقطع دمہا
وعن الاساس امرأۃ طاہر ونساء طواہر طہرت من الحیض ۱۲ (حاشیہ بیان القرآن ص۱۲۸ ج ۱)۔
لا یعذب ولا یوثق ،، یہ دو قرآتیں ہیں ایک میں ذال اور ثا مثلثہ کا فتح ہے اور دوسری میں دونوں کا کسرہ ہے۔
حضرت تھانویؒ اس کی توجیہ میں فرماتے ہیں پہلی قرأت پہ عذاب اور وثاق کی اضافت مفعول کی طرف ہوگی اور کسرہ کی صورت میں فاعل کی طرف ہوگی (وجوہ المثانی)
اسی طرح حمالۃ الحطب میں تاء کا نصب حال یا ذم کی بنا پر ہے اور اس کا رفع اس بنا پر ہے کہ وہ ھی مبتدا محذوف کی خبر ہے (وجوہ المثانی)
ولکن ھذا اٰخر الکلام فی ھذا المقام والحمد للہ المفضال المنعام علی اتمام المرام،
وصلی اللہ تعالیٰ علی نبیہ سید الانام وعلی اٰلہ العظام واصحابہ الکرام افضل الصلوۃ وازکی التحیات والسلام الیٰ یوم القیام
کتبہ الاحقر الافقر السید عبد الشکور الترمذی عفی عنہ ذنبہ الجلی والخفی۔ الخادم فی الجامعۃ الحقانیۃ فی قریہ ساہیوال من مضافات سرگودھا۔ تحریراً فی ثامن من شہر صفر المظفر ۱۴۱۴ھ

مقالہ نمبر ۲۵
حقیقت تصوف کا مکتشف اعظم
اور
فن حصول احسان و تقوے کا
مجدد اعظم
حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رح
از
حضرت علامہ سید سلیمان صاحب ندوی رح

حقیقتِ تصوّف کا مکتشفِ اعظم

اور
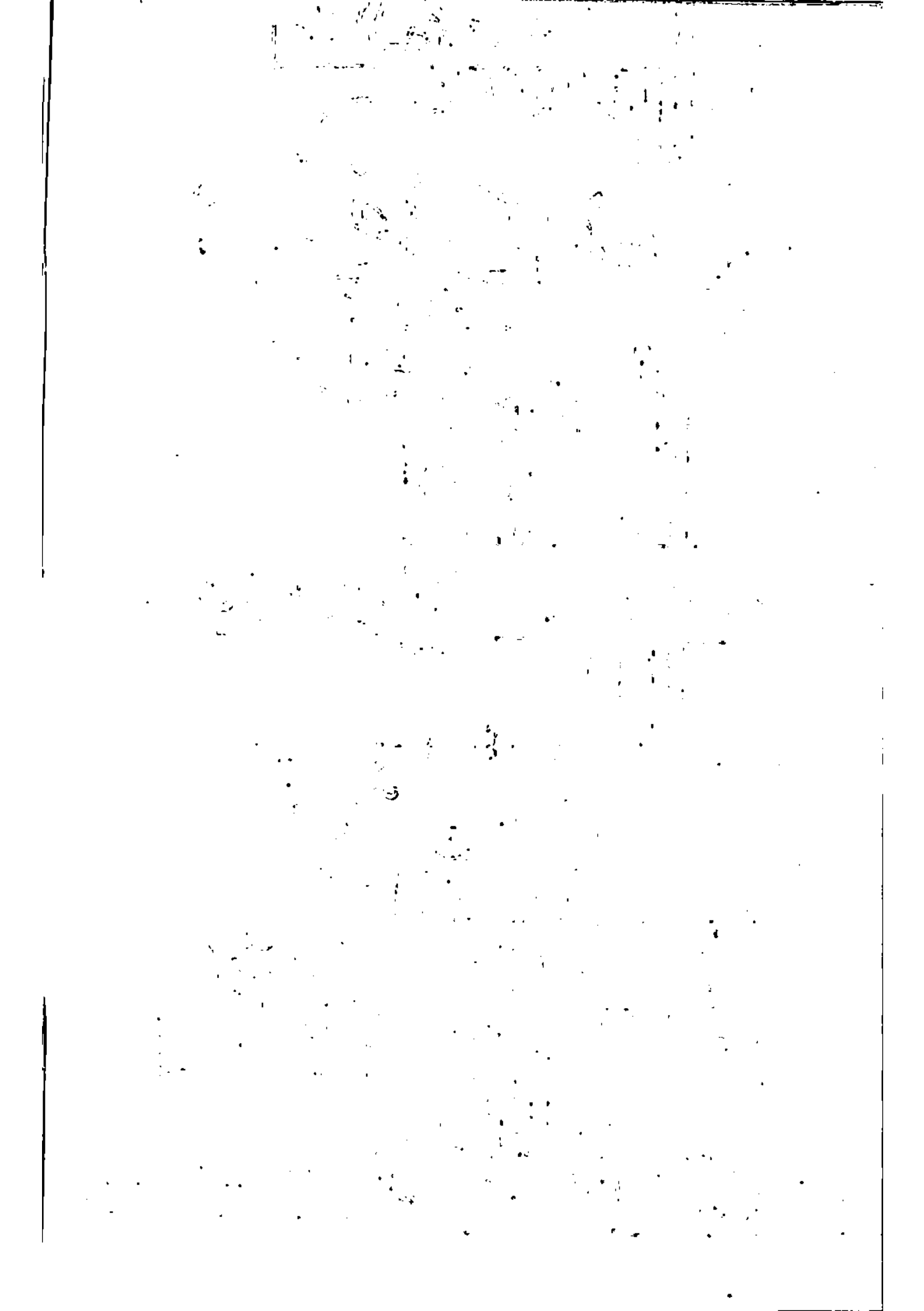
فنِ حصولِ احسان و تقویٰ کا مجدّدِ کامل

(از علامہ سیّد سلیمان ندوی رح)

پیشِ نظر اوراق میں ایک ایسی ہستی کا مرقع پیش کیا جا رہا ہے جو اپنے وقت میں مجموعۂ کمالات اور جامع انواع فضائل تھی۔ عالم۔ حافظ۔ قاری۔ مدرس۔ مفسر۔ محدث فقیہ۔ واعظ۔ صوفی۔ متکلم۔ مناظر۔ ناظم۔ ناشر۔ ادیب اور خانقاہ نشین شیخ سب کچھ تھی۔ لیکن اس نے سب سے بڑھ کر اپنے تمام فضائل و کمالات کو فن تصوف کی اصلاح و تکمیل میں صرف فرما دیا، اور دوسرے علوم و فنون میں سے ہر ایک پر عالمانہ اطلاع اور محققانہ عبور کے باوجود ان میں سے کسی کو اپنا تنہا اور مخصوص شغل نہیں بنایا۔ بلکہ اپنے تمام علوم و فنون اور کمالات کو صرف اسی ایک فن شریف کی خدمت میں لگا دیا۔ اس لئے یہ کہنا گویا صحیح ہے کہ ان کو تمام دوسرے علمی اور عملی کمالات صرف اسی لئے دیئے گئے تھے کہ اس فن کی تجدید ہو جو دنیا میں کس پرسی کی حالت میں اور ہندوستان میں بہ حالت غربت تھا جس کی حقیقت پر تہ بہ تہ پردے پڑ گئے تھے اور جس کی تابانی پر بدعات کی ظلمت غالب آگئی تھی۔ اور جو خود دکانداری صوفیوں کے ہاتھوں دنیاداری اور کسبِ معاش کے فنون میں سے ایک فن کی حیثیت میں آگیا تھا۔ اور جہاں اس کا وجود تھا بھی وہ یا محض چند فلسفیانہ خیالات کا مجموعہ

ہو کر رہ گیا تھا، یا اوراد و وظائف کے نصاب کا۔ سلفِ صالحین نے اس فن کے جو ابواب و مسائل منقح کر کے لکھے تھے وہ بالکل فراموش ہو گئے تھے اور خصوصیت کے ساتھ سلوک کی حقیقت اور غایت بالکل ہی چھپ گئی تھی اور جہاں کسی قدر اس کا نام و نشان تھا وہاں علم میں وحدۃ الوجود یا وحدۃ الشہود کی ناقابل افہام و تفہیم بلکہ ناقص تعبیر پر اور اعمال میں صرف ذکر و فکر و مراقبہ کے چند اصول پر پوری پوری قناعت تھی۔ بدعات نے دین کا نام اور رسوم نے سلوک و تصوف کی جگہ حاصل کر لی تھی۔ طریقت و شریعت کو دو متقابل حریف ٹھہرا کر ان میں ایک کو دوسرے سے گرانے کی کوشش کی جا رہی تھی عام صوفیوں کی زبانوں پر چند جاہلانہ نعرے اور چند مبتدعانہ اصول و اعمال رہ گئے تھے جن کو طریقت کا نام بخشا گیا۔

صوفیانہ خانوادوں کی جہالت اور موروثی گدی نشینی کی متواتر رسم نے اللہ تعالیٰ کی بخشش و عطایا اور مقبولیت کو بھی ایک صنعت گری کا کارخانہ بنا رکھا تھا۔ خانقاہوں کا کام صرف اعراس و فاتحہ کا اہتمام اور سماع و رقص و قوالی کا انصرام رہ گیا تھا۔ مقررہ دنوں اور مہینوں میں کچھ لوگ جمع ہو کر فاتحہ خوانی کر لیں مٹھائی کھالیں اور ایک جگہ بیٹھ کر کسی سازندے کے ترانے پر ہو حق کر لیں اور زیادہ پڑھیں تو وحدۃ الوجود کی آڑ لے کر شوخی اور بے باکی اور رندی کے اشعار و مضامین پڑھ لیں اور سر دھن لیں۔ چند سینہ بہ سینہ راز تھے جن کو بے سمجھے بوجھے بار بار دہرایا جا رہا تھا۔ تصحیح عقائد، تحسین عبادت، اثباتِ سنت، اصلاحِ اعمال اور ادائے حقوق العباد جو اصل دین اور صحیح سلوک تھا وہ ہر جگہ سے مٹ چکا تھا۔ علمائے ظاہر چونکہ باطن کے منکر تھے یا باطن سے ناآشنا تھے، اس لئے ان کے پند و نصائح کی حیثیت صوفیوں میں تفریح ناشناس سے زیادہ نہ تھی اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ چونکہ طریقت کے اصل راز سے واقف نہیں اس لئے ان کی بات سننے کے قابل نہ تھی اور علمائے ظاہر چونکہ باطن سے منکر یا ناآشنا تھے ڈان دکاندار صوفیوں کو دیکھ کر اصل فن سلوک کو ضلالت اور گمراہی قرار دینے لگے تھے اور اس کے اصول و مسائل کو خلاف شریعت اور مخالف کتاب و سنت سمجھتے تھے۔

یہ نہیں کہا جاتا کہ علمائے حق اور صوفیائے برحق کا مطلق وجود ہی نہ تھا۔ بے شبہ جابجا صحیح و صالح بزرگوں کے سلسلے قائم تھے۔ کہیں کہیں ان کے فیوض و برکات بھی جاری اور ان کی تعلیم و تربیت کی برکت بھی عیاں تھی۔ لیکن یہ جو کچھ تھا خواص کے لئے تھا اور محدود حلقوں میں تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ اشخاص کی تلقین و ہدایت تو ہو رہی تھی مگر تدوین فن، ترتیب اصول تحقیق مسائل، تالیف رسائل اور اصل سلوک کے مضامین کو کتاب و سنت کی اور سلف صالحین اور اولیائے کاملین کی تشریح و توضیح سے ملا کر دیکھنے کے کام کہیں نہیں ہو رہے تھے اور نہ خطب و مواعظ اور تحریر و تقریر کے ذریعہ عوام کے خیالات کی اصلاح کی کوشش کی جا رہی تھی اور نہ رد شبہات و دفع شکوک اور رفع اوہام کے لئے کوئی سلسلہ تھا اور نہ سالکین کی ظاہری و باطنی تربیت کی کوئی ایسی درس گاہ تھی جس میں راہ کی مشکلات کو علمی و فنی طریق سے بتایا اور سکھایا جاتا ہو اور نہ کہیں کوئی ایسی مسند بچھی تھی جہاں شریعت و طریقت کے مسائل پہلو بہ پہلو بیان ہوتے ہوں، جہاں تفسیر و فقہ و حدیث کے ساتھ امراض قلب کے علاج کے نسخے بھی بتائے جاتے ہوں جو کتاب و سنت میں موجود ہیں جہاں ایک طرف قال اللہ و قال الرسول کا ترانہ بلند ہو اور دوسری طرف عبودیت و بندگی کے اسرار اور اتباع سنت کے رموز بھی سکھائے جاتے ہوں۔ جہاں جس قلم سے احکام فقہی کے فتاوے نکل رہے ہوں، اسی قلم سے سلوک و طریق کے مسائل بھی شائع ہو رہے ہوں، جس منبر سے نماز و روزہ اور حج و زکوٰۃ کے فقہی مسائل و اشگاف بیان کئے جا رہے ہوں، اسی منبر سے روحانی حقیقت اور ان کی قلبی ادا کاری کے طریق بتائے جا رہے ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے اس صدی میں اس کام کے لئے حضرت حکیم الامت مجدد ملت (مرشدی و مولائی مولانا شاہ اشرف علی) علیہ الرحمۃ کا انتخاب فرمایا اور وہ کام ان سے لیا گیا جو چند صدیوں سے معطل پڑا ہوا تھا۔ –

اس کے علاوہ زمانہ کا تقاضا تھا کہ اس کے مقتضیات نے جو نئی ضرورتیں پیدا

کر رکھی ہیں دین کی حفاظت کے لئے ان کا بندوبست کر دیا جائے چنانچہ ایک طرف کلام پاک کی تفسیر کی جلدیں تیار ہوئیں۔ دوسری طرف احادیث نبویہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نئے مجموعے ترتیب پائے۔ تیسری طرف فقہ و فتاوی کا سرمایہ جمع ہوا۔ چوتھی طرف علم اسرار و حقائق کی تدوین ہوئی۔ پانچویں گوشہ میں تصوف کے اصول جمع کئے گئے جو اب تک جمع نہیں ہوئے تھے۔ اُن میں ان کے ان احوال و کیفیات پر گفتگو کی گئی جن کے نہ سمجھنے سے بیسیوں قسم کی گمراہیاں راہ پاتی ہیں ایک اور سمت میں مولانا روم (رحمۃ اللہ علیہ) کی مثنوی کے دفتر کھولے گئے جن کے سپرد صدیوں سے حقائق و دقائق کے خزانے ہیں۔ عوام کی طرف توجہ کی گئی تو زندگی کی روح کا سراغ لگایا گیا تو ان کی شادی و بیاہ کے مراسم کی اصلاح کی گئی۔ نیک و صالح بیبیوں کے لئے بہشتی زیور کا سامان کیا گیا۔ بچوں کے لئے ان کی تعلیم و تربیت کے آداب و اصول مرتب فرمائے، مدرسین کے قواعد و ضوابط کے نقشے بنائے گئے، داد و ستد اور خرید و فروخت اور معاملات کے دینی اصول سمجھائے گئے اور دین کی تعلیم میں شریعت کی وسعت دکھائی گئی جس سے مسلمان کی پوری زندگی ولادت سے موت تک سما گئی۔ عوام مسلمانوں کی رہبری کے لئے مواعظ کی سیکڑوں مشعلیں جا بجا روشن کی گئیں اور بیسوں شہروں میں پھر پھر کر ان کو غفلت کی نیند سے چونکایا گیا۔ علماء اور فقہاء اور محققین کے لئے بوادر و نوادر اور بدائع کے سلسلے قائم کئے، مدت کی بند شدہ راہ جو ائمہ مجتہدین کی خطاؤں کے استدراک کے لئے رجوع عن الخطاء کا اعلان تھی۔ وہ ترجیح الراجح کے نام سے کھولی گئی اور اپنی ہر غلطی و خطاء کا علی رؤس الاشہاد اعلان کیا گیا تاکہ آئندہ مسلمانوں کے لئے ٹھوکر کا باعث نہ بنے تو تعلیم یافتہ مسلمانوں کے شکوک و شبہات کا جواب دیا گیا۔ باطل فرقوں کی تردید میں رسائل لکھے گئے۔ اخلاق و اعمال اور حقوق العباد کی اہمیت ظاہر کی گئی، اور ہزاروں مسلمانوں کو ان کی وہ تعلیم دی گئی جس کو مسلمان عوام کیا خواص بھی بھلا بیٹھے تھے

اصول وضوابط اور آداب کی وہ تربیت فرمائی گئی جو دین سے تقریباً صدیوں سے خارج کی جا چکی تھی۔ اور پھر اپنے بعد اپنی روش پر تعلیم و تربیت کے لئے ڈیڑھ سو کے قریب مجازین کو چھوڑا، جو ان کے بعد بھی ان کاموں میں مصروف ہیں۔ اس حلقۂ فیض میں علماء بھی داخل ہوئے، تعلیم یافتہ بھی، عوام بھی، غرباء بھی۔ اُمراء بھی بہت بڑے بڑے عہدہ دار بھی، زمیندار بھی، تاجر اور سوداگر بھی اور مفلس و قلاش بھی۔ اس سے اس دائرہ کی وسعت کا اندازہ اب بھی کیا جا سکتا ہے۔ مدارس پر غور کیجئے۔ دار العلوم دیوبند بھی مظاہر العلوم سہارنپور بھی، دار العلوم ندوہ بھی۔ یہاں تک کہ پہلا علی گڑھ کالج اور موجودہ مسلم یونیورسٹی بھی اور وہ سیکڑوں مدارس جو ہندوستان میں جگہ جگہ پھیلے ہیں۔ جغرافیائی حیثیت سے غور کیجئے تو سرحد سے لیکر بنگال مدراس اور گجرات۔ بلکہ حجاز افریقہ اور ان تمام ملکوں تک جہاں جہاں ہندوستانی مسلمان پھیلے ان کے اثرات بھی ساتھ ساتھ پھیلے ہیں۔ راقم کو ہندوستان کے دور دراز علاقوں میں جانے کا اتفاق ہوا مگر جہاں گیا یہ معلوم ہوا کہ وہ روشنی وہاں پہلے سے پہنچی ہوئی ہے اور کوئی نہ کوئی اس روشنی سے بحمد اللہ ضرور منور ہے۔

اس تعلیم و تربیت، تصنیف و تالیف، مواعظ و ملفوظات کی بدولت عقائد حقہ کی تبلیغ ہوئی، مسائل صحیحہ کی اشاعت ہوئی، دینی تعلیم کا بندوبست ہوا۔ رسوم و بدعات کا قلع قمع ہوا، سنن نبوی کا احیاء ہوا۔ غافل چونکے، سوتے جاگے۔ بھولوں کو یاد آئی۔ بے تعلقوں کو اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا ہوا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی محبت سے سینے گرمائے۔ اور اللہ کی یاد سے دل روشناس ہوئے اور وہ فن جو جوہر سے خالی ہو چکا تھا پھر شبلیؒ جنیدؒ اور بسطامیؒ و جیلانیؒ اور سہروردیؒ و سرہندیؒ بزرگوں کے خزانوں سے معمور ہو گیا۔ رحمہم اللہ تعالیٰ۔ یہ وہ شان تجدید تھی جو اس صدی میں مجدد وقت کیلئے اللہ تعالیٰ نے مخصوص فرمائی ؎

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

حضرت حکیم الامت قدس سرہ کے سانحۂ ارتحال پر سید سلیمان ندوی رح نے اپنے جن تاثرات کا اظہار فرمایا وہ حسب ذیل ہیں:۔

مَوتُ العَالِم مَوتُ العَالَم

محفل دوشین کا وہ چراغ سحر جو کئی سال سے ضعف و مرض کے جھونکوں سے بجھ بجھ کر سنبھل جاتا تھا بالآخر ۸۲ سال ۳ ماہ ۱۰ روز جل کر ۱۵ رجب ۱۳۶۲ھ کی شب کو ہمیشہ کے لئے بجھ گیا۔

داغ فراق صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

یعنی حکیم الامت مجدد الملت و طریقت شیخ الکل حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے مرض ضعف و اسہال میں کئی ماہ علیل رہ کر ۱۹ اور ۲۰ جولائی ۱۹۴۳ء کی درمیانی شب کو ۱۰ بجے نماز عشا کے وقت اس دار فانی کو الوداع کہا، اور اپنے لاکھوں معتقدوں اور مریدوں اور مستفیدوں کو غمگین و مہجور چھوڑا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اب اس دور کا بالکلیہ خاتمہ ہو گیا جو حضرت شاہ امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ، مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نانوتوی، مولانا قاسم صاحب نانوتویؒ، مولانا شیخ محمد صاحبؒ تھانوی کی یادگار تھا اور جس کی ذات میں حضرات چشت اور حضرت مجدد الف ثانیؒ اور حضرت سید احمد صاحب بریلوی کی نسبتیں یکجا تھیں۔ جس کا سینہ چشتی ذوق و عشق اور مجددی سکون و محبت کا مجمع البحرین تھا جس کی زبان شریعت و طریقت کی وحدت کی ترجمان تھی جس کے قلم نے فقہ و تصوف کو ایک مدت کی ہنگامہ آرائی کے بعد باہم ہم آغوش کیا تھا۔ اور جس کے فیض نے تقریباً نصف صدی تک اللہ تعالےٰ کے فضل و توفیق سے اپنی تعلیم و تربیت اور تزکیہ و ہدایت سے ایک عالم کو مستفید رکھا تھا اور جس نے اپنی تحریر و تقریر

سے حقائق ایمانی و دقائق فہمی، اسرار احسانی اور رموز حکمت ربانی کو برملا فاش کیا تھا اور اسی لئے دنیا نے اس کو حکیم الامت کہکر پکارا، اور حقیقت یہ ہے کہ اس اشرف زمانہ کے لئے یہ خطاب عین حقیقت تھا۔

تصانیف

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف اور رسائل کی تعداد آٹھ سو کے قریب ہے اور کُل کی کُل تحقیقات علمیہ، حقائق دینیہ اور نکات احسانیہ سے لبریز ہیں، ان میں تفسیر البیان القرآن شرح مثنوی، فتاویٰ امدادیہ، التعریف الی التصوف اور بہشتی زیور وغیرہ کتابیں کئی کئی جلدوں میں ہیں۔ ملفوظات اور مواعظ و خطبات کی تعداد سیکڑوں کی حد تک ہے، ان تصانیف میں قرآن پاک کی مشکل آیات کریمہ کی تفسیر، احادیث شریف کی شرح، فقہ کے مشکل مسائل کا جواب، سلوک و طریقت کے نکتے، اخلاق فضائل و رذائل کی حکیمانہ تحقیق اور ان کے حصول اور ازالہ کی تدابیر اور زمانۂ حال کے مشکوک و شبہات کے جوابات سب کچھ ہیں۔ تصانیف میں متفرق علوم و مسائل اس کثرت سے ہیں کہ اگر ان سے کسی ایک موضوع کے مباحث کو علیحدہ علیحدہ کیا جائے تو ایک ایک مستقل کتاب بن جائے۔ چنانچہ حضرت کے تربیت یافتوں نے اس قسم کے بیسیوں مجموعے تیار کئے ہیں۔ سب سے اخیر میں اس قسم کا مجموعہ نوادر النوادر کے نام سے ایک ہزار صفحوں میں چھپ کر شائع ہوا ہے۔ خطوط کے جوابات کا جن کے متعلق وفات کے دن تک اہتمام یہ رہا کہ آج کے خط کا جواب کل کے لئے اُٹھا نہ رکھا جائے، عظیم الشان دفتر الگ ہے۔ تصنیفات میں بلکہ ہر تحریر میں اہل نظر کو یہ معلوم ہوگا کہ گویا مصنف کے سارے مسائل و مواد یکجا ہیں اور وہ سب کو اپنی اپنی جگہ احتیاط سے رکھتا جاتا ہے۔ عام طور سے یہ ہوتا ہے کہ مصنف جس موضوع پر قلم اٹھاتا ہے اس کو اس میں ایسا غلو ہوجاتا ہے کہ دوسرے گوشوں سے اس کو ذہول ہوجاتا ہے۔ حضرت کی تصانیف کی خاص بات یہ ہے کہ قلم ہر ایک احتیاط اور رعایت کرکے اور غلو سے بچ کر اس طرح نکلتا ہے کہ جاننے والوں پر حیرت چھا جاتی ہے۔ حضرت کا ترجمہ قرآن پاک سہولت بیان اور وضوح مطالب میں اپنا آپ نظیر ہے۔ بہشتی زیور کہنے کو تو عورتوں

کی کتاب ہے مگر فقہ حنفی کی ضروریات کے لئے انتہائی احتیاط و کاوش کا نتیجہ ہے۔ تفسیر بیان القرآن کو یوں سمجھنا چاہئے کہ روح المعانی اور تفاسیر ما سبق کی اردو میں خلاصہ در جہ محتاطانہ ترجمان ہے۔ سلوک و طریقت کی کتابوں کا بھی یہی حال ہے۔ حضرت کی تجدید طریقت کا بڑا کمال یہ ہے کہ ہندوستان میں بلکہ تمام دنیا میں عامیانہ تصوف کی حقیقت جوگ سے مل گئی تھی اس کو زوائد و حواشی سے صاف کرکے قدماء اور سلف صالحین کے رنگ پر لے آئے۔

اللہ تعالےٰ کا شکر ہے کہ اس نے ایک کامل زندگی کو جو کمال زہد و ورع، کمال اتباع شرع، کمال اتباع سنت کے ساتھ تھی۔ اس زمانے میں نمونے کے لئے پیدا کیا۔ وہ آئی اور ساٹھ برس کے مجاہدہ کا نمونہ دکھا کر واپس ہوگئی۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ وادخلہ اعلیٰ علیین وصلی اللہ تعالےٰ علی النبی الامین وآلہ وصحابہ اجمعین وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

ہیچ میرزو ہیچمدان

سلیمان

۸ رشعبان ۱۳۶۲ھ

(رسالہ معارف نمبر ۲ جلد ۵۲۔ اگست ۱۹۴۳ء) دار المصنفین اعظم گڈھ

مقالہ نمبر

آدابِ سلوک

عارف باللہ حضرت ڈاکٹر محمد عبدالحی عارفی صاحبؒ

آدابِ سلوک

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا خاص مذاقِ سلوک

دورِ حاضر میں تہذیبِ اخلاق اور تزکیۂ نفس کے لئے بھی حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا خاص مجددانہ و مصلحانہ اندازِ تعلیم و تربیت تھا۔ مقاصدِ تصوف و سلوک کے حاصل کرنے کے واسطے کتاب و سنت کی مطابقت میں سالکین و طالبینِ طریق کی تعلیم و تربیت کے ایسے ضوابط اور دستور العمل مقرر فرمائے تھے کہ ہر درجہ و استعداد کا طالبِ حق ان کے مطابق عمل کرنے سے بغیر کسی کاوش و تردد کے اور بغیر کسی مشقتِ شدیدہ و مجاہدہ و تذبذب کے مقصودِ طریق سے واقف ہو کر بہت جلد کامیاب ہو سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت کو مسائلِ سلوک میں جو خاص فہم و فراست ودیعت فرمائی تھی اس کے متعلق بطور تحدیثِ نعمت حضرت فرماتے ہیں: "جو خدا کی نعمت مجھ کو حاصل ہے اس کو بیان کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ تربیتِ باطن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے بہت آسان طریق عنایت فرمائے ہیں۔ نیز امراضِ باطن کی تشخیص میں اللہ تعالیٰ نے فہم عطا فرمائی ہے اس میں رائے بہت کم غلطی کرتی ہے اور اکثر جو تجویز کیا جاتا ہے وہ صحیح ہوتا ہے اور نافع ہوتا ہے۔ یہ سب حضرت حاجی صاحبؒ کی دعاؤں اور توجہات کی برکت ہے۔ حضرت حاجی صاحبؒ فنِ تصوف کے امام تھے، مجدد تھے مجتہد تھے جو فن مدتوں سے مردہ ہو چکا تھا ان کے واسطہ سے پھر از سرِ نو زندہ ہوا۔ حضرتؒ فرماتے تھے کہ کوئی بھی مقصود ہو جب تک اس کے حاصل کرنے کے لئے صحیح ذرائع اختیار نہ کئے جائیں مقصود کبھی حاصل نہیں ہوتا۔ تہذیبِ اخلاق اور تزکیۂ نفس بھی دین کا ایک اہم اور بنیادی شعبہ ہے، اس کے حصول کے لئے بھی کتاب و سنت کے ضابطے اختیار کرنا ضروری ہے۔ بغیر اس کے مقصود

کبھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ میری نظر میں اس کی بڑی اہمیت ہے۔ اور میری تعلیم و تربیت کا سارا دارومدار اسی پر ہے میں طریق میں تہذیب اخلاق کو سب سے زیادہ مقدم سمجھتا ہوں چنانچہ جب اخلاق درست ہو جاتے ہیں تو اعمال خود بخود درست ہو جاتے ہیں۔ اس لئے طالب و سالک کو پہلے ہی سے اس بات کی فہم پیدا کرا دی جاتی ہے۔ حضرتؒ اکثر اس کی وضاحت فرماتے رہتے تھے کہ ذکر و اذکار بے شک نہایت ضروری اور مفید امور ہیں لیکن اخلاق و اعمال کی خرابی ایسا حجاب ہے جو ان کے اثرات و انوار کو روح میں سرایت کرنے سے روک دیتا ہے اس لئے جب تک اصلاح اخلاق و اعمال نہ ہو اس وقت تک ذکر و اذکار سے کوئی نفع نہیں ہوتا۔ عام طور پر حقیقت ناشناس صوفیاء و مشائخ کے یہاں اذکار و اشغال ہی پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اور اصلاح اخلاق و اعمال کی طرف توجہ نہیں کی جاتی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سالک و طالب طریق حقیقت مقصود سے بے خبر رہ کر ہمیشہ احوال و کیفیات کے چکر میں سرگرداں اور رضائے حق سے محروم رہتا ہے۔ حضرتؒ نے اس دقیق اور اہم نکتہ سے اہل دل و اہل نظر کو آگاہ فرمایا اور اس کو اپنا اصول تربیت قرار دیکر ہمیشہ طالبین و سالکین کو سب سے پہلے اپنے اخلاق و اعمال درست کرنے کے لئے ہدایت و تلقین فرمائی۔ فرماتے ہیں کہ "کوئی ذکر و شغل کرتا ہو تو مجھے اس وقت تک قدر نہیں ہوتی جب تک کہ اس کے اخلاق و اعمال درست نہ ہوں۔ ذکر و شغل میں تو مزہ آتا ہے نہ کرے تو چین نہ آئے۔ عمل تو وہ ہے جس میں نفس پر تنگی ہو پھر رضائے حق حاصل کرنے کے لئے اس عمل کو اختیار کرے، اس طرح چاہے خود اپنے اوپر تکلیف اٹھالے مگر دوسرے کے حقوق ضرور ادا کرتا رہے۔ (اشرف السوانح)

فرمایا کہ دو گھنٹہ ضربیں لگا لینا کیا مشکل ہے، تھوڑی دیر محنت کرلی پھر دن بھر رات بھر آزاد۔ میرے یہاں تو وہ آوے جس کو رات دن اپنے نفس پر آرے چلانے ہوں۔ قدم قدم پر یہ فکر ہو کہ کونسا کام جائز ہے اور کونسا ناجائز؟

طالبین کے اندر اہتمام دین اور فکرِ جائز و ناجائز پیدا کر دینا ہی تو شیخ کی حقیقی کرامت اور اس کے صاحب فیض و برکت ہونے کی بین علامت ہے اور اس کا اصلی فرض منصبی بھی یہی ہے۔ (اشرف السوانح)

ایک جگہ ارشاد فرماتے ہیں: مجھ کو کسی اور بات کا اتنا اہتمام نہیں جس قدر تہذیب اخلاق و دیانت کا ہے کیونکہ درس و تدریس کا اہتمام تو ہر جگہ ہوتا ہے لیکن اخلاق کی طرف کسی کو خیال بھی نہیں ہے۔ مثلاً میں اس پر زیادہ نظر نہیں کرتا کہ کس نے جماعت سے نماز پڑھی اور کس نے نہیں پڑھی کیونکہ اول تو عذر کا احتمال ہے دوسرے اس سے صرف فاعل کا حرج ہے کسی دوسرے کو اذیت نہیں۔ بخلاف اس کے کہ کسی سے کوئی حرکت خلاف تہذیب سرزد ہو جس سے دوسرے کو اذیت ہو اس لئے اس کا اہتمام کے ساتھ تدارک کیا جاتا ہے۔ (اشرف السوانح)

حقیقتِ تصوف علمِ باعمل ہے

(۱) ہمارے نزدیک حقیقتِ تصوف کی صرف علم باعمل ہے اور عمل وہی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم فرمایا ہے اور جو سالک کے اختیار میں ہے اس کے علاوہ سب چیزیں زائد ہیں اگر وہ عطا ہو جائیں اور شیخ ان کو بتلا دے تو نعمت ہے، اور قابل شکر اور عطا نہ ہوں یا عطا ہو کر زائل ہو جائیں تو ان کی تحصیل کی فکر یا ان کے زوال پر قلق طریق میں ناجائز اور باطن کے لئے سخت مضر ہے خواہ وہ کچھ ہی ہو۔

(۲) شیخ کو اطلاع تو سب حالات کی ضروری ہے۔ اپنی رائے سے یا کسی خواب یا وارد کی بنا پر کوئی کام کرنا طریق میں جائز نہیں۔ پھر اس اطلاع کے بعد شیخ تدبیر ان کی کرے گا جس کا تعلق امور نہی سے ہو بقیہ کی تدبیر اس کے ذمہ نہیں اس لئے طالب کو اس کا مطالبہ یا انتظار بھی طریق میں ناجائز ہے۔ اسی طرح اگر کوئی مرض یا کوئی

اثر واقعی یا خیالی تکلیف دہ یا کوئی آفت داخلی یا خارجی، عارضی یا لازم ہو جائے اس کا تدارک بھی شیخ کے فرض منصبی کے حدود سے خارج ہے۔ (تربیت السالک)

(۲) ملفوظ — فرمایا کہ طالب کے اندر اصلاح اعمال کا اہتمام پیدا کر دینے کے قبل اس کو اذکار و اشغال میں مشغول کر دینا اکثر مضر ثابت ہوتا ہے کیونکہ پھر وہ اپنے آپ کو بزرگ سمجھنے لگتا ہے۔ خاص کر اگر کہیں اتفاقاً اذکار و اشغال سے یکسوئی ہو کر اس پر کیفیات کا بھی ورود ہونے لگا تب تو گویا اس کے نزدیک بزرگی کی رجسٹری ہو گئی۔ حالانکہ اس قسم کی کیفیات کا بزرگی سے کیا تعلق۔ ایسی کیفیات تو بعض ریاضات اور مشق سے فساق و فجار بلکہ کفار تک کو حاصل ہو جاتی ہیں اور جب وہ ان کیفیات ہی کو بزرگی سمجھ لیتا ہے تو پھر اس کو اصلاح نفس اور اصلاح اعمال کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔ نہ کبھی ادھر توجہ ہوتی ہے اس لئے ہمیشہ جہل ہی میں مبتلا رہتا ہے اور اصل مقصود یعنی وصول الی اللہ سے محروم رہتا ہے جس کا طریق تحصیل نصوص نے صرف اصلاح اعمال ہی کو بتلایا ہے۔ (اشرف السوانح صـ۱۹۵)

حضرت والا اپنی اس ترتیب کے متعلق یہ فرمایا کرتے تھے کہ سلسلہ چشتیہ کے مشائخ سلف کے یہاں تو سلوک کی اصل ترتیب یہی ہے کہ اصلاح اعمال ظاہرہ و باطنہ کی تکمیل کے بعد اذکار و اشغال شروع کراتے تھے لیکن اکابر متاخرین نے یہ دیکھ کر کہ اس زمانے میں عمریں اور ہمتیں دونوں قاصر ہیں تو انہوں نے اس ترتیب کو قائم نہیں رکھا بلکہ اصلاح اعمال کے ساتھ ساتھ اذکار و اشغال کی بھی تعلیم کرنے لگے اور دونوں کو ساتھ ساتھ چلانے لگے اور میں نے اپنے زمانے کے طالبین کی مصالح پر نظر کر کے اکابر سلف کے طریق اور اکابر متاخرین کے طریق کے بین بین طریق اختیار کیا ہے یعنی کچھ دن تک تو میں محض اصلاح اعمال ہی میں مشغول رکھتا ہوں اور جب یہ دیکھ لیتا ہوں کہ اصلاح اعمال کی اہمیت اچھی طرح اس کے ذہن نشین ہو گئی ہے اور اس کے اندر اس کا خاص اہتمام پیدا ہو گیا ہے۔ اس وقت اذکار و اشغال بھی بتلا دیتا ہوں اور پھر

دونوں کا سلسلہ ساتھ ساتھ چلاتا رہتا ہوں غرض میں نے اکابر متاخرین کے طرق میں اپنے زمانے کے طالبین کی طبائع کا رنگ دیکھ کر بضرورت صرف اتنی ترمیم کرلی ہے کہ وہ حضرات تو دونوں چیزوں کو شروع ہی سے ساتھ ساتھ چلاتے تھے اور میں کچھ دن بعد ساتھ ساتھ چلاتا ہوں۔ (اشرف السوانح ص ۱۹۱-۱۹۲ حصہ دوم)

شاہی سلوک

حضرت والا کا انداز تعلیم تربیت یہ تھا کہ نہ تو ریاضات کراتے نہ مجاہدات، نہ ترک تعلقات نہ ترک لذات و مباحات بلکہ یہ تاکید فرماتے کہ خوب راحت و آرام سے رہو کہ اللہ تعالٰی کی محبت قلب میں پیدا ہو اور طبیعت میں نشاط رہے جو معین عبادت ہو البتہ معصیت کے پاس نہ پھٹکو اور نفس کی ہر وقت نگرانی رکھو اور ہمت سے کام لو اور بقدر تحمل و فرصت کچھ ذکر و شغل بھی کرتے رہو بس انشاء اللہ تعالٰی مقصود کا حصول یقینی ہے۔ نہ کم کھانے کی ضرورت نہ کم سونے کی۔ یہ دونوں مجاہدے آج کل متروک ہیں کیونکہ طبائع میں آج کل ضعف غالب ہے البتہ کم بولنا اور کم ملنا جلنا ضروری ہے مگر نہ اتنا کم کہ جس سے قلب میں انقباض پیدا ہو جائے، یہی شاہی سلوک ہے۔ (اشرف السوانح)

حضرتؒ اپنے متعلقین مریدوں اور عقیدت مندوں سے ہمیشہ بہت ہی بے تکلفی اور سادگی کے ساتھ ملتے جلتے تھے۔ مجلس میں اکثر دلچسپ مزاحیہ باتیں بھی کیا کرتے تھے۔

امراض باطنی کا لاجواب علاج

تعلیم و تربیت باطنی کے سلسلہ میں اختیاری اور غیر اختیاری کا مسئلہ حضرتؒ نے اتنا واضح فرمایا ہے کہ صدیوں سے اس کا ایسا عام مفہوم بیان نہ ہوا تھا اور اس نے اتنا کام لیا ہے کہ ہزاروں مشکلات طریق اس کے ذریعہ سے حل فرما دیں جب کوئی طالب اصلاح

اپنے کسی رذیلہ کا علاج پوچھا تو حضرتؒ سب سے پہلے یہی سوال فرماتے کہ یہ اختیاری ہے یا غیر اختیاری۔ اگر وہ کہتا کہ اختیاری ہے تو فرماتے کہ جس بات کا فعل اختیاری ہے اس کا ترک بھی اختیاری ہے، ہمت کر کے اختیار کو عمل میں لاؤ اور چھوڑ دو۔ اگر وہ کہتا کہ غیر اختیاری ہے تو اگر وہ دراصل غیر اختیاری ہوا تو فرماتے کہ غیر اختیاری کا آدمی مکلف ہی نہیں۔ پھر اس میں دینی ضرر ہی کیا ہوا، جو اس کا علاج پوچھا جاتا ہے۔ اگر وہ کہتا کہ ہے تو غیر اختیاری مگر اس کی وجہ سے تکلیف و پریشانی تو ہے اور یہ تو قابل علاج ہے تو جواب ارشاد فرماتے کہ تکلیف و پریشانی کا علاج میرے ذمہ نہیں۔

حضرتؒ فرماتے کہ یہ اختیاری اور غیر اختیاری کا مسئلہ گویا نصف سلوک ہے، بلکہ قریب قریب سارا سلوک ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جتنے ظاہری و باطنی اعمال جن کا تعلق اوامر و نواہی سے ہے سب اختیاری ہیں اور فرض و واجب ہیں ہر شخص ان کا مکلف ہے لیکن ان اعمال کے جتنے تاثرات و انفعالات ہیں خواہ خطرات وساوس ہوں یا قبض و بسط یا وجدانیات و کیفیات سب غیر اختیاری ہیں اور غیر مکلف ہیں نہ وہ مضر ہیں اور نہ ان پر کوئی مواخذہ ہے۔

اس تفہیم و تعلیم سے حضرتؒ نے شریعت و طریقت کی تمام دشواریوں کو نہایت آسان و قابل عمل بنا دیا۔

غایتِ بیعت

بیعت کا معاملہ بھی محض ایک خانقاہی رسم ہو کر رہ گیا تھا۔ حضرتؒ نے اس کی حقیقت اور اس کی اہمیت و ضرورت خاص طور پر بڑی وضاحت کے ساتھ نمایاں فرمائی اور اس کے صحیح اصول پر تمام عمر عمل کر کے ہمیشہ کے لئے ایک مثالی معیار قائم فرمایا:

حضرت رح کا ارشاد ہے کہ :-

لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ جب تک ہاتھ میں ہاتھ لیکر بیعت نہ کیا جائے صرف زبانی معاہدے کو کافی نہیں سمجھا جاتا۔ اگر کہا جائے کہ ہم تم کو تعلیم دیں گے اور ہر طرح تمہاری اصلاح کی تدبیر کریں گے، تو اس پر کوئی راضی نہیں ہوتا اس لئے جو موقوف علیہ نہ ہو اس کو موقوف علیہ سمجھنا یہ غلوفی العقیدہ ہے۔ اس عقیدے کی اصلاح ہونی چاہئے اس کے دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ اس طریقے کو اسی ہیئت سے جاری رکھا جائے اور زبان سے سمجھا دیا جائے کہ یہ ہاتھ میں ہاتھ دینا ظاہری بیعت ہے۔ اصل بیعت کام کرنا ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس ہیئت کو بالکل چھوڑ دیا جائے۔ دوسرے حضرات پہلے طریقہ پر عمل کریں اور مجھے چونکہ اس ہیئت خاصہ سے افراط فی الشفقت ہو جاتی ہے اس لئے میں دوسرا طریقہ اختیار کرتا ہوں، اس طرح غلوفی العقیدہ کی بھی اصلاح ہوگئی اور عزم کی بھی۔ (اشرف السوانح ۲)

عملی اصلاح

چونکہ آج کل بیعت کو عموماً لوازم طریق سے سمجھ لیا گیا ہے حالانکہ اصل چیز استفاضہ ہے اس لئے حضرتؒ اس غلوفی الاعتقاد کی اس طرح عملی اصلاح فرماتے تھے کہ اگر کوئی بیعت کی درخواست کرتا تو اول اس سے بیعت کی غایت دریافت فرماتے اور جب تک وہ صحیح غایت نہیں بتلاتا برابر استفسار فرماتے رہتے یہاں تک کہ استفسارات ہی سے سمجھکر وہ خود صحیح غایت بتا دیتا یا اپنے عجز کا اقرار کرکے خود حضرتؒ سے دریافت کرتا تو حضرتؒ خود اس کو صحیح غایت بتا دیتے۔ شروع میں اس لئے نہ بتاتے کہ جو بات خود مخاطب کی قوت فکریہ پر بوجھ پڑنے کے بعد سمجھ میں آتی ہے یا بتائی جاتی ہے وہ اس قدر پختگی کے ساتھ ذہن نشین ہوتی ہے کہ پھر کبھی نہیں بھولتی۔

جب طالب کو غایت بیعت متعین ہو جاتی تو پھر فرماتے کہ یہ غایت تو بعیت پر

موقوف نہیں یہ تو تعلیم و تعلّم کے ذریعہ سے بھی حاصل ہو سکتی ہے اگر وہ کہتا کہ اس طرح شیخ سے مناسبت اور تعلق خاص پیدا ہو جائے اور عمل آسان ہو جائے تو پھر دریافت فرماتے کہ آیا صرف مرید ہی کو شیخ سے مناسبت ہو جانا کافی ہے یا اس کے علاوہ شیخ کو بھی مرید سے مناسبت ہونا ضروری ہے۔ جب اس سے یہ اقرار کرا لیتے کہ جانبین میں مناسبت ہونا ضروری ہے تو فرماتے تو اس کے لئے تو صرف بیعت کافی نہیں بلکہ اور چند چیزیں بھی ضروری ہیں مثلاً کچھ دن پاس رہنا خصوصیات مزاج کا تتبع اور ان کی رعایت کرنا کچھ عرصہ تک تعلیمی خط و کتابت جاری رکھنا وغیرہ۔ غرض جانبین کی مناسبت کے لئے صرف بیعت کافی نہیں بلکہ شیخ کو تو طالب کے ساتھ زیادہ تر اس کے برتاؤ سے مناسبت پیدا ہوتی ہے (اشرف السوانح ج ۲)

بیعت میں مناسبت باہمی شرط ہے

فرمایا کہ بیعت کوئی معمولی چیز نہیں بلکہ اس کے لئے بھی شرائط ہیں۔ اور بیعت میں عجلت ہرگز نہ کرنا چاہئے تاکہ جانبین کو ایک دوسرے کی جانچ کا اطمینان سے موقع مل سکے، نیز اس میں طلب کا بھی امتحان ہو جاتا ہے۔ جب تک آپس میں مناسبت پیدا نہ ہو بیعت سے کوئی فائدہ نہیں، اور مناسبت کثرت مجالست ورنہ کثرت مکاتبت سے بھی پیدا ہو سکتی ہے اور یہ بھی جب ممکن ہے جب طالب کو غایت بیعت اور مقاصد کا اچھی طرح علم ہو جائے۔
(اشرف السوانح)

حضرت امر بیعت میں اپنے شرح صدر کو بھی دیکھتے تھے بلکہ در اصل قبول بیعت کا زیادہ تر دار و مدار قبول قلب ہی پر ہوتا تھا، جن طالبین کی صلاحیت اور مناسبت پر قلب شہادت نہیں دیتا اور جن کی طرف دل و دماغ رجوع نہیں ہوتا ان کو حضرت بیعت نہیں فرماتے تھے بلکہ غیب سے ایسی صورت حال پیدا ہو جاتی کہ ان سے خود ہی پیچھا چھوٹ جاتا (اشرف السوانح)

چاروں سلسلوں میں بیعت

حضرت والا اپنے پیر و مرشد اعلیٰ حضرت حاجی صاحب قدس سرہ العزیز کے طریق انیق اور معمول مقبول کے مطابق طالبین کو بیعت فرماتے وقت چاروں سلسلوں میں داخل فرماتے تھے تاکہ سب اکابر طریق سے انتساب ہو جائے اور سب کی برکات نصیب ہوں۔ نیز چاروں سلسلوں کے بزرگوں کے ساتھ یکساں اعتقاد رہے، اور ایک سلسلہ کے بزرگوں کو دوسرے سلسلوں کے بزرگوں پر فضیلت نہ دیں جو اس لئے ممنوع ہے کہ اکثر اس تفضیل سے دوسرے بزرگوں کی تنقیص لازم آجاتی ہے، جو ناجائز بھی ہے اور نہایت خطرناک بھی کیونکہ بزرگوں کے ساتھ سوء ظن بعض اوقات سوء خاتمہ کا سبب ہو جاتا ہے ورنہ برکات سے محرومی تو ضرور ہی ہو جاتی ہے۔
(اشرف السوانح حصہ دوم ص۱۸۵)

حقیقت یہ ہے کہ تمام سلسلوں کے بزرگوں کا یہی نصب العین تھا کہ سالکین اور طالبین حق کی اصلاح باطن اور تزکیۂ نفس کے لئے حسب ضرورت مجاہدے کرائے جائیں تاکہ ان کے قلوب کی صلاحیتیں درست ہو جائیں اور کیفیت تقویٰ پیدا ہو جو ذریعہ ہے حصول رضائے حق اور تعلق مع اللہ کا۔ اس کے لئے وہ جو تدابیر اختیار فرماتے تھے وہ اصول شریعت اور سنّت کے مطابق ہوتی تھیں کیونکہ تزکیۂ نفس کی وہی حقیقت ہے، جس کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم منجانب اللہ مامور تھے جیسا کہ یُزَکِّی نُفُوسَهُمْ کی شان میں وارد ہے۔ وہ تعلیم تمام تر احادیث میں مدون اور محفوظ ہے۔

حضرتؒ نے جس طرح شریعت کی بدعات کو مٹایا اسی طرح طریقت کی بدعات کو بھی ختم کیا۔ تمام خانقاہی رسومات و روایات کو حذف کر دیا اور چاروں سلسلوں کی تعلیم

لی تجدید لی۔ فرماتے تھے کہ یہ نہ سمجھنا کیفیات باطنہ اور مقامات روحانیت ہمارے یہاں نہیں ہیں۔ الحمد للہ سب کچھ ہے، کشف و کرامات و تصرفات وغیرہ اپنے مقام پر سب برحق لیکن پھر بھی ان میں مادّیت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اہل حق کو اس سے بہتر اور قوی و لطیف چیز عطا فرمائی ہے، وہ ہے روحانیت، اس کے بھی لطائف و مدارج ہیں مگر روحانیت کی ترقی منحصر ہے تعمیل احکام شرع پر کیفیات و مکاشفات کو اس میں کوئی دخل نہیں۔ ساری طریقت اور سلوک کا راز اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کے اندر مضمر ہے۔ وہ کون لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کے انعامات ہوئے وہ ہیں انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین۔ انہیں کا مسلک اختیار کرو۔ انہیں کی تقلید سے تم پر بھی اللہ تعالیٰ کے انعامات نازل ہوں گے اور تعلق مع اللہ قوی ہوگا اور ترقی کرے گا۔ اس طرح امتداد زمانہ سے چاروں سلسلوں میں جو مغائرت پیدا ہوگئی تھی اور آپس میں رقابت اور غلط احساس فضیلت پیدا ہوگیا تھا اس کو رفع فرما دیا۔ اور سب کا منبع اور مرجع شریعت غرا ہی کے واحد مرکز پر قائم فرما کر حقیقت طریق و سلوک کو مستند و معتبر بنا دیا۔ فرمایا کہ نقشبندیہ و چشتیہ سب نام ہیں اور حقیقت سب کی ایک ہے یعنی

اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

نیز بعض نقشبندیوں کا مزاج چشتیہ ہوتا ہے اور بعض چشتیوں کا مزاج نقشبندیہ ہوتا ہے یہ تقسیم ایسی ہے جیسے وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اسی طرح دوسرے سلسلوں کا معاملہ ہے۔

سالکینِ طریق کو اپنے حالات کا جائزہ لینے کی ہدایت

طالبِ طریق سے فرماتے تھے کہ اپنی تمام روزمرہ کی زندگی کا جائزہ لیتا رہے اور محرکات نفس پر نظر رکھے اور اس کا اندازہ کرتے کہ تعلق مع اللہ میں اس کے حسنات اور رذائل کس طرح کام کرتے ہیں۔ دین اور امور شریعت اور اتباع سنت میں کس طرح عملی دشواری محسوس ہوتی ہے اور کس طرح کے اوہام و شکوک پیدا ہوتے ہیں تاکہ ان کے تدارک کی فکر اور اصلاح کا تقاضہ ہو۔

فرماتے تھے کہ مسلمان کی روزمرہ کی زندگی میں تمامتر شریعت، تمامتر سنت اور تمامتر طریقت ہی سے معاملہ رہتا ہے جس کا مختصر حاصل یہ ہے کہ حقوق۔ حدود اور حفظ حدود۔

حقوق تمامتر احکامات شرعیہ

حدود تمامتر اتباعِ سنت

حفظ حدود تمامتر طریقت

پس انہیں تین باتوں کا حق ادا کرنا مسلمان کے لئے حصول مقام عبدیت کا ذریعہ ہے۔

حضرت رح کے ضابطہ تعلیم و تربیت میں چند خاص بنیادی اصول تھے جن کی فہم پیدا ہو جانے سے طریق میں کوئی گنجلک پیچیدگی یا ابہام باقی نہ رہتا تھا۔ مثلاً

مطالبات دین کو مفاد دنیا پر غالب رکھنا۔

عقل کو شریعت کا متبع رکھنا

اختیاری امور میں کوتاہی نہ کرنا اور غیر اختیاری امور کے درپے نہ ہونا۔

سالک کو اپنی تجویز ترک کرنا اور تفویض کو اختیار کرنا۔

مقصود شرعیہ کو پیش نظر رکھنا اور غیر مقصود کی طرف توجہ نہ کرنا۔

کیفیات باطنہ کو محمود سمجھنا اور مقصود نہ سمجھنا۔

طبعی امور سے مغلوب نہ ہونا بلکہ عقل کے فتویٰ پر عمل کرنا۔ اور
ہمیشہ عقل کو شریعت کا تابع رکھنا۔

تربیت باطن کے متعلق حضرتؒ کے یہ چند مجددانہ اصول تھے چنانچہ سالکین وطالبین کو حضرتؒ ہمیشہ ہدایت فرماتے رہتے تھے کہ اپنے تمام امور زندگی میں خصوصاً باطنی حالات وکیفیات میں وجدانیات ومکاشفات میں، جذبات وخیالات میں، وساوس وخطرات میں انہیں مذکورہ معتبر ومستند اصول کو پیش نظر رکھ کر کام کریں۔ پھر جو بھی حالات پیش آئیں اور جن میں تردد وتشویش خاطر ہو ان کو اپنے مصلح ومرشد کو تحریر کر کے مطلع کرتے رہیں ان کا جو بھی مشورہ یا ہدایت ہو اس پر خلوص کے ساتھ عمل کریں۔

مختلف ماحول واستعداد کے سالکین وطالبین نے اپنے تمام اوہام وشکوک اور اندیشہ ناک خطرات ووساوس کو اور ظاہری وباطنی احوال واعمال کو حضرتؒ کے سامنے پیش کیا اور ہدایت طلب کی ہے حضرتؒ نے ان کے لئے بہت ہی مجرب ونافع اور صحت بخش اکسیری نسخے تجویز فرمائے ہیں جن کے مطابق عمل کرنے سے الحمد للہ سائلین وسالکین کو نفس مطمئنہ کی دولت نصیب ہوئی ہے اور انشاء اللہ نصیب ہوتی رہے گی۔

یہ سوالات وجوابات یکجائی صورت میں مدون ہو کر تربیت السالک میں شائع ہو گئے ہیں۔ یہ تربیت السالک گویا طب روحانی کی قرابادین اعظم ہے اس میں آپ ہر طرح کے لوگوں کے حالات مطالعہ کریں گے۔ اس میں علماء وصوفیاء بھی ہیں، انگریزی تعلیم یافتہ اور کاروباری لوگ بھی ہیں۔ دفاتر میں کام کرنے والے بھی ہیں۔ نسیب ہی کے دل کی آواز اس میں مذکور ہے اور بہت ممکن ہے کہ اس میں مطالعہ کرنے والے کے لئے بھی دارو ئے شفا ہو

یہ انداز تعلیم وتربیت اس مجدد اعظم کا اس دور حاضر میں بہت عدیم المثال اور منفرد کارنامہ ہے جس نے عالم تصوف میں ایک زندہ جاوید انقلاب پیدا کر دیا اور شاہراہ طریقت صدیوں کے لئے ہموار وبے غبار وبے خطر ہو گئی اور نفس وشیطان کی شرارتوں اور فریب کاریوں سے مامون ومحفوظ ہو گئی۔

تربیت کے چند اصول

طالبین طریق جو سلسلہ میں داخل ہونا اور بیعت ہونا چاہتے تھے ان کے متعلق حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے اصول و ضوابط کی اس طرح وضاحت فرمائی ہے۔

فرمایا کہ جو شخص مجھ سے بیعت کی درخواست کرتا ہے اول تو میں اس کو دین کے ضروری مسائل کا علم حاصل کرنے کے لئے چند کتابیں پڑھنے کے لئے کہتا ہوں مثلاً قصد السبیل بہشتی زیور اور مواعظ و ملفوظات کو تاکیداً مطالعہ کے لئے کہتا ہوں اور اس سے بہت نفع ہوتا ہے اور اس سے طالب کو بیعت کی غایت معلوم ہوجاتی ہے، اگر کوئی شخص یہ لکھتا ہے کہ ہم نے کتابیں پڑھی ہیں تو میں لکھتا ہوں کہ پڑھ کر اپنی حالت میں کیا تغیر پیدا کیا۔ اس طریقے سے وہ نفع ہوتا ہے جو برسوں کے مجاہدے سے بھی نہیں ہوتا ہیں تو اول ہی روز سے کام میں لگا دیتا ہوں مگر لوگ قدر نہیں کرتے۔ اصل چیز فکر ہے جب آدمی فکر میں پڑتا ہے تو راستہ تلاش کرتا ہے۔ بس میں اول ہی گفت گو یا خط و کتابت میں طالب کے سر پہ بوجھ رکھ دیتا ہوں جس کی وجہ سے اسے فکر پیدا ہوجاتی ہے۔ اس فکر کی وجہ سے راستہ خود بخود منکشف ہونے لگتا ہے۔

فرمایا طالب علموں کو وصیت کرتا ہوں کہ درس و تدریس پر مغرور نہ ہوں۔ اس کا کارآمد ہونا موقوف ہے اہل اللہ کی خدمت، صحبت اور نظرِ عنایت پر اس کا التزام نہایت اہتمام سے رکھیں ؎

بے عنایاتِ حق و خاصانِ حق
گر ملک باشد سیہ ہستش ورق

بعض تعلیمی ضابطے

بیعت کرنے کے بعد اور قبل تلقین اذکار طالب کے موجودہ معمولات بھی دریافت فرمالیتے

اور ان میں مناسب کمی بیشی فرما کر اوراد تجویز فرما دیتے اور اس کی وجہ یہی بیان فرماتے کہ پرانے معمولات سے چونکہ دلچسپی و انس ہو جاتا ہے اس لئے ان کو چھوڑنے کو بھی دل گوارا نہیں کرتا اس لئے بلا ضرورت ان کو نہیں چھڑواتا۔ نیز قدیم معمولات میں مداومت کے بدولت ایک خاص برکت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ (اشرف السوانح حصہ دوم)

تعلیم و تربیت کا طریقہ حضرتؒ کے یہاں یہ بھی تھا کہ طالب کو ہدایت ہوتی تھی کہ اس معاملہ میں زبانی کوئی گفت گو نہ کرے۔ جو کچھ دریافت کرنا ہو یا جو اپنا باطنی حال اظہار کرنا ہو۔ وہ تحریر کے ذریعہ سے کرے چنانچہ ایسے خطوط کے جواب ہمیشہ سائل کی عبارت کے سامنے حاشیہ پر تحریر فرما دیتے تھے تاکہ سوال و جواب ایک ساتھ رہیں اور بعد میں کوئی مغالطہ پیدا نہ ہو۔ یہ بھی ہدایت تھی کہ ہمیشہ جوابی لفافہ بھیجا جائے۔ کارڈ پر حالات لکھنا پسند فرماتے تھے۔ یہ بھی ہدایت تھی کہ خط ہفتہ میں ایکبار لکھا جائے اور ہر خط میں صرف ایک مضمون ہونا چاہیئے۔ سالک کو اپنے احوال باطنی سوائے اپنے شیخ کے دوسروں پر ظاہر کرنے کی سخت ممانعت تھی۔

یہ بھی ہدایت تھی کہ ہر نئے خط کے ساتھ پچھلا خط بھی ملفوف کیا جائے اور خطوط کو محفوظ رکھنے کی ہدایت تھی تاکہ آئندہ ان کے مطالعہ سے یادداشت تازہ ہوتی رہے۔

حضرت کا یہ بھی انداز تعلیم و تربیت تھا کہ روزانہ کی مجلس میں خاص طور پر ایسے مضامین بیان فرماتے جن سے عام طور پر لوگوں کو سابقہ رہتا ہے مثلاً معاشرے کی خرابیاں۔ معاملات میں کوتاہیاں، اخلاق کی کمزوریاں۔ ان باتوں کو کچھ ایسے پیرائے سے حکایات و روایات کے طور پر بیان فرماتے کہ ان کے اسباب پر نظر پہنچتی پھر ان کے تدارک کے لئے تدابیر تجویز فرماتے جاتے۔ یہ انداز بیان گو عام حالات کے متعلق ہوتا مگر مجلس میں ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ گویا حضرت کو اس کے حالات کا کشف ہو رہا ہے اور حضرت اس کے دل کی بات بیان فرما رہے ہیں۔ یہ بات حضرت کے لئے عام طور پر مشہور تھی کہ حضرتؒ کو کشف ہوتا ہے مگر حضرتؒ اکثر اس کی

تردید یقین کے ساتھ فرماتے تھے کہ ہرگز یہ معاملہ نہیں ہے بلکہ اللہ تعالے جس سے کام لیتے ہیں اس کی اعانت فرماتے ہیں اور لوگوں کے حسب حال جو بات ہوتی ہے وہ بیان ہو جاتی ہے۔

اوراد و وظائف

سالکین و طالبین طریق کے لئے ان کی استعداد اور تحمل کے موافق کچھ اوراد و وظائف اور ذکر و اذکار بھی تعلیم فرما دیتے تھے اور ان پر التزام و دوام کے لئے تاکید بھی فرماتے تھے مگر ہمیشہ متنبہ فرماتے رہتے تھے کہ صرف انہیں باتوں کو مدار ترقی باطن نہ سمجھیں یہ باتیں صرف ممد و معاون ہیں اور اصل شے جس سے معرفت، تقویٰ، شرافت نفس حاصل ہوتی ہے اور تعلق مع اللہ پیدا ہوتا ہے وہ صرف ظاہر و باطن کے اوامر و نواہی پر عمل اور اتباع سنت ہی پر منحصر ہے۔ جو ہر شخص پر فرض و واجب ہے اور یہی حاصل تصوف و سلوک ہے، جو لوگ اس کی اہمیت نہیں سمجھتے اور اس پر عمل نہیں کرتے وہ عمر بھر سرگرداں اور نامراد رہتے ہیں اس وقت اکثر علماء اور صوفیاء کا یہی حال ہے اِلّا ماشاء اللہ۔

تربیت گاہ باطن

حضرتؒ کی تربیت گاہ باطن میں نہ کیفیات و ذوقیات تھیں نہ وجد و حال، نہ رسمی مجاہدے تھے نہ مراقبے۔ بس اہتمام تھا تو شریعت کے احکامات کی بجا آوری کا تھا۔ دھن تھی تو اپنے ہر انداز زندگی میں اپنے محبوب، محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر انداز زندگی کی اتباع کی تھی۔ فکر تھی تو نفس و شیطان کے مکائد سے بچنے کی تھی اور تاکید تھی تو صرف یہ تھی کہ اپنے ظاہر کو بھی پاک و صاف رکھو اور اپنے باطن کو بھی طاہر و طیب رکھو۔ اگر ان باتوں کی توفیق نصیب ہو جائے تو سمجھ لو کہ دونوں جہان کی دولت ہاتھ آگئی۔

سالکین کو اس کی بھی تاکید کی جاتی تھی کہ منجملہ حقوق طریق کے یہ بھی لازم و واجب ہے کہ حقوق العباد کا حدود شرع کے اندر خیال رکھا جائے ماں باپ کے حقوق۔ بیوی بچوں کے

حقوق عزیزوا قارب کے حقوق۔ دوست احباب کے حقوق۔ اہل تعلقات کے حقوق ادا کرنا محض نوافل واوراد و وظائف کے مقابلے میں زیادہ اہم ہے۔ ان میں کوتاہی کرنے سے مقصود طریق کبھی حاصل نہیں ہوسکتا کیونکہ خدا کی مخلوق کو ناراض کرکے خالق کو راضی کرنا ؎

ایں خیال است محال است و جنوں

حقوق العباد کا ادا کرنا فرض و واجب ہے، ان کے ترک سے مواخذہ ہوگا۔ اور ترک وظائف پر کوئی مواخذہ نہیں، یہ تو مستحب ہے۔ تو جو کام ضروری ہے اس کو ترک کرکے غیر ضروری کام کو ضروری اور اس پر کامیابی کا دارومدار سمجھنا محض خوش فہمی اور جہالت ہے اور انجام کار گمراہی اور نامرادی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے لوگوں کے دلوں میں اعمال واجبہ کی وہ وقعت وعظمت نہیں جو غیر واجبہ کی ہے۔ نوافل و وظائف کی کثرت کو زیادہ موجب قرب سمجھتے ہیں اور دوسروں کی حق تلفی نہ کرنا اور کسی کو اذیت نہ پہنچانا اس کو موجب قرب نہیں سمجھتے۔ اعمال واجبہ کو حقیر سمجھنے کا سبب، ان اعمال کا عموم ہے کہ اس کو تو سب ہی کرتے ہیں۔ پھر ان میں خصوصیت ہی کیا ہے۔ کوئی خاص امتیازی بات تو ہے نہیں۔ ان میں حصول ولایت و قطبیت و غوثیت کی کون سی بات ہے۔ ان میں سوز و ساز ہے نہ کیفیات نہ وجد نہ حال کس قدر افسوسناک یہ انداز خیال ہے اور محض باطل ہے۔

حضرتؒ اپنی مجالس میں بڑی اہمیت کے ساتھ آداب معاشرت بتایا کرتے تھے۔ فرماتے تھے کہ یہ کوئی اپنی پسند کی چیز نہیں ہے کہ جو دل چاہا اپنی مرضی کے مطابق معاشرہ اختیار کرلیا۔ کتاب و سنت میں اس کے آداب و حدود بھی مقرر کئے گئے ہیں۔ اس میں بھی جائز و ناجائز ہے حلال و حرام کا تعلق ہے، اس لئے جو عمل خلاف دین ہوگا ضرور قابل مواخذہ ہوگا۔

موجودہ تہذیب و تمدن میں مزاج ایسے بدل گئے ہیں کہ عوام تو کیا خواص کو بھی اس طرف التفات نہیں لیکن سالک کے لئے یہ بات بڑے خسران کی ہے کہ دین کے ان اہم

شعبہ کو نظر انداز کیا جائے۔ اس خلاف ورزی کا مرتکب ہوتے ہوئے رضائے حق جو مقصود طریق ہے کیسے حاصل ہو سکتا ہے۔

حضرتؒ نے متعدد وعظ اس موضوع پر فرمائے ہیں اور چند کتابیں اس مضمون پر تالیف فرمائی ہیں۔ حضرتؒ سالکین اور زیر تربیت اشخاص کو بڑی اہمیت کے ساتھ اس بات پر توجہ دلاتے کہ عالم تعلقات میں اپنا جو معاملہ یا برتاؤ دوسرے کے لئے باعث اذیت ہو یا اس کی ناگواری کا سبب ہو وہ طریق میں سخت قسم کا سدراہ ہے۔ کسی کو اپنی ذات سے ادنیٰ ناگواری بھی نہ ہو اس کا خیال رکھنا ہر شخص پر واجب ہے اور یہی حاصل سلوک ہے۔

حضرتؒ سالکین کے لئے تمام کیفیات و انفعالات باطنی کو نظر انداز کر کے دو باتوں کی خاص طور پر تلقین فرماتے۔ ایک یہ کہ غایت طریق پر نظر رکھی جائے کہ وہ رضائے حق ہے جس کا حصول محض ادائے حقوق واجبہ پر منحصر ہے۔ دوسرے معاملات و تعلقات میں اپنی ذات سے کسی کو تکلیف نہ پہنچنے پائے یہی شرافت نفس اور صحیح احساس انسانیت کی علامت ہے اور غایت سلوک ہے۔

اصلاح نفس میں اصلاح بدن کو کافی دخل ہے اس لئے بقدر وسعت بضرورت غذا اور دوا کا اہتمام بھی عبادت اور سنت ہے ان النفس علیك حقا ان الجسد علیك حقا حدیث ہے (تربیت السالک)

سیاست تربیت

جن لوگوں سے اصلاحی تعلق تھا حضرتؒ بڑی توجہ کے ساتھ ان کے خاص خاص

حالات اور حرکات و سکنات پر نظر رکھتے تھے خواہ کتنا ہی خصوصی و قریبی تعلق کیوں نہ ہو اس معاملہ میں کبھی مروّت اور چشم پوشی نہ فرماتے۔ معمولی معمولی غلطیوں پر سخت دار و گیر فرماتے تھے کیونکہ اپنے متعلقین کی غلطیوں پر چشم پوشی کرنا طریق میں خیانت ہے اور ان کے لئے خرابی کا باعث ہے۔ اس لئے کسی میں اگر بے پرواہی یا بے حیائی یا بیفکری کی بات دیکھتے تو اس کو بڑی سختی سے متنبہ فرماتے اور صحیح بات اختیار کرنے کی ہدایت فرماتے۔ کسی کو اپنی ذمہ داری کے کاموں میں غفلت برتتے پر سخت سرزنش و مواخذہ فرماتے کسی کو بدنظمی اور بے عقلی کے ساتھ کام کرتے دیکھتے تو سخت دار و گیر فرماتے اور جب تک وہ صحیح بات نہ سمجھ لیتا اسوقت تک اس کو معاف نہ فرماتے۔ بے ادبی اور بدتمیزی کی باتوں پر حضرت رحہ کو سخت غصہ آجاتا تھا۔ اور لہجہ بدل کر سخت فہمائش فرماتے۔ جن لوگوں میں شرارتِ نفس اور بداخلاقی کا مادہ ہوتا جو دوسروں کے لئے وجہ اذیت ہوتا تو حضرت رحہ ان کی سختی کے ساتھ اصلاح فرماتے۔

سالکین کی اس طرح کی تقصیرات اور خامیوں کی اصلاح کے لئے بطور معالجہ ہر شخص کی حالت کے لحاظ سے تادیب و سرزنش کا انداز بھی جداگانہ تھا۔ کسی کو مجلس سے اٹھا دیتے کسی کو ایک مدت تک کے لئے مکاتبت یا مخاطبت کی ممانعت فرما دیتے۔ کسی کو شدید غلطی پر قطع تعلق کی دھمکی دیتے، کسی کو بے پرواہی اور حرکات نازیبا پر سخت قسم کے جرمانے تجویز فرماتے مثلاً کسی کو کچھ دنوں کے لئے مسجد میں جھاڑو دینے اور نمازیوں کے جوتے سیدھے کرنے کے لئے فرماتے۔ کسی کو کچھ رقم بطور جرمانہ کسی خاص طریقے سے صرف کرنے کے لئے، کسی کو معمولات اوراد و وظائف کچھ عرصہ تک ترک کر دینے کے لئے یا کسی کو نوافل خاص تعداد میں ادا کرنے کے لئے جو نفس پر شاق ہو حکم فرماتے۔ کسی کو تہذیب نفس کے لئے کوئی مجاہدہ شاقہ تجویز فرماتے، وغیرہ وغیرہ۔ غائیت ان سب مواخذوں سے سالک کی اصلاح ہی ہوتی تھی۔ کیونکہ باوجود اس سخت گیری کے ہر معاملہ میں مشفقانہ اور مربیانہ انداز ہی ہوتا تھا۔ خود ہی فرماتے تھے کہ جب میں کسی سے خفا

ہوتا ہوں تو برابر اس کی طرف متوجہ رہتا ہوں اور میں اس وقت اللہ تعالیٰ سے اپنے لئے ہر مواخذہ سے پناہ مانگتا ہوں ۔ اور یہ بات میری عادت میں داخل ہو چکی ہے کبھی اس میں ذہول نہیں ہوتا ۔

یہی سبب تھا کہ باوجود مورد عتاب ہونے اور ناراضگی کے ہر شخص یہ محسوس کرتا تھا کہ حضرتؒ کے غصہ سے دل روشن ہو جاتا ہے اور حضرت کے ساتھ عقیدت و محبت میں اضافہ ہو جاتا ہے ۔

حضرتؒ کی تعلیم و تربیت کی یہ بھی ایک نمایاں خصوصیت تھی کہ سالک طالب طریق کی کیسی ہی ابتر اور اندیشہ ناک اور مایوس کن حالت ہو حضرتؒ ہمیشہ اس کو امید افزا اور حوصلہ افزا امداد و شفائے باطن تلقین فرماتے تھے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت و مغفرت بے پایاں کی طرف متوجہ فرماتے تھے جس سے بہت لوگ تسکین و طمانیت قلب حاصل کر کے باطنی و ظاہری ہلاکت و بربادی سے بچ گئے ۔

حضرت والا کی جو بات بھی تھی ، نہایت باضابطہ اور با اصول تھی ۔ لیکن یہ بھی بارہا فرمایا کہ مجھے انتظامات کا خواہ مخواہ شوق نہیں ہے ۔ بلکہ مجھے تو ان سے طبعی وحشت ہوتی ہے کیونکہ میری طبیعت فطری طور پر بہت آزاد ہے ، مگر جہاں ضرورت ہو اور بدون ضرورت کام ہی نہ چلے وہاں منتظم ہونا ہی پڑتا ہے ، اور وہاں منتظم ہونا ہی ضروری ہے ۔ کیوں کہ جہاں ضرورت ہو وہاں تو انتظامات میں مجھے بجائے مشقت اور وحشت کے نہایت مسرت اور دلچسپی ہوتی ہے ۔ (اشرف السوانح ۲۶)

حضرت اکثر فرماتے کہ میں فقط دوسروں ہی کو اصول صحیحہ کا پابند نہیں بناتا بلکہ اپنے آپ کو بھی تو پابند کرتا ہوں اور یہ تکلف یا تصنع سے نہیں ، بلکہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اصول صحیحہ کی پابندی میرا مقتضائے طبعی ہو گیا ہے ۔ گو اس میں کسی قدر مشقت بھی ہو اور گو اس کا تعلق میرے محکومین اور تابعین ہی سے ہو ۔ کیونکہ اصول صحیحہ ہر حال قابل احترام

ہیں۔ یہاں تک کہ اکثر اہل معاملہ کو میری رعایت اصول کا علم بھی نہیں ہوتا۔ لیکن میرے قلب کو تو تسلی رہتی ہے کہ میں نے اصول صحیحہ کی رعایت کی کسی کو جتلانا تھوڑا ہی مقصود ہے۔ اور میں نے یہ قواعد سوچ سوچ کر بلا ضرورت پہلے سے تجویز نہیں کئے۔ بلکہ جیسے جیسے معاملات لوگ میرے ساتھ کرتے گئے اور ان کی بنا پر جیسی جیسی ضرورت پیش آتی گئی قواعد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ باقی خدا نہ کرے مجھکو کوئی شوق تھوڑا ہی ہے خواہ مخواہ قواعد بنانے کا، اور لوگوں کو تنگی میں ڈالنے کا۔ استغفر اللہ۔ بلکہ واللہ مجھے بعض ضابطے کے قواعد تجویز کرتے وقت نہایت شرم آئی کہ یہ کیا واہیات عدالتوں کے سے ضابطے ہیں۔ لیکن کیا کرتا ضرورتوں نے مجبور کر دیا۔ میرا مقصود ان قواعد سے صرف یہ ہے کہ نہ مجھے کوئی اذیت ہو نہ دوسروں کا کوئی کام اٹکے۔ ورنہ اگر یہ قواعد نہ ہوتے تو بڑی گڑبڑ رہتی۔ نہ مجھی کو راحت رہتی۔ نہ لوگوں کے کام بنتے۔ اب تو بفضلہ تعالیٰ دونوں کی مصلحتیں پوری ہو رہی ہیں۔ میرے قواعد اپنی ذات میں بالکل سہل ہیں البتہ میں بھی ان کی پابندی سختی سے کرتا ہوں اور دوسروں سے بھی ان کی پابندی سختی سے کراتا ہوں بس اس پابندی ہی سے لوگ گھبراتے ہیں۔ حالانکہ بلا تشبیہ شرائع کا بھی یہی حال ہے کہ وہ اپنی ذات میں تو بالکل سہل ہیں۔ چنانچہ نصوص صریحہ سے ان کا سہل ہونا ثابت ہے۔ خود اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر وما جعل علیکم فی الدین من حرج۔

اور حدیث شریف میں ہے الدین یسرٌ

لیکن ان کی پابندی سختی سے کرائی جاتی ہے اور ان کے ترک پر سخت سخت وعیدیں ہیں۔ چنانچہ نماز اپنے ارکان و شرائط کے لحاظ سے بہت سہل عمل ہے اور معذوری کی حالت میں اس کے اندر اور بھی سہولتیں رکھ دی گئی ہیں لیکن اس کی پابندی بڑی سختی کے ساتھ کرائی گئی ہے اور اس کے ترک پر دنیا و آخرت میں سخت سخت وعیدیں اور سزائیں ہیں دنیا میں تو بعض ائمہ نے ترک نماز پر سزا نے قتل تک کا فتویٰ دیا ہے اور بعض نے حبس دوام کا

اور آخرت میں فرعون و ہامان کے ساتھ دوزخ میں جانے کی وعید وارد ہے، غرض اس قانون کو ہرگز سخت نہیں کہہ سکتے جو اپنی ذات میں تو سہل ہو لیکن اس کی پابندی سختی سے کرائی جائے۔
(اشرف السوانح ص۲)

حضرتؒ فرمایا کرتے تھے میں نے اپنے معمولات میں راحت کی تدابیر اختیار کر رکھی ہیں، یہی میرا اصل مذاق ہے کہ دنیا کی بھی راحت ہو اور آخرت کی بھی اور صرف اپنی ہی راحت مقصود نہیں دوسروں کی راحت کا بھی خیال رکھتا ہوں۔ (اشرف المعمولات)

حضرتؒ اپنے متعلق یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ میرے اندر حدت تو ہے مگر الحمد للہ شدت نہیں ہے، بلکہ دوسروں کے جذبات کی تو میں اتنی رعایت رکھتا ہوں کہ دوسروں کی نظر بھی ان دقائق کی غایت تک نہ پہنچتی ہوگی۔ بفضلہ تعالیٰ دور دور تک کے احتمالات اذیت پر بھی فوراً میری نظر پہنچ جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ ان سے احتراز کی توفیق بھی عطا فرما دیتے ہیں اور اسی لئے مجھے اور بھی غصہ آتا ہے کہ میں تو ان کی اتنی رعایت کروں اور یہ میرے ساتھ ایسی بے فکری برتیں۔ (اشرف السوانح)

اپنے طرز سیاست ہی کے متعلق یہ بھی فرمایا کرتے کہ بعض لوگوں نے مجھ سے کہا کہ اپنے اور حضرات کا تو یہ طرز نہ تھا۔ میں نے کہا کہ یہ بات تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے کہ حد خمر نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تھی نہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں تھی صرف تعزیر تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بجائے تعزیر کے یہ حد کیوں جاری اور مقرر کر دی۔ بس جو وہاں جواب ہے وہی یہاں بھی ہے، یعنی پہلے طبائع میں سلامتی تھی اس لئے واقعات میں قلت تھی لہذا صرف تعزیر کافی تھی حد مقرر کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ بعد کو طبائع کا رنگ بدل گیا اور واقعات زیادہ ہونے لگے اس لئے حد مقرر کرنے کی ضرورت واقع ہوئی۔ تو جو فاروق نے کیا وہی ایک فاروقی نے کیا
(اشرف السوانح)

فرمایا کہ بقول حضرت شیخ اکبر رحمۃ اللہ علیہ شیخ کامل کے اندر یادشاہوں کی سی سیاست ہونا ضروری ہے کیونکہ عام طبائع کے اعتبار سے عادت اکثر یہ بھی ہے کہ بغیر سختی کے اصلاح نہیں ہوتی اسی لئے اس کی ضرورت سب عقلاء کے نزدیک مسلم ہے۔۔۔ ہر متمدن جماعت نے حسب ضرورت اپنے اپنے اصول سیاست مقرر کر رکھے ہیں بلکہ نظام عالم ہی اصول سیاست پر قائم ہے جب امن ظاہری کے لئے سیاست ضروری ہے تو امن باطنی کے لئے تو بدرجہ اولیٰ ضروری ہوگی۔ کیونکہ فساد ظاہری کی اصلاح اتنی دشوار نہیں جتنی فساد باطنی کی ہے۔ پھر تعجب ہے کہ رذائل نفس کے ازالہ کے لئے سیاست کی ضرورت ہی نہیں سمجھی جاتی اور اگر کوئی مصلح بزرگان سلف کے طریق کو زندہ کرے اور فطری اصول پر طالبین اصلاح کی اصلاح کرے تو اس پر ہر کس و ناکس اعتراض کرنے کے لئے تیار ہے (اشرف السوانح حصہ دوم)

فرمایا کہ ابھی تو اس وجہ سے کہ المعاصر اصل للمنافرہ لوگوں کو میرے اس طرز تربیت سے وحشت ہے اور اس پر اعتراض ہے لیکن انشاء اللہ تعالیٰ میرے بعد لوگ اس کی قدر کریں گے اور سندیں پیش کریں گے میں نے اپنے اوپر بدنامی لیکر اوروں کے لئے راستہ صاف کر دیا ہے۔ (اشرف السوانح حصہ دوم)

تنبیہ

حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کے اس طریق اصلاح بطرز سیاست کے متعلق ایک ضروری تنبیہ بھی قابل عرض اور قابل غور ہے وہ یہ کہ اس طریق خاص کے اختیار کرنے کا ہر شخص ہرگز اہل نہیں لہذا عام مصلحین اس کے اختیار کرنے کی ہرگز جرأت نہ کریں ورنہ کورانہ تقلید کر کے اپنا اور طالبین اصلاح کا بھی ناس کریں گے۔ یہ تو ان خاص الخاص حضرات ہی کا منصب ہے جو نفسانیت سے نکل چکے ہوں اور جو حدود کی حفاظت پر پورے طور سے قادر ہوں محض تقلید سے اس منصب خاص کی اہلیت پیدا نہیں ہو سکتی۔ (اشرف السوانح حصہ دوم)

مجاز بیعت کے لئے شرائط استعداد

حضرتؒ نے ایک مرشد و مصلح میں جن اوصاف کا ہونا ضروری ہے ان کی اس طرح تشریح فرمائی ہے۔ ارشاد:۔

وصف اول یہ ہے کہ وہ متقی ہو۔

دوسرے یہ کہ وہ خود اپنی اصلاح کئے ہوئے ہو۔

تیسرے یہ کہ اس کو طریق سے مناسبت پیدا ہو چکی ہو لیکن محض علمی مناسبت نہیں بلکہ حالی۔

چوتھے یہ کہ اس میں دوسروں کی بھی اصلاح کرنے کی اہلیت پیدا ہو گئی ہو۔

پانچویں یہ کہ اوصاف مذکورہ میں اس کو بقدر ضرورت رسوخ بھی حاصل ہو گیا ہو اور

چھٹی بات یہ کہ اس سے یہ توقع بھی ہو کہ گو فی الحال اس کو اوصاف مذکورہ میں رسوخ کا صرف یہ درجہ ضروریہ حاصل ہے لیکن آئندہ وہ ترقی کر کے اس میں رسوخ کا درجہ کاملہ بھی حاصل کر لے گا۔ یہ سب چھ اوصاف ہوئے لیکن ان سب اوصاف کا تحقق صرف ظن غالب ہوتا ہے یقین نہیں ہوتا اور نہ ہو سکتا ہے۔ (اشرف السوانح ۲)

حضرتؒ اکثر اپنے طالبین بیعت کو اپنے خلفائے مجازین کے سپرد کر دیا کرتے تھے اس میں ایک مصلحت یہ بھی تھی کہ حضرتؒ اندازہ کر لیں کہ جن صلاحیتوں کی بنا پر ان کو اجازت دی گئی ہے ان کا مصرف یہ حضرات کس طریقے سے کرتے ہیں بعض کی باقاعدہ تعلیمات پر اظہار مسرت فرماتے اور اپنا اطمینان ظاہر فرماتے اسی طرح بعض کی بے پرواہی اور ضابطۂ تربیت سے انحراف کا حال معلوم ہوتا تو اس پر ان کو تنبیہ فرماتے اور صحیح طریقہ اختیار کرنے کی تاکید فرماتے، اور ان کو تاکید تھی کہ اپنے حالات اور اپنے متعلق طالبین کی تعلیم و تعلم کے طریقے سے حضرت کو مطلع کرتے رہا کریں تاکہ ان کو اپنے نفس کی نگہداشت اور طریقہ کار

کی بھی اصلاح ہوتی رہے اور ہدایت ملتی رہے۔

فرمایا کہ گو بعد تکمیل کے شیخ کی تعلیم کی حاجت نہیں رہتی لیکن بقائے فیض کے لئے اس کے ساتھ اعتقاد و امتنان کا تعلق عمر بھر رکھنا ضروری ہے۔ (اشرف السوانح حصہ دوم)

مجاز بیعت

سالکین تربیت یافتہ کو اکثر اس عنوان سے اجازت عطا فرماتے تھے، کہ بیساختہ قلب پر وارد ہوا کہ آپ کو بیعت و تلقین کی اجازت دیدی جائے لہذا تو کلاً علی اللہ آپ کو اجازت دیتا ہوں اللہ تعالیٰ نفع کو عام اور تام فرمادیں اگر کوئی رجوع کرے تو انکار نہ کریں۔ اس اجازت کی اپنے خاص احباب کو بھی اطلاع کر دیں۔

مجاز صحبت

تعلیم و تلقین کے سلسلہ میں حضرتؒ نے اپنے مجددانہ ذوق سے ایسے لوگوں کی بھی ایک جماعت تجویز فرمائی تھی جن کو بیعت لینے کی تو اجازت نہ تھی مگر وہ اپنی صحبت و تعلیم سے لوگوں کو طریق کی اشاعت کر سکتے تھے اس میں علماء کے علاوہ دیگر مشاغل کے ایسے لوگ بھی شامل تھے جن کی استعداد باطنی صحیح معیار پر آچکی تھی۔ ان کو اجازت ان طریقہ سے عطا فرماتے تھے۔

ایک روز قلب پر بیساختہ وارد ہوا کہ بعض ایسے احباب کو (جو تلقین کی کافی صلاحیت رکھتے ہیں مگر اجتماع شرائط بیعت میں بعض خاص حالات کا انتظار ہے) تلقین بلا بیعت کی اجازت دے دوں اور ایسے حضرات کا لقب مجاز صحبت تجویز کیا گیا یعنی مجاز بالصحبۃ یعنی جن کو صرف بواسطہ صحبت نفع پہنچانے کی اجازت دی گئی اور فرق کے لیے جماعت سابقہ کا لقب مجاز بیعت یعنی مجاز بالبیعۃ قرار دیا گیا۔ اگر ان مجازین صحبت میں حالات

منتظرہ رونما ہو گئے (جن کی تعیین اور فیصلہ میں صرف میں منفرد ہوں خود اہل معاملہ کو اس کا منتظر رہنا منافی اخلاص ہے) اس حالت میں ان کو مجازین بیعت میں داخل کرکے شائع کردیا جائے گا۔

فرمایا کہ میں توعملاً یہ دکھادینا چاہتا ہوں کہ نفع بیعت پر موقوف نہیں بلکہ تعلیم اور اس کی اتباع پر موقوف ہے اصل چیز یہی ہے۔(اشرف السوانح)

حقیقت اجازت بیعت

ملفوظ :۔ حضرتؒ فرماتے تھے کہ اس اجازت کی نظیر بالکل ایسی ہے جیسے علوم درسیہ میں جو سندِ فراغ دی جاتی ہے اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ابھی اسی وقت اس کو ان علوم میں کمال کا درجہ حاصل ہو گیا۔ بلکہ محض اس ظنِ غالب پر سند دی جاتی ہے کہ اس کو ان علوم سے ایسی مناسبت پیدا ہو گئی ہے کہ اگر وہ برابر درس ومطالعہ میں مصروف ومشغول رہے تو قوی امید ہے کہ رفتہ رفتہ اس کو کمال کا درجہ بھی حاصل ہو جائے گا۔ پھر اگر وہ اپنی غفلت اور ناقدردانی سے خود ہی اپنی اس مناسبت اور استعداد کو ضائع کرے تو اس کا الزام سند دینے والوں پر ہرگز نہیں بلکہ خود اسی پر ہے اسی طرح جو کسی کو بیعت کی اجازت دی جاتی ہے اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ فی الحال ہی اس کو ان اوصاف میں کمال کا درجہ حاصل ہو گیا ہے بلکہ محض اس ظنِ غالب پر اجازت دی جاتی ہے کہ اس کو فی الحال تو ان اوصاف کا درجہ ضروریہ حاصل ہو گیا ہے اور اگر وہ برابر ان کی تکمیل کی فکر اور کوشش میں رہا تو قوی امید ہے کہ رفتہ رفتہ اس کو آئندہ ان اوصاف میں کمال کا درجہ بھی حاصل ہو جائے گا۔ (اشرف السوانح)

اپنے طریق پر اطمینان وتشکّر

ارشاد۔ واقعی اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ میرے یہاں حقیقت سے کوئی ناواقف نہیں اور یہ میرے کھرّے پن کی بدولت ہے ورنہ یہاں بھی خلط مبحث ہوجاتا اب جتنے ہیں بفضل تعالیٰ ان پر اطمینان تو ہے اور میرے نزدیک تو قریب قریب ہر شخص قابل اجازت ہے، اور میں تو سب کو اجازت دے دیتا لیکن مصالح دینیہ کا مقتضاء یہ ہے کہ صاحب اجازت میں کسی نہ کسی قسم کی وجاہت دینی یا دنیوی بھی ہو۔ مثلاً اہل علم یا کسی معزز طبقہ کا ہو تاکہ اس کی طرف رجوع کرنے میں کسی کو عار نہ آئے اور طریق کی بے وقعتی نہ ہو۔ الحمد للہ میرے احباب میں ایسے ایسے موجود ہیں جو اصول اصلاح کو اچھی طرح سمجھے ہوئے ہیں اور مشہور مشہور مشائخ سے بھی اچھی طرح سمجھے ہوئے ہیں اور مشہور مشہور مشائخ سے بھی اچھی تربیت باطنی کرسکتے ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ آج کل لوگ بس شہرت کی بنا پر معتقد ہوتے ہیں۔ کمال کو کوئی نہیں دیکھتا طریق سے بہت ہی بیگانگی ہوگئی ہے۔ (اشرف السوانح حصّہ دوم)

ہنوز آں ابر رحمت درفشاں است

خم وخمخانہ با مہر ونشان است

مؤلف
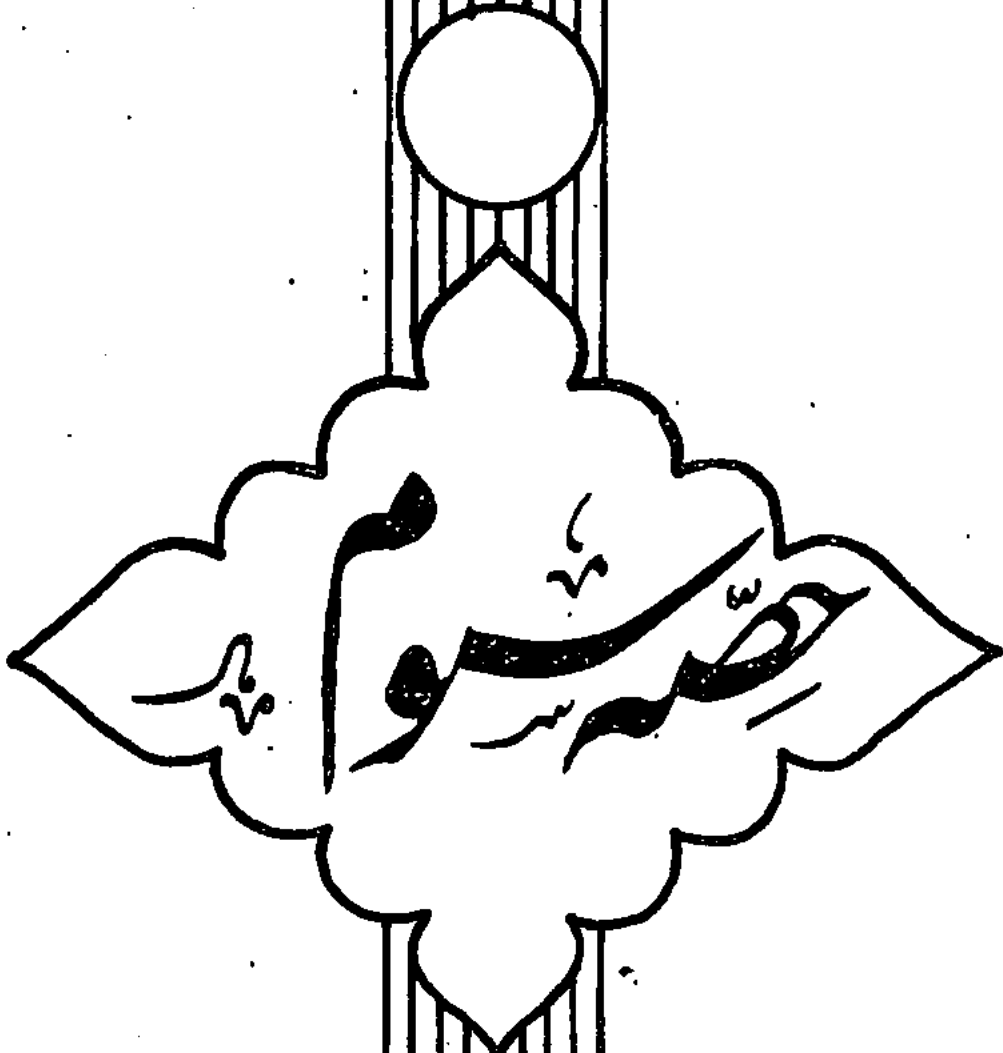
تمّت

مقالات
حصہ سوم
سیاسی خدمات
مرتب کردہ :-

مقالہ نمبر ۲۷

حکیم الامت مولانا تھانوی اور تحریکِ پاکستان

از انیس احمد

برصغیر میں مشائخ اور علمائے کرام نے ہر دور میں اور ہر زمانے میں حق کی سربلندی اور ملّت کی سرفرازی کے لئے مجاہدانہ کام کیے بعض نے راہ حق میں صبر و استقامت سے حالات کے شدائد کا مقابلہ کیا قید و بند کی سختیاں جھیلیں اور چند شیدائیان اسلام نے جانِ عزیز کا نذرانہ پیش کر کے شہادت پائی جب کہ بعض شیوخ و عارفین نے قلمی جہاد کے ذریعہ دین حنیف کی تبلیغ اور نشر و اشاعت میں کوشاں رہے۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے موقع پر حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی شاملی کے امیر جہاد تھے اور اس دور کے اکثر اکابرین شیخ طریقت حضرت حاجی صاحب کے روحانی فیوض و برکات اور انوار کمالات سے بہرور ہوئے تھے ان اکابرین میں مولانا تھانوی اپنی علمی خدمات اور مجتہدانہ کمالات کی بناء پر نہایت ممتاز اور جلیل القدر تھے۔

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رح (۱۲۸۰۔۱۳۶۳ھ ۱۸۶۱۔۱۹۴۳ء) ان منفرد اور ممتاز علماء و مشائخ میں تھے۔ جن کی دین مبین اور ملّت

سلسلہ اِلٰہیہ کی مخلصانہ خدمت تاریخ اسلام کا ایک روشن تر باب ہے۔ آپ کی سیرت وکردار ظاہری و باطنی کمالات کے پیش نظر چودھویں صدی میں آپ کی شخصیت کو قطبیت اور جمیع صفاتِ الٰہیہ سے جو نسبت ہے اُس حیثیت سے آپ کے درجات کو جاننا انہیں، عارفین کا کام ہے جو ان حقائق کے رمز آشنا ہیں کہ یہ وہ مقامات سیر و سلوک ہیں جن کی سیر سفر کے بغیر کوئی ان کی نیرنگیوں کو نہیں جان سکتا۔

آپ کی ذات اس لحاظ سے یگانۂ روزگار تھی کہ آپ محدّث بھی تھے۔ اور مفسّر، فقیہہ بھی تھے اور متکلم بھی متشرع بھی تھے اور شیخ طریقت بھی، محیٔ سُنّت بھی تھے اور مجدد ملت بھی اور یہ مجددانہ اصلاح۔ خدمت دین اور خلق اللہ کی ہمدردی کا جذبہ صادقہ آپ میں وہبی تھا۔ نام ونمود سے بے نیاز۔ سراپا اخلاص پیکرِ تسلیم رضا اور خانقاہِ امدادیہ کے پُرسکون درویشانہ ماحول میں ذکرالٰہی اور تصنیف وتالیف میں مشغول ہزار سے اُوپر تصانیف کی یادگار چھوڑیں تلقین وارشاد کا ایسا دلکش انداز کہ بات سننے والے کے دِل میں اتر جائے۔ تزکیہ نفس واِصلاح باطن کا حکیمانہ اسلوب ہزاروں بندگانِ خدا روحانی فیوض وبرکات سے مالا مال ہوئے سچ ہے کہ ہر رنگ جُدا تھا اور ہر شان نرالی، یہی وجہ ہے کہ آپ جملہ امور میں اصلاح ومصالح امت ملحوظ رکھتے اور اپنے مخصوص مسلک پر عمل پیرا رہتے تھے۔

اگرچہ مولانا تھانوی جامع الصفات تھے لیکن آپ کو سیاست سے کوئی شغف نہ تھا اور نہ سیاست کی طرف دلی میلان تاہم ۱۹۱۸ء میں پہلی عالمی جنگ کے خاتمہ پر سیاسی کشمکش کا آغاز ہوا۔ برطانوی جہانگیری سیاست کے خلاف وہ گرم بازاری ہوئی کہ سارا ملک سیاسی نعروں سے گونج اٹھا آزادی کے بلند آہنگ نغمات تیز تر دھنوں میں گائے جانے لگے ہیجانی سیاست کاریوں نے وہ تفرقہ اندازیاں کیں کہ خاندان تقسیم ہو گئے۔ اور مختلف طبقات گروہ در گروہ ہو کر کٹ گئے۔

ایک جانب انڈین نیشنل کانگریس نے ترک موالات کے ذریعہ برطانوی حکومت پر دباؤ ڈالا اور دوسری طرف ترکی سلطنت کی برطانوی بندر بانٹ سے عثمانی خلافت ختم ہو گئی۔ ہندوستانی مسلمانوں کو مغربی اقوام کی اس انتقامی کاروائی پر شدید جذباتی اور اور ذہنی صدمہ پہنچا۔ اسلام کی علامتی وروایتی خلافت کے خاتمہ پر ان کے غم و غصّے کی انتہا نہ تھی ہر طرف نفرت و اشتعال کا شدید طوفان امنڈ پڑا۔

اس موقع پر خلافت کمیٹی کے زیر اہتمام علی برادران کی قیادت میں تحریک خلافت کا وہ زور رہا کہ ہندوستان سراپا احتجاج بن گیا مقامات مقدسہ اور ترکی کی حفاظت کے لئے مسلمانوں میں ایسا بے پناہ جذبہ پیدا ہوا تاریخ میں جس کی مثال نہیں ملتی۔ اس کے نتیجے میں

عوام کی زندگی میں انقلاب آیا۔ ہمدردی، ایثار و قربانی کے جذبات پیدا ہوئے اور عوام میں سیاسی شعور ابھرا، مسلم دنیا کی مرکزیت کے قیام واستحکام کے ملّی شعور نے کیا کیا جلوہ گری نہ دکھائی لیکن چند در چند وجوہ کی بناء پر یہ عظیم الشان تحریک نتیجہ خیز نہ ہو سکی۔ تاہم تحریک خلافت نے برصغیر کی تاریخ میں ناقابل فراموش نقوش و اثرات مرتسم کیے۔

علمائے امّت کی اکثریت کا فتویٰ ترک موالات اور تحریک خلافت کی تائید و حمایت میں تھا لیکن مولانا تھانوی کا مسلک اس سے کُلیتاً مختلف تھا اور اس اختلاف کی بنیاد مشیخیت نہیں محض حق پرستی اور صدق اخلاص تھا۔ ۱۹۱۹ء تا ۱۹۲۲ء کے دوران خلافت کمیٹی تحریکات میں اکابرین ملّت نے شرکت کی تاہم حضرت تھانوی کو ان کے اصل مقصد سے اتفاق تھا مگر تحریک خلافت کے طریق کار سے اصولی اختلاف تھا لیکن اس کے باوجود انہوں نے ترکوں کی امداد و اعانت کے لئے ایک مفصّل مضمون بعنوان "الصحف المنشورہ فی فضائل اعانت انگورہ" لکھا جو رسالہ "النور" ماہِ رمضان ۱۳۴۰ھ میں شائع ہوا۔

سیاسی کشمکش کے اس دور میں ملک طول و عرض سے بعض افراد نے متواتر خطوط لکھے۔ کچھ لوگوں نے مسائل حاضرہ کے متعلق رائے طلب کی جب کہ بعض نے استفتاء کیا ان میں کچھ معتقدین تھے اور

چند مخالفین۔

یہی وجہ ہے کہ مولانا تھانوی نے اس باب میں جو کچھ رقم کیا وہ زیادہ تر جوابی خطوط تھے اور خاص بات یہ تھی کہ جملہ امور مسئولہ میں شرعی حیثیت اور دینی فراست و بصیرت سے فقیہانہ نظر ڈال کر واضح راہِ عمل ظاہر فرمائی ان جوابات کو بعد میں مستقل عنوانات کے تحت مدون کر کے شائع کیا گیا۔

چونکہ ملی تحریکات کے سلسلے میں علمائے اُمت میں واضح اختلاف تھا۔ لہٰذا سیاسی نظریات و عملیات میں بے شمار تبدیلیوں کی بنا پر اختلافات کی جہتیں بڑھتی گئیں تاہم مولانا تھانوی نے ملکی ملی حالات کے مشاہدہ و تجزیئے کے بعد ۱۹۲۵ء میں "حیات المسلمین" کی تصنیف کا آغاز کیا جو کہ ۱۹۲۸ء میں شائع ہوئی اور یہ کتاب شخصی اصلاح کے لئے تھی اس کے دیباچہ میں رقمطراز ہیں۔

اس وقت مسلمانوں پر عالم میں عموماً اور کشور ہند میں خصوصاً مصیبتوں پر مصیبتیں اور بلاؤں پر بلائیں نازل ہوتی چلی جارہی ہیں مگر نہ ان کی طرف ان کے ذہن کو مطلق التفات ہوتا ہے نہ ان کی زبان پر اس کا نام آتا ہے، نہ ان کے قلم سے یہ مضمون نکلتا ہے اگر کسی کو علاج و تدبیر کی طرف توجہ ہوتی ہے تو وہ نسخے استعمال کئے جاتے ہیں جن کے متعلق بلا تکلف یہ کہنا صحیح ہے کہ وہ مرض کے خلاف ہوتے ہیں۔ جو مزاج میں بجائے درستی کے اور سُستی

پیدا کر دیتے ہیں کیونکہ ان مصائب کی تشخیص میں ان کو نصوصِ الٰہیّہ و نبویہ کی پوری تصدیق نہیں ہوتی۔ پیچیدہ صورت حال کے نازک مضمرات پر فکر و نظر کا یہ کس درجہ متین جواب ہے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بعد میں "صیانۃ المسلمین" لکھی جو وسط جولائی ۱۹۳۰ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ اور یہ جمہوری نظام کے متعلق تھی۔

صیانۃ المسلمین کے سرِ آغاز میں فرماتے ہیں۔

ہمارے بھائیوں میں اجتماع اتفاق، تنظیم قریب قریب مفقود ہے اس لئے ہر مسلمان بجائے خود اپنے کو تنہا دیکھ کر اپنے ضعف سے پریشان ہے ورنہ اہل باطل کے مقابلہ میں اہل حق کی پریشانی کا احتمال ہی نہیں ہو سکتا۔ اور اگر کہیں برائے نام تنظیم ہے تو اس سے محض اغراض دنیویہ مقصود ہیں بلکہ اکثر تو دین کو ان اغراض میں مخل سمجھ کر اس سے اعراض کرتے ہیں۔

مسلمانان ہند جن پریشانیوں میں مبتلا ہیں ان میں دو طریق مشروع ہیں۔ ایک ضعفاء کے لئے کہ سکوت محض سے کام لیں نہ حفاظت کا کوئی سامان کریں نہ مدافعت کا اہتمام کریں۔ دوسرا اقویا کے لئے کہ حفاظت و مدافعت کی تدبیریں کریں اپنے لئے بھی اور اپنے مسلمان بھائیوں کے لئے بھی۔

اسی زمانہ میں ایک موقع پر آپ نے فرمایا۔

کانگریس کی ایک منظم جماعت ہے اور اہل حق کی کوئی منظم جماعت نہیں ہر شخص تنہا ہے اس لئے ہر شخص خوفزدہ ہے ضرورت اس کی ہے کہ اہل حق کے اندر ایک جماعت ایسی منظم ہو جو ان ظالموں کو دفع کرسکے کیونکہ ان لوگوں کی اتنی جرأت بڑھ گئی ہے کہ بعض مقامات پر مسلمانوں پر یہ لوگ چڑھ آئے ہیں اور حملہ کر دیا حالانکہ مسلمانوں کا کوئی قصور نہ تھا۔ بیچارے مسلمان حیران و پریشان تھے اور کچھ نہ کرسکے۔

اس لئے مسلمانوں کو ضرور اپنی حفاظت کا سامان کرنا چاہیئے ورنہ اگر ان لوگوں کی جرأت بڑھ گئی تو مسلمانوں کا جان و مال سب خطرہ میں ہے۔ مگر اب مشکل یہ ہے کہ ایسی منظم جماعت آئے کہاں سے ؟؟؟

مرقومہ بالا تینوں اقتباسات سے اندازہ ہوتا ہے کہ حکیم الامّت مولینا تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے عصری مسائل کا موضوعی انداز میں جو واقعاتی تجزیہ فرمایا وہ حکیمانہ بصیرت اور مومنانہ فراست کی بیّن دلیل ہے۔

بلاشبہ مولینا تھانوی نے مسلمانوں کی سیاسیات و اجتماعیات کے لئے عارفانہ بصیرت سے حدود شرعیہ کے دائرے میں چند اصول و ضوابط تحریر فرمائے جو پُرفتن سیاست کی طوفانی شورشوں کے دور میں مِلّتِ اسلامیہ کے لئے رہنما اصولوں کا کام دیتے رہے۔

بروایت مولانا عبدالماجد دریا آبادی دارالحرب ہند میں دارالاسلام کے قیام کے سلسلے میں حضرت تھانوی کے قلبی میلان فکری اپج اور ذہنی کاوش و تاثر کی معنوی پیش بینی و نقشہ گری واضح تھی ۔

مولانا عبدالماجد جون ۱۹۲۸ء میں خانقاہِ امدادیہ میں پہلی بار حاضر ہو کر مجالس اشرفیہ میں شریک ہوئے تھے ان کا بیان ہے ۔

دوسری نشست چاشت کے وقت شروع ہوئی اور کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے تک جاری رہی اس میں حضرت نے خوب کھل کر باتیں کیں مختلف بزرگوں کے واقعات عام دینی ہدایات اخلاقی و روحانی مذاکرات سب بڑے دلچسپ دلکش اور موثر انداز میں واعظانہ خشکی کا کہیں نام و نشان نہیں ۔

صبح اور دوپہر کی ملا کر طویل صحبت میں سیاسی پہلوؤں پر گفتگو آجانا ناگزیر سا تھا گفتگو ہوئی حضرت نے اتنی معقولیت سے کی کہ ساری بدگمانیاں کافور ہو کر رہ گئیں کون کہتا ہے کہ حضرت گورنمنٹی آدمی ہیں! لَاحَولَ وَلاَ قُوَّۃَ ۔ جس نے بھی ایسا کہا جان کر یا بے جانے بہرحال جھوٹ ہی کہا یہ تو خالص مسلمان کی گفتگو تھی، مسلمان بھی ایسا جو جوشِ دینی اور غیرتِ ملی میں کسی خلافتی سے ہرگز کم نہیں ۔

پاکستان کا تخیل خالص اسلامی حکومت کا خیال یہ سب آوازیں بعد کی ہیں پہلے پہل اس قسم کی آوازیں یہیں کان میں پڑیں ۔ بس فرق حضرت کو ہم لوگوں کے اس وقت کے طریقہ کار سے پورا اتفاق نہ تھا ۔

لیکن یہ اختلاف تو کچھ ایسا بڑا اختلاف نہیں۔ نفس مقصد یعنی حکومت کافرانہ سے گلو خلاصی اور دارالاسلام کے قیام میں حضرت ہم لوگوں سے کچھ پیچھے نہ تھے عجب نہیں جو کچھ آگے ہی ہوں۔

حضرت کی گفتگو میں یہ جزو بالکل صاف تھا حضرت کو حکومت وقت سے جو مخالفت تھی وہ اس کے کافرانہ ہونے کی بناء پر تھی نہ کہ اس کے بدیسی یا غیر ملکی ہونے کی بناء پر،،

(نقوش و تاثرات ص۲۱-۲۳)

بالکل صاف جزو کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا عبدالماجد رح لکھتے ہیں۔

حضرت کو بعض معاصر علماء کی طرح جنگ آزادی جنگ حقوق اور آزادئ وطن وغیرہ سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی ان کے سامنے مسئلہ سیاسی نہیں تمام تر دینی تھا وہ اسلام کی حکومت چاہتے تھے۔

۱۹۲۸ء میں جب پہلی بار حاضری ہوئی تو اس ملاقات میں حضرت نے دارالاسلام کی اسکیم خاصی تفصیل سے بیان فرمائی تھی۔

کہ جی یوں چاہتا ہے کہ ایک خطہ پر خالص اسلامی حکومت ہو سارے قوانین تعزیرات وغیرہ کا اجراء احکام شریعت کے مطابق ہو، بیت المال ہو، نظام زکوٰۃ رائج ہو شرعی

عدالتیں قائم ہوں دوسری قوموں کے ساتھ مل کر کام کرنے سے بھلا یہ نتائج کہاں حاصل ہو سکتے ہیں ؟ اس مقصد کے لئے تو صرف مسلمانوں ہی کی جماعت ہونی چاہیئے اور اسی کو کوشش کرنی چاہیئے

(نقوش و تاثرات ص۲۴)

اس مجمل اور مختصر بیان سے دار الاسلام کے مکمل خاکہ کی واضح نشان دہی ہوتی ہے کہ یہ قلب صافی کی واردات تھی یا عارفِ بصیرت کی پیش بینی بہر کیف یہ ایک حقیقت ہے کہ ملکی وسائل و حالات میں وقتاً فوقتاً جو تبدیلیاں رونما ہوتی رہتیں بالعموم حضرت ان تغیرات سے باخبر رہتے اور خانقاہ اشرفیہ سے مناسب ہدایات و رہنمائی ملفوظات کا سلسلہ جاری رہتا۔

حضرت تھانوی کی عادتِ راسخہ تھی کہ واقعات و معاملات غور و فکر کے بعد جب کسی نتیجہ پر پہنچتے تو لحاظ و مروّت یا سود و زیاں کی پروا کیئے بغیر اس پر قائم رہتے۔ دار العلوم کی سرپرستی سے علیحدگی اس کی ایک مثال ہے۔

۱۹۳۲ء میں مولانا تھانوی دار العلوم دیوبند کے سرپرست تھے مدرسہ کے بعض اکابرین جمعیۃ العلماء ہند کے ارکان تھے اور کانگریس کے ہمنوا ان کی دیکھا دیکھی طلباء نے سیاست میں عملی حصّہ لینا شروع کر دیا جو کہ حضرت تھانوی کو ناگوار گذرا اس کی وجہ یہ تھی کہ آپؒ کے نزدیک عملی سیاست میں طلباء کی شرکت نافع نہ تھی اس سے

تعلیمی مقاصد کے تدریجاً تادیبی مفاسد پر منتج ہونے کا احتمال تھا۔
اس مسئلہ پر تعلیم و تعلم کے وسیع تر مفاد میں مولانا کی محتاط رائے یہ تھی ۔

موجودہ سیاست کا اشتغال خواہ فی نفسہ حق ہو یا باطل مگر دار العلوم کے طلباء و علماء کی اس میں شرکت بہر حال مدرسہ کے مقاصد اصلیہ کو متزلزل کر دینے والی ہے جس کا مشاہدہ و تجربہ بھی عرصہ سے ہو رہا ہے ۔

اس لئے سیاست سے اجتناب برتنے کے لئے حضرت تھانوی نے مہتمم مدرسہ کی تائید سے ایک اعلان شائع کرایا کہ آئندہ دار العلوم کے ارباب سیاسی سرگرمیوں میں قطعاً حصہ نہ لیں سرپرست اور مہتمم کی طرف سے اس بیان کی اشاعت پر باب نزاع کھل گیا اور مختلف حلقوں سے کچھ آوازیں بلند ہوئیں چنانچہ اس امتناعی بیان پر پنجاب سے ایک صاحب نے اخبار " سچ " میں سوال اٹھایا تھا کہ اسلام تو عین سیاست ہے اور جہاد فرض عین پھر دیوبند والوں نے طلباء کے لئے سیاسیات کو کیوں شجر ممنوعہ قرار دیا ؟ - اور اس میں شرکت کیسے ممنوع قرار دی ؟

اس اعتراض پر مولانا عبد الماجد مدیر " ہفتہ وار سچ " نے جواباً مندرجہ ذیل نوٹ لکھا ۔

یہ دو مسئلے الگ الگ ہیں ایک تو نفس جہاد ہے یعنی ظالم

غاصب ایسے دین اور دشمنِ دین حکومتوں سے بقدر استطاعت مقابلہ کرتے رہنا سو یہ عین اسلام ہے ۔ اور اس سے کسی کو اختلاف نہیں اب اس کے آگے دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ اُمت کے فلاں فلاں افراد یا طبقات یا ادارے کے لئے خود مصالحِ امت کے لحاظ سے اس میں شرکت مفید و مناسب ہوگی یا مضر و نامناسب ؟

تو یہ ایک اجتہادی مسئلہ ہے اور اس کے اندر مسلک و رائے کے اختلاف کی بڑی گنجائش ہے ۔ سرپرست و مہتمم مدرسہ کے تجربے میں اگر طلباء کی شرکت مضر و نامناسب ثابت ہوتی ہے تو یہ کچھ اس عمومی حکم کے منافی نہیں ہے ۔

(نقوش و تاثرات ص)

حضرت تھانوی کو یہ جواب پسند آیا اور اس میں مزید اضافہ فرمایا۔

تین رفیق سفر کر رہے ہیں ۔ کسی مقام پر پہنچ کر دیکھا کہ عین راستہ پر ایک شیر کو تین چار بھیڑیئے لپٹ رہے ہیں اور راستہ بند ہے ان کے پاس کوئی ہتھیار وغیرہ نہیں ۔ البتہ ان کے سامنے اینٹیں اور پتھر پڑے ہیں ان تینوں میں اختلاف رائے ہوا اور رائے کے اختلاف سے عمل میں بھی اختلاف ہوا ۔

ایک کی رائے ہوئی کہ شیر کی امداد کرنا مناسب ہے اگر یہ غالب آگیا تو طبعًا اس احسان سے متاثر ہو کر مجھ سے مزاحمت نہ کرے گا اور میں اطمینان سے اپنے راستے پر چلا جاؤں گا ۔ یہ خیال

کرکے اس نے اینٹوں سے بھیڑیوں کو مارنا شروع کر دیا۔

دوسرے کی رائے یہ ہوئی کہ شیر اکیلا ہے اور بھیڑیئے متعدد ہیں غالباً غلبہ انہیں کو ہوگا۔ اگر ان کی نصرت کی تو طبعاً یہ اس احسان سے متأثر ہو کر مجھ سے مزاحمت نہ کریں گے اور میں امن و امان کے ساتھ اپنے راستے چلا جاؤں گا یہ خیال کرکے اینٹوں سے شیر کو مارنا شروع کر دیا۔

تیسرے کی یہ رائے ہوئی کہ اینٹیں نہ شیر کی مدافعت کے لئے کافی ہیں نہ بھیڑیوں کے لئے کافی ہیں۔ اگر منصور جانور مغلوب ہوگیا تو غیر منصور کو خواہ مخواہ چھیڑ کر اپنا دشمن بنا دیا اور اگر غالب بھی ہوگیا تب بھی جانور ہے جس کی طبیعت عقل پر غالب ہے کیا توقع ہے کہ احسان سے متأثر ہو کر رعایت کرے گا۔ موقع پا کر وہ بھی طبعاً مزاحمت کرے گا۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ جب تک اپنے پاس قابل اطمینان مدافعت کا سامان نہ ہو کسی کی نصرت نہ کی جائے بلکہ جس طرح ممکن ہو اپنی حفاظت کی کوشش کی جائے پھر خواہ غلبہ کسی کو ہو ممکن ہے کہ ہمارے عدم تعارض کے سبب یہ بھی تعرض نہ کرے اور اگر تعرض بھی کیا تو اس کا افسوس تو نہ ہوگا۔ کہ ہم نے خوامخواہ چھیڑ کر اپنا دشمن بنا لیا۔ اس لئے یہ دونوں سے علیحدہ ہو کر اپنی حفاظت میں مصروف ہوگیا اور جس طرح بن پڑا ان کی زد سے سکوت و سکون کے ساتھ نکل گیا اور دور سے چکر کاٹ

کر اسی راستہ پر جا پڑا اب آگے اس کی قسمت کہ وہ شیر بھیڑیئے وہاں بھی پہنچ گئے۔

یہ تین جدا جدا طریقے ہیں جن کو ان تینوں اشخاص نے اپنے لئے اختیار کیا۔ اگر ان لوگوں نے صریح قوانین عقلیہ کی مخالفت کی ہو اور نیت بھی کسی کی فاسد نہ ہو تو کسی شخص پر کوئی عقلی ملامت نہیں ہو سکتی اور اگر کسی شخص کو اس کے مجوزہ طریق کار کا مضر ہونا صحیح دلائل سے بتلا دیا جائے اور اس کے پاس کوئی معقول جواب بھی نہ ہو اور پھر بھی وہ اسی پر مصر رہے تو پھر وہ ضرور مستحقِ ملامت ہوگا۔

(نقوش و تاثرات ص ۲۷۴ تا ۲۷۵)

حضرت تھانوی رح کی یہ عادت تھی کہ اختلاف کے مواقع پر جو بات بھی حق سمجھتے تھے اس کا صاف صاف اظہار اور برملا اعلان فرما دیتے تھے اگر اسے قبول کر لیا جاتا تو بہتر ورنہ خود اس سے علیحدہ کر لیتے تھے، مناظرہ و مناقشہ میں پڑنا پسند نہ فرماتے تھے چونکہ دارالعلوم دیوبند حضرت کا علمی گہوارہ تھا اور بزرگوں کا مرکز اس لئے حضرت کو اس سے اس درجہ محبت تھی جس کا کوئی دوسرا اندازہ بھی نہیں کر سکتا۔

ارباب مدرسہ نے اس معاملہ میں آپ کی رائے سے اختلاف کیا لہٰذا آپ نے مدرسہ کے مفاد کی خاطر اس کی سرپرستی سے استعفیٰ

دے دیا۔ لیکن اس کی ہمدردی اور بہی خواہی کا تعلق برابر قائم رکھا۔

بقول مولانا عبدالماجد رح سیاسیات حاضرہ سے متعلق مولانا تھانوی کی رائے یہی تھی جو مذکورہ بالا تمثیل کے پیرائے میں بیان فرمائی گئی یہ مسلک کہاں تک صحیح تھا اس سے بحث نہ اس وقت تھی اور نہ اب ہے تاہم اس تمثیل سے حضرت تھانوی رح کا مسلک کلیتًا واضح ہو جاتا ہے۔

غرضیکہ مولانا تھانوی سیاسی محاذ پر اسی رائے پر قائم تھے اور بار بار تلقین فرماتے تھے:

انگریزی حکومت اور کانگریس کے درمیان رسہ کشی میں وہ مسلمانوں کو بالکل غیر جانبدار اور یکسو دیکھنا چاہتے تھے اور سمجھتے تھے کہ جب تک مسلمان خود اپنے اندر پوری قوت پیدا نہیں کر لیتے ان کا کسی فریق کے ساتھ شامل ہو کر عملی حصّہ لینا خودکشی کے مترادف ہو گا۔ اور سارا زور اسی پر دیتے تھے کہ مسلمان پہلے اپنے میں متحدہ قوت وتنظیم پیدا کریں "

(نقوش وتاثرات ص۲۷۶)

اگر مغربی اقوام کی چیرہ دستیوں کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو ماضی میں تہ بر تہ ملفوف سیاسی حوادث کی نیرنگیاں عجیب نقش گری کرتی ہیں جان کمپنی نے تجارت کرتے کرتے سیاست کاری کا دام پھیلایا اور جان بل نے اپنی عیارانہ حکمت عملی سے مسلم اقتدار کو مٹا کر مسلمانوں کی

قوت کو زائل کیا اور ہندوؤں کو سر چڑھایا پھر جب مراعات اور حقوق کی ہوا چلی تو کانگریس نیابتی حقوق و اختیارات کا محدود مطالبہ پیش کرنے لگی جس کے دائرہ کار میں رنگا رنگی کے باوجود ہندو اکثریت کے اختیارات زیادہ اور مسلم اقلیت کے حقوق کمتر تھے اور متحدہ قومیت اور ثقافتی ورثہ میں مشترک عناصر کا بھی سراب تھا مسلمان جس کے فریب خوردہ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ مولانا تھانویؒ ہندوؤں کی عددی اکثریت اور معاندانہ ذہنیت کے سبب ان کے ساتھ مسلمانوں کے اشتراکِ عمل کو مضر سمجھتے تھے۔ اور دار الحرب میں ایک علیحدہ مسلم تنظیم کے حامی تھے۔

یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہوگا کہ ہندوستانی عمائدین میں مولانا ابو الکلام آزاد (۱۸۸۸-۱۹۵۷ء) پہلے مدبّر تھے جنہوں نے کامل آزادی ہند کا مطالبہ پیش کیا جسے "الہلال اور البلاغ" نے ملک کے طول و عرض میں پہنچا دیا جب کہ رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر (۱۸۷۸-۱۹۳۱ء) وہ منفرد سیاسی قائد تھے جو ابتداءً کانگریس کے حامی تھے اور سرد و گرم روزگار میں درمیانہ ہمسفر لیکن بیس کی دہائی کے اواخر میں کانگریسی قائدین کی نامہربی و بے التفاتی نے انہیں سخت ذہنی صدمہ پہنچایا وہ متواتر تلخ تجربات سے دوچار ہوئے اور بڑی بڑی مایوسیاں اٹھانے کے بعد کانگریس سے علیحدہ ہو گئے۔

آخری دور کے مکتوبات میں انہوں نے اس حقیقت کا برملا

اعلان کر دیا کہ کانگریس مسلمانوں کے حقوق سے تغافل برتتی ہے اور اب اس مسئلہ کا واحد حل یہی ہے کہ مسلمان اس سے علیحدہ ہو کر اپنے حقوق کے تحفظ اور اپنی جداگانہ سیاسی حیثیت و مقام حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

حضرت تھانویؒ اور مولانا محمد علی جوہر ملت اسلامیہ کے مخلص خدمت گذار تھے دونوں ذی وقار اور اہل وجاہت تھے مگر دونوں کے مسالک یکسر مختلف بلکہ متضاد تھے۔ ایک مقتداء تھے دوسرے مقتدی اور مقتدر سیاسی قائد لیکن بالآخر ان کی فکر رسا بھی اشتراک عمل کو مضر اور علیحدہ سیاسی منزل کے تصور تک پہنچی۔

اگرچہ دونوں حضرات کی کبھی باہم ملاقات نہیں ہوئی تاہم بعض ارباب نظر دونوں کے درمیان مصالحت و مفاہمت کی کوئی صورت نکالنا چاہتے تھے۔

۱۹۳۰ء کے وسط میں مولانا عبدالماجد نے اس ملاقات کی داغ بیل ڈالی مگر نیرنگی روزگار کہ محمد علی کی شدید علالت کے سبب یہ موقع نہ آیا اور جنوری ۱۹۳۱ء میں وہ وفات پا گئے۔

مولانا عبدالماجدؒ نے اپنے پیر و مرشد کو اس سانحہ کی اطلاع دی حضرت نے جوابی خط میں یوں تعزیت فرمائی۔

مکرمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ

محمد علی کی وفات کا میرے قلب پر جو اثر ہے بیان نہیں

کہ سکتا خدا جانے کتنی دفعہ دعا کر چکا ہوں اور کر رہا ہوں اور مجھ کو مرحوم کی جس صفت کا اعتقاد اور اس اعتقاد کی بناء پر محبت ہے وہ صرف ایک صفت مسلمانوں کی سچّی بے غرض محبت ہے۔ جو باقی دوسری صفات دیکھنے والے جانتے ہیں میں نے کبھی دیکھا نہیں اس لئے ایک ہی صفت سے محبت ہے اور اس کو میں روح الصفات سمجھتا ہوں"

اشرف علی

یہ شرافت نفس و عالی ظرفی کی بہترین مثال ہے (ص ۱۷۶)

تحریکِ خلافت سے لے کر بعد کی تمام سیاسی تحریکات تک جو وقتاً فوقتاً ملک میں ابھرتی رہیں اور ان کی شرعی حیثیت کے متعلق مولانا تھانوی کی فقیہانہ تحریرات شائع ہوتی رہیں جن میں تحریکات حاضرہ کے متعلق شرعی حکم واضح فرما کر مسلمانوں کی رہنمائی کی گئی۔

تحریک خلافت کے ابتدائی دور میں کانگریس کے ساتھ اشتراکِ عمل جس میں حضرت شیخ الہند کی مشروط حمایت شامل رہی اپنی اصل و بنیاد کے اعتبار سے حدود شرعیہ کے مُطابق صحیح اور جائز تھا۔ اسی لئے اس وقت علمائے اُمّت میں سے کسی نے اصل مسئلے میں اختلاف نہیں کیا۔ اور جن افعال پر کسی نے خدشات و خطرات کا اظہار کیا تو وہ ایسے افعال تھے جن پر خود حضرت شیخ الہندؒ نے شدت کے ساتھ نکیر فرمایا ہے۔

چنانچہ حضرت تھانوی رح فرماتے ہیں :

حضرت مولانا شیخ الہند رح (۱۸۵۱-۱۹۲۰) کا اشتراک مصالحت تھا نہ کہ مطابقت ومتابعت یعنی اس وقت تحریک خلافت نہایت شدت وقوت پر تھی جس سے حضرت مولانا شیخ الہند رح کو قوی امید تھی کہ حکم اسلام کا غالب ہوگا - اور ہم لوگوں (مولانا تھانوی) کا خیال وقرائن وجدان سے اس کا عکس تھا اور سو یہ اختلاف محض رائے کا اختلاف تھا اور مثل اختلاف حنفی وشافعی کے اجتہادی تھا۔ اس اشتراک میں متابعت کا شائبہ کا وہم بھی نہ تھا یہی وجہ ہے کہ اگر کسی وقت کسی شعارِ اسلامی کے ضعف یا کسی شعائر کفر کی قوت کا اندیشہ ہوتا تھا تو فورًا اس پر نکیر شدید فرماتے تھے۔

(بوادر النوادر ص ۹۶۶ تا تذکرۃ الظفر ص ۳۶۰)

چونکہ کانگریس کے اس دوسرے دور میں تمام تر غلبہ وقوت ہندوؤں کو حاصل تھی اور مسلمانوں کے اختلاف واحتجاج کے باوجود وہ من مانی کاروائیاں نافذ کرنے میں مطلقًا کامیاب ہو جاتے تھے اس لئے مسلمانوں کی حیثیت محض تابعیت اور متبوع ہونے کے رہ گئی تھی اس لئے حضرت تھانوی کے نزدیک موجودہ حالات میں کانگریس کے ساتھ اشتراک عمل حدِ جواز سے نکل کر صریح طور پر ناجائز ہو گیا تھا ۔

چنانچہ مولانا تھانوی رح فرماتے ہیں ۔

بخلاف اس وقت کی حالت کے کہ اب کانگریس کی قوت سے

کفر و شرک کا حکم غالب ہے اس کی ہر تجویز سے منافقت و اہانت کی بو آتی ہے۔ اس وقت کا اشتراک بصورت اِدغام بالکل متابعت ہے جو کہ ناجائز ہے لہٰذا مسلمانوں کو اپنی تقویت و تنظیم مستقل لازم ہے۔

(بوادر النوادر)

پس چونکہ موجودہ حالات میں حضرت تھانوی کے نزدیک کانگریس کے ساتھ مسلمانوں کا اشتراک عمل ناجائز تھا اس لئے اب یہ اختلاف مثل شافعی حنفی کے اجتہادی اختلاف نہیں رہا تھا اور نہ کانگریس کے ساتھ مل کر جدوجہد آزادی میں حصہ لینا حضرت شیخ الہند رح کا اتباع رہا تھا جس کی مولانا نے صراحتاً تغلیط فرما دی ہے ان کا ارشاد ہے:۔

حامیان کانگریس میں سے بعض حضرات اس اشتراک کو استاذی حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا اتباع سمجھتے ہیں اور بعض اصحاب اس اختلاف کو مثلِ حنفی و شافعی کے خیال کرتے تھے سو میرے نزدیک یہ دونوں خیال محض غلط ہیں۔ حضرت شیخ الہند رح کا اشتراک مصالحت تھا نہ کہ متابعت :۔

(بوادر النوادر صفحہ ۹)

اگر اس دور کی نازک صورتِ حال پر نظر ڈالی جائے تو فی الجملہ یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ تحریک خلافت کے زمانے میں مسلمانان

ہند کانگریس میں شریک نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ کانگریسی ہندو مسلمانوں کے ساتھ تائید و حمایت میں کھڑے ہو گئے تھے اور آزادی ہند کے مطالبہ کے سلسلہ میں دونوں اقوام میں ایک گونہ مصالحت کی صورت پیدا ہو گئی تھی جو بالکل حدود جواز کے اندر تھی لیکن جب کچھ عرصہ بعد کانگریس کے اندر ہندوؤں کا غلبہ ہو گیا اور طوعاً کرہاً ہندوؤں کی متابعت کرنی لازم ہو گئی تو نئی صورتِ حال یہ تھی کہ اگر کبھی شعائر کفر کے اظہار یا شعائر اسلام مٹانے والی تجاویز کے خلاف زبانی احتجاج بھی کیا جاتا تو قطعاً غیر مؤثر ثابت ہوتا بلکہ اس کی طرف بالکل توجہ نہ دی جاتی تو ایسی صورت میں بلاشبہ کانگریس میں شرکت کرنا جائز نہ تھا۔

اسی لئے مولانا تھانوی نے اس میں شرکت کے عدم جواز کا فتویٰ صادر فرمایا لیکن اس میں بھی یہ التزام ملحوظ رکھا کہ عام فتویٰ صادر فرمانے سے پہلے متعدد بار جمعیّت العلماءِ ہند سے اس بارے میں مکالمہ فرمایا اور کانگریس میں شرکت کے جو نتائج اور مسلمانوں کے قومی نقصانات تھے ان کا حل ان حضرات کرام سے دریافت فرمایا۔ مگر ان کی طرف سے کوئی شافی جواب یا حل نہیں ملا تب اس تمام تحقیق و جستجو کے بعد حضرت تھانوی نے تنظیم المسلمین میں مسلمانانِ ہند کو اپنی علیحدہ تنظیم کا مشورہ دیا۔

چونکہ اس وقت ملک کی موجودہ مسلم جماعتوں میں بجز مسلم لیگ

کے کوئی ایسی جماعت نہ تھی جسے مسلمانوں کی جمہوری طاقت حاصل ہو اس لئے مسلم لیگ میں شرکت وحمایت کی رائے دی گئی کیونکہ اگر کانگریس سے منقطع ہوکر مسلمان منتشر اور پراگندہ ہوجاتے تو یہ ان کی سیاسی موت تھی ۔

اور پھر ایسی غیر مستطیع حالت اور ناگزیر متابعت میں کانگریس میں شرکت سے بھی مسلمان کی قومی زندگی فنا ہو رہی تھی بلکہ اس شرکت سے ہی مذہبی موت لازم آرہی تھی ۔ چنانچہ ۱۹۳۷ء میں جمعیت العلماءِ ہند کے اجلاس دہلی کے موقع پر ناظم اعلیٰ مولانا احمد سعید کے خط اور دعوت نامہ کے جواب میں حضرت تھانوی نے اس کی وضاحت فرمادی تھی ۔

آپ کا ارشاد تھا ۔

شرعی حیثیت سے صرف اپنی ایک رائے کا اظہار کرتا ہوں جس کے متعلق مولانا کفایت اللہ سے زبانی گفتگو بھی ہوچکی ہے اور اب تو واقعات نے مجھ کو اس رائے پر بہت ہی پختہ کردیا کہ مسلمانوں کا خصوصاً حضراتِ علماء کا کانگریس میں شریک ہونا میرے نزدیک مذہباً مہلک ہے بلکہ کانگریس سے بیزاری کا اعلان کردینا نہایت ضروری ہے ۔

علما کو خود مسلمانوں کی تنظیم کرنی چاہیئے تاکہ ان تنظیم خالص دینی اصولوں پر ہو کیونکہ مسلمانوں کو کانگریس میں داخل ہونا اور داخل کرنا میرے

نزدیک ان کی دینی موت کے مترادف ہے۔

(افادات اشرفیہ ص۸۸ تذکرۃ الظفر ص۳۶۲ تا ص۳۶۴)

یہاں یہ ذکر بھی قابل لحاظ ہے کہ مولانا تھانوی نے مسلم لیگ کی تائید حمایت اسی وقت فرمائی تھی جب کہ آپ کو پختہ یقین ہوگیا تھا کہ مسلم لیگ نے کانگریس کا ساتھ چھوڑ کر علیحدگی اختیار کر لی۔ نیز یہ کہ وہ مسلمانانِ ہند کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کے لئے مساعی ہے۔

حضرت تھانوی اسلامیانِ ہند کے لئے دار الاسلام کے کس درجہ خواہاں تھے۔ اس کا اندازہ مولانا جلیل احمد[1] علیگڑھی خلیفہ مجاز حضرت تھانوی کی مندرجہ تحریر سے ہوتا ہے۔

احقر بعونہٖ تعالیٰ تقریباً ۱۳-۱۴ برس مستقل طور پر محی السنّت حکیم الامت مجدد الملّت مرشدی حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب قدس سرہٗ کے دربارِ گہربار میں رہا اس عرصہ میں احقر نے وقتاً فوقتاً خود اس کا مشاہدہ کیا کہ جب مسلمانوں پر کفار کے ظلم و ستم کا بیان ہوتا تو حضرت حکیم الامت پر ایک خاص کیفیت کا ورود مشاہدہ کیا جاتا آنکھیں سرخ نظر آنے لگتیں اور حاضرین کو بداہتاً محسوس ہوتا کہ حضرت بے چینی کے ساتھ کسی چیز کے متمنی اور کسی وقت کے منتظر ہیں۔

---

[1] بانی مجلس صیانۃ المسلمین پاکستان ۱۲۔

ایک بار قرب و جوار کے ایک مسلمان نے اپنی مستعدی کا اظہار کیا مسکرا کر فرمایا اگر ضرورت ہوئی تو تم سے جہاد کا کام لیں گے
اسی طرح ایک بار صوبہ سرحد کے ایک والی ریاست نے دوستانہ تعلقات کو وسیع کرنا چاہا تو حضرت نے اس سے عذر فرمایا مگر یہ بھی فرمایا کہ ہاں وقت آئے گا تو آپ سے جہاد کا کام لیا جائے گا۔ (آثار رحمت ص۱۶۷)

جہاد خواہ کسی نوع کا ہو اس کے لئے مرکز اور امیر کا ہونا بڑا ضروری ہے۔ جس کے لئے حضرت تھانوی بڑے متفکر تھے ۱۹۳۸ء میں جب زعمائے مسلم لیگ کے نام آپ کے تاریخی پیغام کا مسودہ تیار کیا گیا تو مسودہ تیار کرنے والے مولوی صاحب نے اس میں ایک فقرہ یہ بھی لکھ دیا تھا کہ لوگوں کو جب نماز روزہ کی ترغیب دی جاتی ہے تو مغرب زدہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ خالی نماز روزہ سے کیا ہوتا ہے۔؟

تو اس فقرہ کی تصحیح کرتے ہوئے آپ نے فرمایا۔

جیسے یہ غلط ہے کہ نماز روزہ کو کامیابی میں کیا دخل ہے اسی طرح یہ بھی صحیح نہیں کہ خالی نماز روزہ کامیابی کے لئے کافی ہے۔ بلکہ دلائل سے اس کے شاہد ہیں کہ خالی نماز روزہ سے کبھی کامیابی نہیں ہوئی ہے اور نہ ہو سکتی ہے بلکہ ایک دوسری چیز کی بھی ضرورت ہے وہ چیز قتال جہاد ہے

کیا مکہ میں نماز روزہ نہ تھا بھلا صحابہؓ سے بڑھ کر نماز روزہ کس کا ہو سکتا ہے مگر اس کے باوجود دیکھ لیجئے کہ مکہ کے اندر مسلمان اتنے دنوں تک رہے لیکن غلبہ نہ ہوا۔ جب ہجرت ہوئی قتال ہوا اس وقت غلبہ ہوا۔

تمام تاریخ اسلامی اٹھا کر دیکھ لیں کہیں اس کی نظیر نہ ملے گی۔ کہ خالی نماز روزہ سے مسلمانوں کو غلبہ ہوا ہو البتہ ضروری نماز روزہ بھی ہے غلبہ کی حیثیت سے نماز روزہ اور قتال میں فرق یہ ہے کہ نماز روزہ تو شرط ہے غلبہ کی، اگر نماز روزہ اور اطاعت ہوگی تو غلبہ ہوگا اور جہاد علت ہے غلبہ کی۔ گو نماز روزہ فرض عین ہے اور جہاد فرض کفایہ ہے مگر غلبہ کی علت جہاد ہی ہے پس ثابت ہوا کہ مسلمانوں کا غلبہ دونوں ہی چیزوں پر موقوف ہے۔ اور یہ میری رائے آج سے نہیں ہمیشہ سے ہے۔ کہ جب تک اطاعت کے ساتھ قتال نہ ہوگا اس وقت تک مسلمانوں کو فلاح میسر نہیں ہو سکتی۔ اور جہاد کے لئے مرکز ضروری ہے۔

دوسری چیز یہ ہے کہ کوئی امیر المومنین ہو اور جس کو امیر المومنین بنایا جائے تو اس کے اندر تین صفات ہوں۔

۱۔ ایک تدین یعنی وہ دیندار ہو

۲۔ دوسرے وہ سیاست سے واقف ہو۔ اور

۳۔ تیسرے اس کے اندر ہمت ہو۔

اب مشکل یہ ہے کہ بعض کے اندر تدیّن تو ہے مگر سیاست سے واقفیت نہیں اور بعض کے اندر ہمت نہیں۔

(آثار رحمت ص۱۰۷ تا ۱۰۸)

اسی بناء پر مولانا تھانوی رح مسلم لیگ کی تطہیر، قائداعظم اور اکابرین لیگ میں تدیّن پیدا کرنا چاہتے تھے کہ حضرت کے خیال کے بموجب قائداعظم کے اندر سیاست بھی تھی اور ہمت بھی لیکن تدیّن کی کمی تھی جسے پورا کرنے کی خاطر آپ نے ان کو دین کی تبلیغ و تعلیم کی کوشش فرمائی۔

حضرت تھانوی رح کو فراستاً معلوم ہو گیا تھا کہ پاکستان ایک نہ ایک دن معرضِ وجود میں آکر رہے گا۔ جس کے حصول کا سہرا قائداعظم کے سر ہو گا۔

لیکن چونکہ وہ انگریزی ماحول میں تعلیم و تربیّت پانے کی وجہ سے دینی تعلیم سے کماحقہٗ واقف نہ تھے اور نہ ہی ان کے رفقاءِ کار دیندار قسم کے لوگ تھے۔ اس لئے مولانا تھانوی نے محسوس کیا کہ جنگِ پاکستان لڑنے والے زعمائے لیگ کو دین کی تبلیغ اور کتاب و سنت کی اتباع کی تلقین کی جائے اس غرض سے علماء[1] کا ایک تبلیغی وفد قائداعظم کے پاس بھیجا جس نے یہ فریضہ حُسن و

---

[1] ۔ اس تبلیغی وفد کے شرکاء مولوی شبیر علی فاروقی، مولانا ظفر احمد عثمانی تھے

خوبی انجام دیا۔

مئی ۱۹۳۸ء کا ذکر ہے کہ حضرت تھانوی نے مولوی شبیر علی فاروقی مہتمم خانقاہِ امدادیہ کو بلایا اور فرمایا۔

میاں شبیر علی ہوا کا رخ بتا رہا ہے کہ لیگ والے کامیاب ہو جائیں گے اور بھائی جو سلطنت ملے گی وہ انہی لوگوں کو ملے گی جن کو آج سب فاسق و فاجر کہتے ہیں مولویوں کو تو ملنے سے رہی لہٰذا ہم کو یہ کوشش کرنا چاہیئے کہ یہی لوگ دیندار بن جائیں اور بھائی آج کل کے حالات ایسے ہیں کہ اگر سلطنت مولویوں کو مل بھی جائے تو شاید مولوی چلا بھی نہ سکیں۔ یورپ والوں سے معاملات ساری دنیا سے جوڑ توڑ ہمارے بس کا کام نہیں اور سچ تو یہ ہے کہ سلطنت کرنا دنیا داروں ہی کا کام ہے۔ مولویوں کو یہ کرسیاں اور تخت زیب بھی نہیں دیتا اگر تمہاری کوشش سے یہ لوگ دیندار اور دیانتدار بن گئے اور پھر سلطنت انہی کے ہاتھ میں رہی تو چشمِ ما روشن دلِ ما شاد۔ کہ ہم خود سلطنت کے طالب نہیں ہم کو صرف یہ مقصود ہے کہ جو سلطنت قائم ہو وہ دیندار اور دیانتدار لوگوں کے ہاتھ میں ہو تاکہ اللہ کے دین کا بول بالا ہو۔

(تعمیر پاکستان اور علمائے ربانی ص۲۶)

یہ سن کر مولوی شبیر علی فاروقی نے عرض کیا کہ حضرت پھر تبلیغ نیچے کے طبقہ یعنی عوام سے شروع ہو یا اوپر کے طبقے یعنی خواص سے؟

اس پر ارشاد فرمایا۔

اوپر کے طبقے سے کیونکہ وقت کم ہے خواص کی تعداد بھی کم ہے اور الناس علیٰ دین ملوکہم۔ کے بموجب اگر خواص دیندار اور دیانتدار بن گئے تو انشاء اللہ تعالیٰ عوام کی بھی اصلاح ہو جائے گی۔ (تعمیر پاکستان اور علمائے ربانی ص۷۰)

حضرت تھانوی کے وصال کے تقریباً ۴۔ برس بعد پیرالٰہ آباد کا تخیل، مجذوب کی بڑ، اور۔ دیوانے کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا۔ بلاشبہ تشکیل پاکستان کا معجزانہ واقعہ برصغیر کی تاریخ میں جدو جہد آزادی کا ثمر اور حوادثِ روزگار کا ایک شاندار اور نادر باب تھا جس پر مسلم قوم بجا طور پر مفتخر تھی۔

کتابیات

نقوش و تاثرات	سیرت اشرف
افادات اشرفیہ	تذکرۃ الظفر
اشرف السوانح	آثار رحمت۔

مقالہ نمبر ۲۸
حکیم الامت حضرت تھانوی رح
پاکستان کے اولین خواہاں
اور
قائد اعظم رح کے خصوصی معاون
جناب منشی عبدالرحمن خان مرحوم ملتان

پاکستان کے اوّلین خواہاں اور قائداعظمؒ کے خصوصی معاون

حکیم الامّت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ

اشرف العلماء قطب الارشاد، حکیم الامّت، مجدّد الملّت، علوم ظاہری و باطنی کے مخزن، علوم و فضل کے معدن، امور شریعت و اسرار طریقت کے دفتر تقویٰ و طہارت، رشد و ہدایت کے پیکر، بے مثال فقیہہ، عدیم النظیر مفسّر، بلند پایہ محدّث، بابصیرت متکلم، اتباع سنّت کا درس مجسّم، گوشہ نشین درویش، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، مولانا محمد یعقوب نانوتوی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا شیخ محمد تھانوی کی آخری یادگار اور قائدِ اعظمؒ کے ممد و معاون حضرت مولانا اشرف علی تھانوی ان علماء سلف میں سے تھے۔ جن کی زبان شریعت و طریقت کی وحدت کی ترجمان تھی۔ جن کے قلم نے فقہ و تصوّف کی ہنگامہ آرائی کو ختم کر کے ہم آغوش کر دیا ہے۔ جو حضرت مجدّد الف ثانیؒ اور حضرت سیّد احمد بریلوی شہیدؒ کی پشتوں میں سے تھے۔ جو اپنی تعلیم و تربیت اور تزکیہ و ہدایت سے نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک عوام و خواص کو مستفید و مستفیض فرماتے رہے جن کا آستانہ معرفت و روحانیت کا ایک ایسا صاف و شفاف سرچشمہ تھا۔ جس سے ہزاروں تشنہ کام سیراب ہو کر جاتے رہے۔ جن کی زندگیاں معصیت کوش اور عصیاں آلود ہو چکی تھیں۔ وہ یہیں سے پاک و صاف ہو کر

ان کو ہر مقصود سے دامن بھر کر جاتے رہے۔ آپ ان خوش قسمت انسانوں میں سے تھے۔ جو صدیوں بعد پیدا ہوتے ہیں۔ اور صدیوں کے لیے سرمایہ عبرت بصیرت چھوڑ جاتے ہیں۔ آپ کوئی "نوتنی دکان" نہیں لگاتے آئے تھے، بلکہ اس خفتہ بخت قوم کو دشتِ عرب کے ایک امّی صلی اللہ علیہ وسلم کا صرف یہ ارشاد گرامی یاد دلانے آئے تھے کہ:

"حقیقت میں ترقی، جس کی اس وقت دم بدم پکار ہے اُونچے محلوں بھرے خزانوں، بیش قیمت لباسوں، گراں بہا سامانوں، بڑی بڑی تجارتوں، اعلیٰ ملازمتوں، اونچی اونچی تنخواہوں، شاہانہ احتراموں اعزازوں اور خطابوں کا نام نہیں، بلکہ اللہ کے احکام کی تعمیل کے ساتھ بلند اخلاق، شریف عادات، اور پاک و صاف قلب کا نام ہے جو آب و گل سے وابستہ اور فانی کا طالب نہ ہو، اور حُبِ مال و حُبِ جاہ کا گرویدہ نہ ہو۔ جس میں اخلاق کے ساتھ خالق کی رضا کے لیے خدمتِ خلق کا جذبہ ہو۔"

(جامع المجددین ص ۲۹)

آپ نے اپنی ساری عمر حضورؐ کے اسی پیغام کو عام کرنے میں لگادی۔ اور اس غرض کے لیے ایک دو نہیں، دس بیس نہیں، سو دو سو نہیں بارہ سو سے اوپر کتابیں لکھ کر چھوڑ گئے۔ اور اپنا کوئی حقِ تصنیف و تالیف محفوظ نہ رکھا۔ تاکہ جس کا جی چاہے، انہیں چھپوائے۔ لوگوں تک پہنچائے۔ اور اسی دنیا میں لاکھوں کا نفع پائے اور اسطرح دوسروں کو دنیا کمانے کا راستہ بتا گئے اور اپنا سرمایۂ آخرت

بڑھا گئے۔

متحدہ ہندوستان میں سب سے پہلا پاکستان حضرت تھانویؒ کے اجداد میں سے حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کے رفیق سید اسماعیل شہیدؒ نے انگریزوں اور سکھوں کے خلاف جہاد کر کے سرحد میں جو چھوٹا سا علاقہ حاصل کیا تھا اس میں قائم کیا۔ اس میں:

"انہوں نے ٹھیک اسی طرز کی حکومت قائم کی جس کو خلافت علیٰ منہاج النبوت کہا گیا ہے۔ وہی فقیرانہ انداز، وہی مساوات، وہی شوریٰ، وہی عدل وانصاف، وہی حدود شرعیہ، وہی مال کو حق کے ساتھ لینا، اور حق کے مطابق صرف کرنا، وہی مظلوم کی حمایت، اگرچہ ضعیف ہو، اور ظالم کی ممانعت اگرچہ قوی ہو، وہی خدا سے ڈر کر حکومت کرنا۔ اخلاق صالحہ کی بنیاد پر سیاست چلانا غرض ہر پہلو میں انہوں نے اس حکمرانی کا نمونہ ایک مرتبہ پھر تازہ کر دیا۔ جو کبھی صدیق و فاروق نے کی تھی۔"

(تجدید احیائے دین ص ۷۶، ۷۷)

حضرت تھانویؒ بھی متحدہ ہندوستان میں ویسا ہی پاکستان قائم کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ جون ۱۹۲۸ء میں جب مولانا حسین احمد مدنیؒ اور مولانا عبدالماجد دریابادیؒ حضرت تھانویؒ کی خدمت میں تھانہ بھون پہنچے تو سب سے پہلے پاکستان کا وہیں تذکرہ آیا۔ اور حضرت تھانویؒ نے ہی اس کا صحیح نقشہ ان حضرات کے سامنے کھینچا۔ جس کی بناء پر مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے لکھا کہ:

"پاکستان کا تخیل خالص اسلامی حکومت کا خیال۔ یہ سب آوازیں
بہت بعد کی ہیں۔ پہلے پہل اس قسم کی آوازیں یہیں کان میں پڑیں۔ حضرت
کی گفتگو میں یہ جزو بالکل صاف تھا"

(نقوش و تاثرات ص ۲۳)

راقم کی درخواست پر "جزو" مذکور کی مولانا دریابادی نے ان الفاظ میں
وضاحت فرمائی:

"حضرت تھانوی رح کو بعض معاصر علماء کی طرح "جنگِ آزادی"
"جنگِ حقوق"، "آزادیٔ وطن" وغیرہ سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ ان
کے سامنے مسئلہ سیاسی نہیں، تمام تر دینی تھا۔ وہ صرف اسلام کی حکومت
چاہتے تھے۔ ۱۹۲۸ء میں پہلی بار حاضری ہوئی تو اس ملاقات میں
حضرت نے دارالاسلام کی سکیم خاصی تفصیل سے بیان فرمائی تھی۔ کہ جی
یوں چاہتا ہے کہ ایک خطہ پر خالص اسلامی حکومت ہو۔ سارے قوانین
تعزیرات وغیرہ کا اجراء، احکام شریعت کے مطابق ہو، بیت المال
ہو، نظام زکوٰۃ رائج ہو، شرعی عدالتیں قائم ہوں۔ مگر یہ سارے کام خالصتاً
فقہ کے مطابق علی منہاج الخلافۃ ہوں نہ کہ خود ساختہ متجددین کی ناقص
وغلط آراء کے موافق۔ وقس علی ہذا۔ دوسری قوموں کے ساتھ مل کر کام
کرنے سے یہ نتائج کہاں حاصل ہو سکتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے
تو صرف مسلمانوں ہی کی جماعت ہونی چاہیئے اور اس کو یہ کوشش
کرنی چاہیئے۔" (انداز سخن ص ۲۱۰)

ہندوستان کے ساحلی علاقہ کے ہندو راجاؤں کے عہدِ حکومت میں مسلمانوں کی آمد کے بعد ادران کے مقدمات کا فیصلہ کرنے کے لیے مسلمان حاکم مقرر کر دیئے گئے تھے۔ کیونکہ مسلمان اور کسی کا فیصلہ تسلیم نہ کرتے تھے۔ حضرت تھانویؒ بھی ہندوستان میں مسلمانوں کے معاملات کا شریعت کے مطابق فیصلہ کرانا چاہتے تھے۔ چنانچہ اس غرض کے لیے سب سے پہلے آپ نے ہندوستان میں قاضیوں کے تقرر کی تحریک شروع کی۔ حضرت حافظ محمد احمد مہتمم دارالعلوم دیوبند کے توسط سے ممبران اسمبلی کونسل، مسٹر مانٹیگو وزیر ہند اور سائمن کمشن کے سامنے یہ سوال پیش کیا گیا۔

آپ کے ایماء پر میرٹھ میں انجمن "نصب القضا" قائم ہوئی۔ اس نے رسالہ "القول الماضی" شائع کر کے لوگوں کو اس طرف توجہ دلائی اور ۱۹۲۹ء میں اس غرض کے لیے دہلی میں ایک جلسہ منعقد ہوا۔ جس میں تمام ممبران اسمبلی، ممتاز علماء دیوبند و سہارنپور، حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیری، مولانا محمد علی جوہر اور حضرت تھانویؒ کی طرف سے مولانا عبدالکریم گمتھلویؒ شریک ہوئے۔ یہ سوئے پاکستان کی طرف پہلا عملی اقدام تھا۔ جو حضرت تھانویؒ کی خاموش مساعی سے اٹھا۔ اس کے بعد حضرت تھانویؒ نے پنجاب کا قانونِ رواجِ عام بدلوانے اور شرعاً وراثت دلوانے کی مہم شروع کی۔ اس کے لیے آپ خود تھانہ بھون سے لاہور تشریف لائے۔ "غضب المیراث" کے نام سے اس تحریک کے لیے ایک رسالہ لکھا اور اسے اپنے خرچ سے شائع کرا کر مسلمانوں کو اس شرعی حق کے حصول کی خاطر اس مہم کو چلانے کی تحریک کی اور اس غرض کے لیے آپ نے پنجاب میں تحریک چلانے کے لیے

اپنے خلیفہ مولانا عبدالمجید بچھرایونی کو مولانا عبدالکریم گمتھلویؒ کے ہمراہ لاہور بھیجا اور "تحریک عدل فی المیراث" چلائی۔

۱۹۳۰ء میں حضرت تھانویؒ نے نواب جمشید علی خان ممبر لیجسلیٹو اسمبلی، حافظ ہدایت حسین بیرسٹر ممبر کونسل آف سٹیٹ اور حاجی وجیہہ الدین ممبر اسمبلی سے پانچ گھنٹہ کی بحث وتمحیص کے بعد اس بات کی تحریک ان سے چلوائی کو مسلمانوں کے اوقاف کے انتظامی معاملات میں غیر مسلم حکومت کو دخیل نہیں ہونا چاہیئے۔ اور ان کے ایسے دخل کو مذہبی دست اندازی قرار دیا۔ یہ سوئے پاکستان حضرت تھانویؒ کا دوسرا عملی قدم تھا۔

دسمبر ۱۹۳۰ء میں ڈاکٹر محمد اقبالؒ نے اپنے الہ آباد کے خطبہ تاریخی میں حضرت تھانویؒ کی ہی دلی خواہش کو کہ ہندوستان کے اندر ایک خطہ پر اسلامی حکومت قائم ہونی چاہیئے۔ ایک تحریک کی صورت دے دی جس کے لیے مسلم لیگ میدانِ عمل میں نکلی اور قائداعظم کی زیر قیادت اس مقصد کے حصول کے لیے سرگرم عمل ہو گئی طبقہ علماء میں سے قائدِ اعظمؒ کی اور مسلم لیگ کی سب سے پہلے مولانا اشرف علی تھانویؒ نے تائید کی اور اس کے لیے متعدد اہم اقدامات کیے۔ تاجرانِ بمبئی کے ایک وفد نے قائداعظم سے دورانِ ملاقات سوال کیا کہ آپ کی تحریک پاکستان کو علمائے ہند کی تائید حاصل نہیں۔ تو قائدِ اعظم فوراً اُٹھ کر دوسرے کمرے میں گئے اور ایک فائل لا کر اس وفد کے سامنے رکھ دی کہ آپ پہچانتے ہیں کہ یہ کن کے خطوط ہیں۔ تو وہ وفد یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ تو حضرت تھانویؒ کے آپ کے نام خطوط تھے، اس پر قائدِ اعظم نے جوش کے لہجہ میں فرمایا کہ:

"تم کن کو علماء سمجھتے ہو؟ انہوں نے مولانا حسین احمد صاحب مدنی رح مولانا مفتی کفایت اللہ اور مولانا ابوالکلام آزاد کا نام لیا۔ قائد اعظم رح نے فرمایا کہ مولانا حسین احمد عالم ہیں مگر ان کی سیاست ایک ہی ہے کہ انگریزوں کے دشمن ہیں۔ اس دشمنی میں وہ مسلمانوں کے مفاد کی رعایت نہیں کرتے۔ مولانا کفایت اللہ صاحب واقعی مفتی ہیں۔ اور کچھ سیاست دان بھی۔ لیکن ابوالکلام نہ عالم ہے نہ سیاست دان ہے مسلم لیگ کے ساتھ ایک بہت بڑا عالم ہے۔ جس کا علم و تقویٰ ایک پلڑے میں رکھا جائے تو اس کا پلڑا بھاری ہو گا۔ مولانا اشرف علی تھانوی رح ہیں۔ جو چھوٹے سے قصبے میں رہتے ہیں۔ مسلم لیگ کو ان کی حمایت کافی ہے۔ اور کوئی موافقت کرے یا نہ کرے ہمیں پرواہ نہیں۔"

(تعمیر پاکستان اور علماء ربانی ص ۹۶)

حضرت تھانوی رح کے سلسلہ کے نامور علماء علامہ شبیر احمد عثمانی رح مولانا ظفر احمد عثمانی رح، مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی وغیرہ نے حضرت کے ایماء پر تحریک پاکستان میں جو سرگرمی دکھائی وہ کسی سے مخفی نہیں۔ حق تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے حضرت تھانوی رح کی دلی خواہش ان کی وفات کے بعد پوری کردی۔ جناب قائد اعظم رح کی مساعی جمیلہ سے ہندوستان کے اندر اسلامی حکومت قائم کرنے کے لیے ایک وسیع و عریض خطہ زمین عطا کیا۔ جس کا نام پاکستان رکھا گیا۔ مگر (؟) میں آج تک نہ اسلامی تعزیر جاری ہو سکیں اور نہ قرآنی حکومت قائم ہو سکی۔ جو بھی اس میں برسراقتدار آیا وہ چونکہ انگریزی تہذیب و تعلیم کا دلدادہ تھا۔ اس لیے اس نے اسلام سے ہٹ کر انگریزی عہد کے

طور طریقوں پر کام چلایا اور زیادہ تر توجہ اپنے اقتدار کے تحفظ پر صرف کرتا رہا۔ کسی نے پاکستان میں "اسلام آباد" قائم کر کے کسی نے جوا، شراب پر پابندی عائد کر کے اور اتوار کی بجائے جمعہ کو چھٹی کر کے بزعم خود یہاں اسلامی حکومت قائم کرنے کا نعرہ لگانے پر اکتفا کر لیا۔ کسی خود ساختہ آئین کو اسلامی آئین کہہ دینے سے وہ اسلامی آئین نہیں بن سکتا تاوقتیکہ وہ کتاب و سنّت کے سانچے میں ڈھلا ہوا نہ ہو۔ اس لیے حضرت تھانوی کی خواہش اس حد تک تو پوری ہو گئی کہ شرعی احکام کے اجرار کے لیے ایک خطۂ زمین مل گیا۔ مگر یہاں صحیح معنوں میں نظامِ الٰہی اسلامی نظام جب تک جاری نہ ہو اس وقت تک حضرت تھانوی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

مقالہ نمبر ۲۹

تحریک پاکستان

اور

دار العلوم دیوبند کے اکابر

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

اور

حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

جناب مقبول جہانگیر صاحب (مرحوم)
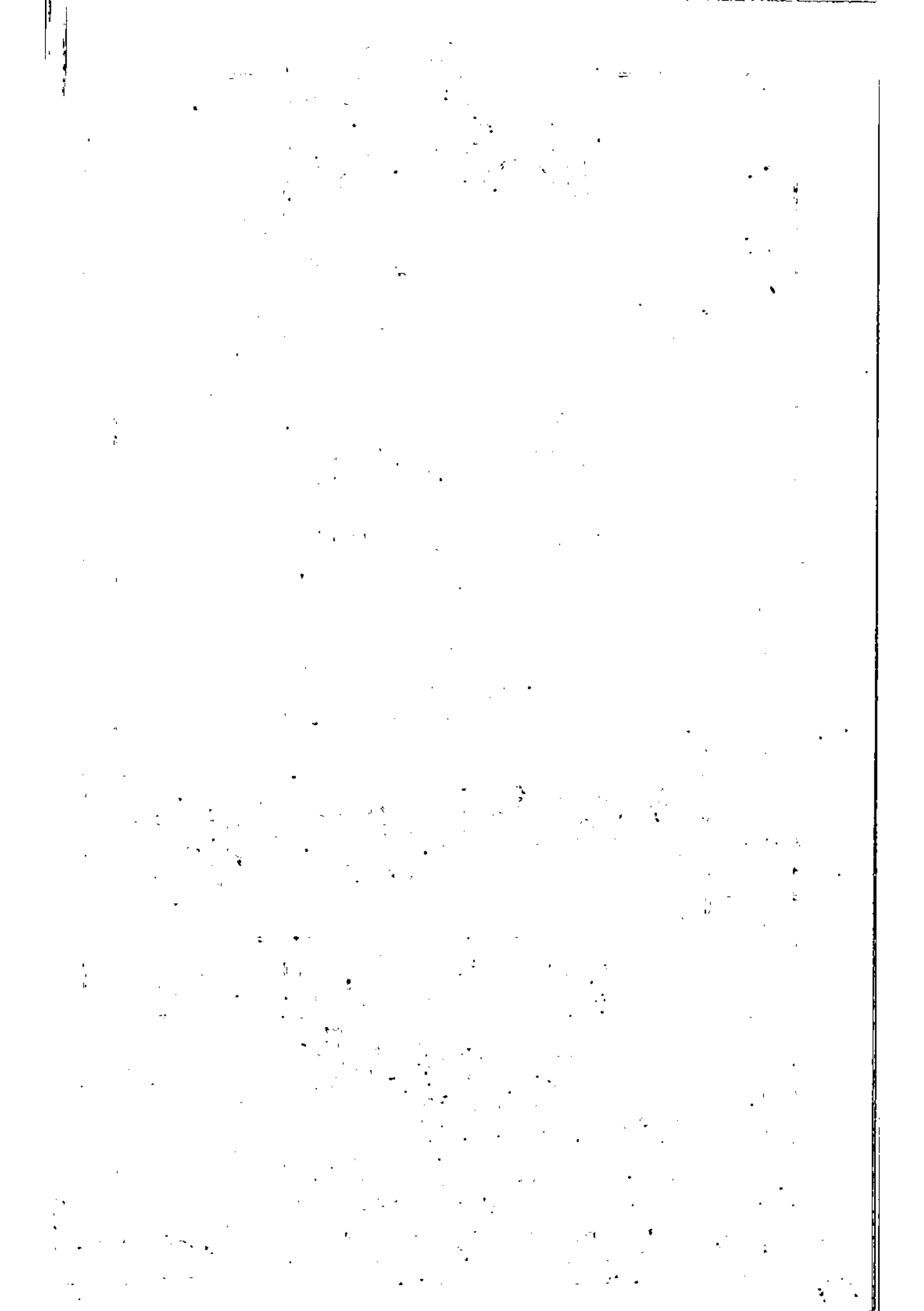
تحریکِ پاکستان میں دارالعلوم کے اکابر حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اور علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے

بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا!

اکابر دیوبند میں جن بزرگوں نے تحریکِ پاکستان اور مسلم لیگ کی حمایت میں سب سے قوی اور اہم آواز بلند کی، وہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمۃ کی آواز تھی۔

حضرت مولانا کا طبعی میلان یکسوئی کے ساتھ تصنیف و تالیف، تعلیم و تربیت اور اصلاحِ امت و ہدایتِ خلق کی طرف تھا، اس لیے عملی طور پر سیاسی اور ملکی تحریکوں میں براہِ راست حصّہ لینے کی نوبت نہ آئی اور نہ آپ کسی سیاسی جماعت سے منسلک ہوئے، البتہ جب کبھی ملک میں کوئی سیاسی تحریک شروع ہوئی، اس کے بارے میں ایک ماہرِ شریعت عالمِ دین ہونے کی حیثیت سے اس کی شرعی حیثیت پر فقیہانہ نظرِ بصیرت ڈال کر نتائج و عواقب واضح کرنے اور ملّت کی علمی اور دینی راہنمائی کا فریضہ ادا کرنے میں کبھی دریغ نہ فرمایا۔

آل انڈیا نیشنل کانگریس شروع میں ایک اعتدال پسند جماعت تھی لیکن بعد میں ظاہر ہو گیا کہ اس کی کارروائیوں سے مسلمانوں کے مفادات کو زبردست نقصان پہنچ سکتا ہے۔ سر سید احمد خاں مرحوم پہلے آدمی تھے جنہوں نے اعلانیہ کانگریس

کی مخالفت کی اور مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ اس سے الگ رہیں اور اپنے آپ کو تعلیم کے لیے وقف کر دیں۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ کا مشورہ بھی یہی رہا اور ان کی دلیل یہ تھی کہ کانگریس میں چونکہ اکثریت غیر مسلموں کی ہے۔ اس لیے اس جماعت کی اصلاح ناممکن ہے۔ حضرت کے خیال میں کانگریس کی مقبولیت کی اصل وجہ یہ تھی کہ مسلمان اس میں شریک تھے فرمایا:

"ہندوؤں کی پچاس سالہ مردہ کانگریس کو مسلمانوں نے زندہ کیا۔ جب تک مسلمانوں نے شرکت نہ کی تھی۔ کسی نے کانگریس کا نام بھی نہ سنا تھا۔ اگر خدانخواستہ یہ جماعت ہندوستان میں برسر اقتدار آگئی تو یہ بھی ہندوستان میں وہی کرے گی جو بالشویک کر رہے ہیں۔"

اس زمانے میں جمعیت العلمائے ہند کا اجلاس دہلی میں ہوا۔ مولانا تھانویؒ کو بھی شرکت کی دعوت ملی۔ جواب میں تحریر فرمایا:

"واقعات نے مجھ کو اس رائے پر بہت پختہ کر دیا ہے، کہ مسلمانوں خصوصاً علماء کا کانگریس میں شریک ہونا میرے نزدیک مذہباً مہلک ہے بلکہ کانگریس سے بیزاری کا اعلان کر دینا بہت ضروری ہے۔ علماء کو خود مسلمانوں کی تنظیم کرنی چاہیے۔ اور مسلمانوں کا کانگریس میں داخل ہونا اور داخل کرنا میرے نزدیک ان کی اپنی موت کے مترادف ہے۔ بعض اہل علم فرماتے ہیں کہ ہم کانگریس میں شرکت اس وجہ سے کرتے ہیں کہ اس پر مسلمانوں کا قبضہ ہو جائے اور ہمارا غلبہ

ہو، اگر مقصود واقعی یہ ہے۔ تو اس کا حصول مسلم لیگ میں زیادہ آسان ہے کیونکہ مسلم لیگ والے اتباع کے لیے آمادہ ہیں۔ چنانچہ مسلم لیگ کے بڑے بڑے ارکان نے مجھے لکھا ہے کہ ہم حضراتِ علماء کی رائے کے اتباع کے لیے تیار ہیں اور کانگریسی تو خود اپنا تابع بناتے ہیں۔ ان پر غلبہ پانا مشکل ہے۔"

پاکستان کا اوّلین نقشہ:

مولانا عبدالماجد دریا بادیؒ راوی ہیں کہ حضرت تھانویؒ کو بعض معاصر علماء کی طرح جنگِ آزادی، جنگ حقوقِ آزادی وطنی وغیرہ سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ان کے سامنے مسئلہ سیاسی نہیں، تمام تر دینی تھا، وہ صرف اسلام کی حکومت چاہتے تھے۔ ۱۹۲۸ء میں جب پہلی بار حاضری ہوئی تو اس ملاقات میں حضرت نے دارالسلام کی اسکیم خاصی تفصیل سے بیان فرمائی تھی کہ جی یوں چاہتا ہے ایک خطّے پر خالص اسلامی حکومت ہو، سارے قوانین تعزیرات وغیرہ کا اجراء احکام شریعت کے مطابق ہو، بیت المال ہو، نظام زکوٰۃ رائج ہو، شرعی عدالتیں قائم ہوں وغیرہ۔ دوسری قوموں کے ساتھ مل کر کام کرتے ہوئے یہ نتائج کہاں حاصل ہو سکتے ہیں؟ اس مقصد کے لیے صرف مسلمانوں ہی کی جماعت ہونی چاہیئے۔ اور اسی کو یہ کوشش کرنی چاہیئے۔

گویا خانقاہِ امدادیہ تھانہ بھون میں بوریہ نشین اس مردِ درویش نے حصول و بقائے پاکستان کا لائحہ عمل اور نظام پاکستان کا نقشہ اس وقت پیش کیا جب پاکستان چاہنے والوں کو اس کا خواب وخیال بھی نہ تھا۔ اس زمانے میں صدر جمعیۃ علمائے ہند

مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب، حضرت تھانویؒ سے مسائلِ حاضرہ پر گفتگو کرنے تشریف لائے۔ حضرت نے ہندوؤں کے ساتھ مل کر کام کرنے سے کراہت کا اظہار کیا:

"احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود کو اپنے ساتھ جہاد میں لیا ہے۔"

حضرت تھانوی نے اس کا جو جواب دیا وہ مولانا ظفر احمد عثمانی مرحوم کے الفاظ میں کچھ یوں تھا: فرمایا

"کفار اور مشرکین کو آپ جہاد میں اس وقت لے سکتے ہیں کہ جھنڈا مسلمانوں کا رہے اور کفار ہمارے حکم کے تحت ہوں، اس وقت حالت برعکس ہے۔ کانگریس میں ہندوؤں کا غلبہ ہے اور انہی کا حکم غالب ہے۔"

غرض حضرت تھانویؒ ہمیشہ سے مسلمانوں کی الگ تنظیم کے رہے۔ حتیٰ کہ جب تک مسلم لیگ نے کانگریس کا ساتھ دیا اس وقت تک حضرت نے مسلم لیگ کا ساتھ نہیں دیا۔ اور جب مسلم لیگ کانگریس سے علیحدہ ہوئی تب حضرت نے علانیہ مسلم لیگ کی حمایت فرمائی۔ مسلم لیگ نے کانگریس کے علیحدہ ہونے کے بعد پہلا الیکشن جھانسی کے علاقے میں لڑا تھا۔ وہاں کے مسلمانوں نے تار کے ذریعے حضرت تھانویؒ سے پوچھا کہ مسلم لیگ اور کانگریس دونوں میں سے کس کو ووٹ دیا جائے؟ اس وقت تک حضرت کا ذہن مسلم لیگ کی حمایت کے بارے میں واضح نہ تھا بلکہ یہ خدشہ محسوس کرتے تھے کہ یہ لوگ کہیں مصطفےٰ کمال پاشا کی طرح دین کو مسخ نہ کردیں،

اس لیے تار کا جواب دینے میں تامل تھا۔ آخر آپ کے بھانجے مولانا ظفر احمد عثمانی نے مشورہ دیا:

"آپ کانگریس کی حمایت کے خلاف تو ہیں ہی، تامل صرف مسلم لیگ کی حمایت کرنے میں ہے، اس لیے آپ یہ جواب دے دیں کہ کانگریس کو ووٹ نہ دیا جائے۔"

یہ جواب حضرت نے پسند فرمایا اور اسی مضمون کا جوابی تار روانہ کر دیا گیا۔ نتیجہ یہ کہ مسلم لیگ کامیاب ہو گئی۔

الیکشن میں مسلم لیگ کی کامیابی کی خوشخبری دینے کے لیے مولانا شوکت علی مرحوم اپنے چند ساتھیوں کو لے کر تھانہ بھون آئے۔ انہوں نے بتایا کہ ہم نے حضرت تھانویؒ کے جوابی تار کو فتوے کی صورت میں چھپوا کر بڑی تعداد میں تقسیم کرایا اور جگہ جگہ چسپاں کیا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ جو لوگ کانگریس کو ووٹ دینے آتے تھے، وہ بھی یہ فتویٰ دیکھ کر مسلم لیگ کو ووٹ دیتے تھے۔

مولانا تھانوی کا فتویٰ مسلم لیگ کی حمایت میں:

جب کانگریس میں مسلمانوں کے بلا شرط داخلے سے خطرناک نتائج و عواقب تقریباً سامنے آ گئے، تو حضرتِ تھانویؒ نے مسلم لیگ کی حمایت اور شرکت کی رائے دی۔ آپ کا فتویٰ بنام تنظیم المسلمین شائع ہوا۔ یہ فتویٰ ۹ ذی الحجہ ۱۳۵۶ھ بمطابق ۱۰ فروری ۱۹۳۸ء کا تحریر شدہ ہے۔ اس کے ساتھ ہی مسلم لیگ کی دینی حالت درست کرنے کو حضرت تھانویؒ مختلف اوقات اور مختلف مقامات میں مسلم لیگ کے زعماء کے

پاس اپنی طرف سے وفود بھیجتے رہے۔ مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس پٹنہ منعقدہ ۲۶ دسمبر ۱۹۳۸ء کو حضرت نے ایک تبلیغی وفد روانہ کیا۔ اس وفد نے قائدِ اعظمؒ کو نماز کی تلقین کی۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ مسلم لیگ کا اجلاس دو بجے یہ کہہ کر ملتوی کر دیا گیا کہ سب صاحب نماز پڑھیں۔ قاضیٔ شہر کی امامت میں قائدِ اعظم سمیت کوئی ایک لاکھ افراد نے نماز ادا کی۔ مولانا ظفر احمد عثمانیؒ اس وفد کے امیر تھے۔ اور حضرت تھانوی کی ہدایت کے مطابق انھوں نے قائدِ اعظم سے ملاقات میں کہا کہ مسلمان ایک دینی قوم ہے جب تک دین کو سیاست سے نہ ملایا جائے گا، کامیابی نہ ہوگی۔ آپ بھی مسلم لیگ کو دین میں شامل کریں۔ قائدِ اعظم نے یہ خیال ظاہر کیا کہ سیاست کو دین سے علیحدہ ہی رکھنا چاہیئے۔ مولانا ظفر احمد نے جواب دیا:

"یہ تو یورپ کی سیاست ہے اسلامی سیاست یہ ہے کہ خلیفۂ اسلام قائدِ حرب بھی تھا اور نماز کا امام بھی۔ جب تک مسلمان، مسلمان رہے یہی صورت رہی اور جب سے سیاست نے دین کو چھوڑا، مسلمانوں کا تنزل شروع ہوگیا۔ ترکی کے مصطفٰے کمال نے دین کو چھوڑا تو سلطنت مختصر ہو کر رہ گئی۔ افغانستان کے امان اللہ خان نے دین کو خیرباد کہا تو اُسے قوم نے الگ کر دیا۔"

قائدِ اعظم پر ان کلمات کا یہ اثر ہوا کہ اگلے دن کھلے اجلاس میں اعلان کر دیا:

"اسلام عقائد و عبادات، معاملات، اخلاق اور سیاست کا مجموعہ ہے، قرآن مجید نے سب کو ساتھ ساتھ بیان کیا ہے۔ اس لیے سیاست کے ساتھ دین کو بھی لینا چاہیئے۔"

قائداعظم کی یہ تقریر دہلی کے اخبار "الامان" نے اس شہ سرخی کے ساتھ شائع کی تھی:

"مولانا حکیم الامّت تھانویؒ کی روحانیت کی تاثیر اور قائداعظم کی تقریر"

اکابر دیوبند میں سے دوسرے بزرگ حضرت علّامہ شبیر احمد عثمانی علیہ الرحمۃ ہیں جن کی مساعی تحریک پاکستان کے ضمن میں اتنی وقیع اور گراں بہا ہیں کہ کوئی مورّخ ان کا تذکرہ کیے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اس ضمن میں یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ تحریک پاکستان میں شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے ساتھ ساتھ بے شمار تلامذہ نے بھی شب و روز کام کیا۔ یہ تلامذہ برِّصغیر پاک و ہند کے چپّے چپّے پر پھیلے ہوئے تھے ان سب کا نام بنام تذکرہ کیا جائے تو بلاشبہ ایک عظیم دفتر مرتب ہو سکتا ہے۔ واقعہ ہے کہ جب تک علّامہ عثمانی مسلم لیگ کی حمایت اور سرپرستی فرماتے رہے الیگ زندہ اور متحرک رہی، لیکن قائداعظم اور علّامہ عثمانی کی وفات حسرتِ آیات کے بعد مسلم لیگ جس رفتار سے تنزّل کا شکار ہوئی، یہ امر کسی تفصیلی بحث کا محتاج نہیں۔

جو حضرات دارالعلوم دیوبند کے فیض یافتہ ہیں اور جنہوں نے برِّصغیر کے دینی و علمی حلقوں میں بلکہ تمام عالمِ اسلام میں نام پیدا کیا۔ ان میں علّامہ شبیر احمد عثمانی کا نام نامی نمایاں ہے۔ ان کی ذاتِ ستودہ صفات ایسی ہے جس پر ملّتِ اسلامیہ ناز کر سکتی ہے۔ علم فقہ، تفسیر، حدیث، حدیث معانی، فلسفہ، منطق، علم معانی، اور علم کلام، غرض کوئی فن ایسا نہیں ہے جس میں حضرت علّامہ عثمانیؒ نے اپنی بے مثال قابلیت کے جوہر نہ دکھائے ہوں۔ فنِ تقریر میں خداداد ملکہ تھا۔ مشکل سے مشکل اور ادق سے ادق مسائل کو چند

جملوں میں پانی کر دینا آپ ہی کا حصہ تھا، اُردو، فارسی، عربی زبانوں میں تحریر و تقریر پر بلا تکلف قادر تھے۔ حضرت علامہ سیّد محمد انور شاہ صاحب کشمیریؒ فرماتے تھے:

"مولانا شبیر احمد عثمانی اس زمانے کے محدث، مفسر اور متکلم ہیں احقر کے علم میں کوئی شخص حدیث کی خدمت ان سے زیادہ اور بہتر اور برتر نہ کر سکا۔ مولانا موصوف نے اہلِ علم کی گردنوں پر احسان کیا ہے۔"

علامہ عثمانی کی سیاسی خدمات:

۱۹۱۱ء جنگِ بلقان و طرابلس کے موقع پر علامہ عثمانی نے سیاسیات میں حصہ لینا شروع کیا اور جمعیۃ الانصار ہند کے سربراہ کی حیثیت سے بلقان اور طرابلس کے مصیبت زدہ مسلمانوں کی بہت مالی مدد کی ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۸ء تک تحریکِ خلافت میں شرکت کی اور خلافتِ عثمانیہ کی بحالی کے لیے شب و روز کام کیا ۱۹۱۹ء میں جمعیۃ علمائے ہند کا قیام عمل میں آیا مجلسِ عاملہ کے رکن کی حیثیت سے علامہ عثمانی نے ۱۹۲۰ء میں دہلی کے ایک عظیم الشان جلسے سے خطاب فرمایا جو ترکِ موالات کے سلسلے میں پہلا قدم تھا۔ اس جلسے کی صدارت حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن نے فرمائی تھی۔ بعد ازاں علامہ عثمانی نے شیخ الہند کی قیادت میں پورے برصغیر کا دورہ کیا اور مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے جگایا۔

یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ حضرت علامہ عثمانی کے دل و دماغ پر مسلمانوں کے زوال کا بہت اثر تھا اور آپ ہمہ وقت اسی میں غلطاں رہتے تھے کہ مسلمانوں

کو اس زوال سے کیونکر نکالا جائے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی حکومتِ الٰہیہ کا تصوّر پیش کر چکے تھے۔ اور اب ضرورت تھی کہ اس تصور کو عملی جامہ پہنایا جائے۔ اس غرض سے علامہ عثمانی نے مسلم لیگ میں شمولیت کی۔ سنہ ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ تاریخی قرار دادِ پاکستان منظور کر چکی تھی۔ چنانچہ اس کے ٹھیک پانچ سال بعد ۴۵ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کو مسلمانانِ ہند کی نمائندہ جماعت ثابت کرنے کے لیے علاّمہ عثمانی نے کانگریس کا سخت مقابلہ کر کے قائدِ اعظم محمد علی جناح کی قیادت کو عملی جامہ پہنانے کا تاریخی کارنامہ سر انجام دیا۔ علاّمہ کی کوششوں ہی سے خان لیاقت علی خان بھی الیکشن میں کامیاب ہوئے۔

انہی دنوں یعنی ۴۵ء میں جمعیۃ علمائے اسلام کا قیام عمل میں آیا۔ ۱۹۴۶ء میں علامہ شبیّر احمد عثمانی نے جمعیۃ العلمائے اسلام کے تحت لاہور میں ہونے والے ایک عظیم جلسے سے خطاب کیا۔ یہ جلسہ اسلامیہ کالج لاہور کے وسیع میدان میں ہوا تھا۔ اور اس کی صدارت بھی علاّمہ شبیر احمد عثمانی نے فرمائی۔ علاّمہ کی ولولہ انگیز تقریر سے پنجاب میں برسرِ اقتدار یونینسٹ پارٹی کے در و دیوار کانپ اُٹھے، پنجاب کے مسلمانوں پر حق و باطل کا فرق واضح ہو گیا۔ اور لوگ جوق در جوق مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع ہونے لگے۔ متحدہ ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی کے لیے علامہ عثمانی بنگال کے حلقے سے ممبر منتخب ہوئے تھے۔ اس لیے برطانوی فیصلے کے تحت جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت تھی، ان علاقوں کو پاکستان میں شامل کرنے کا فیصلہ پارلیمنٹ نے دے دیا۔ اور اس طرح کانگریس اور مسلم لیگ کی دیرینہ کش مکش ختم ہوئی۔

صوبہ سرحد میں ریفرنڈم :

کانگریس کے دماغوں نے یکایک یہ مطالبہ داغ دیا کہ صوبہ سرحد میں چونکہ کانگریس کی وزارت ہے، اس لیے اس صوبے کو ہندوستان میں شامل کیا جائے اور اس مقصد کے لیے سرحد کے عوام سے پوچھا جائے کہ وہ بھارت میں شامل ہونا چاہتے ہیں یا پاکستان میں۔ مسلم لیگ کے لیے یہ نہایت نازک اور کٹھن مرحلہ تھا، لیکن یہاں بھی علامہ شبیر احمد عثمانی کی ذات آڑے آئی۔ انہوں نے سرحد کا دورہ کیا۔ اور وہاں کے مسلمانوں کو اپنے زورِ خطابت کے ذریعے مسلم لیگ اور پاکستان کا حامی بنا لیا۔ بلاشبہ یہ علامہ شبیر احمد عثمانی کا عظیم کارنامہ ہے۔

۱۴ راگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان معرضِ وجود میں آیا۔ حضرت علامہ عثمانی چونکہ دستور ساز اسمبلی کے رکن تھے۔ اس لیے آپ کراچی تشریف لائے اور کراچی کے ایک معمولی مکان میں قیام فرمایا، اس کے بعد دستور سازی کے اہم فریضے کی طرف جسم و جان کی تمام توانائیوں سے متوجہ ہوئے۔

ستمبر ۱۹۴۷ء میں بھارتی فوجوں نے کشمیر پر چڑھائی کی۔ علامہ عثمانی نے کشمیری مسلمانوں کی آزادی کے لیے جہاد کا فتویٰ صادر کیا اور کشمیر کے مسلمانوں کی ہر طرح مدد فرمائی۔

علامہ کے دل و دماغ پر حکومتِ الٰہیہ کا نشہ اس قدر غالب تھا کہ دن کا چین اور رات کی نیند حرام کر کے آپ دستورِ اسلامی کی ترتیب و تدوین اور اس کے نفاذ کے لیے ہمہ تن مصروفِ جہد ہو گئے۔ تمام مکاتبِ فکر کے اکابر علماء

کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا بھی آپ ہی کا حصّہ تھا۔ ان علماء سے بائیس نکات متفقہ طور پر منظور کرا کے علامہ نے ملّتِ اسلامیہ پر عظیم احسان کیا۔ دستور ساز اسمبلی میں رہ کر وزیر اعظم پاکستان لیاقت علی خاں کو مجبور کیا کہ وہ علامہ عثمانی کی مرتب کردہ قرارداد پاکستان دستور ساز اسمبلی میں پیش کریں اور اسے منظور کرائیں۔ چنانچہ یہ قرارداد مقاصد منظور کی گئی اور مملکتِ پاکستان اسلامی جمہوریہ بنی۔ ۱۳ دسمبر ۱۹۴۹ء کو آپ نے وفات پائی۔

مولانا شبیر احمد عثمانی نے چھ سال کی عمر میں اپنی تعلیم کا آغاز دار العلوم دیوبند سے کیا۔ آٹھ سال میں تمام علوم و فنون کی کتابیں پڑھ کر دورۂ حدیث ۱۹۰۸ء میں پڑھا امتحان میں اوّل درجے پر آئے۔ آپ کے اساتذہ میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب کے اسمائے گرامی نمایاں ہیں۔

دار العلوم سے فارغ ہونے کے بعد آپ عرصہ دراز تک درس و تدریس کی ذمہ داریاں مختلف مدارس میں ادا کرتے رہے۔ دار العلوم دیوبند میں درسِ حدیث، تفسیر، فقہ، منطق اور فلسفہ کی کتابیں پڑھائیں۔ جامعہ عربیہ ڈابھیل ضلع سورت میں بھی طلبہ کو زیورِ تعلیم و تربیت سے آراستہ کیا۔ اور ۴۶ء میں جب مسلم لیگ میں شرکت فرمائی تو بعض وجوہ کی بناء پر دار العلوم دیوبند سے علیحدگی اختیار کر لی۔

حضرت مولانا محمّد یُوسف صاحب بستوی مہتمم جامعہ خیر العلوم بستی انڈیا

ناشر
مجلس صیانۃ المسلمین پاکستان
صدر دفتر : جامعہ اشرفیہ ، فیروز پور روڈ ، لاہور

مقالہ نمبر ۳۰

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ کی

حالاتِ حاضرہ پر گہری نظر

اور

ایمانی فراست

جناب مولانا عبدالرؤف صاحب الہ آبادی
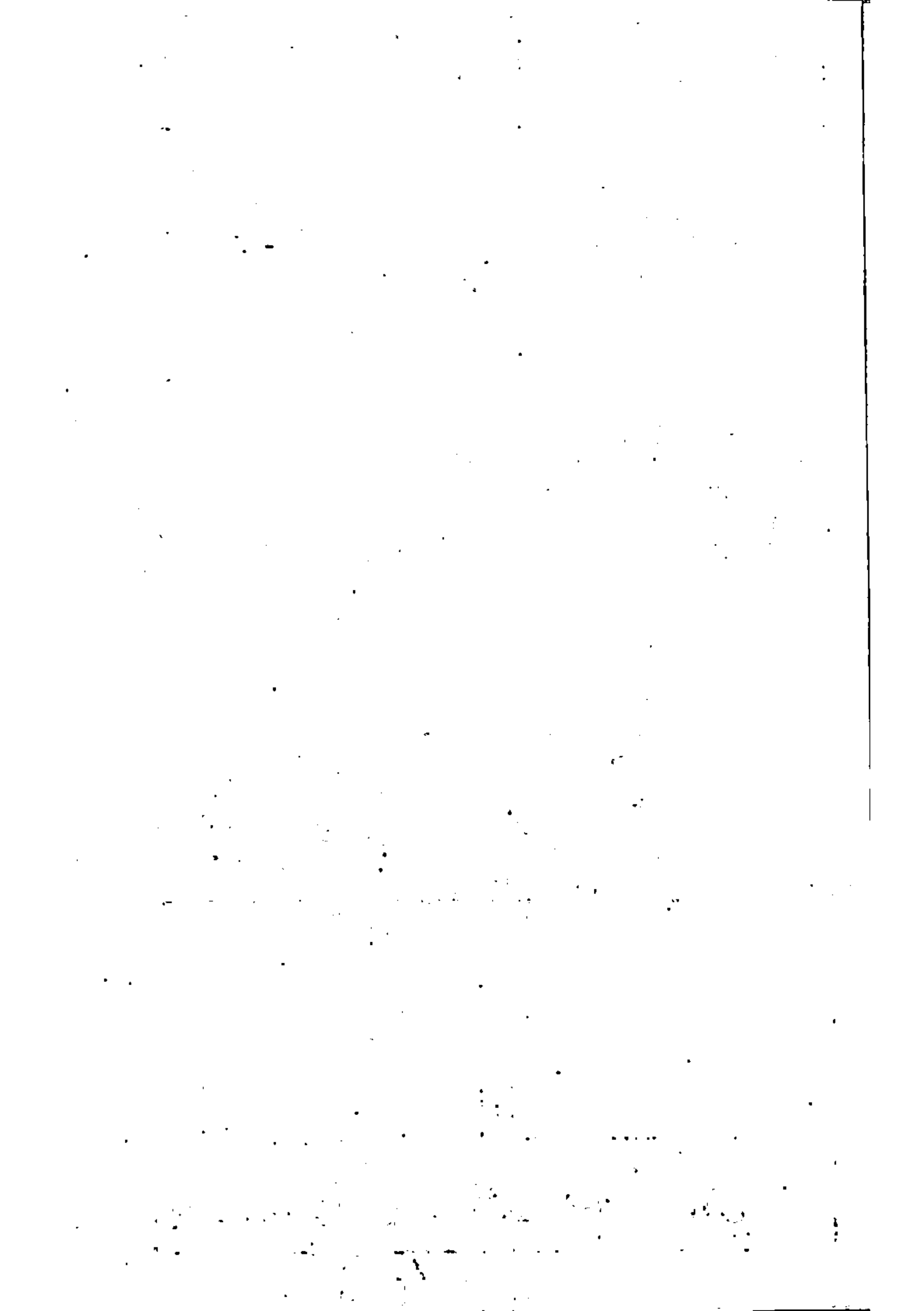
الحمد للہ وکفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفی۔ امابعد

اللہ رب العزت نے حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کو بہت سے علمی اور عملی کمالات سے نوازا تھا، ان کمالات کا تذکرہ یا ان پر تبصرہ ہم جیسے ہیچمدانوں کے لئے ناممکن ہے نامناسب، تاہم اپنے ایمان کی تازگی اور اپنے ذوق کی تسکین کے لئے یہ چند باتیں عرضِ خدمت ہیں، یہ حضرت تھانویؒ کے مقامِ رفیع کی ترجمانی نہیں اپنی بے مائیگی کے اعتراف و اقرار سے مجلس صیانۃ المسلمین کے ارشاد کی تعمیل ہے۔

شاہاں چہ عجب گر　　　　بنوازند گدا را

حکیم الامت حضرت تھانویؒ نسباً فاروقی یعنی سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اولاد میں سے تھے، جو صحابہ کرام میں اپنی عزیمت اور فراست میں نہایت ممتاز تھے، آپ کی اولاد میں جن بزرگوں میں یہ نسبت روشن ہوئی ان میں حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ حضرت شاہ ولی اللہؒ محدث دہلوی، اور حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نابغہ روزگار ہستیاں تھیں۔

مت سہل انہیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

ملکی صورت حال میں حضرت حکیم الامت کی صوابدید

حضرت تھانویؒ نے جس ماحول میں شعور کی انگڑائی لی یہ وہ دور تھا جس میں انگریز اس ملک میں چھاچکے تھے ۱۸۵۷ کی مہم آزادی ظاہراً ناکام ہوچکی تھی حضرت

حکیم الامتؒ کے اکابر، حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ، حجۃ الاسلام
حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور
حضرت مولانا حافظ محمد ضامن صاحب شہید تھانویؒ جو اس جنگ آزادی میں پیش
پیش رہے تھے، اور شاملی کے محاذ پر کھلے بندوں لڑ رہے تھے نئے حالات میں
نئی سوچ سے دوچار تھے، اب سوال یہ تھا کہ انگریز سے سر دست حکومت تو ہم واپس
نہیں لے سکتے لیکن اپنی تہذیب کے تحفظ اپنے مذہب کے بچاؤ اور اپنے افکار
کی حفاظت کے لئے ہم ان حالات میں کیا کچھ کر سکتے ہیں؟ پورے غور و خوض سے
وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ جس طرح بھی بن پڑے اسلامی علوم کے قلعے محفوظ کر لئے جائیں
اور ان پر جاں نثار پہرے دار بٹھا دیئے جائیں جو یورپ کی تہذیب اور حکومت
کی تحریص سے ذرا متاثر نہ ہو سکیں۔ اس فیصلہ کے نتیجے میں دارالعلوم دیوبند اور پھر
مظاہر علوم سہارنپور جیسی دینی درس گاہیں قائم ہوئیں، اور دیکھتے دیکھتے پورے
ملک میں دینی مدارس کا ایک جال پھیل گیا، انگریزوں نے حکومت تو ہم سے چھین
لی لیکن وہ ہم سے ہمارا دین نہ چھین سکے، والحمد للہ علیٰ ذالک،

ان اکابر کی صوابدید اب یہ تھی کہ اگر علوم اسلامی کے گرد اس محنت سے پہرہ
نہ دیا گیا تو پھر اسلامی علوم زندہ انسانوں میں نہیں فقط لائبریریوں میں پڑ کر رہ جائیں گے

ع حکومت چھن گئی ہم سے مگر وہ عارضی شے تھی نہیں دنیا کے آئین تبدل سے کوئی چارہ
مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آقا کی جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارہ

انگریزی حکومت سے ٹکر لی جائے اس کے لئے اب حالات سازگار نہ رہے
تھے قوم کو تھے لڑا کر ضائع کر لینا کوئی دانائی کا قدم نہ تھا، حضرت حاجی امداد اللہ

صاحبؒ مکہ مکرمہ ہجرت فرما گئے، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ پنڈتوں اور پادریوں کے سامنے کھڑے ہو گئے، حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ افاضہ علوم میں لگ گئے، اور دیکھتے دیکھتے علماء حق کی ایک ایسی کھیپ تیار ہو گئی جنہوں نے چند سالوں کے اندر اسلامی عقائد و افکار کے گرد نہایت مضبوط پہرے بٹھا دیئے،

حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے اپنے بزرگوں کی اسی لائن پر خدمت دین کی راہ اختیار کی، آپ نے اپنے بزرگوں کے اس دوسرے موقف کو اپنایا وہ بزرگ خود ان بدلے ہوئے حالات میں اپنا پہلا فیصلہ بدل چکے تھے، حضرت حکیم الامتؒ نے اپنی خداداد فراست سے بھانپ لیا کہ انگریز جب بھی اس ملک سے جائے گا اپنے بین الاقوامی حالات کے تقاضوں سے جائے گا، اسے فوجی مقابلوں سے نکالنا اب ہندوستانیوں کے بس کی بات نہیں رہی، آپ کے اس موقف کے وجوہ کچھ بھی ہوں لیکن آنے والے واقعات نے بتلا دیا کہ جو کچھ آپ نے کیا بات اسی کے مطابق رہی، دوسری جنگ عظیم کے سیاسی نتائج میں ایک یہ فیصلہ بھی تھا کہ دول یورپ اپنی نوآبادیات سے دستبردار ہو کر ان ممالک کو ان کے رہنے والوں کے سپرد کر دیں، اور اسی فیصلہ کے تحت انگریزوں کو ۱۹۴۷ء میں ہندوستان سے نکلنا پڑا۔

۱۸۵۷ اور ۱۹۴۷ کے درمیان تو نوے سال کا عرصہ ہوتا ہے اس دوران ہندوستان میں کتنی جماعتیں بنیں کتنی تحریکیں اٹھیں، کتنے نوجوان خاک و خون میں لوٹے، کتنی آبادیاں ویرانوں میں تبدیل ہوئیں، کتنے جلسے ہوئے، کتنے جلوس نکلے۔ اہل وطن نے کیا کیا قربانیاں دیں، لیکن ہوا یہی کچھ کہ انگریز اہل وطن کو لڑاتے رہے اور اپنے پاؤں

جماتے رہے یہ صرف علمارحق کی محنتیں تھیں کہ کسی طرح عامۃ المسلمین کے ایمان وعمل کا تحفظ ہوسکے، انگریز قادیانیت، انکار حدیث جیسی تحریکیں کھڑی کر کے بھی ہمارا دین ہم سے نہ چھین سکے، اور لارڈ میکالے کا نظام تعلیم ہمیں اپنی تاریخ سے لاتعلق نہ کرسکا۔

نوّے سال کے اس دور میں مسلمانانِ ہند کے جو قافلے آزادی وطن کے لئے نکلے ہمیں ان کے نیک ارادوں اور قربانیوں کا پورا اعتراف ہے، اور اسی پہلو سے وہ خراج تحسین کے مستحق ہیں کہ ان کے جذبہ حریت اور دلولہ جہاد نے مسلمانوں کے دلوں میں ایمان کی وہ چنگاری باقی رکھی جس کی روشنی میں آئندہ آزادی کا نقشہ ایک آزاد اسلامی ریاست کی صورت میں کھینچا، لیکن یہ امر واقع ہے کہ انگریز برصغیر پاک وہند سے کسی فوجی کارروائی کے نتیجہ میں نہیں نکلے اپنے بین الاقوامی تقاضوں کے تحت گئے۔ یہی وہ بات ہے جو حضرت تھانویؒ نے کہی تھی۔

انگریزی دور میں عامۃ المسلمین کی قابل رحم حالت

انگریز صدی سے زیادہ ہندوستان پر قابض رہا ان کے دور حکومت ملکی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں، دفتروں اور اسکولوں میں، کاروبار کی منڈیوں اور دیہات سدھار کی تنظیموں میں، کونسلوں اور عدالتوں میں کیا سب ہی ہندو ہوتے تھے؟ یا وہاں مسلمان بھی تھے؟ اگر ان اداروں میں مسلمان بھی ہوتے تھے تو وہ براہ راست انگریزی تہذیب کی زد میں تھے تو ان کے دین وایمان کے تحفظ کے

لئے صرف دینی کوششیں کارآمد ہو سکتی تھیں جن میں کوئی سیاسی رنگ نہ ہو، ملکی حالات سے قطع نظر دین کی آفاقی صدا ہو، عقائد صحیحہ کا استحکام اور عمل و کردار کا پیغام ہو، حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے پوری کوشش کی کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو جہاں تک ہو سکے انگریزی افکار، انگریزی تہذیب، انگریزی ثقافت، انگریزی معاشرت اور انگریزی تمدن سے بچایا جائے، اگر ہم اس ملک کو انگریزی حکومت سے نہیں بچا سکتے تو انگریزی اثرات سے جہاں تک ہو سکے ہم اسے بچا لیں، اسی دعوت عمل سے حضرت تھانویؒ کا قلم پھر ہر اس موضوع پر چلا جو وقت کا تقاضہ تھا اور آپ کا دینی لٹریچر ہر اس حلقہ تک پہنچا جہاں آزادی کے قافلوں کی کوئی آواز نہ پہنچ رہی تھی، اس طبقے کے دین و ایمان کو بچانے کے لئے حضرت تھانویؒ نے جو کام کیا صیانۃ المسلمین کے لئے صحیح طور پر اسلام کا اعجاز کہا جا سکتا ہے، آپ کی اس محنت کے اثرات کہاں کہاں تک پھیلے اور اس نے کن کن تاریک گوشوں کو منور کیا اس کے لئے ماہنامہ المیزان بمبئی کے ایڈیٹر کی یہ رپورٹ ملاحظہ ہو، آپ اپنے مدنی میاں کے تبلیغی دورہ کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"بلجیم میں جانا ہوا میزبان نے جو آپ کا نیاز مند تھا اپنے فرزند سے کہا کہ وہ کتاب حضرت کو دکھاؤ جو تمہارے مطالعہ میں ہے صاحبزادے نے فرنچ زبان میں بہشتی زیور لا کر سامنے رکھ دی جس کے ٹائیٹل پر نام نہاد حکیم الامت کو امام اہل سنت لکھا، تحیر و تاسف کے ملے جلے جذبات کے ساتھ آپ دیر تک عالم خیال میں گم ہو گئے۔"

مارچ ۱۹۷۶ء

اس وقت دنیا میں جہاں جہاں مسلمان آباد ہیں افریقی ممالک ہوں یا امریکی، یورپ ہو یا ایشیا، آسٹریلیا ہو یا نیوزی لینڈ یا فجی آئی لینڈز، ان مسلمانوں کے یہاں جو عام مسلمان ہیں کسی سیاسی یا تنظیم سے وابستہ نہیں، کسی خاص طبقہ علماء سے پیوستہ نہیں، فرقہ وارانہ مسائل سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں، مگر مسلمان ہونے، رہنے اور مرنے کا بنیادی تصور ان کے ہاں موجود ہے، ان کے یہاں حضرت حکیم الامت تھانویؒ کی کتابیں ان کی زبانوں میں آپ کو ضرور ملیں گی، اور بجا طور پر کہا جاسکتا تھا کہ ان حلقوں میں اسلام کی صحیح بات پہنچنے اور پہنچانے کی جو خدمت اللہ تعالےٰ نے آپ کے قلم سے لی ہے اس دور کی پوری دنیا میں اس کی مثال نہیں ملتی، مسلمانوں میں قرآن کریم کے بعد جو کتابیں سب سے زیادہ پڑھی، سُنی اور شائع ہوتی ہیں ان میں بہشتی زیور، اصلاحی نصاب اور شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحبؒ کا تبلیغی نصاب وہ کتابیں ہیں کہ کوئی ادارہ، کوئی تحریک، کوئی جماعت اور کوئی شخص برصغیر پاک و ہند میں ان کی نظیر پیش نہیں کر سکتا، اور یہ ہمہ گیر مقبولیت الٰہی کا ایک کھلا نشان ہے۔

حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ اپنے وقت کے عباسی حکمرانوں کو حکومت کا صحیح حقدار نہ کہتے تھے، آپ کی ہمدردیاں صرف حضرت امام حسنؓ کے پڑپوتے النفس الذکیہ کے ساتھ تھیں، آپ نے حکومت کی چیف جسٹس کے عہدے کی پیشکش بھی قبول نہ کی تھی لیکن آپ وقت کی سیاسی تحریکوں سے کنارہ کش اس لئے رہے کہ اس کے بغیر فقہ اسلامی کی باقاعدہ تدوین نہ ہو سکتی تھی، آپ سے پہلے کسی اور مجتہد نے اسے مدون نہ کیا تھا، ائمہ اربعہ میں سے باقی تین امام آپ کے بعد ہوئے آپ

پہلے امام ہیں جنہوں نے فقہ اسلام کو وقت کی سیاست کا کوئی چھینٹا ڈالے بغیر اس کے اصلی رنگ میں مدون کیا، آئندہ آنے والے مجتہدین ان اصول و قواعد کی روشنی میں اپنے اصول مدون کرتے رہے، پھر محدثین آئے جنہوں نے ان ائمہ اربعہ کے ماخذ و استدلات پر حدیث کی کتابیں ترتیب دیں، اور علم دین وقت کی کسی سیاسی آلائش کے بغیر اپنی پوری وسعتوں سے اپنی اصلی شکل میں منضبط اور مدون ہوگیا۔

حکیم الامت حضرت تھانوی کے پیش نظر بھی یہی تھا کہ حضرت امام اعظمؒ نے جس طرح اپنے موقف سے علم اسلام کی حفاظت کی اور اسے اس کے خالص رنگ میں نکھارا آپ نے قارہ ہند کے مسلمانوں کی علمی حفاظت اور دینی صیانت فرمائی، وہ لوگ جو اپنے تقاضوں اور اپنی مجبوریوں کے تحت سرکاری حلقوں میں کام کر رہے ہیں یا ان کے اداروں میں پڑھ رہے ہیں جس قدر ممکن ہو ان کے دین کو بچانے کی کوئی صورت نکل آئے، آپ نے حیوۃ المسلمین جیسی تالیفات اور اپنے مواعظ و بیانات سے ایک ایسی فضا قائم کردی، اور ایک ایسا ماحول بنا دیا کہ جو کچھ آپ نے سوچا تھا ایک عملی صورت میں سامنے آگیا۔

حکیم الامت کا آفاقی طریق اصلاح

حضرت تھانویؒ کا طریق اصلاح ملکی نہیں آفاقی ہے، آپ اگر برصغیر پاک و ہند میں نہ بھی رہتے تو آپ کی دینی صدا یہی ہوتی، آپ حضرت حکیم الامتؒ کی

کوئی کتاب پڑھیں آپ اس طرح محسوس کریں گے کہ آپ نے وہ خاص بات خاص آپ کے لئے ہی لکھی ہے آفاقی رشد وہدایت کی یہی شان ہے کہ وہ زمان ومکان کی حدود سے بالا ہو، اور ہر دور اور ہر علاقے سے اس کا اجالا ہو،

آپ کی جچی تلی تعبیر میں آپ کی ذہانت اور مومنانہ فراست کو بہت دخل ہے آپ نے یہ دولت وراثت میں پائی تھی، آپ کے والد ماجد عبدالحق صاحب مرحوم میرٹھ کی ایک بڑی ریاست کے مختار عام تھے، اور بڑے صاحب فراست تھے، اور ان کی ذہانت اور طباعی ان کے حلقوں میں خاصی معروف تھی، حضرت تھانویؒ کی والدہ صاحبہ بھی صاحب نسبت بی بی تھیں۔ آپ کے ماموں پیرجی امداد علی مرحوم بھی صاحب حال وقال بزرگ تھے، حضرت مولانا فتح محمد صاحب تھانویؒ جیسے صاحب نسبت بزرگ آپ کے پہلے استاد تھے، اور حضرت مولانا شیخ محمد صاحب محدث تھانویؒ کی نظر کیمیا اثر شروع سے آپ کے شامل حال تھی علمی کمالات کی منزلیں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ اول شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندیؒ سے طے کیں تو منازل سلوک میں آپ مرشد عالم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ کی اڑان سے اڑے، اس ماحول میں جو علمی ذہانت اور ایمانی فراست کسی باخدا انسان میں پیدا ہو سکتی ہے آپ اپنے دور میں اس کا مظہر اتم تھے، آپ نے دین کے لئے جو کوششیں کیں ان میں سے کوئی بھی ضائع نہیں ہوئی اس کی وجہ یہی ہے کہ آپ کی جملہ دینی کوششیں وقت اور علاقے کے تقاضوں سے بالا ہوتی تھیں، آپ کا طریقہ اصلاح آفاقی تھا اور یہ وہ بلندی ہے جہاں ناکامی کا دھواں نہیں پہنچتا۔

اصول وضوابط کی پابندی سختی نہیں

آپ کے مزاج میں فاروقی رگ ممتاز تھی، کوئی دوسری صورت ہوتی تو لوگ کبھی آپ کو ایک گوشے میں بیٹھ کر اس قدر عظیم دینی کام نہ کرنے دیتے، مشہور ہے کہ آپ کے مزاج میں سختی تھی، لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ سختی نہ تھی حقیقت پسندی تھی، ہم اس دور میں حقائق اور مکارم اخلاق سے اتنے دور جا بسے ہیں کہ ذرا سی روک ٹوک بھی ہمیں سختی دکھائی دیتی ہے، مر یانہ حقیقت پسندی آپ کے مزاج میں تھی، ہم نے غلط فہمی میں اسے "سختی" سمجھ لیا ہے، برصغیر پاک و ہند کے سیاسی مدوجزر پر آپ کی نظر تھی، ہو سکتا ہے بعض تکوینی فیصلے بھی آپ پر منکشف ہو چکے ہوں، ان حالات میں آپ نے جس نرمی اور تلطف سے کام لیا اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کی طبیعت اصول وضوابط کی پابند تھی، لیکن سختی نہ تھی،

مسلم لیگ کے ہراول دستے سے کون ناواقف ہے کہاں تک یہ لوگ دینی زندگی رکھتے تھے، ان کے عقائد و افکار اور اخلاق و اعمال پر کہاں تک اسلامی تہذیب وتمدن کا سایہ تھا؟ یہ بات محتاج بیان نہیں، لیکن حضرت حکیم الامتؒ نے جب خداداد فراست سے بھانپ لیا کہ پاکستان بن کر رہے گا اور اسلام کے نام پر ایک نئی مملکت وجود میں آئے گی تو آپ نے نہایت نرم انداز میں ان کارکنوں میں دینی روح پیدا کرنے کی فکر کی، اور سختی کو کہیں آڑے نہ آنے دیا، حضرت حکیم الامتؒ کے ایک مرید صادق نواب جمشید علی خاں مرحوم رئیس باغپت (میرٹھ) تھے، یہ قائد اعظم

کے بڑے گہرے دوست تھے۔ حکیم الامتؒ ان کے ذریعہ مسلم لیگ کے اس ہراول دستے میں اسلامی رنگ بھر رہے تھے، مگر افسوس کہ حضرت حکیم الامتؒ ۱۹۴۳ء میں وفات پا گئے، اور جن بزرگوں پر آپ کی نظر تھی وہ پاکستان کے ابتدائی دنوں میں ہی راہیء ملک بقا ہوئے، اور پھر ملک میں جو کچھ ہوا وہ سب کے سامنے ہے۔

حالات پر گہری نظر اور اپنی فراست،

۱۸۵۷ء کی مہم آزادی کے بعد جو حالات ملک میں پیش آئے آپ نے ان کے پیش نظر صاف کہہ دیا تھا کہ اب انگریز اس ملک سے فوجی کارروائی سے نہ نکلے گا، ہمیں اب وہ موقف اختیار کرنا چاہیئے جو ہمارے اکابر حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے بالآخر اختیار کیا، عربی مدارس کا جال بچھا دو، اور اسلامی عقائد و اعمال کے گرد حفاظت کے پہرے دو، آئندہ کے واقعات نے تصدیق کر دی کہ حضرت حکیم الامتؒ کی حالات پر گہری نظر تھی، اور وہی کچھ ہوا جو حضرت حکیم الامت نے کہا تھا۔۔۔۔
پھر جب آزادی کا آفتاب طلوع ہونے والا تھا تو سب کہتے تھے کہ پاکستان کسی طرح نہ بن سکے گا، مگر حضرت تھانویؒ نے کہا کہ ایسا ہوگا، اور حالات نے بتا دیا کہ وہی کچھ ہوا جو حضرت تھانویؒ نے کہا تھا، یہ ایک مومنانہ فراست ہے ورنہ غیب کے دریچے بدون اعلام الٰہی کسی پر نہیں کھلتے،
آپ تنہا نہیں، اپنی ذات میں ایک انجمن تھے، آپ نے نظریہ پاکستان کی کھل

کر حمایت کی، مسلم لیگی رہنماؤں کو اصلاح عمل کی دعوت دی مسلمانوں کو غیر مسلم اقوام کی مضرتوں سے آگاہ کیا، عامۃ المسلمین کے ایمان وعمل کی حفاظت کے اصلاحی نسخے تجویز فرمائے، اور پاکستان کے خاکہ میں دین کا رنگ بھرنے کی بھرپور کوشش کی، آپ کی وفات کے بعد آپ کے خلفا اور متوسلین اسی راہ پر چلے تحریک پاکستان میں علماء حق کا یہ وہ کردار ہے کہ برصغیر پاک وہند کی کوئی دینی تنظیم اس کی نظیر پیش نہیں کر سکتی۔

ایک سوال، اور اس کا جواب

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے کہ انگریز ہماری کسی فوجی کارروائی سے یہاں سے نہ نکلے گا، کیا یہ صورت حال مرشد عالم حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کی نظر سے اوجھل تھی؟ نہیں ہرگز نہیں، لیکن انہیں ترکی کی مداخلت سے تحریک خلافت کی کامیابی کا گمان پیدا ہو گیا تھا، اور ظاہر ہے کہ اس میں مسلمان اقلیت میں نہ تھے، صرف ہندوستان پیش نظر ہوتا تو وہ بھی حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی اس راہ پر چلتے جو یہ اکابر بدلے ہوئے حالات میں اب اپنا چکے تھے۔ ترکوں کے اشتراک سے مسلمانوں کو ہندوستان کی ہندو اکثریت سے کسی جارحیت کا اندیشہ نہ تھا،

حضرت شیخ الہندؒ کا یہ صوابدید بہت قریب تھا کہ ہندوستان کی آزادی کا سبب بن جائے، مگر افسوس کہ ہندوستان میں ایک مذہبی گروہ اس دعوت کے ساتھ سامنے

آیا کہ ترک خلافت کے حقدار نہیں، وہ عرب نہیں ہیں، قریش میں سے نہیں ہیں، انہیں کیا حق ہے کہ عرب ممالک پر حکومت کریں، اور پوری دنیائے اسلام پر خلافت کریں، اِس صدا نے تحریکِ خلافت کو کمزور کر دیا، اور حضرت شیخ الہندؒ کی ریشمی رومال کی تحریک ہندوستان پر کامیابی کے ساتھ اپنے برگ و بار نہ اتار سکی، تاہم اس سے انکار نہیں کہ قوموں میں جرأت و عزیمت کے یہ مظاہرے بھی ایک بہت بڑا قیمتی سرمایہ ہیں۔ تکوینی فیصلے اپنی جگہ کچھ ہوں تشریعی نظام میں کچھ اور ذمہ داریاں بھی ادا کرنا پڑتی ہیں۔

حضرت شیخ الہندؒ نے قید و بند کی مصیبتیں برداشت کیں اور اُمت مسلمہ کے بین الاقوامی رشتوں میں تازہ خون بھرنے کی کوشش کی، لیکن آپ نے استاد ہونے کے باوجود کبھی حضرت تھانویؒ کو اپنی ہم نوائی کے لئے مجبور نہیں کیا، جب آپ سے ایسا کرنے کی استدعا کی تو آپ نے فرمایا کہ

"میرا سیاسی مؤقف ایک میری صوابدید ہے، میری ایک سیاسی رائے ہے کوئی وحی خداوندی تو نہیں کہ اس میں دوسری کسی رائے کی گنجائش نہ ہو، ہو سکتا ہے کہ مولانا اشرف علی کی رائے ہی درست ہو"۔

ان بزرگوں کا اختلاف بھی کتنا سامان راحت تھا حضرت جو کچھ کرتے اور کہتے تھے سب اللہ کی رضا کے لئے تھا اس لئے وہ اختلاف کے باوجود ایک دوسرے کے ساتھ تھے، مگر افسوس کہ آج علماء کے اختلاف میں وہ رنگ نظر نہیں آتا،

ے ہمارے بعد اُجالا نہ ہوگا محفل میں بہت چراغ جلاؤ گے روشنی کے لئے

مقالہ نمبر ۳۱

حکیم الامت

حضرت تھانوی رح

علماءِ دیوبند کی پہلی شخصیت

جنہوں نے علی الاعلان

مسلم لیگ اور قائدِ اعظم کی

حمایت کی

جنابِ احسان قریشی صاحب

بی۔ اے۔ سیالکوٹ
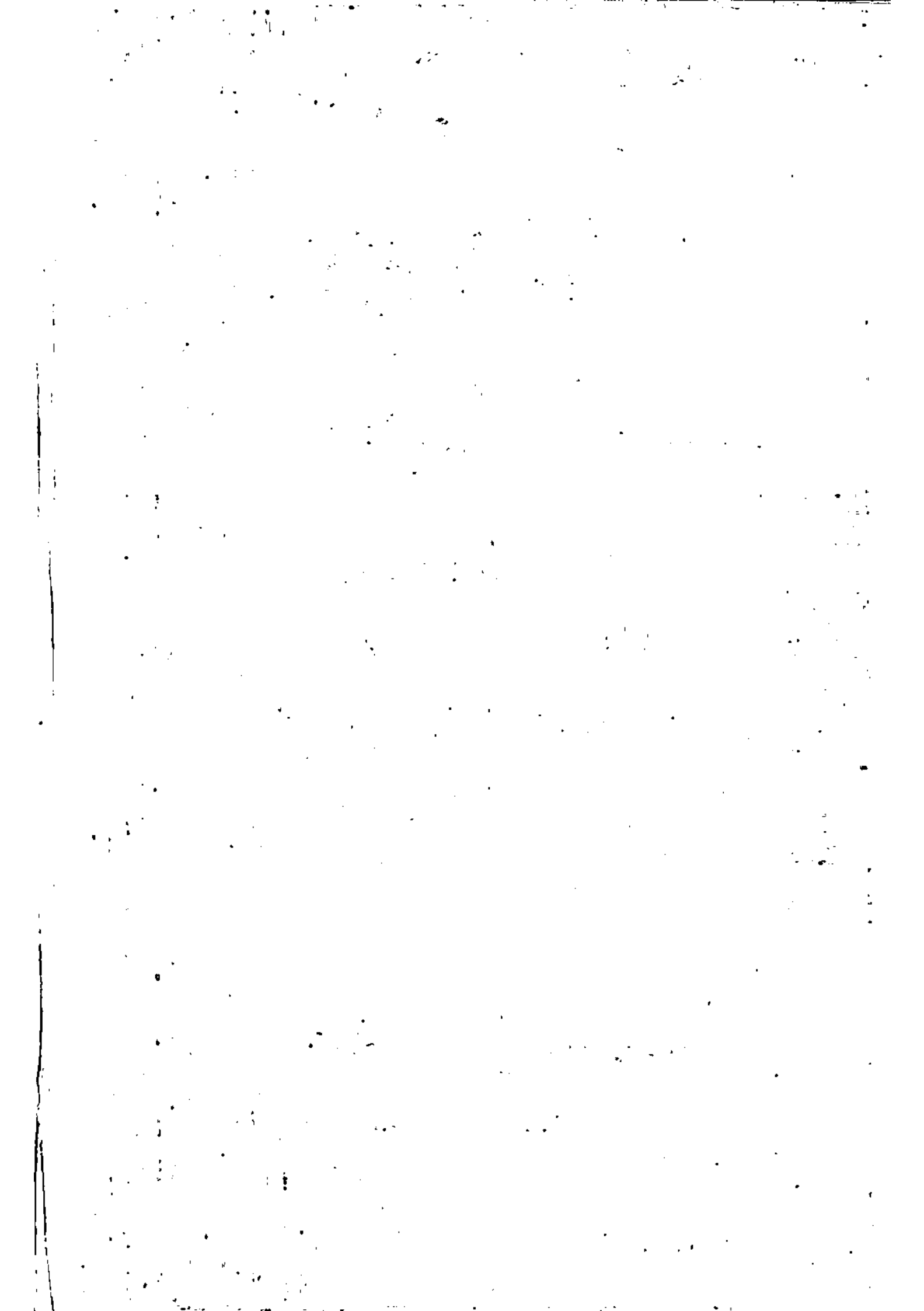
حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ

(احسان قریشی صابری)

حکیم الامت مولانا شاہ اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۹۴۳ء) اس صدی کے مجدد تھے۔ ان کا انتقال ۱۷ رجب المرجب ۱۳۶۲ھ بمطابق ۲۱ جولائی ۱۹۴۳ء بدھ کے روز انہی کے قصبہ تھانہ بھون ضلع مظفر نگر میں ہوا۔ وفات کے وقت ان کی عمر ۸۲ سال تھی۔ مولانا تھانوی علمائے دیوبند میں سے پہلے بزرگ تھے۔ جنہوں نے علی الاعلان مسلم لیگ اور قائد اعظم محمد علی جناح کی حمایت کی مولانا نے کم و بیش چودہ سو کے قریب کتابیں اور رسائل لکھے جن میں سے تفسیر بیان القرآن بہت مشہور ہے۔ مشہور عالم کتاب بہشتی زیور ان کے ایام شباب کی تصنیف ہے۔ جبکہ حضرت کی عمر صرف ۲۴ یا ۲۵ سال تھی۔ اس "بہشتی زیور" کی افادیت کا اندازہ صرف اس بات سے ہی ہو جائے گا۔ کہ گذشتہ ۱۰ سال میں اس کے سات لاکھ سے زیادہ نسخے پاکستان اور ہندوستان میں چھپ کر فروخت ہو چکے ہیں۔ برصغیر میں کسی اور دینی تصنیف کی اشاعت تعداد کے لحاظ سے اس معیار تک نہیں پہنچی۔ میں نے حضرت کی زبان مبارک سے خود سنا ہے کہ ہندوستان کے ۲۰ سے زیادہ کتب فروش باری باری حضرت کی خدمت میں حاضر

ہوئے اور پیش کش کی کہ "بہشتی زیور" کی اشاعت کے حقوق یعنی کاپی رائٹ ان کے نام کر دیا جائے۔ ایک لاکھ روپیہ نقد دیا جائے گا۔ اس زمانے کا ایک لاکھ روپیہ آجکل کے ۵۰ لاکھ کے برابر سمجھیے اگرچہ ان ایام میں مولانا کی مالی حالت کچھ اچھی نہ تھی پھر بھی انہوں نے ان تمام پبلشر حضرات کو جو جواب دیا وہ برصغیر پاکستان و ہند کی تاریخ میں ایک منفرد اور "تاریخی جواب" کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کو کہا گیا۔

"میں دین کی اشاعت کے لیے کسی کتاب کا معاوضہ وصول کرنا گناہ عظیم سمجھتا ہوں۔ ہر کتب فروش کو اجازت ہے کہ وہ اس کتاب کو شائع کرے اور اس کا منافع خود وصول کرے۔ میں اس میں سے ایک پیسہ بھی وصول نہیں کروں گا۔ مگر دو شرائط ہیں ایک تو اس کتاب کو کسی اچھے کاتب کے ذریعے اچھے کاغذ پر شائع کرنا ہوگا۔ دوسرے کتب فروش صاحبان ایک روپیہ فی کتاب سے زیادہ منافع حاصل نہ کریں کتاب کی اتنی قیمت مقرر کریں کہ لاگت کے بعد صرف ایک روپیہ فی کتاب منافع ان کے حصہ میں آئے۔ ورنہ کتب فروش بھی سخت گنہگار ہوں گے۔

راقم الحروف کو عمر میں صرف دو بار مولانا تھانوی کی زیارت کا موقعہ ملا۔ ایک بار تھانہ بھون میں اور دوسری بار مولانا مفتی محمد حسن کے دولت خانہ واقع محلہ شریف پورہ امرتسر (۱۹۳۸ء) میں۔ میں ان گھڑیوں کو اپنی عمر کا سرمایۂ عظیم سمجھتا ہوں۔ ۱۹۳۸ء میں میں ایف اے کا طالبعلم تھا۔ مولانا تھانویؒ مفتی صاحبؒ کے گھر ٹھہرے ہوئے تھے۔ مفتی صاحب کے صاحبزادے مولانا محمد عبید اللہ (حال مہتمم جامعہ اشرفیہ لاہور) اور راقم الحروف دونوں کی ڈیوٹی مفتی صاحب نے حضرت مولانا تھانوی کو چائے پلانے پر لگا دی تھی۔ امرتسر شہر کے سینکڑوں علماء، فضلاء، صوفیاء اور اتقیاء وہاں جمع تھے مجھے

اچھی طرح یاد ہے کہ اس مجلس میں مولانا تھانوی نے ایک بار یوں فرمایا تھا۔
محمد حسن! مجھ سے اکثر مجالس میں آج کل کانگرس اور مسلم لیگ کے سلسلہ میں سوالات کیے جاتے ہیں اس مجلس میں بھی ایک صاحب نے اسی موضوع پر مجھ سے کچھ سننے کے لیے ایک رقعہ میری طرف ارسال کیا ہے۔ میری عرض ہے کہ مسلم لیگ کی قیادت محمد علی جناح کے ہاتھ میں ہے۔ گو جناح صاحب اتنے پابند صوم وصلوٰۃ شخص تو نہیں ہیں لیکن سیاست میں مسلمانان ہند میں قابل ترین شخصیت مانے جاتے ہیں مخالفین بھی مانتے ہیں۔ کہ جناح صاحب سرکاری آدمی نہیں ہیں ملک وقوم یعنی مسلمانان ہند کی آزادی کے لیے ان کے دل میں انتہائی تڑپ ولولہ اور جذبہ ہے اس لیے برطانوی حکومت کے مقابلہ میں بھی اور کانگرس کے مقابلہ میں بھی انھوں نے ہمیشہ مسلمانان ہند کی بہتری کے لیے آواز بلند کی ہے۔ جناح صاحب کے خلاف کئی کم فہم مسلمان یہ غلط پراپیگنڈہ کر رہے ہیں کہ جاہ پسندی کے لیے یہ سب کام کر رہے ہیں۔ ایسا غلط پراپیگنڈہ کرنے والوں کو شرم آنی چاہیئے اگر جناح صاحب جاہ پسند ہوتے تو کسی خطاب اور کسی عہدہ کے لیے کوشش کرتے جس کا ملنا ایسے قابل شخص کے لیے بہت ہی سہل تھا۔ لیکن جناح صاحب نے کبھی اس کی خواہش نہیں کی۔ وہ مخلص ترین اور دیانتدار مسلمان ہیں اور مسلمانان ہند کے قابل ترین لیڈر ہیں۔ ان کی کوششیں یقیناً کامیاب ہوں گی اور باری تعالیٰ مسلمانوں کے لیے علیحدہ ریاست کے قیام کا سہرا انشاء اللہ جناح صاحب کے سر باندھیں گے۔ میں نے اپنے تمام خلفاء متبعین اور مریدین کو کہہ دیا ہے کہ ہر بات میں جناح صاحب کا ساتھ دیں۔ اس سلسلہ میں میں نے اپنے بھانجے (مولانا ظفر احمد عثمانی کو بھی تاکیداً کہہ دیا ہے کہ وہ آئندہ سالوں کے لیے اپنی خدمات مسلم لیگ کے کام کے لیے

ہی وقف کر دیں اور دامے درمے قدمے سخنے جناح صاحب کی ہی امداد کریں۔

مولانا تھانوی کی عملی خدمات کے متعلق مجھ جیسے ہیچمدان کا قلم کیا کچھ لکھ سکتا ہے۔ ان کی خدمات علمی کو برصغیر کا کون مسلمان نہیں جانتا؟ خود ان کے مرشد حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی چشتی صابری کہا کرتے تھے کہ مجھے اپنے تمام خلفاء اور مریدوں میں شاہ اشرف علی تھانوی پر ناز ہے۔ حاجی صاحب نے ۱۳ جمادی الثانی ۱۳۱۷ ہجری بمطابق ۱۸ ، اکتوبر ۱۸۹۹ء ہجری کو مکہ معظمہ میں انتقال فرمایا۔ انتقال سے ایک روز قبل مکہ شریف میں ہی اپنے مریدوں سے فرمایا کہ میری وفات کے بعد میری ٹوپی خرقہ اور عصا کسی معتبر آتے جاتے کے ہاتھ مولوی اشرف علی تھانوی کو پہنچا دینا میں یہ وصیت اس لیے نہیں کر رہا کہ مولانا تھانوی میرے ہی قصبہ میں تھانہ بھون میں بیٹھے ہوئے اس عالم جوانی میں دین کی قابل قدر خدمت سرانجام دے رہے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ قسام ازل مولوی اشرف علی سے ایک ایسا کام لیں گے جو مسلمانان ہند کی آزادی کا باعث بنے گا۔ میں نے تو انگریزوں کے خلاف ۱۸۵۷ء میں جہاد کیا تھا۔ مگر میری قسمت میں کامیابی نہیں لکھی تھی۔ لیکن اب یہی کامیابی میرا جانشین انشاء اللہ تعالیٰ حاصل کر کے رہے گا۔ وہ اور آگے اس کے خلفاء میرے مشن کو پورا کریں گے۔

مولانا سید سلیمان ندوی جیسے عالم بے بدل اور فاضل اجل سے کون واقف نہیں؟ (وفات ۲۲ ، نومبر ۱۹۵۳ء) کراچی ان کی تصنیف سیرت النبیؐ کی چار جلدیں ہی ان کے تعارف علمی کے لیے کافی ہیں۔ سید سلیمان ندوی نے مولانا تھانوی کے آخری ایام میں ان سے بیعت کی تھی اور خلافت سے بھی سرفراز ہوئے۔

مولانا اشرف علی تھانوی صاحب کشف و کرامت بزرگ تھے۔ ان کی ایک

کرامت حضرت مولانا مفتی محمد حسنؒ کی زبان سنیے گا۔

وفات سے پندرہ روز قبل حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی مولانا تھانوی کی عیادت کے لیے تھانہ بھون پہنچے۔ اتفاق سے اس وقت مولانا تھانوی کے بھانجے مولانا ظفر احمد عثمانی بھی وہاں موجود تھے۔ ان دونوں علماء سے مولانا تھانوی نے جولائی ۴۳ء میں یوں فرمایا۔

پاکستان کا ریزولیوشن ۴۰ ۱۹ء میں لاہور میں پاس ہو چکا ہے کہ حق تعالیٰ نے مجھ پر انعام فرمایا ہے مجھے کشفاً معلوم ہوا ہے کہ قائد اعظم کو حق تعالیٰ کامیابی سے نوازیں گے۔ ۱۹۴۰ء کی قرارداد پاکستان کی انشاءاللہ فتح ہوگی۔ میرا یہ مرض الموت ہے۔ میں اس سے جانبر نہیں ہو سکوں گا۔ اگر میں مزید زندہ رہتا تو تحریک پاکستان کے لیے خود کام کرتا۔ تم دونوں کو میری وصیت ہے کہ جناح صاحب کے پلان کے مطابق کام کرنا۔ جناح صاحب نے ۲۳/اپریل ۴۳ ۱۹ء کے اجلاس دہلی کے لیے مجھے بلایا بھی تھا۔ خط پر نواب زادہ لیاقت علی خاں صاحب کے دستخط تھے۔ مگر میں بوجہ علالت اس اجلاس میں نہیں جا سکا۔ مشیت ایزدی یہی ہے کہ مسلمانوں کے لیے علیحدہ خطہ زمین بنے گا۔ قیام پاکستان کے لیے جو کچھ ہو سکے کر گذرنا۔ مخالفین کی ذرا بھر بھی پرواہ نہ کرنا اپنے مریدوں اور متوسلین کو بھی تحریک پاکستان کے لیے کام کرنے پر ابھارتے رہنا۔

اب آخر میں مشہور عالم دین اہل قلم فلسفی اور ادیب مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے قلم سے مزار پر انوار حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانوی کا قلمی نقشہ سنیے۔

مزار شریف پر حاضری کی تمنا دل میں عرصہ سے تھی۔ جولائی کے مہینہ سے یہ فرض اور قرض برابر چلا آرہا تھا۔ نوبت وسط نومبر ۱۹۴۳ء میں آئی ۱۵، نومبر کی دوپہر میں تھانہ بھون ٹاؤن اسٹیشن پر اترا اور سیدھا مزار پر حاضر ہو گیا۔ مزار جو دیکھا تو آہ! یہ مزار! نہ کوئی بلند گنبد نہ کوئی کلس دار قبہ نہ چار دیواری نہ ہی آستانہ۔ نہ ہی جنگلہ نہ ہی کوئی کٹہرا ایک اوسط درجہ کی وسعت کا باغ ایک سمت میں ایک مختصر پر فضا عمارت وسط باغ میں چند گز مربع کا ایک مسطح تختہ اور وہی اس اللہ کے شیر کی خوابگاہ اور آخری آرامگاہ۔ نہ شامیانہ نہ چھت صرف آسمان کی کھلی چھت کے نیچے ایک نیچی سی کچی تربت! سادگی کی تصویر! صاحب قبر کی بے نفسی کا آئینہ نہ کوئی لوح نہ کوئی کتبہ نہ پھول نہ چادر چند قدم کے فاصلہ پر وصل بلگرامی مرحوم اور دوسرے مریدین کی قبریں جو مرشد کی پیشوائی کے شوق میں ان سے پہلے ہی میاں پہنچے ہوئے تھے اور شیخ کی قبر ان سب قبروں سے بھی پست۔ تصور کی آنکھ نے کیا کیا دیکھا۔ تخیل کے کان میں کیا کیا آوازیں آئیں۔ کوئی کہے بھی تو کس سے؟ کس زبان میں کہے۔

ایں حدیثِ ما بیانے دیگر است

جی میں آیا کہ مٹی اٹھا کر آنکھوں سے لگائیے عقل نے کچھ اور ہی سمجھایا روتی ہوئی آنکھوں اور روتے ہوئے دل کے ساتھ سلام رخصت عرض کیا اور اپنے خانقاہ آہ وہ روح بے جسد وہ مکان بے مکین وہ انگشتری بے نگین مدرسہ چل رہا تھا۔ لیکن سرد ی خاموش و ویران۔ بجھی ہوئی شمع ایک ہو کا عالم سناٹے کا مقام نہ دری نہ جاجم نہ تکیہ نہ مسند نہ ڈیسک نہ قلمدان نہ یاد ایک ایک چیز کی آتی رہی اور عبرت کی نہ ختم ہونے والی داستان سنا کر رلاتی رہی۔۔۔

اپنی اس ۵۶ سالہ زندگی میں اللہ والے متعدد دیکھ ڈالے بڑے بڑے عابد زاہد متقی اور تہجد گزار نظر سے گزرے لیکن اصلاح و ارشاد کی مسند نشینی کا حقدار جیسا حضرت شاہ محمد اشرف علی تھانویؒ کو پایا کسی اور کو نہ پایا کتنے ہی بزرگ صورت درویش نما عالم لباس، خرقہ پوش اور عمامہ بند ایسے ملے جن کی حقیقت چند مہینوں کے سابقہ کے بعد مخفی نہ رہی مگر حضرت کے پرتو نظر سے زندگی بن گئی بے معنی زندگی بامقصد ہو گئی ورنہ خدا معلوم مقسوم کہاں کہاں مارا مارا بھٹکتا پھرتا۔ شریعت، طریقت حقیقت، معرفت حضرت ہی کی صحبت میں رہ کر کھلی! بلا کسی استحقاق اور جہد و طلب کے یہ نعمت جاں نواز کچھ کم شامل حال رہی کہ اتنے ہی دن کی خدمت و صحبت نصیب ہو گئی یہ اور بات ہے کہ سکندر چشمہ حیات تک رسائی پا جانے کے بعد بھی پیاسے کا پیاسا واپس ہوا ہے

بروفات ایں چنیں عالم نہ گریہ در جہاں

کہ دریں ایام علم و زہد ما حاصل بدلے

مصرعۂ تاریخ رحلت گفت موزنا روی

مولوی اشرف علی تھانویؒ کامل بدلے!

مولانا اشرف علی تھانوی

اور

تحریک آزادی

پروفیسر احمد سعید

ناشر مجلس صیانۃ المسلمین پاکستان لاہور

مقالہ نمبر ۳۲

حکیم الامت حضرت تھانوی

اور

قائدِ اعظم

جناب مولانا محمد عبداللہ صاحب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ

اور

قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ

علامہ اقبالؒ نے ہندوستان میں ایک اسلامی سلطنت کے قیام کا خیال اس وقت ظاہر فرمایا تھا۔ جب وہ ۲۹ر دسمبر ۱۹۳۰ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کا خطبہ صدارت دے رہے تھے۔ بعد میں یہی خیال ایک تاریخی اجلاس منعقدہ ۲۳ر مارچ ۱۹۴۰ء لاہور میں بصورت قرارداد سامنے آیا۔ جو قائدِ اعظم محمد علی جناح کی کوششوں سے ۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء میں حقیقت بن کر منصۂ شہود پر نمودار ہوا۔

لیکن اسلامی سلطنت کے قیام کا یہی خیال جو علامہ اقبالؒ نے پیش فرمایا حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اپنی مجالس میں بہت پہلے ظاہر فرما چکے تھے۔ بلکہ حضرت تھانویؒ نے اس اسلامی سلطنت کا مکمل خاکہ اور طریقۂ حصول بھی بتا دیا تھا۔ اس کا ثبوت ہمیں مولانا عبدالماجد دریابادی اور حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کی اس ملاقات سے ملتا ہے جو ۱۹۲۸ء میں ان حضرات نے حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے کی تھی۔

مولانا عبدالماجد دریابادی فرماتے ہیں:

"۱۹۲۸ئہ تھا اور مخاطب روزنامہ ہمدرد" کا ڈائریکٹر تھا۔ صبح
اور دوپہر کی طویل صحبت میں سیاسی پہلوؤں پر گفتگو کا آجانا ناگزیر سا
تھا۔" گفتگو ہوئی حضرت نے اتنی معقولیت سے کی کہ ساری بدگمانیاں
کافور ہو کر رہیں۔ کون کہتا ہے کہ حضرت گورنمنٹ آدمی ہیں۔ لاحول ولا
قوۃ۔ جس نے بھی ایسا کہا، جان کر یا بے جان کر! بہرحال جھوٹ ہی
کہا۔ یہ تو خالص ایک مسلمان کی گفتگو تھی۔ مسلمان بھی ایسا جو جوشِ دینی
اور غیرت ملّی میں کسی "خلافتی" سے ہرگز کم نہیں۔

پاکستان کا تخیّل خالص اسلامی حکومت کا خیال، یہ سب آوازیں
بہت بعد کی ہیں۔ پہلے پہل اس قسم کی آواز یہاں ہی کان میں پڑی۔
بس صرف حضرت کو ہم لوگوں کے اس وقت کے طریقہ کار سے
پورا اتفاق نہیں تھا۔"

(نقوش و تاثرات)

مولانا دریابادیؒ کے اس بیان سے صاف واضح ہوتا ہے کہ مولانا
اشرف علی تھانویؒ نے بہت پہلے ایک اسلامی سلطنت اور اُس کے خاکے
کے، متعلق تجویز پیش کی تھی۔ صرف یہی نہیں کہ حضرت نے یہ تجویز ہی پیش کی
کی تھی۔ بلکہ اس پر عمل کرنے کے لیے بھی بے چین رہے۔ یہ صرف مولینا
اشرف علی تھانویؒ صاحب ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ مسلم لیگ ایک منظم
اور فعال جماعت بنی۔ اور پھر یہ کہ مسلم لیگ میں علماء کرام نے شمولیت اختیار
کی۔ مولانا کی خدمات کا اعتراف خود مسلم لیگ کے اس تعزیتی اجلاس میں کیا

گیا تھا۔ جو مولانا کے انتقال کے بعد صرف اس غرض سے منعقد کیا گیا تھا۔

قرارداد کا متن یہ ہے:

"آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا یہ اجلاس حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی وفات پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے، مولانا مرحوم ایک جیّد عالم تھے، اُنھوں نے سینکڑوں کتابیں لکھیں، لاکھوں لوگ ان کے مرید تھے۔ اسلام کی اشاعت و تبلیغ میں جو خدمات اُنھوں نے سر انجام دیں۔ ان کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ ان کی وفات مسلم لیگ کے لئے اس وجہ سے مزید دُکھ کا باعث ہوئی ہے۔ کہ مولانا کی تائید و حمایت اس کے لئے بہت مدد گار ثابت ہوئی جس کی وجہ سے مسلم لیگ نے ان خود غرض اور گمراہ طاقتوں کا مقابلہ کیا جو مسلمانوں کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے پر تلی ہوئی تھیں۔ کونسل کا یہ اجلاس خداوند کریم سے دُعا کرتا ہے کہ مولانا کی رُوح کو سکون پہنچے اور ان کی روح بدستور ان مسلمانوں کی راہنمائی کرتی رہے جو مسلم انڈیا کی وحدت کے لیے کام کر رہے ہیں۔ کونسل کا یہ اجلاس مولانا کے خاندان اور لاکھوں مریدوں سے بھی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔"

(آل انڈیا مسلم لیگ کی قرارداد ۲۴ نومبر ۱۹۴۳ء)

اس قرارداد سے بھی مولانا کا مسلم لیگ کے ساتھ ہمدردیوں کا اظہار بخوبی ہوتا ہے۔ ۲۳ اپریل ۱۹۴۳ء کو دہلی میں آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ہوا۔ اس میں شمولیت کے لیے حضرت تھانویؒ کو مندرجہ ذیل مضمون کا دعوت نامہ

ارسال کیا:

"آپ سے استدعا ہے کہ آپ اس موقع پر تشریف لاکر اپنے ارشادات سے مجلس کو ہدایت فرمائیں تو بہتر ہے لیکن اگر حضور خود تشریف نہ لاسکیں تو اپنے نمائندہ کو بھیج کر مشکور فرمائیں۔ اور دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ اس اجتماع کے رعب سے غیر مسلموں کے دلوں کو مسخور کردے اور ہمارا مطالبہ پاکستان منوا دے تاکہ اسلامی سلطنت قائم ہو سکے۔"

اس کے جواب میں مولانا نے مسلم لیگ کے ارکان کے نام ایک مکتوب گرامی ارسال فرمایا۔ خود شرکت اس لیے نہ فرما سکے کہ آپ بہت علیل تھے، وہ مکتوب گرامی بعینہٖ نقل کیا جاتا ہے۔

"از ناکارہ آوارہ ننگ انام اشرف برائے نام بخدمت ارکان مسلم لیگ نصرہم اللہ ونصرہم اللہ۔ السلام علیکم۔ لیگ کے عزائم معلوم کر کے اس آیت پر عمل کی توفیق ہوئی۔ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰہِ وَبِرَحْمَتِہٖ فَبِذٰلِکَ فَلْیَفْرَحُوْا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ عذر نہ ہوتا تو اس آیت پر بھی عمل کرتا اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا لیکن عذر کے سبب اس رخصت پر عمل کی اجازت مل گئی۔"

لیس علی الضعفاء .... ما ینفقون۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس آیت کا شرف حاصل ہو گیا۔ کہ اپنی دو کتابوں کا پتہ دیتا ہوں جو انشاء اللہ قیامت تک آنے والی نسلوں کے لیے پیام عمل ہے

ایک "حیوٰۃ المسلمین" شخصی اصلاح کے لیے دوسری "صیانۃ المسلمین" جمہوری نظام کے لیے۔ ان کے مضامین اپنے موضوع میں گو رنگین نہیں مگر سنگین ضرور ہیں۔ جس میں وہی فرق ہے جو ذوق اور غالب کے اشعار میں اور محمود خان اور محمد صادق خان کے نسخوں میں ہے۔ اور نمائندہ وہ کام نہ کر سکتا جو یہ کتابیں کر سکتی ہیں۔ مگر شرط عمل ہے جیسے اعلیٰ درجے کا ماءاللحم بوتلوں میں بھرا قیمتی ہے مگر نتیجہ خیز نہیں یہ نفع اُس وقت ظاہر ہو گا جب حلق سے اترے گا۔ ورنہ بدون عمل یہ سب کوششیں اس کا مصداق ہوں گی کہ نشستند، گفتند، برخاستند، باقی دعا ہر حال میں خصوصی ان تاریخوں میں زیادہ اہتمام سے جاری رکھوں گا۔

نوٹ:۔ یہ دونوں کتابیں اگر یہاں مل گئیں تو ۲۲ اپریل کو ڈاک سے "ہدیتہً" روانہ کر دوں گا۔ ورنہ وہیں سے کسی کتب خانہ تجارتی سے تلاش کی جائیں "۔

والسلام

احقر اشرف علی تھانوی

ربیع الثانی ۱۳۶۲ھ ہجری

مولانا کے اس مکتوب گرامی سے معلوم ہوا کہ انہوں نے مسلم لیگ کے لیے جن دو چیزوں کا انتخاب فرمایا وہ "حیوٰۃ المسلمین" اور "صیانۃ المسلمین" تھیں۔ مگر بعد میں چل کر یہی "صیانۃ المسلمین" ایک جماعت کی شکل اختیار کر گئی۔ گویا یوں کہا

جا سکتا ہے کہ مولانا نے تقسیم پاکستان کے لیے منشور اور جماعت دونوں پیش کر دیں۔ اور نیز یہ کہ اگر یوں کہا جائے کہ پاکستان مولانا کی دعاؤں کا ثمرہ ہے تو بے جا نہ ہو گا۔ مولانا کا یہی خلوص تھا کہ جس نے قائد اعظم محمد علی جناح جیسے ذہین، اور عظیم سیاستدان کو بھی علماء کا قدردان اور ان سے مشورہ لینے پر مجبور کر لیا۔ چنانچہ مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں:

"رمضان المبارک ۱۳۵۷ھ کا زمانہ تھا کہ حضرت کو یہ معلوم ہوا کہ مسلم لیگ اور کانگریس میں باہمی مصالحت کی گفتگو ہو رہی ہے اور مسٹر جناح گفتگو کرنے والے ہیں۔ حضرت کو یہ فکر ہوئی مسٹر جناح شرعی احکام سے واقف نہیں، کہیں اس مصالحت میں کچھ خلاف شرع شرائط پر صلح نہ ہو جائے تو مسلمانوں کے لیے بڑی مشکل ہو گی، اس لیے مسٹر جناح کے نام اس مضمون کا خط لکھا کہ محض سیاسی اور اقتصادی معاملات میں تو آپ کو کچھ بتلانے کی ضرورت نہیں۔ لیکن مذہبی اُمور میں آپ کو ان سے مصالحت کرنے کا حق اُس وقت تک نہیں ہے جب تک آپ علماء ماہرین سے مسودۂ صلح دکھلا کر مشورہ نہ کر لیں، ایسا نہ ہو کہ کوئی امر خلافِ شرع طے ہو جائے پھر دشواریاں پیدا ہوں) جس کے جواب میں مسٹر جناح کا خط انگریزی میں آیا جس کا ترجمہ یہ ہے:

"مجھ کو مولانا مظہر الدین نیز نواب زادہ لیاقت علی خان صاحب سے گفتگو کرنے کا موقع ملا۔ اور میں بہت زیادہ خوش ہوا یہ

معلوم کر کے کہ آپ کو آل انڈیا مسلم لیگ کے مقصد اور پروگرام سے پوری ہمدردی ہے۔ مجھ کو آپ کا خط ملا لیکن موجودہ متعدد مشاغل اور عازم حاضری بمبئی کے سبب آپ کو جواب اس سے قبل نہ دے سکا۔ چند نکات جو میرے سامنے پیش کئے گئے ہیں میں نے ان کو بغور تحریر کر لیا ہے اور آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں ان کے متعلق آپ سے ضرور مشورہ کروں گا۔ جب وقت آئے گا۔ آپ کی مہربانی کا شکریہ۔"

فقط

محمد علی جناح

قائد اعظم محمد علی جناح حضرت تھانویؒ کا بہت ہی احترام کرتے تھے حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ اپنی روئیداد میں لکھتے ہیں:

حضرت کی وفات کے بعد کا واقعہ ہے کہ بمبئی میں "جمعیۃ علمائے اسلام" کی کانفرنس ہوئی جس میں مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ، میں، مولانا طاہر مرحوم وغیرہ شریک ہوئے۔ بمبئی کے چند تاجر جن کو حضرتؒ سے تعلق تھا ہمیں ملے اور بیان کیا کہ قائد اعظم کی مجلس میں ایک دفعہ یہ گفتگو آئی کہ کانگریس میں علماء زیادہ ہیں اور مسلم لیگ میں علماء کوئی نہیں۔ جس کی وجہ سے مسلمانوں کو مسلم لیگ سے دلچسپی نہیں۔ یہ سن کر قائد اعظم نے پرجوش لہجے میں فرمایا:

"مسلم لیگ کے ساتھ ایک بہت بڑا عالم ہے۔ جس کا علم و تقدس و تقویٰ اگر ایک پلڑے میں رکھا جائے اور تمام علماء کا علم و

تقدس و تقویٰ دوسرے پلڑے میں رکھا جائے تو اس کا پلڑا بھاری ہوگا۔ وہ مولانا اشرف علی تھانوی ہیں۔ جو چھوٹے سے قصبہ میں رہتے ہیں۔ مسلم لیگ کو ان کی حمایت کافی ہے اور کوئی موافقت کرے یا نہ کرے ہمیں پرواہ نہیں "

(تعمیر پاکستان اور علمائے ربانی)

اس سے معلوم ہوا کہ قائد اعظم محمد جناح جن کو بانیٔ پاکستان کہا جاتا ہے مولانا کا کتنا احترام کرتے تھے۔ اس لیے کہ وہ سمجھتے تھے کہ مولانا نے تحریک پاکستان میں کتنی قربانیاں دی ہیں۔ مولانا شبیر احمد عثمانی رح اور مولانا ظفر احمد عثمانی رح جو قائد اعظم محمد علی جناح کے نہ صرف قریبی ساتھی اور مشیر تھے بلکہ ان کے دست راست بھی تھے یہی وجہ ہے کہ سرحد کے ریفرنڈم کے لیے مولانا شبیر احمد عثمانی رح اور سلہٹ کے ریفرنڈم کے لیے مولانا ظفر احمد عثمانی رح کو بھیجا گیا۔ الحمد للہ کہ ان حضرات نے یہ سارا کام حضرت تھانویؒ کے ایما اور حکم پر انجام دیا۔ جس کے بہترین نتائج دنیا کے سامنے ہیں۔ قائد اعظم محمد علی جناح کو ان حضرات کی خدمات کا اعتراف تھا۔ اس اعتراف میں مغربی پاکستان کی پرچم کشائی حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رح اور سابقہ مشرقی پاکستان کی پرچم کشائی مولانا ظفر احمد عثمانی سے کروائی۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ کے برادر زاد مجھ سے۔ مولانا شبیر علی فرماتے ہیں کہ:

۲۰ مئی ۱۹۳۸ء کا واقعہ ہے کہ ایک دن حضرت نے سہ پہر مجھے یاد فرمایا میں حاضر ہوا۔ دیکھا کہ حضرت کچھ متفکر سے ہیں۔ تھوڑی دیر کے

بعد سر اٹھایا اور فرمایا:

"میاں شبیر علی! ہوا کا رُخ بتا رہا ہے کہ لیگ والے کامیاب ہو جائیں گے اور بھائی جو سلطنت ملے گی ان ہی لوگوں کو ملے گی جن کو آج سب فاسق فاجر کہتے ہیں رمولویوں کو ملنے سے رہی۔ لہذا ہمیں یہ کوشش کرنی چاہیئے کہ یہی لوگ دیندار بن جاویں۔ اور آگے چل کر فرمایا۔

ہم تو سلطنت کے طالب نہیں۔ ہمیں صرف یہ مقصود ہے کہ جو سلطنت قائم ہو وہ دیندار اور دیانتدار لوگوں کے ہاتھ میں ہو۔ اور بس تاکہ اللہ کے دین کا بول بالا ہو"

(روئیداد ص ۲۱)

نیز حضرت تھانویؒ کو ہر وقت اس بات کا فکر رہتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح مسلم لیگ والوں کی اصلاح ہو جائے۔ چنانچہ قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ کی خدمت میں آپ نے کئی ایک وفود تبلیغی بھیجے۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے سب سے پہلا وفد آپ نے ۲۴ جون ۱۹۳۸ء کو مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی قیادت میں بھیجنے کا اہتمام فرمایا۔ لیکن مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی والدہ کی علالت کی وجہ سے یہ وفد نہ جا سکا۔ حضرت تھانویؒ نے ارکانِ وفد کو مندرجہ ذیل ہدایات دی تھیں۔

"جناح صاحب سے جو باتیں کرنی ہیں وہ میں نے مولانا شبیر احمد کو خط میں لکھ دی ہیں۔ وہ امیر الوفد بھی ہیں۔ اور گفتگو کا سلیقہ بھی اُن کو بہت بہتر آتا ہے۔ لیکن اگر کسی سے گفتگو کا تم کو اتفاق ہو جائے

تو گفتگو میں اس کا لحاظ رکھنا کہ گفتگو نرم لہجہ میں ہو۔"

اس کے بعد دسمبر ۱۹۳۸ء میں حضرت تھانویؒ نے دوسرا وفد تشکیل دیا جو ان حضرات پر مشتمل تھا۔ مولانا شبیر علی تھانویؒ۔ مولانا ظفر احمد عثمانی، مولانا عبدالجبار مولانا عبدالغنی پھولپوری اور مولانا معظم حسین صاحب امروہی۔ اس میں مولانا مرتضیٰ حسن صاحب چاند پوری کو رئیس الوفد بنایا گیا۔ حضرت تھانویؒ نے اس وفد کی روانگی کے تمام اخراجات خود ہی برداشت فرمائے۔

مولانا شبیر علی فرماتے ہیں:

"جب ہم جناح صاحب کے پاس پہنچے۔ مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ گھنٹہ بھر جاری رہی۔ میں نے جناح صاحب سے سوال کیا کہ آپ ہزاروں روپے خرچ کر کے یہ پنڈال وغیرہ بنواتے ہیں۔ لوگ گلے پھاڑ پھاڑ کر نعرہ تکبیر لگاتے ہیں۔ اس سے کیا فائدہ؟ جناح صاحب نے جواب دیا کہ اس سے غیر مسلموں پر رعب پڑتا ہے۔ میں نے کہا کہ میں آپ کو ایک اور ترکیب بتاتا ہوں وہ یہ کہ جب نماز کا وقت آجایا کرے تو آپ باجماعت نماز ادا کیا کریں اس سے اور زیادہ رعب پڑے گا۔ اس پر جناح صاحبؒ نے فوراً فرمایا۔ کہ آپ فرماتے تو صحیح ہیں مگر اس وقت مجھے اس پر عمل کرنے سے معذور سمجھیں۔ میں نے کہا کہ آپ کو کیا عذر ہے۔ فرمایا کہ آپ باجماعت نماز پڑھنے کو کہتے ہیں تو امام کس کو بناؤں ممکن ہے کہ میرا خیال صحیح ہو کہ اگر میں امامت کروں تو سب لوگ

نہیں تو بہت بڑی اکثریت میرے پیچھے نماز پڑھ لے۔ مگر میں امامت کے قابل نہیں۔ مجھ میں اس کی اہلیت نہیں۔ اس لیے کسی دوسرے کو امام بنانا پڑے گا۔ اگر امام دیو بندی ہو گا تو بریلوی اس کے پیچھے نماز نہیں پڑھیں گے۔ اور اگر بریلوی ہو گا تو دیو بندی نہیں پڑھیں گے۔ اس طرح بجائے رعب کے اُلٹا اختلاف نمایاں ہو گا"

مولانا شبیر علی فرماتے ہیں:

"کہ میں نے یہ کہتے ہوئے کہ یہ پھر کسی مجلس میں عرض کروں گا کہ یہ عذر صحیح ہے کہ نہیں۔ اس وقت اتنا عرض ہے کہ خود آپ پر بھی تو نماز فرض ہے۔ آپ کیوں نہیں پڑھتے۔ آپ جلسوں میں اپنا یہ معمول رکھیں کہ جب بھی نماز کا وقت آجائے تو مصلّیٰ بچھا لیں اور نیت باندھ لیں اور کوئی پڑھے یا نہ پڑھے۔ وہ کرسی پر تکیہ لگائے بیٹھے تھے۔ میری بات سن کر آگے کو جھک گئے اور نہایت ہی ندامت کے لہجے میں یہ الفاظ فرمائے:

میں گنہگار ہوں خطاوار ہوں۔ آپ کو حق ہے کہ مجھے کہیں میرا فرض ہے کہ اس کو سنوں۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ نماز پڑھا کروں گا"

(مشاہدات و واردات منشی عبدالرحمٰن صاحب ص ۱۱۴ تا ۱۱۸)

اس کے بعد حضرت تھانویؒ نے قائداعظم کے قول و کردار کا گہری نظر سے مطالعہ شروع کر دیا۔ آپ جب بھی کوئی بات خلاف شریعت دیکھتے

تو فوراً قائداعظم کے پاس وفد بھیجتے۔ دسمبر ۱۹۳۸ء کے بعد قائداعظم نے جو تقاریر کیں، ان سے مذہب اور سیاست کے متعلق ان کا نظریہ واضح ہو گیا کہ وہ اہل مغرب کی طرح مذہب اور سیاست کو ایک دوسرے سے الگ سمجھتے ہیں اور الگ رکھنا چاہتے ہیں۔ اس پر حضرت تھانوی نے مولانا شبیر علی تھانوی کو بلایا اور فرمایا:

"جناح صاحب کی تقریروں میں یہ دیکھا گیا ہے کہ مذہب اور سیاست کو الگ الگ سمجھتے ہیں۔ اس کی بابت ان کو سمجھانا ہے"

(روئیداد تبلیغ)

چنانچہ مولانا شبیر علی صاحب فوراً تیار ہو گئے۔ ان کی درخواست پر حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی، مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی ۱۲ فروری ۱۹۴۳ء کو وہاں پہنچ گئے۔ شام سات بجے قائداعظم سے بات ہوئی۔ مسئلہ زیر بحث یہی رہا کہ مذہب اور سیاست دونوں ایک ہی ہیں یا الگ الگ ہیں۔ اڑھائی گھنٹے کی گفتگو کے بعد قائداعظم نے وفد کی مصروفیات کو تسلیم کرتے ہوئے فرمایا:

"دنیا کے کسی مذہب میں سیاست مذہب سے الگ ہو یا نہ ہو میری سمجھ میں اب خوب آگیا ہے کہ اسلام میں سیاست مذہب سے الگ نہیں بلکہ مذہب کے تابع ہے"

(روئیداد تبلیغ ص ۷)

ایک اور مقام پر حضرت مولانا شبیر علی صاحب فرماتے ہیں، ایک موقعہ پر دورانِ گفتگو قائدِ اعظم نے فرمایا:

"بس! اگر آپ کا مطلب یہ ہے کہ میں بے چون وچرا آپ کا کہا مانوں تو میں تیار ہوں۔ آج تک تو میں آپ سے سمجھنے کے لیے بحث بھی کیا کرتا تھا، لیکن آج کے بعد میں خاموش بیٹھ کر سنوں گا اور مذہبی معاملات میں جو ہدایات آپ دیں گے اُن کو تسلیم کروں گا۔ کیونکہ مجھے حضرت تھانویؒ پر پورا پورا اعتماد ہے کہ مذہبی معاملات میں ان کا پایہ بہت بلند ہے اور ان کی رائے درست ہوتی ہے۔"

غرض یہ اور اس قسم کے کئی اور ایسے واقعات ہیں جن سے قائدِ اعظم اور حضرت تھانویؒ کے اصلاحی تعلق کا پتہ چلتا ہے۔ مولانا تھانویؒ احقاقِ حق اور ابطالِ باطل میں اپنی مثال آپ تھے جہاں آپ نے کھل کر مسلم لیگ کی حمایت کی، تحریکِ پاکستان میں علمائے کرام کو شمولیت کے لیے دعوت دی، وہاں کانگریس کی کھل کر مخالفت بھی کی۔ اس میں شک نہیں کہ قائدِ اعظم انتہائی بصیرت کے مالک تھے۔ سیاسی معاملات میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ تاہم اگر علمائے کرام کا ساتھ نہ ہوتا تو تحریکِ پاکستان میں کامیابی مشکل ہوتی۔ ۱۹۳۹ء میں "جمعیۃ العلماء ہند" کا اجلاس دہلی میں منعقد ہوا۔ جمعیّت کی طرف سے حضرت تھانویؒ کو بھی

دعوت دی گئی جس کے جواب میں آپ نے تحریر فرمایا:

اب تو واقعات نے مجھ کو اس رائے پر بہت ہی پختہ کر دیا ہے کہ مسلمانوں خصوصاً علماء کا کانگریس میں شریک ہونا میرے نزدیک مذہباً مہلک ہے۔ بلکہ کانگریس سے بیزاری کا اعلان کر دینا بہت ضروری ہے۔ علماء کو خود مسلمانوں کی تنظیم کرنی چاہیئے، اور مسلمانوں کا کانگریس میں داخل ہونا اور داخل کرنا میرے نزدیک ان کی دینی موت کے مترادف ہے۔"

(تحریک آزادی ص ۲۹)

(پروفیسر احمد سعید)
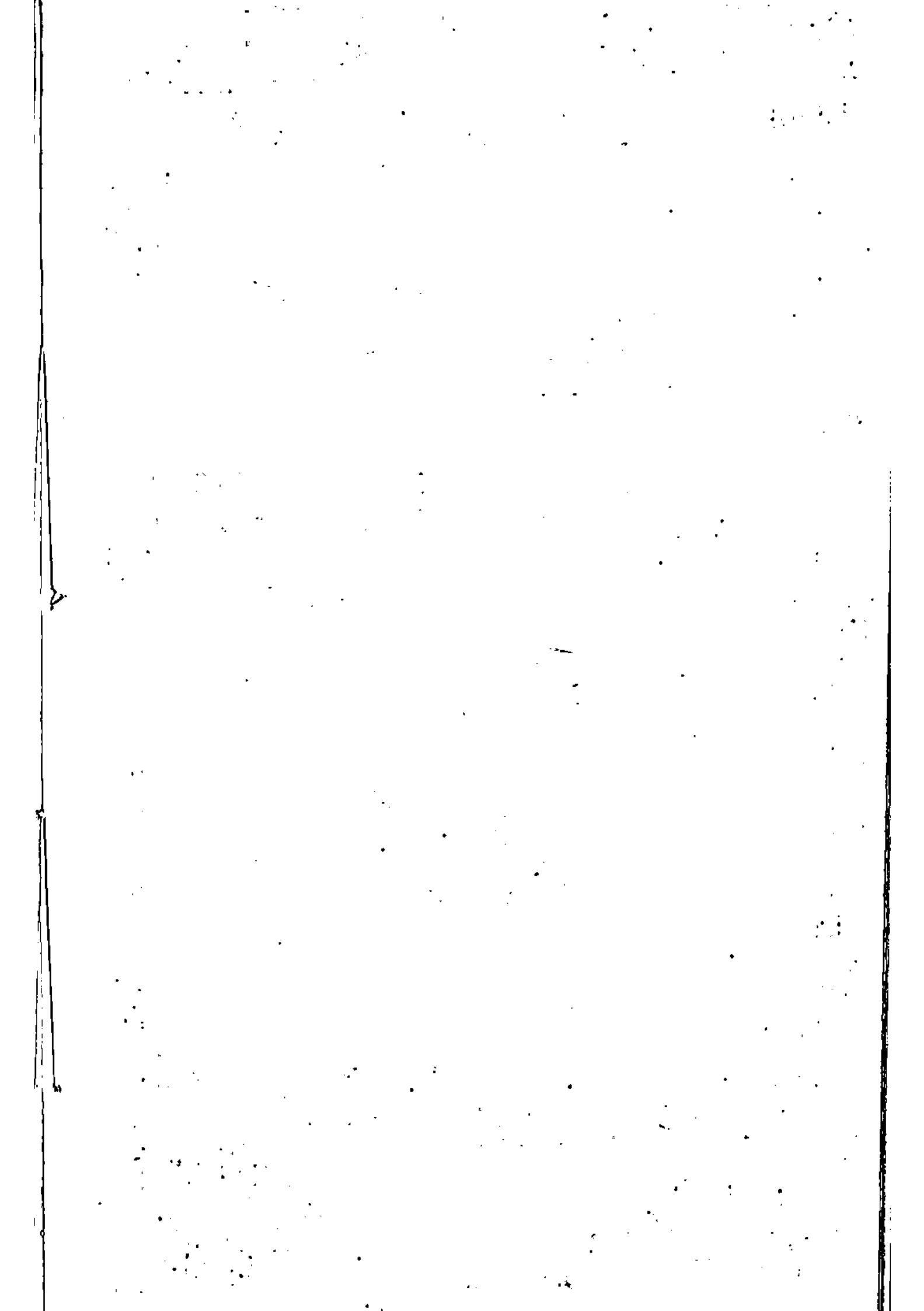
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت تھانویؒ اور تحریک خلافت

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ اگرچہ انیسویں اور بیسویں صدی کے نصف آخر اور نصف اوّل سے تعلق رکھتے تھے اور آپ کی وفات قیام پاکستان سے صرف چار سال پیشتر یعنی ۲۰ر جولائی ۱۹۴۳ء کو بروز سہ شنبہ ہوئی لیکن آپ کی گرانقدر علمی خدمات، تفقہ فی الدین، اتباع شریعت، رشد و ہدایت، تقویٰ وطہارت، اصلاح امت اور مجدّدانہ کارناموں کے پیش نظر جو آپ نے اپنی طویل زندگی کے آخری سانسوں تک انجام دیئے بلاشک وشبہ آپ کو اسلام کے عہد اوّل کے محدثین وائمۂ مجتہدین کے زمرے میں شمار کرنا چاہیئے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے فرزندان گرامی شاہ رفیع الدینؒ اور شاہ عبدالقادرؒ کے قرآنی تراجم کے علاوہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ کے ترجمۂ قرآن کی موجودگی میں جن کی صحت ومقبولیت اہل علم کے نزدیک مسلّم ومستند چلی آرہی ہے، مولانا تھانویؒ کی شہرۂ آفاق تفسیر "بیان القرآن" ان تمام تراجم وتفاسیر پر ایک گرانقدر علمی اضافہ ہے اور یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ اردو زبان کے تراجم وتفاسیر میں "بیان القرآن" جیسی شہرت ومقبولیت کسی دوسرے ترجمہ وتفسیر کو حاصل نہ ہوسکی۔

مولانا تھانویؒ کے اصلاحی اور تجدیدی کارناموں سے قطع نظر، اُن کی علمی خدمات کا تعارف پیش کرنا بھی کوئی آسان کام نہیں۔ علوم ومعارف اسلامی کا

جو سمندر اُن کی نوک قلم سے قطرہ قطرہ ہو کر ٹپکا اور مختلف علمی موضوعات پر جو صدہا تصانیف مرتب ہوئیں ان کے موضوعات کا احاطہ کرنا اور ان کی مکمل فہرست مرتّب کر دینا ہی بہت بڑی علمی خدمات شمار ہو گی اور خود اس پر ایک مستقل کتاب مرتب ہو جائے گی۔ تفسیر وحدیث، تصوّف وحکمت، تجوید وقرأت، عقائد وعبادات، سلوک وطریقت، منطق وکلام، سیاسیات ومعاملات غرض کونسا علمی موضوع ہے جس پر آپ نے قلم نہیں اٹھایا۔ آپ کی چھوٹی بڑی تصانیف ومؤلفات کی تعداد کم وبیش ایک ہزار تک پہنچ جاتی ہے اور برّصغیر کی علمی تاریخ میں شاہ ولی اللہ کے بعد اتنے بلند تر معیار اور اعلیٰ پیمانے پر حضرت تھانوی رح کے علاوہ کسی عالم ربانی نے علوم ومعارف اسلامی کی خدمت وترجمانی کی سعادت حاصل نہیں کی۔

مولانا تھانوی رح تاریخِ اسلام کی ان خوش نصیب ہستیوں میں سے ہیں جنہیں قدرت نے علومِ ظاہری اور علومِ باطنی کے کمالات سے بڑی فیاضی کے ساتھ نوازا اور اُن سے یکساں طور پر مستفید ہونے کے بیش از بیش مواقع مہیا کئے چنانچہ ظاہری علوم کی تکمیل کی سعادت مولانا محمد قاسم نانوتوی رح، مولانا فتح محمد تھانوی رح مولانا محمد یعقوب نانوتوی رح، شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی رح، مولانا سید احمد دہلوی رح اور مولانا محمد عبداللہ مہاجر مکی رح جیسے استادانِ کامل کی زیر سرپرستی حاصل ہوئی تو دوسری طرف شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رح جیسے مرشد کامل کی راہ نمائی میں منازلِ سلوک طے کرنے اور آپ کے روحانی فیوض وبرکات سے بہرہ مند ہونے کا پورا پورا موقع ملا جس کے نتیجہ میں آپ کی ذاتِ گرامی شریعت وطریقت کا دو آتشہ بن گئی اور آپ جامع شریعت وطریقت کہلائے۔

پھر جس طرح آپ کے استادانِ گرامی میں بڑے بڑے مشائخ اور جید علماءِ عصر شامل ہیں اسی طرح آپ کے شاگردانِ رشید اور فیض یافتگان میں بھی برصغیر کے اکابر علماء کی بہت بڑی تعداد نظر آتی ہے جن میں سے چند مسترشدین کے اسماءِ گرامی درج کئے جاتے ہیں۔ مولانا محمد اسحاق بردوانیؒ، مولانا احمد علی فتحپوریؒ، مولانا فضل حقؒ بارہ بنکی، شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، شیخ الاسلام مولانا ظفر احمد عثمانیؒ، مولانا سید احمد تھانویؒ، مولانا شاہ لطف رسولؒ بارہ بنکی، مولانا سید اسحاق علی کانپوریؒ، مولانا محمد رشید کانپوریؒ، مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ، مولانا مفتی محمد حسن امرتسریؒ، مولانا عبد الرحمٰن کاملپوریؒ، مولانا عبد الباری ندویؒ، مولانا عبد الماجد دریابادیؒ، مولانا خیر محمد جالندھریؒ، مولانا عبد الغنی پھولپوریؒ، مولانا جلیل احمد شیروانیؒ، مولانا اطہر علیؒ کشور گنج، مولانا حکیم محمد مصطفٰی بجنوریؒ، مولانا محمد عیسٰی محی الدین پوریؒ، مولانا رسول خاں صاحب ہزارویؒ، مولانا عبد الکریم گمتھلویؒ، مولانا قاری محمد طیب دیوبندیؒ، مولانا اسعد اللہ خاں رامپوریؒ اور مولانا محمد یوسف بنوریؒ رحمہم اللہ علیہم اجمعین۔

جن منتسبین و مسترشدین کے اسماءِ گرامی بیان کئے گئے ہیں یہ ان اکابر علماء میں سے ہیں جن کے علمی و روحانی فیوض کا سلسلہ برصغیر کے گوشے گوشے میں پھیلا ہوا ہے اور پاک و ہند کے تمام علمی و دینی مراکز انہی کے دم قدم سے آباد ہیں اور آج بھی جہاں جہاں علوم و معارفِ اسلامی کی کوئی کرن دکھائی دیتی ہے تو وہ ان انفاسِ قدسیہ ہی سے کسبِ نور کر رہی ہے، چنانچہ

ہندوستان میں دارالعلوم دیوبند کے روحِ رواں قاری محمد طیب، مظاہر العلوم سہارنپور کے مہتمم مولانا اسعد اللہ خاں اور پاکستان کی دینی درس گاہوں میں جامعہ اشرفیہ لاہور کے بانی مولانا مفتی محمد حسن امرتسریؒ، دارالعلوم ٹنڈو اللہ یار (سندھ) کے شیخ الحدیث حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ، دارالعلوم کراچی کے سرپرست وبانی مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ، خیر المدارس ملتان کے بانی ومہتمم مولانا خیر محمد جالندھریؒ، اور دارالعلوم نیوٹاؤن کراچی کے بانی وسرپرست مولانا محمد یوسف بنوریؒ جیسے علماء ومشائخ رہ چکے ہیں۔ ہندوستان وپاکستان کے علاوہ بنگلہ دیش کی معروف دینی درس گاہیں اشرف العلوم ڈھاکہ، جامعہ قرآنیہ لال باغ ڈھاکہ، اور دارالعلوم ہاٹ ہزاروی چاٹگام بھی حضرت تھانویؒ کے خدام ومنتسبین کے دم قدم سے آباد ہیں۔ غرض جس طرح شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے بارے میں ایک یمنی محدث نے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ سے کہا تھا کہ:

> "شاہ ولی اللہ طوبیٰ کا درخت ہے، جس طرح جہاں جہاں طوبیٰ کی شاخیں ہیں وہاں جنت ہے اور جہاں اس کی شاخیں نہیں ہیں وہاں جنت نہیں ہے، اسی طرح جہاں ولی اللہ کا سلسلہ ہے وہاں جنت ہے اور جہاں ان کا سلسلہ نہیں ہے وہاں جنت نہیں ہے۔"

بالکل یہی بات سلسلۂ اشرفیہ پہ صادق آتی ہے کہ برصغیر کے طول وعرض میں جہاں کہیں بھی علم وعرفان کی کوئی شمع فروزاں نظر آتی ہے وہ اسی آفتاب درخشاں کی شعاعِ نور ہے۔

یہاں یہ بتا دینا نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے کہ برصغیر کے اکابر علماء میں حضرت تھانویؒ ہی وہ پہلی شخصیت ہیں جنہوں نے مسلم لیگ اور مطالبۂ پاکستان کی تائید و حمایت میں پہلی آواز بلند کی، بلکہ خالص اسلامی مملکت کا تصوّر سب سے پہلے آپ ہی کے ذہن رسا میں پیدا ہوا۔ چنانچہ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ مدیر "صدق" لکھنؤ جون ۱۹۲۸ء میں حضرت تھانویؒ سے اپنی پہلی ملاقات کی تفصیل بیان کرتے ہوئے اپنی کتاب "نقوش و تاثرات" کے صفحہ ۲۳ پر لکھتے ہیں:۔

"پاکستان کا تخیل، خالص اسلامی حکومت کا خیال، یہ سب آوازیں بہت بعد کی ہیں، پہلے پہل اس قسم کی آواز یہیں کان میں پڑی، حضرتؒ کی گفتگو میں یہ جزو بالکل صاف تھا۔"

اس جزو خاص کی وضاحت کرتے ہوئے خود مولانا دریابادیؒ اپنے ایک مکتوب گرامی میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"حضرت کو بعض معاصر علماء کی طرح جنگِ آزادی، جنگِ حقوق، آزادیٔ وطن وغیرہ سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ ان کے سامنے مسئلہ سیاسی نہیں تھا تمامتر دینی تھا، وہ صرف اسلام کی حکومت چاہتے تھے۔ ۱۹۲۸ء میں جب پہلی بار حاضری ہوئی تو اس ملاقات میں حضرت نے دارالاسلام کی اسکیم خاصی تفصیل سے بیان فرمائی تھی کہ: جی یوں چاہتا ہے کہ ایک خطہ پر خالص اسلامی حکومت ہو، سارے قوانین و تعذیرات کا اجراً احکام شریعت کے مطابق ہو، بیت المال ہو، نظامِ زکوٰۃ رائج ہو، شرعی عدالتیں قائم ہوں وقس

عَلیٰ ھٰذٰا۔ دوسری قوموں کے ساتھ مل کر کام کرنے سے یہ نتائج
کہاں حاصل ہوسکتے ہیں؟ اس مقصد کے لئے تو صرف مسلمانوں ہی
کی جماعت ہونی چاہئے۔"

کانگریس اور مسلم لیگ کی علانیہ جنگ کا آغاز جھانسی کے ایک ضمنی الیکشن میں ہوا جو مسلم لیگ کو ۱۹۳۶ء میں لڑنا پڑی، کانگریس مسلم لیگ کے مقابلے میں بڑے بڑے کانگریسی علماء کو لے آئی۔ دوسری طرف مسلم لیگ کے کیمپ میں صرف مولانا شوکت علیؒ، مولانا ظفر علی خانؒ، اور مولانا مظہر الدینؒ مدیر "الامان" تھے جنہیں اخباری مولوی سمجھ کر نظر انداز کردیا گیا تھا، آخر مولانا شوکت علی مرحوم نے حضرت تھانویؒ سے بذریعہ جوابی تار دریافت کیا کہ ووٹ کس جماعت کو دیا جائے۔

حضرت تھانویؒ کا ذہن کانگریس کی مخالفت کے بارے میں تو بالکل صاف تھا لیکن ہنوز مسلم لیگ سے بھی کچھ مطمئن نہ تھے اور آپ نے ابھی تک شرح صدر کے ساتھ مسلم لیگ کی تائید و حمایت کا کوئی فیصلہ نہ کیا تھا اس لئے کسی نتیجہ پر پہنچنے کے لئے بغرض مشورہ اپنے حقیقی بھانجے حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ اور بھتیجے مولانا شبیر علی تھانویؒ کو طلب فرمایا۔ مسئلے کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے مشورہ دیا کہ آپ صرف اس مضمون کو تار ارسال فرمادیں کہ: "کانگریس کو ووٹ نہ دیا جائے۔"

حضرت کو یہ رائے بہت پسند آئی اور اسی وقت اس مضمون کا تار روانہ کردیا گیا۔ مولانا شوکت علی مرحوم نے حضرتؒ کے جوابی تار کے مضمون کو بڑے بڑے پوسٹروں کی شکل میں چھپوا کر شہر کے در و دیوار پر چسپاں کرادیا

مسلم لیگ کی حمایت کرنے والے علماء کرام کی کوئی باقاعدہ تنظیم ہونی چاہیے تو اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کی سعادت بھی حضرت تھانوی کے دست راست حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی کے حصّے میں آئی جن کی صدارت میں اکتوبر ۱۹۴۵ء کو کلکتہ کے خلافت پارک میں مرکزی جمعیتہ علماء اسلام کا تاسیسی اجلاس منعقد ہوا جس میں شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی کو صدر اور مولانا ظفر احمد عثمانی کو سینیئر نائب صدر منتخب کیا گیا، اور حضرت تھانوی کے انہی دو جرنیلوں نے متحدہ ہندوستان کی مسلم رائے عامہ کو مسلم لیگ اور مطالبۂ پاکستان کے حق میں ہموار کرنے کی ذمہ داری قبول کی، اور ایک سال کی قلیل مدت میں قیام پاکستان کی راہ ہموار کردی، اور آخر کار مولانا تھانوی کی وہ دیرینہ آرزو پوری ہوگئی جس کا اظہار ۱۹۲۸ء میں مولانا عبدالماجد دریابادی سے اپنی پہلی ملاقات کے موقع پر فرمایا تھا، اور قائداعظم نے ان بزرگوں کی خدمات جلیلہ کا اعتراف اسی طرح فرمایا کہ مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کی سرزمین پر پاکستان کی رسم پرچم کشائی ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کے موقع پر شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی اور مولانا ظفر احمد عثمانی کے ہاتھوں سے کرائی ؎

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

حکیم الامت حضرت تھانوی، تحریک خلافت اور کانگریس

ایک زمانہ وہ بھی تھا جب یہ بات سب کے لئے باعث حیرت تھی کہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی جیسی جامع کمالات شخصیت اپنے تمام تر علمی و روحانی تفوق اور مصلحانہ و مجددانہ کارناموں کے باوصف کانگریس کے ساتھ مل کر آزادیٔ وطن کی جدو جہد اور قومی تحریکات میں شرکت سے عملاً کنارہ کش

جس کے نتیجہ میں کانگریس کو مسلم لیگ کے مقابلے میں پہلی بار ذلت آمیز شکست اٹھانی پڑی، الیکشن سے فراغت پانے کے بعد مولانا شوکت علیؒ اور مولانا مظہر الدین مدیر "الامان" دہلی شکریہ ادا کرنے کے لئے حضرت کی خدمت میں تھانہ بھون حاضر ہوئے اور الیکشنی مہم کی تمام تفاصیل زبانی بیان کیں، اسی روز بعد نماز عشاء تھانہ بھون میں حضرتؒ کی اجازت سے مسلم لیگ کا ایک جلسۂ عام منعقد ہوا جس میں مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے مسلم لیگ کی تائید وحمایت میں پہلی بار تقریر فرمائی۔

جھانسی کے الیکشن میں مسلم لیگ کی تائید وحمایت کے بعد ۱۹۳۸ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس پٹنہ (بہار) کے موقع پر حضرت تھانویؒ نے مولانا ظفر احمد عثمانیؒ اور مولانا شبیر علی تھانویؒ کی معیت میں قائداعظمؒ اور اراکین مسلم لیگ کی اصلاح وتبلیغ کے سلسلے میں ایک تبلیغی وفد روانہ کیا جس نے قائداعظمؒ سے مل کر شعائرِ اسلامی کے احترام اور اتباع شریعت کی تلقین کی، اس تبلیغ کا یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ اگلے دن کے اجلاس کی تمام نشستوں میں قائداعظمؒ اور تمام حاضرینِ اجلاس نے تمام نمازیں باجماعت ادا کیں، ہر نماز کے وقت اجلاس ملتوی کیا گیا اور قائداعظمؒ نے اراکینِ وفد کے رُوبرو پابندی کے ساتھ نماز پڑھنے کا وعدہ فرمایا۔ اس کے بعد مولانا تھانویؒ کی طرف سے تبلیغی وفود اور تبلیغی خطوط کا سلسلہ برابر جاری رہا اور قائداعظمؒ ملکی اور دینی امور میں حضرت تھانویؒ سے مسلسل رہنمائی حاصل کرتے رہے، چنانچہ جب یہ خیال پیدا ہوا کہ جمعیۃ علماء ہند کے مقابلے میں

ہی رہی، ان پر جا و بیجا تنقیدیں بھی ہوئیں، مخالفانہ پروپیگنڈے کا نشانہ بھی بنے، تحریک آزادیٔ وطن سے بے تعلقی کے طعنے بھی دیئے گئے اور سب سے بڑھ کر ان پر اپنے استاد محترم حضرت شیخ الہندؒ مولانا محمود حسن کی مخالفت کے الزامات بھی عائد کئے گئے، لیکن حضرت تھانویؒ کی دینی اور سیاسی بصیرت نے اپنے لئے جو راہ عمل منتخب کی تھی بالآخر وہی درست ثابت ہوئی۔

سنہ ۱۹۱۸ء کی خلافت کمیٹی کی تحریکات میں اس دور کے تمام قابلِ ذکر زعماءِ قوم اور خود حضرت شیخ الہندؒ کی عملی شرکت کی وجہ سے حضرت تھانویؒ کے لئے بڑی کڑی آزمائش کا مرحلہ پیش آ گیا تھا، لیکن آپ اس غیر معمولی آزمائش سے جس سرخروئی اور ثابت قدمی کے ساتھ گزرے ہیں اس پر ان کی دینی اور سیاسی بصیرت کو جتنا بھی خراج تحسین پیش کیا جائے کم ہے۔

تحریک خلافت سے بے تعلقی اور اس تحریک کے خاتمے کے بعد مسلمانوں کی کانگریس میں انفرادی شرکت کے بارے میں حضرت تھانویؒ نے دو بالکل مختلف نقطہ ہائے نظر پیش کئے ہیں لیکن ان کے مخالفین نے ان کے بیّن فرق کو سمجھنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی بلکہ وہ بتکرار ایک ہی الزام دہراتے رہے کہ مولانا تھانویؒ کو جہاد حریت یا تحریکات آزادی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور وہ اپنے استاد گرامی حضرت شیخ الہندؒ سے بھی شدید اختلاف کے مرتکب ہوئے ہیں، یہی نہیں بلکہ ان پر انگریزی حکومت کا ایجنٹ ہونے اور گورنمنٹی آدمی ہونے کے بے سروپا الزامات بھی عائد کیے گئے۔ اس سلسلے میں ہم اپنی طرف سے کوئی صفائی پیش کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے بلکہ

ایک کٹر خلافتی، دیانتدار صحافی، مولانا محمد علی جوہرؒ کے دیرینہ رفیق کار اور ان کے اخبار "ہمدرد" کے ڈائریکٹر مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی کتاب "نقوش و تاثرات" کے دو اہم اقتباسات خود ان کے الفاظ میں نقل کرتے ہیں جو انہوں نے حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کی معیت میں حضرت تھانویؒ سے اپنی پہلی ملاقات کے ضمن میں تحریر کئے ہیں :-

"سنہ ۱۹۲۸ء تھا اور مخاطب روزنامہ "ہمدرد" کا ڈائرکٹر تھا، صبح اور دوپہر کی طویل صحبت میں سیاسی پہلوؤں پر گفتگو کا آجانا ناگزیر سا تھا، حضرتؒ نے اتنی معقولیت سے گفتگو فرمائی کہ ساری بدگمانیاں کافور ہو کر رہیں۔ کون کہتا ہے کہ حضرتؒ "گورنمنٹی" آدمی ہیں؟ لاحول ولاقوۃ۔ جس نے بھی ایسا کہا جان کر یا انجانے میں بہر حال جھوٹ ہی کہا، یہ تو خالص مسلمان کی گفتگو تھی، مسلمان بھی ایسا جو جوش دینی اور غیرت ملی میں کسی خلافتی سے ہرگز کم نہیں۔ پاکستان کا تخیل خالص اسلامی حکومت کا خیال یہ سب آوازیں بہت بعد کی ہیں۔ پہلے پہل اس قسم کی آواز یہیں کان میں پڑی۔ بس حضرتؒ کو ہم لوگوں کے اس وقت کے طریق کار سے پورا اختلاف تھا لیکن یہ اختلاف کچھ ایسا بڑا اختلاف نہ تھا۔"

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے اپنے جس طریق کار سے حضرت تھانویؒ کے اختلاف کا اظہار کیا ہے وہ خلافت کمیٹی اور کانگریس کی اس مشترکہ جدوجہد کے بارے میں ہے جب یہ دونوں جماعتیں اپنے جداگانہ جماعتی

تشخص کو برقرار رکھتے ہوئے تحریکات آزادی میں اشتراک عمل کر رہی تھیں۔ اس مرحلے پر اگرچہ مسلمانوں کا جداگانہ جماعتی تشخص برقرار تھا مگر حضرت تھانوی رح کی نگہ دوررس اور سیاسی بصیرت ہندوؤں کی عددی اکثریت میں مضمر خطرات کو برسوں پہلے بھانپ چکی تھی، جن کو علی برادران، مولانا حسرت اور مولانا عبدالماجد دریا بادی رح جیسے تجربہ کار سیاسی زعمائنے بہت عرصے کے بعد محسوس کیا۔ حضرت تھانوی رح نے اس اشتراک عمل کو بھی جو بظاہر دو جماعتوں "تحریکِ خلافت" اور "کانگریس" کے درمیان مساوی بنیاد پر قائم ہوا تھا اور جس میں دونوں جماعتوں کے جماعتی تشخص کو برقرار رکھنے کی پوری کوشش کی گئی تھی ہندوؤں کی محض عددی اکثریت اور معاندانہ ذہنیت کے پیشِ نظر مسلمانانِ ہند کے حق میں مضر اور مہلک ہی تصور کیا تھا حالانکہ یہ اشتراک مصالحت پر مبنی تھی نہ کہ متابعت پر اور اس مرحلے پر اپنے بھی اس اختلاف کو طریق کار ہی کا اختلاف سمجھا تھا، چنانچہ اپنی کتاب "بوادر النوادر" میں تحریر فرماتے ہیں:

"حضرت مولانا محمود حسن رح کا اشتراک مصالحت تھا نہ کہ متابعت، یعنی اس وقت تحریکِ خلافت نہایت قوت پر تھی جس سے حضرت مولانا رح کو قوی امید تھی کہ حکم اسلام کا غالب ہوگا اور ہم لوگوں کا خیال قرائن و وجدان سے اس کا عکس تھا، سو یہ اختلاف محض رائے کا اختلاف تھا اور مثل اختلاف حنفی رح، شافعی رح کے اجتہادی تھا، اس اشتراک میں متابعت کے شائبہ کا وہم بھی نہ تھا، یہی وجہ

تھی کہ اگر کسی وقت کسی شعائر اسلامی کے ضعف یا کسی شعائر کفر کی قوت کا اندیشہ ہوتا تھا تو فوراً اس پر تنقید شدید فرماتے۔"
(بوادر النوادر: ص ۹۶۶)

چنانچہ جمعیۃ علماء ہند کے سالانہ اجلاس کے موقع پر خود حضرت شیخ الہندؒ نے اپنے خطبۂ صدارت میں حضرت تھانویؒ کے مذکورہ بالا خیالات کی ان الفاظ میں تائید فرمائی ہے:

"اسلام نے احسان کا بدلہ احسان قرار دیا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ احسان اس کا نام ہے کہ آپ اپنی چیز کسی کو دیدیں۔ کسی دوسرے کی چیز اٹھا کر دینے کو احسان نہیں کہتے۔ اس لئے آپ برادران وطن (ہندوؤں، سکھوں) کے احسان کے بدلے میں وہی کام کرسکتے ہیں جو اخلاقی اور شریفانہ طور پر اپنے اختیارات سے کرسکتے ہیں۔ مذہبی احکام خدا کی امانت ہیں، ان پر تمہارا اختیار نہیں ہے۔ اس لئے لازم ہے کہ حدود مذہب کے اندر رہ کر تم احسان کے بدلے احسان کرو۔ اور دونوں قومیں مل کر ایک ایسے زبردست دشمن کے مقابلے میں کھڑے ہوجاؤ جو تمہارے مذہب اور تمہاری آزادی کو پامال کر رہا ہے"۔

پھر انہی خیالات کی مزید توضیح و ترجمانی حضرت شیخ الہندؒ کے "خطبۂ ترک موالات" میں بایں الفاظ موجود ہے:

"بہت سے خیرخواہ ہندو مسلم اتحاد کے عواقب از عوام الناس

اور بعض لیڈروں کی ان غلط کارروائیوں پر متنبہ فرما رہے ہیں جو اس اتفاق کے جوش سے پیدا ہوئی ہیں۔ مثلاً قربانی گاؤ میں بعض جگہ تشدد و مزاحمت کیا جانا، یا قربانی کے جانور سجا کر رضاکارانہ طور پر گئو شالہ میں پہنچانا، یا قشقہ لگانا یا ہندوؤں کی ارتھیوں کے ساتھ رام رام ست کہتے ہوئے جانا، یا یہ کہنا کہ امام مہدی کی جگہ امام گاندھی تشریف لائے ہیں، یا یہ کہ اگر نبوت ختم نہ ہو گئی ہوتی تو مہاتما گاندھی نبی ہوتے یا قرآن وحدیث کی خدمت میں بسر کی ہوئی عمر نشارِیت پرستی کرنا، یا یہ دعا کرنا کہ اگر میں کوئی مذہب تبدیل کروں تو سکھوں کے مذہب میں داخل ہوں وغیرہ۔

بلا شبہ میں جب بھی اپنی قوم کے بڑے سر برآوردہ افراد کو سنتا ہوں کہ وہ اس قسم کے محرمات یا کفریات کے مرتکب ہوتے ہیں اور وہ باتیں زبان سے بے دھڑک نکال دیتے ہیں جن کو سُن کر ایک سچے مسلمان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں تو میرا دل پاش پاش ہو جاتا ہے۔ اور قصد کرتا ہوں کہ اس طوفان بے تمیزی کو روکنا جب اپنی قدرت میں نہیں تو ان معاملات سے بالکل یکسوئی بہتر ہے۔"

حضرت شیخ الہندؒ کے یہ ارشادات اس اشتراکِ عمل سے بیزاری بلکہ اس سے کنارہ کشی اختیار فرمانے کے عزم کو ظاہر کر رہے ہیں جس کے ذریعہ ہندوؤں سے مساوی بنیاد پر جماعتی اشتراکِ عمل کیا گیا تھا اور جس میں متابعت

ومتبوعیت کا اس وقت تک کوئی شائبہ تک نہ تھا، لیکن حضرت تھانوی رح اس وقت بھی محسوس فرما رہے تھے کہ ہندوؤں کی معاندانہ ذہنیت اور عددی اکثریت بالآخر مسلمانوں کے جداگانہ قومی تشخص کے لئے ایک نہ ایک دن زبردست خطرہ ثابت ہوکر رہے گی اور یہ اشتراکِ عمل زیادہ عرصے تک مساویانہ بنیاد پر قائم نہ رہ سکے گا۔ لیکن اس وقت اس نقطۂ نظر کو حضرت تھانوی رح نے بھی محض اختلاف رائے کا یا مثل اختلاف حنفی رح و شافعی رح اجتہادی اختلاف ہی کا درجہ دیا تھا۔ اور اس اتحاد کو دو قوموں یا دو جماعتوں کے مابین ایک مساوی معاہدے کی حیثیت دی تھی جس کے لئے ان کی نظر میں یہ شرعی جواز موجود تھا کہ اس اشتراکِ عمل کو مسلمانانِ مدینہ اور یہودیوں کے مابین طے پانے والے معاہدے کے ساتھ تشبیہ دی جاسکتی تھی لیکن وہ اپنی دینی اور سیاسی بصیرت سے اس وقت بھی اس اتحاد کو سیاسی اعتبار سے مسلمانوں کے حق میں نقصان دہ تصور کرتے تھے کیونکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ تحریک خلافت کا وقتی جوش وخروش ختم ہونے کے بعد ہندوؤں کی عددی اکثریت اور مسلمانوں کی غیر مؤثر اقلیت کے مابین قائم ہونے والا یہ اتحاد مساوی بنیاد پر برقرار نہ رہ سکے گا، بلکہ مسلمانوں کو کسی نہ کسی وقت انفرادی طور پر کانگریس میں شرکت پر مجبور کیا جائے گا اور اس طرح غیر مسلموں کے ساتھ اتحادِ عمل کے لئے غلبۂ اسلام اور جماعتی معاہدے کی شرط بھی برقرار نہ رہ سکے گی، چنانچہ یہی ہوا، تحریک خلافت کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا، یہ جماعت جماعتی حیثیت سے ختم ہوگئی اور اس کے بیشتر ارکان انفرادی طور پر

کانگریس میں شریک ہوگئے، جس کے نتیجہ میں کانگریسی مسلمان ایک ہندو اکثریتی جماعت میں قطعی طور پر ایک غیر مؤثر اقلیت بن کر رہ گئے، اور اس کے بعد شرعی طور پر غلبۂ اسلام کی شرط یا مساوی بنیاد پر جماعتی معاہدے کی شکل بھی باقی نہ رہی، اندریں حالات تحریک خلافت کے خاتمے کے بعد انفرادی طور پر مسلمانوں کی کانگریس میں شرکت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور یہود مدینہ کے مابین طے پانے والے معاہدے (میثاق مدینہ) پر قیاس کرنے کا شرعی جواز بھی موجود نہ رہا، اس لئے حضرت تھانوی نے تحریک خلافت کے خاتمے کے بعد کانگریس میں جو خالص ہندو اکثریتی جماعت تھی مسلمانوں کی انفرادی شرکت پر عدم جواز کا فتویٰ صادر فرمادیا تھا کیونکہ اندریں حالات غلبۂ کفر اور مسلمانوں کے غیر مؤثر عنصر ہونے کی صورت میں کفار و مشرکین کے ساتھ "موالات" کی سرے سے کوئی گنجائش ہی باقی نہ رہی تھی کیونکہ قرآن کریم میں جابجا "موالات بالکفار" کی صریح طور پر ممانعت کی گئی ہے۔ چنانچہ سورۂ آلِ عمران میں ارشاد ہے :-

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ ۚ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللَّهِ فِي شَيْءٍ

"مومنوں کو چاہیئے کہ وہ مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست نہ بنائیں اور جو شخص ایسا کرے گا سو وہ اللہ سے دوستی رکھنے میں کسی شمار میں نہیں"

یہی مضمون سورۃ النساء میں اس طرح بیان کیا گیا ہے :-

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكَافِرِيْنَ اَوْلِيَاۤءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ط اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطَانًا مُّبِيْنًا ہ

"اے پیروانِ دعوت ایمانی! مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست نہ بناؤ۔ کیا تم یوں چاہتے ہو کہ اپنے اوپر اللہ کی حجت صریح قائم کر لو۔"

مندرجہ بالا نصوص قرآنی کی روشنی میں حضرت شیخ الہندؒ کے دور تک کانگریس کے ساتھ جدوجہد آزادی میں مسلمانوں کی شرکت، دو قوموں یا دو جماعتوں کے مابین طے پانے والے معاہدات کی بنیاد چونکہ مصالحت و مصلحت پر مبنی تھی جس کے لئے میثاق مدینہ اور دیگر معاہدات نبوی کی نظیر موجود تھی لہٰذا اس کے جواز میں حضرت تھانویؒ اور اُن کے ہم خیال علماء کرام کو کوئی شک و شبہ نہ تھا بلکہ وہ محض اپنے قرائن و وجدان کی روشنی میں اس اشتراک عمل کو بھی مسلمانوں کے حق میں مضر ہی سمجھتے تھے، لیکن بعد ازاں انفرادی طور پر مسلمانوں کی شرکت کانگریس کی صورت میں چونکہ سراسر کفر کی متابعت تھی جس کیلئے ان کے نزدیک اسلام میں کوئی گنجائش نہ تھی چنانچہ حضرت تھانویؒ اپنے اس شرعی موقف کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"بخلاف اس وقت کی حالت کے کہ اب کانگریس کی قوت سے کفر و شرک کا حکم غالب ہے، اس وقت کا اشتراک بصورت ادغام

بالکل متابعت ہے جو کہ ناجائز ہے۔" (بحوالہ، بوادر النوادر)

اسی ضمن میں حضرت مولانا محمود حسنؒ کے اشتراکِ عمل کی تعبیر و ترجمانی ان الفاظ کے ساتھ کرتے ہیں۔

"حامیانِ کانگریس میں سے بعض حضرات اس اشتراک کو حضرت مولانا دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کا اتباع سمجھتے ہیں اور بعض اصحاب اس اختلاف کو مثل حنفی، شافعی کے خیال کرتے ہیں، سو میرے نزدیک یہ دونوں خیال محض غلط ہیں حضرت مولاناؒ کا اشتراک مصالحت تھا۔ نہ کہ متابعت۔" (بوادر النوادر)

غرض اسلام کی رُو سے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے مابین اشتراکِ عمل کی دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ حکم اسلام غالب ہو اور مسلمان غالب عنصر کی حیثیت سے کسی جماعتی معاہدے کے فریق بنے ہوں جس کی مثال میثاق مدینہ سے دی جاسکتی ہے، دوسری صورت یہ ہے کہ مساوی بنیاد پر مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان صلح و امن کا کوئی معاہدہ طے پا گیا ہو جس کی مثال صلح حدیبیہ یا غیر مسلم اقوام کے ساتھ مسلمانوں کے دیگر معاہدات سے پیش کی جاسکتی ہے۔ لیکن مدنی زندگی کے ۱۳ سالہ عہدِ رسالت یا خلافت راشدہ کے تیس سالہ دورِ حکومت سے کوئی ایک مثال بھی ایسی پیش نہیں کی جاسکتی کہ مسلمانوں نے کسی غیر مسلم جماعت یا کافر ملک سے ایسی صورت میں اشتراکِ عمل کا معاہدہ کیا ہو جس میں حکم کفر غالب ہو اور مسلمان مغلوب عنصر کی حیثیت سے فریق معاہدہ بنتے ہوں۔

جو حضرات آج بھی متحدہ قومیت اور کانگریس نواز ذہنیت

کے لئے اپنے دلوں میں نرم گوشہ رکھتے ہیں۔ اور بعض نام نہاد فارمولوں کو پاکستان کے بنیادی تصور "دو قومی نظریے" کا نعم البدل ثابت کرنے کی کوششوں میں اپنا زورِ قلم صرف کر رہے ہیں وہ غیر مسلم اقوام کے ساتھ اشتراکِ عمل کی بیّنہ شرائط کی روشنی میں خود ہی اس بات کا فیصلہ کر لیں کہ کانگریس میں مسلمانوں کی شرکت کی نوعیت کیا تھی؟ اور حصولِ آزادی کے بعد ایک متحدہ قانون ساز اسمبلی میں کفر و اسلام کی آمیزش سے جو دستور مرتب ہوتا اور مشترکہ قانون سازی کی جاتی اس کے لئے ان کی نظر میں جواز کی کیا صورت تھی؟۔

مقالہ نمبر ۳۴

از
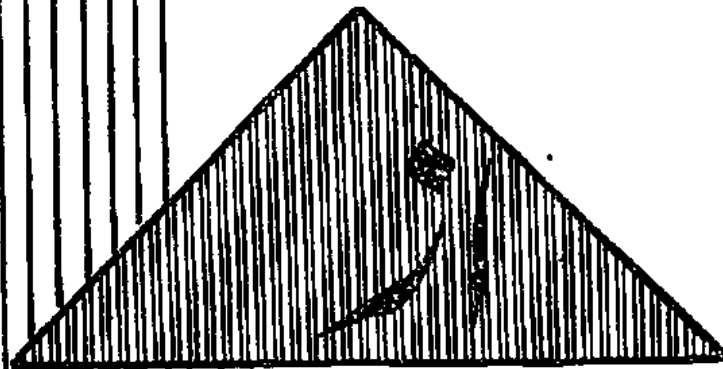
موتُ العَالِم موتُ العَالَم

محفل دو شیں کا وہ چراغ سحر جو کئی سال سے ضعف و مرض کے جھونکوں سے بجھ بجھ کر سنبھل جاتا تھا بالآخر ۸۲ سال ۳ ماہ ۱۰ روز جل کر ۱۵ رجب ۱۳۶۲ھ کی شب کو ہمیشہ کے لئے بجھ گیا،

داغِ فراق صحبتِ شب کی جلی ہوئی　　اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

یعنی حکیم اُمت، مجددِ طریقت، شیخ الکل حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے مرضِ ضعف و اسہال میں کئی ماہ علیل رہ کر ۱۹۔ اور ۲۰ جولائی کی درمیانی شب کو ۱۰ بجے نمازِ عشاء کے وقت اس دار فانی کو الوداع کہا، اور اپنے لاکھوں معتقدوں اور مریدوں اور مستفیدوں کو غمگین و مجبور چھوڑا، انا للہ وانا الیہ راجعون ○ اب اس دور کا بالکلیہ خاتمہ ہو گیا جو حضرت شاہ امداد اللہ صاحب تھانوی کی یادگار تھا اور جس کی ذات میں حضرات چشت اور حضرت مجدد الف ثانی اور حضرت سید احمد بریلوی کی نسبتیں یکجا تھیں، جس کا سینہ چشتی ذوق و عشق اور مجددی سکون و محبت کا مجمع البحرین تھا، جس کی زبان شریعت و طریقت کی وحدت کی ترجمان تھی، جس کے قلم نے فقہ و تصوف کو ایک مدت کی ہنگامہ آرائی کے بعد باہم ہم آغوش کیا تھا اور جس کے فیض نے تقریباً نصف صدی تک اللہ تعالیٰ کے فضل و توفیق سے اپنی تعلیم و تربیت اور تزکیہ و ہدایت سے ایک عالم کو مستفید بنا رکھا تھا، اور جس نے اپنی

تحریر و تقریر سے حقائق ایمانی، دقائق فقہی، اسرار احسانی اور رموزِ حکمتِ ربانی کو برملا فاش کیا تھا، اور اسی لئے دنیا نے اُس کو حکیم الامت کہہ کر پکارا، اور حقیقت یہ ہے کہ اس اشرف زمانہ کے لئے یہ خطاب عین حقیقت تھا،

سوانح

حضرت کی پیدائش ۵ ربیع الثانی ۱۲۸۰ھ کو چہار شنبہ کے دن ہوئی، ابتدائی عربی تعلیم تھانہ بھون میں مولانا فتح محمد صاحب تھانوی سے حاصل کی، ۱۲۹۵ھ سے شروع ۱۳۰۱ھ تک مدرسہ دیوبند میں رہ کر مولانا یعقوب صاحب کے حلقہ میں تکمیل کی، فراغت کے بعد ہی ۱۳۰۱ھ میں مدرس ہو کر کانپور آگئے اور چودہ سال یہاں مقیم رہے اور اپنے درس، مواعظ اور فتاوٰی سے لوگوں کو مستفید کیا،

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے ذریعہ سے بواسطہ خط کے غائبانہ بیعت مہاجر الی اللہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ سے ۱۲۹۹ھ میں ہو چکی تھی، لیکن ۱۳۰۱ھ کے آخر میں ایام حج میں بعد حج حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں اخذ فیض فرمایا، اور واپس آکر ۱۳۰۶ھ تک علمی مشاغل تصنیف و تالیف اور تدریس کے ساتھ ذکر و شغل بھی ضمناً معمول رہا، مگر ۱۳۰۷ھ میں رنگ نے پلٹا کھایا اور یہ رنگ بڑھتا گیا، یہاں تک کہ ۱۳۱۰ھ میں مظطربانہ اور والہانہ حج کا دوبارہ ارادہ کیا، اور حضرت حاجی صاحب کی خدمت بابرکت میں حاضر ہو کر دوبارہ ایک زمانہ خاص تک رہ کر استفادہ باطنی فرمایا، واپس آکر ۱۳۱۴ھ تک پھر کانپور میں رہے، آخر حضرت حاجی صاحب کے مشورہ کے مطابق ۱۳۱۵ھ میں کانپور سے ترک تعلق فرما کر تھانہ بھون میں متوکلانہ اقامت فرمائی، اور اس وقت سے لے کر اخیر وقت تک یعنی اس ۱۳۶۲ھ تک اسی شان سے خانقاہ امدادیہ کی سہ دری

میں بیٹھ کر افادہ و افاضہ میں برابر مصروف رہے اور ایک خلق کو اپنی برکات سے بہرہ مند فرمایا، اس اثناء میں اپنی مواعظ، تصانیف و ملفوظات سے لاکھوں کو انسان، ہزاروں کو مسلمان اور سیکڑوں کو متقی کامل بنا دیا، اور حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یہ دعا یا پیشین گوئی پوری ہوئی۔

"بہتر ہوا کہ آپ تھانہ بھون تشریف لے گئے، اُمید ہے کہ آپ سے خلائق کثیر کو فائدہ ظاہری و باطنی ہو گا اور آپ ہمارے مدرسہ و مسجد کو از سرِ نو آباد کریں، میں ہر وقت آپ کے حال میں دعا کرتا ہوں اور خیال رہتا ہے۔" ۱۲ ربیع الثانی ۱۳۱۵ھ

تصانیف

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف و رسائل کی تعداد آٹھ سو کے قریب ہے، اور کل کی کل تحقیقات علمیہ، حقائق دینیہ اور نکات احسانیہ سے لبریز ہیں، ان میں تفسیر بیان القرآن، شرح مثنوی، فتاویٰ امدادیہ، التعرف الی التصوف اور بہشتی زیور وغیرہ کتابیں کئی کئی جلدوں میں ہیں، ملفوظات اور مواعظ و خطبات کی تعداد سیکڑوں کی حد تک ہے، ان تصانیف میں قرآن پاک کی مشکل آیات کریمہ کی تفسیر، احادیث شریف کی شرح، فقہ کے مشکل مسائل کا جواب سلوک و طریقت کے نکتے، اخلاقی فضائل و رذائل کی حکیمانہ تحقیق اور اُن کے حصول و ازالہ کی تدبیر اور زمانہ حال کے شکوک و شبہات کے جوابات سب کچھ ہیں، تصانیف میں متفرق علوم و مسائل اس کثرت سے ہیں کہ اگر اُن سے کسی ایک موضوع کے مباحث کو علیحدہ علیحدہ کیا جائے تو ایک ایک مستقل کتاب بن جائیں، چنانچہ حضرت کے تربیت یافتوں نے اس قسم کے بیسیوں مجموعے تیار کئے ہیں، سب سے اخیر میں اس قسم کا مجموعہ

بوادر النوادر کے نام سے ایک ہزار صفحوں میں چھپ کر شائع ہوا ہے، خطوط کے جوابات کا جن کے متعلق وفات کے دن تک اہتمام یہ رہا کہ آج کے خط کا جواب کل کے لئے اٹھا نہ رکھا جائے، عظیم الشان دفتر الگ ہے،

تصنیفات میں بلکہ ہر تحریر میں اہل نظر کو یہ معلوم ہوگا کہ گویا مصنف کے سامنے سارے مسائل و مواد یکجا ہیں، اور وہ سب کو اپنی اپنی جگہ احتیاط سے رکھتا جاتا ہے، عام طور سے یہ ہوتا ہے کہ مصنف جس موضوع پر قلم اٹھاتا ہے اس کو اس میں ایسا غلو ہو جاتا ہے کہ دوسرے گوشوں سے اس کو ذہول ہو جاتا ہے، حضرت کی تصانیف کی خاص بات یہ ہے کہ قلم ہر ایک کی احتیاط اور رعایت کرکے اور غلو سے بچ کر اس طرح نکلتا ہے کہ جاننے والوں پر حیرت چھا جاتی ہے، حضرت کا ترجمۂ قرآن پاک تاثیر، سہولت بیان اور وضوح مطالب میں اپنا آپ نظیر ہے، بہشتی زیور کہنے کو تو عورتوں کی کتاب ہے، مگر فقہ حنفی کی ضروریات کے لئے انتہائی احتیاط و کاوش کا نتیجہ ہے، تفسیر بیان القرآن کو یوں سمجھنا چاہیئے کہ روح المعانی اور تفاسیر ماسبق کی اردو میں حد درجہ محتاطانہ ترجمان ہے، سلوک و طریقت کی کتابوں کا بھی یہی حال ہے،

حضرت کی تجدید طریقت کا بڑا کمال یہ ہے کہ ہندوستان میں بلکہ تمام دنیا میں وہ عامیانہ تصوف بلکہ جوگ تک سے وہ مل گئی تھی، اس کو زوائد و حواشی سے صاف کرکے قدماء اور سلف صالحین کے رنگ پر لے آئے

؎ کبھی فرصت سے سن لینا بڑی ہے داستان میری

علالت طبع | حضرت کی صحت ادھر چند سال سے روبا انحطاط تھی، دو[۲]

دفعہ خاص علاج کی غرض سے لکھنؤ تشریف لانا ہوا، اور دونوں دفعہ صحت و عافیت کے ساتھ مراجعت ہوئی، علالت اصلی یہ تھی کہ معدہ جگر کا فعل صحیح نہیں رہا تھا، علاج سے طبع مبارک اصلاح پذیر ہو جاتی تھی، مگر بالکلیہ ازالہ نہیں ہوتا تھا، اس دفعہ دو تین ماہ سے طبیعت پر اضمحلال طاری تھا، چنانچہ علاج کے لئے سہارنپور تشریف لے گئے اور چند روز قیام فرما کر واپس تشریف لے گئے لیکن طبیعت صاف نہیں ہوئی، وطن میں حکیم سعید صاحب گنگوہی کا علاج شروع ہوا اور ورم جگر و معدہ کا مرض تشخیص ہوا، مگر فائدہ نہ ہوا، اشتہا ساقط تھی، روزانہ اسہال کی تعداد چالیس پچاس تک پہنچ گئی اور ضعف روز بروز بڑھتا گیا، وصال سے قریب بیس روز پہلے حکیم خلیل صاحب سہارنپوری کا علاج شروع ہوا، ضعف معدہ اور ضعف جگر کی تجویز تھی، حکیم صاحب کے علاج سے دستوں میں کمی آگئی، مگر اشتہا بالکل ہی ساقط تھی اور ضعف میں ترقی ہی ہوتی رہی۔

میری آخری حاضری

خاکسار جون کے آخر میں اپنے مستقر سے تھانہ بھون اور پھر بھوپال کے ارادہ سے روانہ ہوا لیکن لکھنؤ پہنچ کر دارالعلوم ندوہ کے معاملات نے الجھا لیا، لکھنؤ میں ہر روز حضرت کی شدت علالت کی اطلاعیں آرہی تھیں، حضرت کے ہزاروں معتقدوں کی طرح خاکسار بھی زیارت کے لئے بے چین تھا، حضرت کی طرف سے سخت قدغن تھی کہ باہر لوگوں کو اس شدت علالت اور کیفیت مزاج کی کوئی اطلاع نہ دی جائے تاکہ مخلصین میں اضطراب نہ پیدا ہو اور وہ سفر کی زحمت نہ اٹھائیں

جو پہنچ جاتے تھے عام طور سے بطور تنبیہ ان کو اندر جانے کی اجازت نہیں ملتی تھی، اس پر بھی خاکسار خلاف دستور بے اطلاع ۶ رجولائی کو لکھنؤ سے روانہ ہوگیا، اور ۷ رکی دوپہر کو عین بارش کی حالت میں اسٹیشن سے خانقاہ تک پیادہ پا بھیگتے ہوئے پہنچا، دریافت حال سے معلوم ہوا کہ افاقہ کی صورت ہے، جس سے تسکین ہوئی، میرا اس طرح خلاف دستور بے اطلاع اچانک پہنچ جانا حضرت کے لئے تعجب کا موجب ہوا، میری آمد کے خبر دینے والے سے پوچھا تم مولوی سلیمان کو پہچانتے بھی ہو یا یونہی کہہ رہے ہو، اس نے اثبات میں جواب دیا تو ارشاد ہوا کہ ان کی عادت بے اطلاع آنے کی نہ تھی، حضرت کے عزیز خاص مولانا جمیل احمد صاحب نے عرض کی کہ حضرت کی علالت کی خبر سُن کر چلے آئے ہوں گے، نماز ظہر کے بعد مجلس میں حاضری ہوئی، ضعف سے بستر پر لیٹے تھے، مصافحہ فرمایا، خاکسار نے دستِ مبارک کو بوسہ دیا، شفقت سے بشاشت ظاہر فرمائی، سفر کا حال پوچھا، کسی خادم کے ساتھ نہ لینے پر نصیحت فرمائی، قیام کے دن پوچھے، خاکسار نے بھوپال کے سفر کی ضرورت ظاہر کی کہ سرکار بھوپال نے اپنی ریاست میں مسلمان عورتوں کے طلاق و تفریق کے مسائل کے طے کرنے کے لئے علماء اور اہلِ قانون کی ایک مجلس مقرر کی ہے، اُسی کی شرکت کے لئے مع مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب یہاں سے جانا چاہتا ہوں، اس لئے مجلس کی تاریخ کی اطلاع تک یہاں چند روز رہنا چاہتا ہوں،

فرمایا اللہ تعالیٰ والیۂ بھوپال پر رحمت فرمائے کہ انھوں نے مسلمان عورتوں کے حال پر رحم کھایا، خاکسار نے عرض کی کہ حضرت وہاں اب والیہ نہیں، والی

ہیں، فرمایا ٹھیک ہے، غرض اس حالت میں بھی کہ ضعف پوری شدت پر تھا، تکلم میں تکلف تھا، پھر بھی حاضرین مجلس پر شفقت فرماکر ملفوظات سے ذرا تھم تھم کر بہرہ ور فرما رہے تھے، اور لوگوں کے آئے ہوئے خطوط سُن رہے تھے، اور بدستور جواب لکھوا رہے تھے، بلکہ بعض بعض خطوط پر خود دست مبارک سے بھی لکھ دیتے تھے، کبھی جو قوت پاتے اور اس وقت کام کرنے لگتے یا ملفوظات ارشاد فرمانے لگتے تو تھوڑی دیر کے لئے حاضرین کو یہ خیال ہوتے لگتا کہ حضرت بیمار ہی نہیں، مگر ادھر جوش بیان کم ہوا اور اُدھر سر تکیہ پر رکھ دیا، ہمیشہ کی عادت یہ تھی کہ بڑا تکیہ پیٹھ سے لگا کر سر کو بے سہارے اونچا رکھتے تھے، یہی حال اس وقت بھی تھا، دیکھنے والوں کو تکلیف معلوم ہوتی اور اس مشورہ کو جی چاہتا تھا کہ دوسرا تکیہ اور رکھ کر اس پر حضرت سر مبارک کو رکھ لیں، چنانچہ میں نے اپنی نادانی سے یہ عرض کیا تو ارشاد ہوا نہیں اس کی حاجت نہیں، بعد کو خواجہ صاحب (خواجہ عزیز الحسن صاحب غوری ریٹائرڈ انسپکٹر آف اسکولس یو پی، جو حضرت کے خلیفۂ خاص، محرم خاص بلکہ خادم خاص ہیں) نے فرمایا کہ حضرت کی ہمیشہ کی عادت یہی ہے، اس ضعف و اضمحلال کی حالت میں بھی مجلس کا وقار، نظم و ضبط اور اصول و قواعد کی پابندی بدستور جاری تھی، اور اخیر لمحۂ حیات تک اس میں فرق نہیں آیا،

عصر کے وقت مجلس برخاست ہوئی تو ارشاد فرمایا کہ کھانے کے الگ انتظام کی ضرورت نہیں، چند روز کے مہمانوں کے لئے اس کی ضرورت نہیں، بڑے گھر سے کھانا جائے گا، اور ایک خادم خاص کو اس کی ہدایت فرمائی، اس ناسزاوار کے لئے تو یہ خیر و برکت کا سامان تھا، یہ بھی ارشاد ہوا کہ جب چاہو اور جس وقت چاہو

آسکتے ہو کوئی قید نہیں، یہاں سے اٹھ کر جب خانقاہ پہنچا تو بعد نماز حضرت والا کی طرف سے حضرت کی آخیر تصنیف بوادر النوادر کا ایک نسخہ مولانا جمیل احمد صاحب نے ہدیہ لاکر عنایت فرمایا اور یہ ارشاد گرامی پہنچایا کہ میرے مضامین سے اقتباسات جمع کر کے شائع کرو، اس حکم کو اپنی ہدایت ورہنمائی کا نسخہ سمجھ کر اپنی سعادت کا اظہار کیا، دوسرے دن حاضری کے موقع پر حضرت نے اپنی زبان مبارک سے خود یہ ارشاد فرمانا چاہا تو خاکسار نے حضرت کی زحمت تکلم کے خیال سے عرض کیا کہ یہ ارشاد مبارک مولانا جمیل احمد صاحب کے ذریعہ پہنچ چکا، مگر وہاں سے اٹھنے کے بعد مولانا جمیل صاحب سے جب میں نے پوچھا کہ حضرت کا مقصود کیا ہے، یعنی اس کتاب بوادر سے اقتباس یا عام کتابوں سے، انہوں نے فرمایا، اس کو میں نے اچھی طرح خود بھی نہیں سمجھا، بعد کی حاضری میں موقع پاکر میں نے تفصیل چاہی تو ارشاد ہوا نہیں عام کتابوں میں جو مضمون مفید نظر آئیں ان کو یکجا کر لیا کرو،

آخری حالات

میری حاضری ۷ رجولائی سے ۱۱ رجولائی کی دوپہر تک رہی، اشتہار کا سقوط اور ضعف کا استیلا اپنی حالت پر رہا، دست پانچ، چھ، سات تک آتے رہتے، مزید یہ کہ ہاتھوں اور پاؤں پر ورم تھا، ہاتھ اور پاؤں کی انگلیوں کے ناخنوں میں نیلاہٹ نمودار ہو گئی تھی جو باعث تشویش تھی، دو روز کے بعد اس میں کمی آگئی، مگر وفات کے چند روز پیشتر وہ پھر عود کر آئی تھی،

خدمت اور خاص کر رات گئے وقت نوبت بہ نوبت جاگ کر خدمت کی

سعادت خدام خاص کی خدمت میں آئی، جن میں پہلا درجہ خواجہ صاحب کا ہے، ان کے علاوہ مولانا جمیل احمد صاحب، بندو میاں، (ملازم نواب صاحب باغپت)

اور مولوی شبلی صاحب جونپوری نے اس خدمت خاص کی سعادت اخیر تک پائی، بعد کو مولانا ظفر احمد صاحب بھی ڈھاکہ سے آکر اس میں شامل ہو گئے،

حاضری کے دوسرے یا تیسرے دن استفسار ہوا کہ کھانا تو مزاج کے مطابق ہوتا ہے عرض کہ بالکل مطابق ہے، کس تواضع اور کس شفقت اور کس بلاغت سے ارشاد ہوا کہ میں معافی کا خواستگار نہیں، مستحق ہوں، اس نکتہ پر اہل نظر نے تحسین کی سعادت پائی کہ ضعف و نقاہت کے اس عالم میں بھی دل و دماغ ناقصوں کی تربیت میں مصروف ہیں اور اکرام ضیف کا نمونہ پیش کیا جا رہا ہے،

دو تین واقعے ذکر کے قابل ہیں، اسی اثنائے حاضری میں بنگال سے ایک معتقد با اخلاص کا خط آیا جس میں لکھا تھا کہ حدیث شریف میں ہے کہ جب نبی کی وفات کا وقت آتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو اختیار دیتے ہیں کہ خواہ وہ دنیا میں رہنا پسند کرے یا اللہ تعالیٰ کے یہاں جانا، یہ تمہید لکھ کر اس میں تھا کہ میرے اعتقاد میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متبعین خاص کو بھی اس اختیار خاص سے حسب استعداد حصہ ملتا ہو گا، اس لئے عرض ہے کہ ہم ناقصوں کی تربیت کے لئے حضرت والا چند روز اور اس دنیا میں قیام منظور فرمائیں، خط کے جواب میں لکھوا دیا تم اپنے دماغ کا کسی حاذق طبیب سے علاج کراؤ پھر حاضرین سے خطاب کر کے فرمایا "اول تو یہ ثابت نہیں کہ جو انبیاء (علیہم السلام) کو ملتا ہے اس میں اولیاء و مشائخ کو بھی حصہ ضرور ہی ملتا ہے" اور اس کے بعد فرمایا اور اگر ایسا بھی ہو تو ان انبیاء نے کیا کیا؟ (یعنی اللہ تعالےٰ کے قرب ہی کو حیات دنیا پر ترجیح دی) ایک دفعہ بعد ظہر خط لکھوا کر فارغ ہو چکے تھے کہ اونگھ آگئی، ہشیار ہوئے تو فرمایا کہ ایسا معلوم ہوا کہ اس تخت پر ایک لفافہ

رکھا ہے جس پر عبدالعزیز لکھا ہے، خواجہ صاحب نے عرض کی ابھی حضرت نے خطوط لکھوائے ہیں وہی خیال قائم رہا۔ ارشاد ہوا، ہاں یہ صحیح ہے مگر عبدالعزیز نام کیوں ہے، بات ختم ہوگئی، مجلس کے برخاست کے بعد خواجہ صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ شاہ عبدالعزیزؒ صاحب محدث دہلوی کی عمر کیا تھی؟ میں نے کہا اسّی یا بیاسی[۸۲] برس یاد آتا ہے (اب دارالمصنفین آکر دیکھا تو معلوم ہوا کہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی عمر شریف اکیاسی[۸۱] برس کے قریب یعنی اسّی برس کچھ مہینے ہوئی ہے، بہر حال اس سے خواجہ صاحب کی نکتہ شناس نظر حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تشابہ حال پر پہنچ گئی)

ہر چند یہ تاکید تھی کہ شدت علالت کی اطلاع باہر کسی کو نہ دی جائے، احباب اشارات و تلمیحات اور اصطلاحات میں اپنے متعلقین اور دوستوں کو اطلاع دیتے تھے، غرض یہ تھی کہ زائرین ہجوم نہ کریں، اس پر بھی دور دور سے معتقدین آجاتے تھے، ایک صاحب نے پشاور سے آنے کی اطلاع کرائی، دوسرے نے گورکھپور سے، کسی نہ کسی اور دور مقام سے مگر ہر ایک سے یہی ارشاد ہوا کہ اجازت نامہ کہاں ہے، جب وہ معذوری ظاہر کرتے اور اعتراف قصور کرتے تو فرماتے تمہاری غلطی کا خمیازہ میں کیوں اٹھاؤں، پھر حاضرین کی طرف خطاب کرکے فرمایا ان کو میں محروم کرکے بھی محروم نہیں کرتا ہوں، ایک سبق دے رہا ہوں، پھر اسی معنی کا خواجہ صاحب کا ایک مصرع پڑھا، پھر ارشاد فرمایا کہ ان کے ناکام واپس جانے کا یہ اثر ہوگا کہ اس کو سن کر دوسرے لوگ آنے سے رک جائیں گے، اور اس سے ان کو فائدہ پہنچے گا، غرض یہ تھی کہ لوگ اس بیکار کی زحمت اور تکلیف سے خود بھی بچیں اور حضرت کو

بھی ہجوم سے بچائیں۔

ایک روز بعد مغرب یاد فرمایا اور مشورہ چاہا کہ اشتہا مطلق نہیں اور ضعف بڑھ رہا ہے، گو میں اس کے نتیجہ پر راضی ہوں، مگر بہر حال اگر اس کی تدبیر کوئی ضروری ہو تو کرنا چاہئے، اس اثناء میں خیال ظاہر فرمایا کہ "لکھنؤ میں ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب (ناظم ندوہ) کو (جو مزاج شناس تھے) لکھا جائے کہ صرف اشتہا پیدا ہونے کے لئے کوئی نسخہ تجویز کریں"۔ خاکسار نے عرض کی کہ حضرت چار روز خط کے جانے میں اور چار روز آنے میں لگیں گے، اتنی دیر بہت ہے، پھر رائے ہوئی کہ سہارنپور میں کوئی اچھا ڈاکٹر ہو تو بلایا جائے، مگر دوسرے ہی دن مولوی محمد حسن صاحب اور دوسرے احباب لکھنؤ کا خط آیا کہ حکیم عبدالمجید صاحب لکھنوی جنکے علاج سے پہلے بھی فائدہ ہو چکا تھا اگر اجازت ہو تو ان کو لے کر حاضر ہوں، چنانچہ اجازت کا خط لکھا گیا طالبین کے خطوط بدستور آ رہے تھے، لوگ حسب دستور ہدایا منی آرڈر سے بھیج رہے تھے، مگر شدت احتیاط بدستور قائم تھی، اور وہ واپس ہو رہے تھے، مگر اخلاص و محبت کے سرمایہ کو بہت خوشی سے قبول فرما لیتے تھے، ایک قریب کے نواب صاحب کی ایک رقم آئی تو قبول فرما کر ارشاد ہوا کہ ان لوگوں کا ممنون ہوں کہ وہ دے کر اُلٹے خود ممنون ہوتے ہیں کہ اس نے (اپنی ذات کی طرف اشارہ) قبول کیا، ایک غریب نے کچھ پیش کیا تو اللہ اکبر اس کو آنکھوں سے لگایا، یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

حضرت گو ضبط، صبر اور استقامت سے اپنی تکالیف ظاہر نہیں فرماتے تھے اور نہ آئندہ کے خطرہ کو زبان پر لاتے تھے کہ دوسروں کو بے صبری نہ ہو، مگر بات بات سے سفر کی آمادگی ظاہر ہوتی تھی، گو اُن کی زندگی اور طرز زندگی بس صفائی، پاکیزگی اور باقاعدگی

کی عادی تھی اس کا اثر یہ تھا کہ وقت اخیر کے لئے کوئی کام اٹھا نہیں رکھا، کہ سالک کامل ہر لمحہ کو لمحہ اخیر سمجھتا ہے اور اسی کی تیاری رکھتا ہے یہی حال حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا تھا، کوئی چیز کرنی باقی نہ تھی، تمام انتظامات، حساب وکتاب اور وصایا سے پوری پوری فراغت تھی، عادت شریف تھی کہ آج کا کام کبھی کل پر اٹھا کر نہیں رکھا، گویا ہر وقت آمادۂ سفر تھے،

خاکسار کو بھوپال کی مجلس کی تاریخ ۹ر کو تار سے معلوم ہو چکی تھی، ۱۰ر کو رفیق سفر مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب کا بھی مکرمت نامہ آگیا، ۱۱ر کو صبح کی مجلس کے بعد رخصت کی درخواست پیش کی، بااین ہمہ ضعف وقوت لیٹے ہی لیٹے دونوں ہاتھ رخصت کے لئے بڑھائے، حقیر نے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر دست مبارک کو بوسہ دیا، اور آنکھوں کو ملا، آہ! کس بلا کا رخصتانہ تھا، فرمایا "جاؤ خدا کے سپرد کیا" یہ لفظ کانوں نے پہلے نہیں سنے تھے، آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور دیر تک چہرۂ مبارک پر جمی رہیں کہ یہ جمال جہاں آرا شاید پھر دیکھنے کو نہ ملے، سو ایسا ہی ہوا،

بعد کے اخیر حالات خاکسار کے جانے کے دو ایک روز کے بعد حکیم عبدالمجید صاحب تشریف لے آئے اور علاج اپنے ہاتھ میں لے لیا، پہلے روز عرق دانۂ انار دیا، دوسرے روز ایک بٹیر کی یخنی دلوائی، تیسرے روز دو بٹیروں کی، مگر حکیموں کی ہر مسیحائی تدبیر محکمۂ تقدیر سے رد ہوتی رہی، حکیم صاحب کا ایک ہفتہ علاج رہا۔ مگر حالت میں تغیر نہیں ہوا، میں نے بھوپال سے مولانا جمیل احمد صاحب کو طلب خیریت کا خط لکھا جس کے جواب میں دوشنبہ کے روز یعنی جس کے آنے والی شب میں وفات ہوئی یہ تحریر فرمایا۔

"حکیم عبدالمجید صاحب آئے تھے، ہفتہ پورا کر کے کل واپس جا رہے ہیں، حکیم سمیع اللہ (حضرت کے خلیفہ مقداد خاں صاحب لکھنوی کے صاحبزادہ)، رہیں گے، علاج ان ہی دونوں کا ہے، افاقہ کی صورت نہیں، دست بہت ہیں، ضعف بے حد ہے، سانس میں تکلیف ہے، بائیں پاؤں میں کل سے سخت درد ہے، ہم سب پریشان ہیں" (جمیل احمد دوشنبہ)

لکھنو میں ثقات سے جو حاضر تھے معلوم ہوا کہ دوشنبہ کے روز دست زیادہ آئے، ظہر کے بعد ضعف زیادہ محسوس ہوا، عصر کے بعد مولانا شبیر علی صاحب کو (جو حضرت کے بھتیجے اور تمام امور خانقاہ و مدرسہ کے مہتمم و متولی تھے) یاد فرمایا، اطلاع دی گئی کہ وہ سہارنپور دوا لانے گئے ہیں، اہلیہ خورد سے فرمایا کہ امانتوں کا صندوقچہ اٹھا لو (امانتیں وہ رقمیں تھیں جن کو اہل خیر حضرت کو وکیل بنا کر کار خیر کے لئے بھیجتے تھے) مختلف تھیلیاں مذ دار ہوتی تھیں، ایک تھیلی میں بی بی صاحبہ نے عرض کیا کہ پانچ روپے ہیں، فرمایا چھ ہوں گے، چنانچہ ہاتھ ڈالا تو ایک روپیہ کا نوٹ اور نکلا، ارشاد فرمایا کہ یہ کل رقمیں ان کے مالکوں کو واپس کر دی جائیں، یہ اس مسئلہ شرعی پر عمل تھا کہ وکیل یا موکل کی موت کے بعد وکالت ختم ہو جاتی ہے اور ملک مالک کے تصرف میں واپس جانی چاہئے، مولانا ظفر احمد صاحب کو کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ایک کاغذ پر یہ بشارت نامہ لکھ کر وَجَعَلْنَاهَا وَابْنَهَا آيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ دیا اور فرمایا میں نے سب کو معاف کیا، میں کسی کی طرف سے کوئی غبار لے کر نہیں جا رہا ہوں،

مغرب کے بعد حالت اور زیادہ نازک ہوئی، سانس کی تنگی محسوس تھی، مولانا

ظفر احمد صاحب نے ڈھاکہ واپس جا کر لکھا،

"آپ تھانہ بھون سے بھوپال گئے اور یہاں سخت بھونچال آگیا کہ حضرت حکیم الامت قدس اللہ سرہ نے دار البقا کی طرف ارتحال فرمایا انا للہ وانا الیہ راجعون،

کادت لہا شم الجبال تزول

یہ ناچیز اخیر وقت تک حاضر خدمت رہا، دل پر پتھر رکھ کر بیٹھا رہا قلب اطہر کی طرف متوجہ رہا، تشنگی رفع کرنے کے لیئے آب زمزم دیتا رہا، یہاں تک کہ آخری سانس میرے سامنے ختم ہوا، یٰسین اور کلمہ کی تلقین کرتا رہا، غسل بھی دیا، نماز بھی پڑھائی،

رات کے دس بجے تھے کہ عشاء کی نماز کے لئے خدام قریب کی حوض کی مسجد میں گئے کہ اسی اثنا میں وہ دم آگیا جس دم کے لئے ہر دم تیاری رہتی تھی، اور دولتِ حیات کی آخری سانس اس دنیا میں لے کر واصل بحق ہوئی اللّٰھم انزل علیہ شآبیب رحمتك وارفع درجاته وارزقنا من برکاته

اس وقت خدام خاص کی کیفیت خیال کے قابل ہے جو ایک طرف اپنے محبوب کے فراق میں بے قرار تھے، اور دوسری طرف مقام صبر و رضا کی تعلیم سے بہرہ ور تھے، اور حق تھا کہ حضرت سرور انبیا سید الرسل علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اتباع میں وہی کہیں جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے محبوب فرزند ابراہیم کی وفات کے وقت ارشاد فرمایا تھا کہ "اے ابراہیم ہم تیری جدائی سے غم گین ہیں، لیکن زبان سے ہم وہی کہیں گے جس میں ہمارے پروردگار کی رضا مندی ہو" تاکہ محبت اور

تسلیم ورضا دونوں کا حق ادا ہو،

تجہیز وتکفین کے متعلق یہی فیصلہ ہوا کہ صبح کو ہو، صبح کے وقت خبر کے لئے دو آدمی سہارنپور بھیجے گئے، ایک مدرسہ مظاہر العلوم میں جس سے حضرت کو بہت روحانی تعلق تھا اور دوسرا سہارنپور کے احباب کے پاس، اس صبح کی جانے والی اور آنے والی گاڑیوں میں آدھ ہی گھنٹہ کا فصل ہوتا ہے، اس لئے جو لوگ سنتے کے ساتھ جس حال میں تھے اسی حال میں چل پڑے وہ تو پہلی گاڑی سے روانہ ہو سکے، مگر اس کے بعد بھی سیکڑوں آدمی اسٹیشن پر پہنچ گئے، چنانچہ دوسری اسپیشل ٹرین چھوڑی گئی اور قریب ڈیڑھ ہزار آدمی کے جنازہ کے وقت تک پہنچ سکے،

حضرت نے ہر چیز کا انتظام پہلے سے کر رکھا تھا یعنی ایک زمین لے کر اس کو تکیہ یا قبرستان خاص بنا کر وقف کر دیا تھا، ایک مختصر سے احاطہ کے اندر ایک زمین گھیر دی گئی تھی، جس میں کچھ درخت بھی لگا دیئے گئے تھے، چھوٹی سی مسجد اور ایک مختصر سا سائبان بھی اس میں ہے، اسی میں دوسرے اعزہ اور خدام بھی آسودہ ہیں، اسی کے بیچ میں اس مخدوم کی استراحت ابدی کے لئے زمین چنی گئی،

جنازہ کی نماز کے لئے مولانا شبیر علی صاحب نے مولانا ظفر احمد صاحب کو اشارہ کیا، مجھے معلوم ہوا کہ پہلے تو مولانا ظفر احمد صاحب نے تواضع کرنا چاہا۔ مگر انہیں اپنا خواب یاد آیا تو آگے بڑھ گئے اور نماز جنازہ ادا کی، میں نے سنا کہ مولانا ظفر احمد صاحب ڈھاکہ میں تھے اور حضرت کی شدت علالت کی خبریں جا رہی تھیں اور گھر سے آنے کے لئے شدید تقاضا بھی ہو رہا تھا تو انہوں نے خواب دیکھا کہ وہ تھانہ بھون پہنچے اور حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضرت بہت خوش

ہوتے اور فرمایا کہ ایک نماز پڑھانے والا آگیا،

یہ واقعات تھانہ بھون میں ۱۹؍اور ۲۰؍جولائی کو پیش آئے مگر باہر والوں کو اطلاع ۲ دو دن بعد ملی، دہلی میں ۲۱؍کو اور لکھنؤ میں ۲۲؍کو، مذہبی حلقوں میں اور عربی مدرسوں میں سناٹا چھا گیا،

خاکسار اب تک بھوپال میں تھا، عنایت الٰہی دیکھئے کہ عین شب وصال کو خواب دیکھا کہ مولانا شبیر علی صاحب مجھ سے فرما رہے ہیں کہ حضرت مولانا کو پوری صحت ہوگئی، صبح اٹھ کر میں نے حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب سے یہ خواب بیان کیا، دونوں چُپ رہے، مفتی صاحب ۲۱؍جولائی کو اور خاکسار ۲۲؍جولائی کو بھوپال سے روانہ ہوئے، میں ۲۳؍کی دوپہر کو لکھنؤ پہنچا اور ندوہ آیا، حادثہ سے بالکل بے خبر تھا، مدرسہ پہنچنے کے ساتھ میرے بچہ سلمان سلمہ نے سب سے پہلے خبر دی، اور اتفاق دیکھئے کہ بھوپال سے خط تو میں نے خیر خیریت کے لئے مولانا جمیل احمد کو لکھا تھا، چنانچہ انہوں نے دوشنبہ کے روز شدت علالت اور مایوسی کی اطلاع لکھی، اور اس کی دوسری طرف بلا توقع مولانا شبیر علی صاحب کے قلم کی عبارت یہ تھی:

حضرت مخدوم معظم دام ظلکم العالی، السّلام علیکم ورحمۃ اللہ،

بعد تحریر خط ہذا ۱۹، ۲۰ جولائی کی درمیانی شب میں حضرت والا کا وصال ہوگیا، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ، بجز اطلاع کے اور کیا عرض کرسکتا ہوں، کیونکہ الفاظ اظہار کے لئے نہیں ملتے،

مصیبت زدہ شبیر علی عفی عنہ از تھانہ بھون

۲۴ ر کو سہارنپور اور دہلی سے مولانا زکریا صاحب شیخ الحدیث مظاہر العلوم
سہارنپور اور مولانا الیاس صاحب کاندھلوی لکھنو دار العلوم میں آئے تو مزید
اطلاعات اور تفصیلات معلوم ہوئیں، ۲۶ ر جولائی کا لکھا ہوا مولانا مفتی کفایت اللہ
صاحب کا غم نامہ ملا،

مکرم محترم، دامت معالیہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، امید ہے کہ آپ بھوپال سے واپس آگئے
ہوں گے، میں نے دہلی پہنچ کر حضرت مولانا تھانوی کے وصال کی خبر
سنی، آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھاگیا، فوراً یاد آیا کہ جس شب کو مولانا
نے دنیا کو چھوڑا یعنی دوشنبہ سہ شنبہ کی درمیانی شب اسی رات کی صبح کو
جناب نے بھوپال میں مجھ سے ذکر کیا تھا کہ آپ نے مولوی شبیر علی صاحب
کو خواب میں دیکھا کہ وہ کہہ رہے ہیں حضرت مولانا بالکل صحت یاب
ہوگئے، آپ کا خواب سچا ہوا، مولانا نے دنیاوی تکالیف سے بالکل
صحت پائی، اور رفیق اعلیٰ سے جاملے، انا للہ وانا الیہ راجعون،
رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً واسکنہ الفردوس الاعلیٰ،
ہندوستان ایک حکیم الامۃ مجدد الملۃ سے محروم ہوگیا"

حضرت کے ایک خلیفہ جن کو صدق رویا کی نعمت ملی ہے، وصال کی دوسری
یا تیسری شب کو خواب میں دیکھا کہ حضرت فرما رہے ہیں کہ میرے فیوض اب بھی
جاری رہیں گے، اللہ تعالیٰ نے مجھے مقام شہداء فرمایا یا مقام شہود عطا فرمایا حضرت
نے اسہال کے مرض سے وفات فرمائی، اور حدیث نبوی ہے کل مبطونٍ شہید،

پیٹ کی بیماری سے مرنے والا شہید ہے،

مجھ سے مولوی محمد حسن صاحب کاکوروی (علیگ) مالک انوار المطابع لکھنو نے جو حضرت کے خدام قدیم میں سے ہیں بیان کیا اور انہوں نے خواجہ عزیز الحسن صاحب غوری بی اے (علیگ) سے سنا ان کو چھوٹی پیرانی صاحبہ سے معلوم ہوا (خواجہ صاحب کی اہلیہ بھی ساتھ تھیں) کہ جس وقت روح مبارک پرواز کر رہی تھی حضرت کے داہنے ہاتھ کی شہادت کی انگلی اور بیچ کی انگلی کے درمیان میں ایک نگینہ سا چمکتا معلوم ہوتا تھا جس کو انہوں نے دیکھا اور دوسری عورتوں نے بھی دیکھا"، محرم خاص حضرت خواجہ صاحب نے فرمایا کہ چونکہ جو نور ہدایت حضرت کے ذریعہ پھیلا وہ زیادہ تر ان کی انگلیوں یعنی تصنیفات کے ذریعہ سے پھیلا، اس لئے وہ نور انگلیوں ہی کے درمیان متمثّل ہو کر نظر آیا، واللہ اعلم بالصواب،

حضرت کے بہت سے محبین کی طرح ایک محب خاص مولانا مسعود علی صاحب ندوی کو اس عقیدت و عظمت کی بنا پر جو ان کے دل میں تھی حضرت کی مغفرت کے لئے دعا مانگنے میں دلی کشمکش محسوس ہوتی تھی، انہوں نے خواب دیکھا کہ وہ خانقاہ تھانہ بھون میں حاضر ہیں کہ دفعتہً حضرت تشریف لے آئے اور ان سے فرمایا کہ میری صحت کے لئے دعا مانگا کرو،

حلِّ این نکتہ ہم از روئے نگار آخر شد
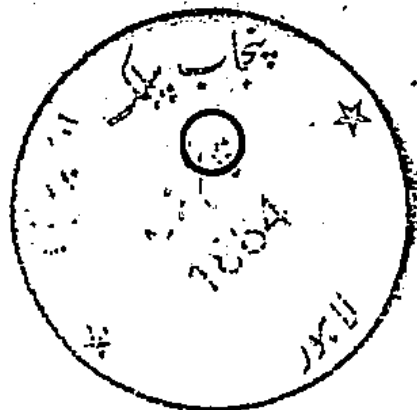
قائداعظم محمدؐ علی جناح مرحوم کے نام حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کا ایک گرامی نامہ

رمضان المبارک ۱۳۵۶ھ کا زمانہ تھا کہ حضرت تھانوی کو معلوم ہوا کہ مسلم لیگ اور کانگریس میں باہمی مصالحت کی گفتگو ہو رہی ہے اور مسٹر جناح گفتگو کرنے والے ہیں۔ حضرتؒ کو فکر ہوئی کہ مسٹر جناح شرعی احکام سے واقف نہیں کہیں اس مصالحت میں کچھ خلاف شرع شرائط پر صلح نہ ہو جائے تو مسلمانوں کیلئے بڑی مشکل ہوگی اس لئے مسٹر جناح کے نام مندرجہ ذیل مضمون کا گرامی نامہ تحریر فرمایا کہ۔

"محض سیاسی اور اقتصادی معاملات میں تو آپ کو کچھ تبلانے کی ضرورت نہیں، لیکن مذہبی امور میں آپ کو ان سے مصالحت کرنے کا حق اس وقت تک نہیں ہے جب تک آپ حضرات علماء ماہرین سے مسودہ صلح دکھلا کر مشورہ نہ کریں، ایسا نہ ہو کہ کوئی امر خلاف شرع طے ہو جائے پھر دشواریاں پیدا ہوں" فقط

اس کے جواب میں مسٹر جناح صاحب کا خط آیا جس کا مضمون یہ ہے۔

جواب قائداعظم :۔ "مجھ کو مولانا مظہر الدین نیز نواب زادہ لیاقت علی خاں صاحب سے گفتگو کرنے کا موقع ملا، اور میں بہت زیادہ خوش ہوا یہ معلوم کر کے کہ آپ کو آل انڈیا مسلم لیگ کے مقصد اور پروگرام سے پوری ہمدردی ہے، مجھ کو آپ کا خط ملا، لیکن موجودہ متعدد مشاغل اور عدم حاضری بمبئی کے سبب آپ کو جواب اس سے قبل نہ دے سکا۔

چند نکات جو میرے سامنے پیش کئے گئے میں نے ان کو بغور تحریر کر لیا ہے اور آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں ان کے متعلق آپ سے ضرور مشورہ کروں گا جب وقت آئے گا۔ آپ کی مہربانی کا بہت بہت شکریہ۔"

آپ کا خادم محمد علی جناح

مجالس حکیم الامت / مفتی محمد شفیع صاحبؒ

قائداعظم محمد علی جناح مرحوم کا

حکیم الامت مجدد الملت حضرۃ مولانا شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی رح سے

اظہارِ عقیدت

قائدِ اعظم محمد علی جناح مرحوم نے ممبئی کے تاجروں سے گفتگو کرتے ہوئے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر کرتے ہوئے حضرات علماء کانگریس کے مقابلہ میں کہا کہ

"مسلم لیگ کے ساتھ ایک بہت بڑا عالم ہے جس کا علم و تقدس اور تقویٰ، اگر ایک پلڑے میں رکھا جائے اور تمام علماء کا علم و تقدس اور تقویٰ دوسرے پلڑے میں رکھا جائے تو مجھے یقین ہے کہ اُن کا پلڑا بھاری ہوگا وہ مولانا اشرف علی تھانوی (رحمۃ اللہ علیہ) ہیں۔"

(تعمیر پاکستان اور علمائے ربانی)
منشی عبدالرحمٰن خان۔ ملتان

مجلس صیانۃ المسلمین پاکستان، لاہور

مختصر تعارف

مجلس صیانۃ المسلمین خالص اسلامی تعلیمات کے ایسے اصلاحی پروگرام کا نام ہے جس پر عمل پیرا ہونے سے انفرادی و اجتماعی کامل اصلاح ہوکر بہت جلد مسلمانوں کا معاشرہ اسلامی معاشرہ بن سکتا ہے ○ اس نظام کے ذریعے ہر فرد اعتقادات، عبادات، معاملات، اخلاق غرض ظاہر و باطن ہر اعتبار سے ایک مثالی انسان بن جاتا ہے ○ معاشرے سے ہر برائی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اخوۃ، مواسات، ایثار، غم خواری، ہمدردی اور اعتماد کا جذبہ ہر فرد میں بیدار ہو جاتا ہے اس نظام کے ذریعے دین کی سچی اور صحیح معلومات حاصل ہوتی ہیں ○ اجتماعی طور پر اس نظام کو اپنانے سے بہت جلد معاشرہ سدھر سکتا ہے ——— اس نظام کی اہم خوبی یہ ہے کہ اس کو

اسلام کے عظیم مفکر

حکیم الامۃ حضرت مولانا شاہ محمد اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ نے

اپنے نورِ بصیرت سے مسلمانوں کے لیے تجویز فرما کر ۱۹۳۰ء بمطابق ۱۳۴۹ھ میں جاری فرمایا، اور تقسیم ملک کے بعد حضرت حکیم الامۃ کے خلیفہ خاص حضرت مولانا شاہ حافظ جلیل احمد شروانی رحمۃ اللہ کے ہاتھوں میں اس کی نشاۃِ ثانیہ زیر سرپرستی حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحبؒ بانی جامعہ اشرفیہ لاہور ہوئی جس سے اب تک ہزار

حضرت تھانویؒ کے خلفاء او